نقش ائمہ در احیاء دین
یعنی
احیائے دین
میں
ائمہ اہلبیتؑ کا کردار
جلد اول
علامہ شیخ سید مرتضیٰ عسکری

2

نقش ائمہ در احیائے دین

یعنی

اِحیائے دِین

میں

ائمۂ اہلبیتؑ کا کِردار

از

علامہ محقق سید مرتضیٰ عسکری

ناشران

مجمع عِلمی اِسلامی

تصنیف
علامہ مرتضیٰ عسکری
ترجمہ
محمد فضل حق
تدوین
رضا حسین رضوانی

علامہ محقق سیّد مرتضیٰ عسکری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمْ
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ
وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَسَلَّمْ

فہرست

دسواں درس ۲۷۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ہمارے دور میں اسلام کی شناخت کے بارے میں باتیں دوسرے ادوار کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی سُننے میں آتی ہیں۔ ایک طرف تو مستشرقین ہیں جن کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور جن کی تحریریں اور تحقیقاتی مقالے کئی ایک زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں[1] اور دوسری جانب ان کے مشرقی شاگرد ہیں جو مشرق میں مغربی علم و دانش کے حاشیہ بردار ہیں اور کہنے کو اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں میں مشرقی علوم کے استادوں کی حیثیت سے متعین ہیں۔ تیسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اسلامی علوم میں تھوڑی بہت شُد بُد رکھتے ہیں اور دین دار معاشروں میں ان کا نفوذ پہلے دو گروہوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ پہلا گروہ عدم صداقت کی بنا پر اور اکثر جانبداری اور اسلام کی زبان اور تعلیمات پر عبور حاصل نہ ہونے کی وجہ سے صحیح اور دقیق طریقے سے اسلام کو پہچاننے سے محروم ہے۔[2] جہاں تک دوسرے گروہ کا تعلق ہے اگرچہ ممکن ہے کہ کبھی کبھی وہ صداقت سے

---

[1] اپنی تمام تر غلطیوں اور غلط بیانیوں کے باوجود اسلام کے بارے میں مستشرقین کی اہم ترین تحریر دائرۃ المعارف الاسلام (Encyclopaedia of Islam) اب تک انگریزی، فرانسیسی، جرمن، عربی، ترکی، فارسی اور اردو میں چھپ چکی ہے۔ [2] درحقیقت بہت سے مستشرقین یا تو وہ ہیں جو لامنس (Lammens) اور گلڈزیہر (Goldziher) کی طرح اسلام سے دشمنی اور کینہ رکھتے ہیں یا نولڈک (Noeldeke)، ماسینین (Massignon)، بلاشر (Blausher) اور ہٹی (Hitti) کی طرح استعمار کے زر خرید ہیں۔ اس سلسلے میں دیکھیے الفِکرُ الاسلامی الحَدیث وَصِلته بالاستعمار الغربی از ڈاکٹر محمد البہی۔ اَلتَّبشِیرُ وَ الِاستِعمَار از ڈاکٹر عمر فروخ و ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی اور اَلِاسلَامُ فِی وَجهِ التَّغرِیب

بے بہرہ نہ بھی ہو لیکن علم پر پُورا پُورا عبور حاصل نہ ہونا اور مغربی استادوں کے سامنے اپنے آپکو بے بضاعت سمجھنا اُن لوگوں کو حقیقت کے لافانی جلوے کے دیدار سے محروم رکھتا ہے۔ جہانتک تیسرے گروہ کا تعلق ہے اس کی محرومیت ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ ناکافی تعلیم اور مطالعہ بجائے خود اِس کے اسلامی مسائل کے نہ جاننے اور صاحبِ نظر نہ ہونے کی کافی دلیل ہے۔ لہٰذا اس میدان کا شہسوار فقط وہی شخص ہو سکتا ہے جو تمام دینی مصادر اور اسلامی علوم میں یدِ طولیٰ رکھتا ہو اور وہ بھی اِس صورت میں جب اُسے ان علوم تک آزادانہ دسترس حاصل ہو۔

اِن شرائط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کو پہچاننے والے صاحبِ نظر حضرات کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور معدودے چند لوگوں کے سوا معاشرے میں ایسے لوگ نظر نہیں آئیں گے۔ ہاں اگر کچھ اصحاب اپنے اندرونی شوق اور مذہبی جوش کی بنا پر تبلیغ اسلام کا ارادہ رکھتے ہوں تو اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم اتنی ابتدائی معلومات حاصل کریں جن کے ذریعے ان کی رسائی اسلام کے صحیح اور تحقیق شُدہ منابع تک ہو سکے اور وہ جو کچھ کہیں اُن ہی کی بنیاد پر کہیں اور جو کچھ لکھیں ان ہی کو سند قرار دیتے ہوئے لکھیں۔ اُن کے لیے اِس کے علاوہ اور کوئی راستا نہیں۔

اِس میں کوئی کلام نہیں کہ ایک اسلامی بحث میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ قول کی صحت ہے۔ باقی سب مسائل کا نمبر بعد میں آتا ہے اور اُن کی حیثیت مقابلتہً فروعی ہے۔ کلام کی خوبصورتی، ادیبانہ طرزِ تحریر اور مطالب کا زوردار اور جالب انداز میں پیش کرنا وغیرہ سبھی چیزیں ضروری ہیں لیکن ان کی حیثیت بنیادی نہیں۔ وہ بنیادی چیز جس سے چشم پوشی ممکن نہیں زیرِ بحث مضمون کی صحت اور اصالت ہے۔ اِس خصوصیت کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور سننے اور پڑھنے والوں کی پسند اور متعلقہ دور پر حکم فرما ذہنی فضا کو بھی اِس امر کی اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اِس خصوصیت میں تغیّر و تبدل کر سکے۔ اِس سلسلے میں

از انوار الجندی۔ اسلام و غرب از پروفیسر خورشید احمد انتاج المستشرقین واثرہ فی الفکر الاسلامی الحدیث از مالک بن نبی

مقررین اور مصنفین کی ذمّے داری بے حد سنگین ہے کیونکہ خداوندِ اسلام اپنے دین میں کسی بھی قسم کی تبدیلی ہرگز قبول نہیں کرتا خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اور وہ ایسی تبدیلی کرنیوالے کو قطعاً معاف نہیں کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس قول میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک اسلامی بحث میں صحت اور اصالت کا حصول کیونکر ممکن ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سو فیصد خلافِ اسلام بحث میں ایک یا کئی ایک احادیث کے حوالے دیے جاتے ہیں یا حقیقت اور اسلام سے کوسوں دُور کسی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید کی آیات بطورِ سند پیش کی جاتی ہیں[۱]۔ ایسا ہونا ممکن ہے اور اکثر ہوا ہے۔

لہٰذا فقط اسلام کا نام لیکر کوئی بات کہنا اس کے صحیح ہونے کی کافی شرط نہیں اور نہ ہی کسی مہجور[۲] حدیث کو بطورِ سند پیش کرنا کسی تحقیق کے صحیح اور اسلامی ہونے کی ضمانت فراہم کرتا ہے بلکہ اِس مقصد کے لیے دینی متُون کے مجموعے کے مکمّل اور ناقدانہ مطالعے اور اس پر غور وخوض کی ضرورت ہے اور یہ چیز بجائے خود کئی ایک تمہیدی علوم پر دسترس کا تقاضا کرتی ہے۔

فرض کیجیے کہ ان شرائط پر پُورا اُترنے کے بعد ایک عالمِ خبیر دینی مصادر اور متُون کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور تمام نصوصِ اسلامی کا مطالعہ کرکے ان کے بارے میں بحث اور کاوش کرتے ہوئے اسلام کی شناخت کا بیڑا اُٹھاتا ہے اور دُوسروں کو یہ دین سمجھانے کی جانب ہاتھ بڑھاتا ہے۔ بلاشُبہ یہ چیزیں لازمی ہیں اور ان کے بغیر اسلام کا سمجھنا کسی طور ممکن نہیں۔ تاہم یہ شرائط اسلام کی شناخت کے لیے کافی نہیں۔ جو چیز کاروانِ دانش کو حقیقت کی منزل تک پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ عالم غیر جانبدار ہو، مناسب تحقیقات سے پہلے کوئی رائے قائم کرنے سے پرہیز کرے اور قدیم یا جدید مکاتبِ فکر میں سے اس کا میلانِ خاطر کسی ایک مکتب کی جانب نہ ہو۔ اِن مقدمات کی بنا پر ایک اسلام شناس حقیقی معنوں میں اِس صفت کا حامل اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اوّل تو وہ قرآن، حدیث، تفسیر، تاریخ، سیرت اور رجال جیسے دینی مدارک اور مصادر سے واقف ہو اور اِن پر پُوری طرح دسترس رکھتا ہو اور دوم وہ

---

[۱] مستشرقین حضرات کی اسلامی بحثوں میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں (مثلاً دائرۃ المعارف الاسلام میں لامانس اور گلڈزیہر وغیرہ کی تحریریں ملاحظہ فرمائیں)۔ [۲] مہجور، یعنی ترک کی ہوئی۔

تعصب سے خالی ذہن، بے لاگ دل اور آزاد فکر کے ساتھ غیر دینی مکاتب سے بہرہ مند ہو اور کوئی پہلے سے قبول شدہ رائے اپنائے بغیر حقائق کے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔[۱]

اسلام کی بنیاد ان کثیر التعداد معارف پر ہے جو کتاب اور سنّت میں جمع ہیں۔ چونکہ ہمارے اور نزولِ کتاب اور سنّتِ نبوی[۲] کی حامل روایات اور متون کے صادر ہونے کے زمانے کے درمیان اب صدیوں کا فاصلہ ہو گیا ہے، لہٰذا انھیں سمجھنے کے لیے اب ہمیں مجبوراً علمی واسطوں کی ضرورت ہے تاکہ ہم اِن چودہ صدیوں کا فاصلہ پاٹ سکیں اور رسولِ اکرمؐ یا ائمہ علیہم السلام کے ایک ہم عصر عرب کی مانند اُن کے ارشادات کو سمجھ سکیں۔ اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ ہر دَور میں اسلام کے معارف کے مطالعہ کے لیے پہلے قدم کے طور پر ہمیں عربی زبان، لغت اور ادبیات کی خصوصی شناخت کی ضرورت ہے۔ عربی زبان کی خصوصی شناخت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عربی الفاظ کے مفردات، ان کی جملہ بندیوں اور کثیر مجازات، کنایات اور استعارات کا مطالعہ کیا جائے اور انھیں پہچانا جائے۔ عربی زبان کی گرامر اور ادبیات کی تحقیق ایک صاحبِ نظر اور ماہرِ فن کی حد تک کی جائے تاکہ انسان اسلامی متون کو آنحضرتؐ اور ائمہؑ کے ایک ہم عصر اور مخاطب عرب کی مانند سمجھ سکے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہر زبان میں اس کی زندگی کے مختلف ادوار میں گوناگوں عوامل کے زیرِ اثر بتدریج تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ایک بے حد خوب صورت لفظ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کریہہ اور ناشائستہ ہو جاتا ہے اور اس کے معنی سابقہ معنی کا بالکل اُلٹ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کسی لفظ کے مفہوم کا دامن تنگ ہو جاتا ہے اور کبھی وسیع ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

---

[۱] یہ وہی شرط ہے جس پر ہماری روایات میں اس وقت اصرار کیا جاتا ہے جب معاملہ تفسیر کا ہو یعنی یہ کہ مفسر کو اپنی رائے سے قرآن مجید کی تفسیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس بارے میں ملاحظہ ہو تفسیر العیاشی جلد ۱ صفحہ ۱۲ - ۱۸ اور تفسیر الصافی جلد ۱ ص۲۱۔

[۲] ائمہ اہلبیتؑ کی روایات رسول اکرمؐ سے حاصل کی گئی ہیں۔ دیکھیے اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۸، حدیث ۲۱ اور جلد ۱ صفحہ ۶۲، حدیث ۱۰۔ بصائر الدرجات صفحہ ۲۹۹ - ۳۰۲ جزو ۶ باب ۱۴ اور ۱۵

اِن وجوہ کی بنا پر عربی زبان، لغت اور گرامر کے قواعد کی اس حد تک شناخت ضروری ہے کہ وہ ہمیں اِن تبدیلیوں پر محیط کر دے اور زمان اور مکان میں سفر کرنے کی قدرت عطا کرے۔ لہٰذا اسلام کو پہچاننے کا پہلا ضروری وسیلہ عربی زبان اور لغت سے اجتہاد اور تخصّص کی حد تک واقفیت ہے۔[۱]

چونکہ ایک طرف ہمارے اور دوسری طرف رسولِ اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ کے درمیان اور راویوں اور مؤلفینِ کتب کے ایک عظیم سلسلے کے درمیان بہت فاصلہ پیدا ہو گیا ہے اس لیے ایک اسلام شناس کو چاہیے کہ وہ صحابۂ رسولؐ اور ائمہؑ اور کثیر التعداد راویوں اور اسلامی متون کے بیشمار مؤلفین کی پہچان کے معاملے میں صاحبِ نظر ہو تاکہ وہ تاریخ، سیرت اور احادیث کی روایات کی صحت یا سقم کے بارے میں فیصلہ کر سکے اور اس کا یہ تخصّص اس حد تک ہونا چاہیے کہ وہ اسرائیلیات جیسی روایات کو جو اسلامی متون میں دَر آئی ہیں[۲] دوسری روایات سے جُدا کر سکے یا بیگانہ علوم کے دینی مدارک میں نفوذ کی نشاندہی کر سکے۔[۳] یہ امر بالکل واضح ہے کہ اس مقصد کے لیے دُوسروں کے فلسفے اور اعتقادات کے اُصولوں کا جاننا بھی ضروری ہے اور جب تک انسان ان کا گہرا مطالعہ نہ کرے خود اپنے موردِ تحقیق مکتب میں ان کے نفوذ کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

یہ علوم بھی اسلام کی شناخت کے لیے دُوسری لازمی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے بغیر ایک متخصّص کے طور پر اسلام کا سمجھنا محال ہے۔ جب ہم مقدماتی علوم کے اِن دو گروہوں سے آگے بڑھتے ہیں تو اصل متون کا نمبر آتا ہے۔ یہ وہ متون ہیں جن کی تحقیق ایک متخصّص مقدماتی علوم

۱۔ اس سلسلے میں صَرف و نحو، معانی، بیان، بدیع، لغت اور بالآخر ان علوم میں بتدریج تبدیلیوں کی تاریخ کا جاننا لازمی ہے۔

۲۔ اس قسم کی روایات کے نمونے تفسیر طبری اور تفسیر درمنثور میں ابتدائے آفرنیش سے مربوط حوادث میں اور مبداء و معاد سے مربوط مسائل میں ملتے ہیں۔ آئندہ مباحث میں ہمارا سابقہ اس قسم کی روایات سے پڑیگا۔

۳۔ مانویوں کی سازشوں اور معاندانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں (جو کہ دوسری صدی ہجری کے روشن فکر ملحد تھے) ہمارے تاریخی متون مثلاً طبری، ابن اثیر، ابن کثیر اور ابن خلدون، اسلام کے لیے تباہ کن جھوٹ سے پٹے پڑے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں عبداللہ بن سبا۔ جلد اوّل اور صدو پنجاہ صحابی دروغین، از مرتضٰی عسکری۔

کا احاطہ کر لینے کے بعد شروع کرتا ہے اور ان سے اسلامی تفکّر کے اصلی خطوط، جزویات اور فروعات کا استنباط کرتا ہے۔ ان متون کو چند زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱- اسلام کا پہلا اور بُنیادی متن یعنی قرآنِ کریم

ایک اسلام شناس کے لیے ضروری ہے کہ قرآنِ کریم اور اس کے ذیل میں تفسیر، بطن، جری[۱]، تمثیل اور شانِ نزول کے عنوان سے وارد شُدہ روایات کی اسلام کے اوّلین اور اہم ترین متن کے طور پر گہری تحقیق کرے اور اس باب کی وسعت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ "البرہان" جیسی تفسیر روائی میں تقریباً ۱۲ ہزار روایات موجود ہیں۔[۲]

۲- اعتقادی متُون

ہمارے ہاں اعتقادات اور فلسفیانہ مسائل پر دلائل و براہین کے سلسلے میں گرانبار خزانے موجود ہیں جن کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی اور ان کا مُطالعہ ہر اسلام شناس کے لیے لازم اور لابدّ ہے۔ اس موضوع پر اصول کافی کی فقط ایک جلد میں ۱۴۳۷ روایتیں موجود ہیں اور یہ اس باب میں موجود معارف کا بے حد مختصر حصّہ ہیں۔

۳- اخلاق اور اخلاقیات

اسلام میں اخلاقی مسائل پر متُون اور نصوص کی مقدار بے حد وسیع ہے اور جب تک ان کا ناقدانہ مُطالعہ نہ کیا جائے اسلام کے بارے میں کسی رائے یا نظریے کا اظہار ممکن نہیں۔

۴- عملی قوانین

وہ متُون جو عملی قواعد و ضوابط پر حاوی ہیں یا اسلامی فراست کے مُطابق انسانی زندگی کا

---

[۱] قرآنی آیات انسان کے اعمال کے مُطابق قیامت تک منطبق ہوتی رہیں گی اور اس طرح ہمارا ہر عمل کسی نہ کسی آیت کا مصداق قرار پاتا رہے گا۔

[۲] تفسیر "المیزان" میں تقریباً پانچ ہزار تحقیق شُدہ روایات نقل کی گئی ہیں۔

پروگرام تشکیل دیتے ہیں، ہمارے متوُن کا گرانبار ترین حصہ ہیں۔ اس قسم کے مصادر اور مدارک اسلام شناسوں کی تحقیقات کے لیے ایک لازمی جزو ہیں اور اُن کے بارے میں دقیق اور ہمہ پہلو تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ فقط وَسَائِلُ الشِّیعَۃِ اِلیٰ تَحصِیلِ مَسَائِلِ الشَّرِیعَۃِ نامی کتاب ۳۵۸۵۰ احادیث پر مشتمل ہے جن میں اسلامی حقوق اور اُن سے متعلقہ عملی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ ایسی احادیث جو اسی موضوع پر ہیں لیکن اِس کتاب میں شامل نہیں اُنھیں مستدرک الوسائل نامی کتاب میں جمع کیا گیا ہے اور اِس کتاب میں موجود احادیث کی تعداد بھی "وَسَائِلُ الشِّیعَۃ" سے چنداں متفاوت نہیں۔

۵۔ دُعائیں

دُعاؤں کے جو ذخائر آنحضرتؐ اور ائمہ اہلبیتؑ سے نقل کیے گئے ہیں اور اِس وقت بھی دستیاب ہیں، اسلام کے معارفِ عالیہ کے ممتاز نمونے ہیں۔ اِن دُعاؤں کے متوُن کے مُطالعہ سے مبدا، معاد، آفرینش، انسان شناسی، اخلاق اور انفرادی اور اجتماعی وظائف کے موضوعات پر اسلام کے معارف کا عالی ترین سطح پر اظہار ہوتا ہے۔ ایک اسلام شناس اِن متوُن کے مجموعے کے دقیق مُطالعہ سے کسی صورت میں بھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔[1]

۶۔ سیرت اور تاریخ

اسلام کی تاریخ میں سے جو چیز دین کے متن سے تعلق رکھتی ہے وہ، وہ ادوار ہیں جن میں اسلام کے پیشواؤں نے اپنی زندگیاں بسر کی ہیں لہٰذا تاریخ جاہلیت کے وہ ادوار جو

---

[1] سند اور متن کے لحاظ سے شیعہ دُعاؤں کا ممتاز ترین اور محکم ترین ذخیرہ صحیفۂ سجّادیہ ہے جو مذکورہ مسائل میں اسلامی تفکر کی بلندی کو اُجاگر کرتا ہے۔ علمائے اسلام نے اس کتاب پر متعدد شرحیں لکھی ہیں۔ اس متن کے علاوہ بھی کئی ایک بڑی اور معتبر کتابیں ہیں جن میں سے شیخ طوسی کی "المصباح المتہجد" اور ابن طاؤس کی "اَلاِقبَالُ بِصَالِحِ الاَعمَالِ" اور شیخ کفعمی کی "اَلبَلَدُ الاَمِینُ وَ الدِّرعُ الحَصِینُ" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ظہورِ اسلام سے پیوستہ ہیں، اور مکے اور مدینے میں آنحضرتؐ کی زندگی کا دور اور اس کے بعد غیبتِ صغریٰ کے خاتمے تک ائمہ اہلبیتؑ کا زمانہ ایسے ادوار ہیں جن کے بارے میں تحقیقات ایک اسلام شناس کے لیے ضروری ہے۔ اُس زمانے کے سیاسی، اقتصادی، اخلاقی اور فکری حالات کا مطالعہ اس لیے لازمی ہے تاکہ دینی رہنماؤں کے انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل کے اسباب سمجھے جا سکیں اور اُن اسباب کا ہر پیشوا کے زمانے کے حالات اور خود اس کے ردِّعمل سے موازنہ کرتے ہوئے گوناگوں حالات میں اسلام کے عملی اور فکری طریقِ کار کے بارے میں واقفیت حاصل کی جا سکے۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ رسولِ اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کی سیرت اسلام کے انفرادی اور اجتماعی منصوبوں کے استنباط کے لیے ایک پوشیدہ خزانے کی حیثیت رکھتی ہے اور بین الاقوامی حقوق، علاقائی اور عالمی سیاست اور اجتماعی رہنمائی جیسے بنیادی مسائل کے بارے میں اس دین کی فراست اور ذکاوت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اِس قسم کے مسائل کے استنباط کے لیے ایک محقق کو جس مواد کی جانب رجوع کرنا لازمی ہے وہ مندرجہ ذیل موضوعات پر مشتمل ہے۔

اسلام کی عام تاریخ[1]، سیرتِ رسولؐ[2] اپنے تمام مصادر کے ساتھ[3]۔ اسلام میں علم کی تاریخ[3]، ملل و نحل اور اسلامی معاشرے میں مذاہب اور افکار کے تغیّرات کی تاریخ[4]، ائمہ اہلبیتؑ کی سیرت کے بارے میں کثیر روایات[5]۔ رسولِ اکرمؐ اور ائمہؑ کے اصحاب کے حالاتِ زندگی اور

---

[1] مثلاً تاریخ یعقوبی، تاریخ ابن خیاط، انساب الاشراف بلاذری، طبری، ابن اثیر، ابن کثیر، طبقات الکبریٰ۔ فتوح البلدان وغیرہ۔

[2] مثلاً مغازی الواقدی، ابن ہشام، ابن سید الناس، الاکتفاء، الارشاد للمفید، اعلام الوریٰ، دلائل النبوّۃ اور امتاع الاسماع وغیرہ۔

[3] مثلاً عیون الانباء فی طبقات الاطبّاء، اخبار الحکماء، الفہرست، طبقات المفسرین، تذکرۃ الحفاظ، طبقات الاطبّاء والحکماء وغیرہ۔

[4] الملل والنحل شہرستانی، الفصل فی الملل، الاھواء والنحل، المنیۃ والامل فی کتاب الملل والنحل، مقالات الاسلامیین اور الفرق بین الفرق وغیرہ۔

[5] اس قسم کی روایات کا تقریباً کامل مجموعہ علامہ مجلسی کی بحار الانوار میں دستیاب ہے۔

اپنے تمام زیر و بم کے ساتھ رسمی خلافت کی تاریخ[1]

مندرجہ بالا تقسیم ایک بہت بڑے منظر کی ایک مختصر سی تصویر پیش کرتی ہے اور ہم یقین رکھتے ہیں اور اس امر کو دہراتے ہیں کہ بجز معدودے چند اشخاص کے، لوگ جامع اور وسیع معنوں میں اسلام شناس نہیں بن سکتے اور یہ وہ اشخاص ہوتے ہیں جو ان تمام علوم میں محقق اور صاحب نظر ہوں۔ البتہ علوم اسلامی کے مختلف شعبوں میں متخصصین (فقیہہ، اصولی، متکلم، مؤرخ، رجالی، محدث، مفسر وغیرہ) کی تعداد کہیں زیادہ ہے لیکن اگر یہ لوگ بھی مذکورہ بالا مکمل اور جامع علمیت اور وسعتِ نظر نہ رکھتے ہوں تو اسلام شناس نہیں کہلا سکتے اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں گفتگو کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

جیسے ہم جانتے ہیں کہ جو چیز اب تک دو مکاتب یعنی تشیع اور تسنن[2] کے درمیان اصلی اختلافی مبحث کے طور پر پیش کی گئی ہے وہ "زعامت اور رہبری" کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے پر جو بلاشبہ اختلاف کے اصلی نقاط میں سے ایک ہے، عرصہ دراز سے تحقیق ہو رہی ہے اور شیعہ علماء نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے اس موضوع پر کافی ریسرچ کی ہے[3] تاہم اس مسئلے پر بہت زیادہ غور و خوض کے نتیجے میں بعض اوقات لوگ دوسرے بنیادی مسائل سے غافل ہو گئے ہیں اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ ہم عموماً یہ خیال کرتے ہیں کہ دونوں مکاتب میں واحد اختلافی مسئلہ یہی ہے لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ اس اختلاف کا تعلق اسلام کے ابتدائی دور سے تھا اور وہ زمانہ اب گزر چکا ہے اور اس کا ہمارے زمانے سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس اختلاف کو فراموش کر دیں اور دونوں مکاتب کے درمیان اتحاد کی کوشش کریں تو ہم اس منطق کے سامنے لاجواب ہو جائیں گے اور باوجودیکہ ہم

---

[1] مثلاً تاریخ الخلفاء (سیوطی)، فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ (الفخری)، مآثر الانافہ اور مروج الذہب وغیرہ۔

[2] یا زیادہ دقیق اور صحیح الفاظ میں اہلبیتِ رسولؐ کا اسلام اور خلفاء اور تاریخ اسلام کے مقتدر لوگوں کا اسلام۔ [3] اس ریسرچ کے تین نمونے یہ ہیں: (۱) الالفین علامہ حلی (ب) عبقات الانوار میر حامد حسین اور (ج) الغدیر علامہ امینی۔

غیر علمی اور دشمنی کو جنم دینے والے بحث مباحثوں سے پرہیز کرتے ہیں اور فقط علمی اور استدلالی سطح پر مذاکرات کے قائل ہیں لیکن ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان دو مکاتب کے اختلافات بنیادی ہیں اور اسلام کے ہر پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے مسئلے سے لیکر نبوّت، امامت اور معاد کے بارے میں یہ اختلافات اعتقادات کی سطح پر ہیں اور پھر انہیں اعتقادات کی بنیاد پر یہ اختلافات فقہی اور عملی مسائل کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتے ہیں حتیٰ کہ بالآخر مسئلہ صحیح اسلام اور تحریف شدہ اسلام کے مابین اختلافات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر قاری کو یہ توفیق حاصل ہو کہ وہ اس کتاب کا دقیق مطالعہ کر سکے تو وہ دورِ حاضر کے اسلام کے دو اصلی مکاتب یعنی تشیّع اور تسنّن کو بنیادی طور پر پہچان لے گا اور اسلام کے ابتدائی دور اور اس کی تاریخ کی ابتدائی صدیوں کے واقعات کی گہرائی کا پتا چلا سکے گا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ چونکہ اس قسم کی گفتگو کا تعلق اسلام اور تشیّع کے متعدد پہلوؤں سے ہے اور اس کے ذریعے اسلام کی اعتقادی اور عملی بناوٹ کے بہت سے مسائل سامنے رکھ کر ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے لہٰذا یہ بجائے خود ایک قسم کی اسلام شناسی ہے جو ہمارے دَور کے لیے ضروری اور اہم ہے اور علاوہ ازیں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ مباحث میں اسلام کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے لہٰذا اس کے ایسے نئے خدوخال سامنے آئے ہیں جن کی جانب زمانۂ گزشتہ میں بہت کم توجہ دی گئی تھی۔

یہ کتاب اُن خطبات کا مجموعہ ہے جو علاّمہ مرتضیٰ عسکریؒ نے تقریباً دو سال تک ہر سنیچر کو تہران کے کئی ایک علماء کی مجلس درس میں دن کے وقت اور مسجد المہدی میں عام اجتماعات میں رات کے وقت دیے۔ ان خطبات کا موضوع صحیح اسلام کے بنیادی مسائل کے بارے میں ایک نیا مبحث ہے جس کے بارے میں آج تک اس شکل میں تحقیق نہیں ہوئی یعنی احیائے دین

۱؎ ایک پرہیزگار دینی عالم کے بلند مقام پر فائز ہونے اور تاریخ اور حدیث کے بارے میں کم نظیر مطالعے اور تحقیقات کا کام سرانجام دینے کے علاوہ آپ دانشکدۂ اصول دین بغداد کے بانی ہیں اور اس معتبر علمی ادارے کے سابق رئیس اور استاد رہ چکے ہیں۔

۲؎ ائمہ اہلبیتؑ اور ان کے شاگردوں اور بلافصل تربیت یافتہ لوگوں کے زمانے میں اس قسم کے مباحث کی مثالیں عام ملتی ہیں لیکن غیبتِ صغریٰ کے بعد رفتہ رفتہ یہ روش بھلا دی گئی۔

ہیں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار۔ ان خطبات کو جو تقریر کی شکل میں تھے ٹیپ ریکارڈ سے منتقل کر کے دوبارہ لکھا گیا اور انکے مصادر اور مدارک کا استخراج کیا گیا اور علاّمہ مرتضیٰ عسکری کی نظرثانی کے بعد ان کا صاف نسخہ تیار کر کے پریس کے سپرد کر دیا گیا۔ چونکہ ان دروس میں وقتاً فوقتاً نئے لوگ بھی شرکت کرتے تھے اس لیے مطالب کی تکرار کی ضرورت پیش آتی تھی جسے ہم نے ممکنہ حد تک مختصر کر دیا ہے لیکن چونکہ بعض اوقات یہ تکرار سہل ممتنع مطالب کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے اس لیے اسے کُلّی طور پر حذف نہیں کیا گیا۔

اِس کتاب کی طباعت سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ کم از کم ایک شخص صحیح اسلام سے ایک قدم نزدیک تر ہو جائے یا جہالت اور تعصّب کا پردہ چاک ہو جائے۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ خُدائے تعالیٰ نوجوان نسل کو ظاہری اور باطنی لغزشوں سے محفوظ رکھّے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

محمّد علی جاوداں

پہلا درس

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی
خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّاهِرِیْنَ
اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

اِنَّ رَبَّکُمُ اللهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ.

"بے شک تمہارا پروردگار وہ خدا ہی ہے جس نے صرف چھ مرحلوں میں آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ پھر عرش کے بنانے پر آمادہ ہوا۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے تو گویا رات دن کو پیچھے پیچھے تیزی سے ڈھونڈتی پھرتی ہے اور اسی نے آفتاب، مہتاب اور ستاروں کو پیدا کیا۔ یہ سب کے سب اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ دیکھو، حکومت اور خلقت بس خاص اسی کے لیے ہے۔ وہ خدا جو سارے جہان کا پروردگار ہے بڑا برکت والا ہے۔" (سورۂ اعراف۔ آیت ۵۴)۔

آج رات سے ہم انشاءاللہ جن بحثوں کا آغاز کرنیوالے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ہم مطالعہ کریں اور اس بات کا پتا چلائیں کہ ائمہ اطہار علیہم السلام نے رسولِ اکرمؐ کے بعد دین اسلام کی حفاظت کے سلسلے میں کیا کردار ادا کیا یا یوں کہیے کہ اس مقدس دین میں جو تحریفیں کی گئیں اُنھیں دُور کرکے اور جو کچھ چھپا یا گیا تھا اسے اجاگر کرکے کیونکر اسے اس کی اصلی حالت میں بنی نوعِ انسان کو لوٹایا؟

اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال رہی تو بحثوں کے اس سلسلے سے واضح ہو جائے گا کہ امام مہدیؑ ہوں یا امام صادقؑ یا امام رضاؑ ہوں غرضیکہ ہر امام کا یا رسولِ اکرمؐ کا عمل اور ہدف یکساں رہا ہے اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ معاشرے پر مرتّب کردہ عمل اور اثر کے

نقطۂ نظر سے رسولِ اکرمؐ ائمہ طاہرینؑ کے ساتھ مل کر ایک ایسا طبقہ تشکیل دیتے ہیں جو آنحضرتؐ کے ساتھ دوسروں کے شامل ہونے سے ظہور پذیر نہیں ہوتا۔

اِس بحث کو جو مُعاشرے میں پہلی بار اس شکل میں اور اس تفصیل کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے چند تمہیدی مطالب کی حاجت ہے جو چند تقاریر کے دوران بیان کیے جائیں گے۔ فی الحال اِن تمہیدات کو بنیاد فراہم کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہم چند اسلامی اصطلاحوں کا گہرا مُطالعہ کریں۔ اِن اصطلاحوں کو بخوبی سمجھ لینے سے ہماری آئندہ تقاریر کے سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں ایسی بہت سی اصطلاحیں موجود ہیں جن کا بخوبی سمجھنا اسلام کے صحیح ادراک کے لیے بے حد ضروری ہے۔ تاہم اپنی موجودہ بحث کے سلسلے میں ہم صرف چند اہم ترین اصطلاحوں کی تشریح پر اکتفا کریں گے اور وہ یہ ہیں:

اِلٰہٌ، عَبْدٌ، رَبٌّ اور اِسْلَامٌ

۱۔ "اِلٰہ" اَلَہَ سے کَتَبَ کے وزن پر عَبَدَ کے معنی میں لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے 'ستائش کی' اور 'پرستش کی'[1] اور "اِلٰہٌ" معبود کے معنوں میں کِتَابٌ کے وزن پر ہے جو کہ مَکْتُوْبٌ کے معنی میں ہے۔

"اِلٰہ" اور "اَللہ" میں یہ فرق ہے کہ "اَللہ" خدا کا خاص نام ہے لیکن "اِلٰہ" اس کا خاص نام نہیں۔

بلاشبہ خدا کے علاوہ ہمارا کوئی "اِلٰہ" نہیں تاہم "اِلٰہ" اس ذاتِ اقدس کا خاص نام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "اَللہ" اسمِ خاص اور اسمِ علم ہے جب کہ "اِلٰہ" اسمِ عام اور اسمِ جنس ہے۔

مفہوم کی وضاحت کے لیے ایک مثال لیجیے۔ اسلام آباد پاکستان کا پایۂ تخت ہے۔ اگر ہم پایۂ تخت کہیں تو بلاشبہ پاکستان کا پایۂ تخت اسلام آباد کے علاوہ اور کوئی نہیں تاہم "پایۂ تخت"

---

[1] راغب اصفہانی: مفردات القرآن، مادہ اِلٰہ صفحہ ۱۹ مطبوعہ تہران۔ الصحاح جلد ۶ حدیث ۲۲۲۳، مادۂ اِلٰہ - المصباح المنیر جلد ا صفحہ ۲۶ 'ستائش کرنا' لفظ "عَبد" کا براہ راست مفہوم نہیں ہے لیکن زبانی پرستش کی اقسام میں سے ہو سکتا ہے۔

اس شہر کا اسم خاص نہیں، کیونکہ دنیا کے بہت سے دوسرے شہروں کو بھی اس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا وضاحت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم ایک دفعہ پھر دہراتے ہیں کہ "اللّٰہ" خدائے تعالیٰ کا نام ہے لیکن "اِلٰہ" ہر اس چیز کو کہا جا سکتا ہے جسے انسان اپنے معبود کے طور پر قبول کرلے۔ قرآن مجید فرعون کا قول نقل فرماتا ہے: "اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو اپنا "اِلٰہ" بنایا تو میں ضرور تمہیں قید میں ڈال دوں گا۔" (سورۂ شعراء۔ آیت ۲۹) لہٰذا "اِلٰہ" ہر معبود کا نام ہے یعنی ہر اس شخص کا جس کی پرستش کی جائے، ہر اُس شخص کا جس کے سامنے انسان جھکے، اس کی اطاعت کرے اور اس کے آگے عاجزی اور خشوع و خضوع کا اظہار کرے یا اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوئی کام کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: "بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا "اِلٰہ" (معبود) بنا رکھا ہے۔" (سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۳) یعنی وہ اپنے نفس اور دل کے کہنے کے مطابق کام کرتا ہے۔

اگر انسان اللہ کی خوشنودی کی خاطر کوئی کام انجام دیتا ہے تو وہ اللہ کو اپنا "اِلٰہ" قرار دیتا ہے لیکن اگر وہ ہوائے نفس کی خاطر کچھ کرتا ہے تو پھر وہ نفس کو اپنا "اِلٰہ" بنا لیتا ہے۔

لہٰذا "اِلٰہ" وہ معبود ہے جس کی عبادت، اطاعت، فرمانبرداری اور ستائش کی جائے۔ ایسی ہستی کو "اِلٰہ" اور "معبود" کہا جاتا ہے اور اس کا فرمان بجا لانے والا "عبد" کہلاتا ہے[۱] امام محمد تقی علیہ السلام نے "عبد" کی تعریف میں جو کچھ فرمایا ہے اس

---

[۱] عبد: لغت میں تحریر ہے کہ: عَبَدَ عِبَادَةً وعُبُوْدَةً وعُبُوْدِيَّةً: اَطَاعَهُ یعنی حکم بجا لاتا ہے۔ اَلْعِبَادَةُ: اَلطَّاعَةُ مَعَ الْخُضُوْعِ: "عبادت یعنی خضوع کیساتھ فرمانبرداری کرنا۔" وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ اَیْ اَطِیْعُوْا رَبَّكُمْ۔ "اپنے پروردگار کی عبادت کرو یعنی اپنے پروردگار کا حکم بجا لاؤ۔" اِيَّاكَ نَعْبُدُ: ای نُطِیْعُ الطَّاعَةَ الَّتِیْ یُخْضَعُ مَعَهَا۔ "یعنی ہم خضوع اور عاجزی کے ساتھ فقط تیرا حکم بجا لاتے ہیں۔" عَبَدَ الطَّاغُوْتَ: اَیِ الشَّیْطَانَ فِیْ مَا سَوَّلَ لَهُ وَ اَغْوَاهُ۔ "طاغوت کی عبادت کی یعنی تحریص اور وسوسوں میں شیطان کی فرمانبرداری کی" (لسان العرب، تاج العروس لفظ 'عبد')

سے اسلامی اصطلاح کے معانی مکمل طور پر سمجھ میں آجاتے ہیں اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کب اور کیسے انسان "عبد" بن جاتا ہے اور کن حالات میں ایک چیز "اِلٰہ" کا روپ دھار لیتی ہے۔

امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اگر کوئی شخص کسی بولنے والے کی باتوں پر کان دھرتا ہے تو وہ اس کی عبادت کرتا ہے۔ اگر بولنے والا اللہ تعالیٰ کے بارے میں بات کرے تو سننے والا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اگر وہ کوئی بات ابلیس کی زبان سے کہے اور شیطانی گفتگو کرے تو وہ (یعنی سننے والا) ابلیس کی عبادت انجام دیتا ہے۔"[۱]

ایک حساس نکتے کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس بحث سے اہلبیتؑ کے مکتب (تشیّع) اور خلفاء کے مکتب (تسنّن) کے مابین جو فرق ہے وہ بالکل واضح ہو جاتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ائمہ اہلبیتؑ میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ "میں کہتا ہوں" (اَنَا اَقُوْلُ) بلکہ ہمیشہ یہی کہا کہ رسول اللہؐ نے یا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے۔[۲] حضرت امیر المومنین علیہ السلام یہ نہیں فرماتے تھے کہ "میں کہتا ہوں"[۳] لیکن خلیفۂ دوم کہا کرتے تھے کہ "میں کہتا ہوں"۔ یہ وہی تھے جنہوں

---

[۱] تحف العقول صفحہ ۳۳۹ مطبوعہ نجف۔ نیز اس حدیث پر بھی غور فرمائیں۔ امام صادقؑ نے فرمایا: "جس کسی نے گناہ میں کسی شخص کی اطاعت کی وہ اس کا عبد ہو گیا۔" اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۳۹۸

[۲] ہشام بن سالم اور حماد بن عثمان وغیرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم نے ابا عبد اللہ امام صادقؑ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے اور میرے والد کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے اور میرے دادا کی حدیث حسینؑ کی حدیث ہے اور حسینؑ کی حدیث حسنؑ کی حدیث ہے اور حسنؑ کی حدیث امیر المومنین علیہ السلام کی حدیث ہے اور امیر المومنینؑ کی حدیث رسول اللہؐ کی حدیث ہے اور رسول اللہؐ کی حدیث ارشادِ الٰہی ہے۔" (اصول کافی جلد ۱ کتاب فضل العلم، حدیث ۱۴)۔

عنبسہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ابا عبد اللہ علیہ السلام سے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ نے جواب دیا۔ اس پر اس شخص نے کہا کہ اگر ایسا اور ایسا ہوتا تو اس میں دوسرا قول نہ ہوتا؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ جب کبھی ہم کسی مسئلہ میں جواب دیں تو وہ رسول اللہؐ سے ہے اور ہم کوئی جواب اپنی رائے سے نہیں دیتے۔ (البصائر الدرجات صفحہ ۳۰۰)

[۳] مثلاً واقعات شوریٰ کی جانب رجوع کریں (عبد اللہ بن سبا جلد ۱ صفحہ ۲۱۴ - ۲۱۵ - عربی متن)۔

نے مسلمانوں کے ایک عام اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"مُتعَتَانِ کَانَتَا عَلٰی عَھدِ رَسُولِ اللّٰہِ الخ دو ایسے متعہ ہیں جو رسولِ اکرم ص کے عہد میں جائز شمار کیے جاتے تھے لیکن میں ان سے منع کرتا ہوں اور انھیں حرام قرار دیتا ہوں اور جو شخص ان پر عمل کرے گا اسے سزا دوں گا[1] یا یہ کہ جو شخص ان پر عمل کرے گا اسے کوڑے لگاؤں گا۔"[2]

امام صادق ع یہ نہیں فرماتے تھے کہ "میں اجتہاد کرتا ہوں، میں رائے دیتا ہوں یا میری ذاتی رائے یہ ہے" بلکہ فرماتے تھے: "اللہ نے فرمایا" اور "اللہ کے رسول ص نے فرمایا" البتہ ابوحنیفہ کہا کرتے تھے کہ "میں نے اجتہاد کیا ہے" یا یہ کہ "میرا ذاتی نظریہ اور رائے یہ ہے۔"[3]

ابتدائی ادوار میں ہمارے علماء فقط محدّث تھے اور امام سے روایت کیا کرتے تھے اور موجودہ دور کے علماء بھی یہ نہیں کہتے کہ "میں یوں کہتا ہوں" یہ فقیہہ یعنی وہ لوگ ہیں جو اللہ اور رسول ص کے احکام کو سمجھتے ہیں اور اسلام کا ہر حکم بیان کرتے ہوئے قولِ امام یا حدیثِ رسول ص کی جانب رجوع کرتے ہیں یا کتابِ الٰہی پر نظر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تمام تر کوشش اپنی ذاتی آراء کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ احکامِ الٰہی کو سمجھنے کے لیے ہوتی ہے لہٰذا جو شخص امام صادق ع کا اتباع کرتا ہے یا ان کے مکتب کے علماء کی پیروی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر کان دھرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور اس کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے البتہ اس کے بالکل برعکس اس شخص کا معاملہ ہے جو کسی ایسے شخص کی بات پر کان دھرتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ "میں کہتا ہوں، میں نے اجتہاد کیا ہے، میں رائے دیتا ہوں، میں قانون وضع کرتا ہوں۔" ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتا بلکہ ایک کمزور اور حقیر انسان کو اپنا مَعبُود و اِلٰہ قرار دیتا ہے۔

(ب) "رب" وہ اہم ترین اسلامی اصطلاح ہے جس کا ہماری بحث کے سلسلے میں سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ اس وقت ہمیں اس اصطلاح سے بہت کام لینا ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں تحقیقات کریں۔ ہم اکثر و بیشتر جملہ اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ ادا کرتے

---

[1] ابن رشد: بدایۃ المجتہد جلد ۲ صفحہ ۱۴۱، ابن قیم: زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۲۰۵، ابن قدامہ: المغنی جلد ۷ صفحہ ۵۲۷ اور ابن حزم: المحلی جلد ۷ صفحہ ۱۰۷ [2] جصاص: احکام القرآن جلد ۱ صفحہ ۲۷۹ اور المحلی جلد ۷ صفحہ ۱۰۷ [3] مقدمہ مراۃ العقول جلد ۲ صفحہ ۱۷-۶۷ فصل تطور اجتہاد۔

ہیں لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس کے دقیق معانی سے واقف نہیں۔ لفظ "رب" جو اس جملے میں استعمال ہوا ہے اور جس کی حیثیت اس کے رکن کی ہے اس کے معنی کیا ہیں؟ ہم اس چیز سے لاعلم ہیں اور یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ جب تک لفظ "رب" کے معنی کا صحیح صحیح علم نہ ہو جائے نہ تو خدا کو پہچاننا ممکن ہے، نہ رسولؐ کو اور نہ ہی امام کو اور نہ ہی موحد کو مشرک سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔

پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ لفظ عربی زبان کی لغت میں کن معنوں میں آیا ہے۔ مشہور لغت شناس راغب اصفہانی کہتے ہیں: اَلرَّبُّ فِی الْاَصْلِ: اَلتَّرْبِيَةُ وَهُوَ اِنْشَاءُ الشَّیْءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ۔

لفظ "رب" دراصل مصدر ہے اور تربیت کرنے کے معنی میں آتا ہے جو شخص کسی چیز کی تربیت کرتا ہے اور اسکے وجود کے پہلے مرحلے سے کمال کی حد تک اس کی پرورش کرتا ہے اور اسے ترقی اور پختگی سے ہمکنار کرتا ہے وہ اس چیز کا رب ہے (مصدر بمعنی اسمِ فاعل)[2]

یہ لفظ "رب" کا ایک پہلو ہے اور پرورش کرنے اور ترقی دینے کے علاوہ "رب" کے لفظ میں مالکیت کا عنصر بھی شامل ہے[3] لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "رب" ایک چیز کا مالک، منتظم اور مربّی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص مُرغیاں پالتا ہو اور افزائش کے ارادے سے انڈوں کا

---

[1] مفردات، مادہ رب صفحہ ۱۸۲۔ مطبوعہ تہران ۱۳۷۳ھ ق "رَبَّ الضَّيْعَةَ اَیْ اَصْلَحَهَا وَاَتَمَّهَا وَرَبَّ فُلَانٌ وَلَدَهُ اَیْ رَبَّاهُ" (الصّحاح جلد ۱ صفحہ ۱۳۰)۔

[2] مَصْدَرٌ اُسْتُعِيرَ لِلْفَاعِلِ (مفردات صفحہ ۱۸۲)۔

[3] رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ: مَالِكُهُ (الصّحاح، مادہ رب جلد ۱۔ صفحہ ۱۳۰) رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ مَالِكُهُ وَمُسْتَحِقُّهُ اَوْ صَاحِبُهُ (القاموس جلد ۱ صفحہ ۳) اَلرَّبُّ: اَلْمَالِكُ (کشاف جلد ۱ صفحہ ۵۳)۔ کبھی کبھی رَبّ کا لفظ جزوی معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (مثلاً فقط مالک یا فقط سربراہِ کار) اور عربی زبان میں جس اسم کے معنی دو حصوں سے مرکب ہوں وہ اسم دونوں حصوں میں سے کسی ایک حصے کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے مثلاً مائدہ کے معنی "دستر خوان بمعہ غذا" کے ہیں لیکن اسے غذا کے بغیر دستر خوان یا دستر خوان کے بغیر غذا کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

خیال رکھے حتیٰ کہ وہ چوزے بن جائیں اور انہیں دانہ پانی دیتا ہے حتیٰ کہ وہ بڑھ کر مرغ بن جائیں تو وہ شخص جس نے ان مرغوں کو پالا ہے اُن کا مالک ہے اور اُن کا "رب" بھی متصور ہوگا۔ رب العالمین سے مراد تمام عالمین کا خداوند اور پروردگار ہے جو اُن کا مالک اور خالق ہے جو اُن کے وجود کے پہلے مرحلے سے ہی انہیں پالتا ہے اور ترقی دیکر کمال کی سرحد تک پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھی رب کہا جاتا ہے نیز مثلاً ایک گھر کے مالک کو بھی جو تمام امور کا ذمے دار ہوتا ہے اور اُن پر اختیار رکھتا ہے رب کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بطور مطلق اور بغیر کسی چیز کے اضافے کے رب کہا جا سکتا ہے مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ۔

"دنیا میں ایسا پاکیزہ شہر اور آخرت میں رب جیسا بخشنے والا۔" (سورۂ سبا۔ آیت ۱۵)

لیکن دوسروں کو کسی چیز کا اضافہ کر کے رب کہا جا سکتا ہے جیسے کہ رَبُّ الدُّجَاجِ (دجاج کے اضافے کے ساتھ رب یعنی مرغوں کا پالنے والا اور مالک) رَبُّ الْبَيْتِ (یعنی گھر کا مالک اور منتظم) رَبُّ الشَّجَرِ (یعنی درختوں کی پرورش کرنے والا اور ان کا مالک)۔

اگر "رب" کا دقیق مفہوم مدِّ نظر رکھا جائے تو اپنے اپنے ادوار کے ظالم اور جابر فرمانرواؤں کے خلاف پیغمبروں کی مہمات اور معرکہ آرائیوں کی وجہ بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے اور ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ یہ سب معرکہ آرائیاں کس چیز کے بارے میں تھیں۔ آسمانی شریعتوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ پیغمبروں کے مقابلے پر آتے تھے ان کا جھگڑا 'خالق' کے بارے میں نہیں بلکہ "ربوبیت" کے متعلق ہوتا تھا کیونکہ ان میں سے اکثر اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ تمام موجودات کا خالق "اللہ" ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کہ وہ اس ذاتِ مقدس کو "اللہ" کے نام سے نہیں بلکہ کسی اور نام سے یاد کرتے ہوں۔ مثلاً یہودیوں کی طرح "یہوہ" کہتے ہوں۔ تاہم یہاں یہ چیز موردِ بحث نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کیا نام دیتے تھے اور صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ وہ لوگ اس بات کو قبول کرتے تھے کہ موجودات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے لیکن "رب" کے مسئلے پر اختلاف رکھتے تھے۔

مذکورہ بالا قول کو ثابت کرنے کے لیے مناسب ہوگا کہ ہم قرآن مجید سے چند مثالیں پیش کریں اور پیغمبروں کی اپنی اقوام یا جابر حکمرانوں سے معرکہ آرائیوں کے چند واقعات کا مطالعہ کریں تاکہ امتِ اسلامی میں ان سے ملتی جلتی معرکہ آرائیوں کو پہچان سکیں۔

قرآن مجید حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم اور اس دور کے جابر حکمران فرعون سے ان کے مقابلے کا ذکر بار بار کرتا ہے۔ سورۃ نازعات میں ہم اس داستان کے ایک نہایت نازک پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ سے آمنا سامنا ہونے اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد فرعون نے اہل مصر کا ایک بہت بڑا اجتماع تشکیل دیا اور ان لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر چلایا کہ: "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔"[۱]

یعنی اگر مُرغ کا کوئی رب ہے اور وہ، وہ شخص ہے جو اُس کا مالک ہو اور وہ اسے پالے اور اس کی زندگی اور نشو و نما کی تدبیریں کرے۔ کسی چیز یا حیوان یا انسان کا رب کون ہے؟ وہ، وہ ہے جو اُس کی ضروریاتِ زندگی پوری کرے اور اس کی زندگی اور حدِّ کمال تک پہنچنے کی تدابیر مرتب کرے۔ یہی وجہ تھی کہ فرعون نے کہا:

"کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہاری خوراک، تمہارا پانی اور جو کچھ تمہارے پاس ہے اور جو کچھ تم کھاتے پیتے ہو، وہ سب میرا مال ہے اور میری ملکیت کے دائرے سے نکل کر تم تک پہنچتا ہے[۲] لہٰذا تمہیں چاہیے کہ قانون، جو ربوبیت کی دوسری خصوصیت ہے مجھ سے حاصل کرو۔ میں تمہاری ضروریات پُوری کرتا ہوں لہٰذا ضروری ہے کہ میں ہی تمہارے لیے قانون وضع کروں اور تمہارا خودمختار فرمانروا بنوں۔"

شہنشاہِ مصر فرعون اس زمانے میں مصر کا مکمل طور پر مالک تھا اور جو شخص بھی کام کرتا تھا اس کا محنت کش اور مزدور شمار ہوتا تھا لہٰذا جو چیز ربوبیت کے لیے لازم ہے کھانا، پانی دینا اور دوسری ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا وہ بظاہر اُسے حاصل تھی اور اسی لیے اس نے دعویٰ کیا تھا کہ: اے میری قوم کے لوگو! تم سب اچھی طرح یہ بات جان لو کہ:

---

[۱] موسیٰؑ نے اسے بڑا معجزہ دکھلایا تو اس نے جھٹلا دیا اور نہ مانا۔ پھر پیٹھ پھیر کر مخالفت کی تدبیریں سوچنے لگا۔ پھر لوگوں کو جمع کیا اور بلند آواز سے چلا کر کہا: "میں تم لوگوں کا سب سے بڑا رب ہوں۔" (سورۃ نازعات آیت ۲۱-۲۵)

[۲] فرعون نے اپنے لوگوں میں پکار کر کہا: "اے میری قوم! کیا یہ ملکِ مصر ہمارا نہیں اور کیا یہ نہریں جو ہمارے شاہی محل کے نیچے بہہ رہی ہیں ہماری نہیں، تو کیا تم کو اتنا بھی نہیں سوجھتا۔" (سورۃ زخرف آیت ۵۱)۔

"یہ سب چیزیں میری ملکیت ہیں اور یہ میں ہی ہوں جو تمہیں تمہاری ضروریات مہیا کرتا ہوں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قانون بھی میں ہی وضع کروں اور تم میری خواہشات اور نظریات کے مطابق زندگی گزارو۔ بہر صورت قانون وضع کرنا اور شریعت اور زندگی کے طور طریقے معیّن کرنا میرا حق ہے۔ اگر میں کہوں کہ بنی اسرائیل غلام بن کر رہیں، ان کے لڑکے ذبح کر دیے جائیں اور ان کی لڑکیاں زندہ رہنے دی جائیں تو یہ فیصلہ قطعی طور پر قابلِ قبول ہونا چاہیے۔ اگر میں یہ کہوں کہ بنی اسرائیل کی حیثیت گھٹیا ہو اور قبطیوں اور مصر کے اصلی باشندوں کو عزّت اور وقار حاصل ہو تو ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

جس ربوبیت کا فرعون دعویٰ کر رہا تھا اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور اس نے انسانوں اور دوسری چیزوں کو پیدا کیا ہے بلکہ اس کا کہنا یہ تھا کہ میں تمہارا بلند مرتبہ رب ہوں لہٰذا تمہیں چاہیے کہ میری خواہشات پوری کرنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کام کرو اور میرے احکامات کے مطابق عمل کرو۔

اس منطق کے جواب میں حضرت موسیٰؑ کیا فرماتے ہیں، ان کا پیغام کیا ہے؟ اور وہ فرعون سے کیونکر نبرد آزما ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کو حکم ملتا ہے کہ:

"اے موسیٰؑ اور ہارونؑ! تم فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم اس کی جانب سے آئے ہیں جو تیرا آقا اور پروردگار ہے اور جس نے تیری پرورش کی ہے اور تجھے کمال تک پہنچایا ہے۔ اے فرعون! تو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ تو لوگوں کا سب سے بڑا رب ہے، اس بارے میں تو سخت غلطی پر ہے اور تیرا دعویٰ فضول اور جھوٹا ہے اور ہم اپنی باتوں کی سچائی کے ثبوت کے طور پر تیرے پروردگار کی طرف سے کچھ نشانیاں اپنے ہمراہ لائے ہیں۔" (سورۂ طٰہٰ۔ آیات ۴۳-۴۷)۔

لیکن چونکہ فرعون کسی کو اپنا پروردگار تسلیم نہیں کرتا اور حضرت موسیٰؑ کے ارشادات قبول نہیں کرتا لہٰذا وہ سوال کرتا ہے:

"فَمَنْ رَّبُّكُمَا يَا مُوسٰى" (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۴۹)

"اے موسیٰؑ! تم جو میری ربوبیت کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہو کہ رب کوئی اور ہے

اور تمام قانون اور احکام اسی سے حاصل کرنے چاہئیں تو وہ دوسرا آخر ہے کون؟"

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى. (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۵۰)

حضرت موسیٰؑ جواب میں کہتے ہیں:

"ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز پیدا کی ہے اور اس کے لیے زندگی کا لائحہ عمل اور قانون متعین کر دیا ہے اور دوسرے الفاظ میں اس کی رہنمائی کی ہے اور ہر مخلوق کو چاہیے کہ جو قانون اس نے وضع کیا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔"

فرعون محسوس کرتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا ارشاد معقولیت پر مبنی ہے لہذا وہ ڈرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی باتیں لوگوں کے دلوں میں اُتر جائیں۔ پس وہ شبہ اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے:

"اچھا، بتاؤ کہ گزشتہ ادوار میں کیا صورتِ حال رہی ہے؟ کیا ان لوگوں کا بھی کوئی رب تھا اور جس رب کا تم دعویٰ کرتے ہو، کیا وہ ان پر بھی حکومت کرتا ہے؟" (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۵۱)۔

حضرت موسیٰؑ جواب دیتے ہیں اور اس جواب میں بھی اپنے رب کی ربوبیت پر بھروسا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان باتوں کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب (لوح محفوظ) میں لکھا ہوا ہے۔ میرا رب نہ بھٹکتا ہے نہ بھولتا ہے۔" (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۵۲)۔

واقعات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب فرعون حضرت موسیٰؑ کی منطق کے توڑ کے طور پر ایک تجویز سوچتا ہے اور وہ یہ کہ وہ لوگوں کے جذبات آپ کے خلاف ابھارنا چاہتا ہے لہذا وہ آپ سے کہتا ہے:

"تم اس لیے آئے ہو تاکہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہماری سرزمین سے نکال باہر کرو اور ہمارے ملک پر قبضہ کر لو لہٰذا ہم بھی تمہارے جادو کو بے اثر بنانے کے لیے جادو سے کام لیں گے۔"

فرعون کے کرائے کے جادوگر اپنی تمام قوت کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے میدان میں آتے ہیں لیکن رب العالمین کی قدرت ظاہر ہوتی ہے اور اُن کے

تمام جادو دھرے رہ جاتے ہیں۔ جادوگر جو دوسروں کے مقابلے میں جادو کو پہچاننے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، رب العالمین کی قدرت کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں:

" اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى " (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۷۰)

" ہم ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب پر ایمان لے آئے ہیں "

پھر وہ فرعون کے اعتراض اور تشدد کے جواب میں کہتے ہیں:

" ہم اپنے رب پر ایمان لے آئے ہیں تاکہ اسکی بخشش کے مستحق ٹھہریں "۔ (سورہ طٰہٰ۔ آیت ۷۳)

اس تمام تر داستان میں " رب " کے نام کی تکرار ہوتی ہے اور دونوں جانب سے اسی کے بارے میں باتیں ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ اسی کا دم بھرتے ہیں اور جادوگر اسی پر ایمان لاتے ہیں لیکن فرعون اسے قبول نہیں کرتا۔ اس بنا پر یہ بات بخوبی مشاہدے میں آجاتی ہے کہ شیطان اور رحمانِ خدا کے دوستوں اور اس کے دشمنوں اور پیغمبروں اور باغیوں کے متضاد گروہوں کے مابین چپقلش زیادہ تر ربوبیت کے بارے میں رہی ہے اور سوال یہ رہا ہے کہ کس کی رائے، قانون، حکم اور دستور کو قبول کیا جائے۔

خداوند عالم کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کی زندگی میں بھی یہی جنگ اور معرکہ آرائی کارفرما ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهِيْمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ (سورہ بقرہ۔ آیت ۲۵۸)

" اے رسولؐ! کیا تم نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جو صرف اس لیے کہ خدا نے اسے سلطنت دی تھی، ابراہیمؑ سے ان کے رب کے بارے میں اُلجھ پڑا "

ایک طرف حضرت ابراہیمؑ ہیں اور دوسری جانب نمرود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نمرود کو سلطنت بخشی ہے۔ قوت اور مطلق العنانیت اسے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا منکر ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ سے اس کی کشمکش اسی مسئلے پر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اس سے کہتے ہیں:

" قانون وضع کرنے اور انسان کی زندگی کی حدود متعین کرنے کا حق اسے حاصل ہے جو اسے پیدا کرتا ہے اور مار دیتا ہے۔ بلاشبہ وہی سب کا رب ہے اور میرا رب بھی وہی ہے "

(سورہ بقرہ۔ آیت ۲۵۸)۔

اس دور کا طاغوت نمرود کہتا ہے :

"میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مار بھی دیتا ہوں (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۸)۔ ایک شخص جسے سزائے موت ہو چکی ہو اُسے قید خانے سے نکال کر آزاد کر دیتا ہوں۔ اس کا شمار مُردوں میں تھا لیکن میں نے اسے زندہ کر دیا۔ ایک دوسرا شخص جو گلی کوچوں میں بے خیالی کے عالم میں، آزادانہ گھوم رہا ہو اسے پکڑوا تا ہوں اور اس کے قتل کا حکم صادر کر دیتا ہوں۔ یہ زندہ تھا اور زندہ ہی رہتا لیکن میں نے اسے مار دیا لہٰذا جو خصوصیتیں تم اپنے رب کے بارے میں بیان کر رہے ہو، وہ مجھ میں بھی ہیں لہٰذا میں بھی رب ہوں"

یہ وہی موقع تھا جب شبہ پیدا کیا گیا اور عین ممکن تھا کہ کوئی نادان شخص اس کے بہکاوے میں آجاتا لیکن حضرت ابراہیمؑ نے بلا کسی تاخیر کے ایک اور دلیل پیش کر دی اور فرمایا:

"میرا رب جو کہ اللہ ہے سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تو رب ہے اور اپنے اس دعوے میں سچّا ہے تو سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا دے"

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۸)

اس پر وہ کافر ہکّا بکّا ہو کر رہ گیا۔

قہرمانِ توحید، ابراہیمؑ کا یہ مقابلہ ایک محاذ پر تھا۔ ایک اور مقابلے میں جو آپ نے ستاروں، چاند اور سورج کو پوجنے والوں کے خلاف کیا، اسی کشمکش کی مثال ایک دفعہ پھر دہرائی گئی۔ حضرت ابراہیمؑ ان مشرکوں کے اجتماع میں تشریف لائے اور ان سے مقابلہ شروع ہوا۔ آپ نے البتّہ یہ مقابلہ انہیں کی زبان میں اور انہیں چیزوں کی بنا پر کیا جن پر وہ یقین رکھتے تھے تاکہ وہ آپ کے استدلال کو سمجھ سکیں اور ان کی جہالت کے ڈھول کا پول کھل جائے۔

رات کا وقت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ ایک روشن ستارہ دیکھتے ہیں اور ستارہ پرستوں کے ہجوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :

"یہ روشن ستارہ میرا رب ہے" (سورۂ انعام۔ آیت ۷۷)۔

کچھ وقت گزر جانے کے بعد ستارہ غروب ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اس کے غروب ہونے کا مشاہدہ کر کے اس کی کمزوری اور نقص کی جانب اشارہ فرماتے ہیں اور

کہتے ہیں:

"یہ میرا رب نہیں ہو سکتا۔ میرا رب غروب نہیں ہو سکتا اور میں غروب ہونیوالوں کو دوست نہیں رکھتا۔" (سورۂ انعام۔ آیت ۷۷)۔

چاند اور سورج کے بارے میں بھی یہی داستان دہرائی جاتی ہے اور آخر کار اجرام فلکی میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ روشن جرم یعنی سورج کے غروب ہو جانے پر حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں:

"اے میری قوم! جن جن چیزوں کو تم لوگ خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سے بیزار ہوں (یہ ہرگز خدا نہیں ہو سکتے) میں نے تو باطل سے کترا کر اس کی طرف اپنا منہ کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔" (سورۂ انعام۔ آیت ۷۹)۔

لوگ حضرت ابراہیمؑ سے بحث مباحثہ جاری رکھتے ہیں اور ان کی دلیلوں کے جواب میں آپ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے جو میرا رب ہے میری رہنمائی کی ہے اور تم جن جھوٹے خداؤں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے نہیں ڈرتا۔" (سورۂ انعام۔ آیت ۸۱)۔

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم اللہ کی ہستی کی قائل تھی لیکن دوسروں کو اس کی ربوبیت میں شریک سمجھتی تھی اور یہی وہ مسئلہ تھا جس پر حضرت ابراہیمؑ کے اور ان لوگوں کے مابین کشمکش تھی اور جس کی بنا پر آپ نے ان سے بحث میں استدلال کیا۔

ایک اور میدان میں حضرت ابراہیمؑ کا مقابلہ اپنی قوم کے بت پرستوں سے ہوا۔ ان کے اجتماع میں وارد ہوتے ہی آپ کی ان سے ٹھن گئی۔ آپ نے فرمایا:

"یہ مورتیاں جن کی تم لوگ پرستش کرتے ہو، آخر ہیں کیا چیز؟"

انہوں نے کہا: "ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔"

آپ نے فرمایا: "یقیناً تم بھی اور تمہارے اَب وجد بھی کھلی گمراہی میں تھے۔"

انہوں نے کہا: "اے ابراہیمؑ! کیا تم ہمارے پاس حق بات لے کر آئے ہو یا یوں ہی دل لگی کر رہے ہو؟"

آپ نے جواب دیا: "میں مذاق نہیں کر رہا بلکہ ٹھیک کہہ رہا ہوں کہ تمہارے معبود بُت نہیں بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا مالک ہے جس نے انھیں پیدا کیا اور میں خود تمہارے سامنے اس بات کا گواہ ہوں" (سورۂ انبیاء - آیات ۵۱-۵۷)۔

قدیم زمانے سے تعلق رکھنے والے خدا پرست مجاہدین یعنی اصحاب کہف کی زبانوں پر بھی یہی الفاظ ہیں۔ وہ بھی اپنے دور کے طاغوت کے مقابلے پر اٹھ کھڑے ہوئے اور آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی ربوبیت کا دم بھرتے رہے۔

وَرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.

(سورۂ کہف - آیت ۱۴)

ہم نے ان کے دلوں پر صبر و استقلال کی گرہ لگا دی کہ جب دقیانوس بادشاہ نے انہیں کفر پر مجبور کیا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بلا تامل کہنے لگے:

"یہ شخص جو ربوبیت کا دعویدار ہے اور کہتا ہے کہ لوگوں کو میری اطاعت کرنی چاہیے، لوگوں کے لیے قانون وضع کرنا صرف میرا حق ہے، ان کی زندگیوں کو میں نظم بخشتا ہوں، نہیں! وہ ہمارا رب نہیں ہے۔ وہ نہ قانون ساز ہے اور نہ ہی ہماری زندگی کو نظم بخشتا ہے بلکہ ہمارا پروردگار وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے"۔

آسمانی شریعتوں کی تاریخ میں سے یہ چند ایک نمونے تھے جن سے انبیاء کرامؑ کے اپنے دور کے طاغوتوں سے مقابلوں کے اصلی محرکات کا پتا چلتا ہے اور اللہ کے نیک بندوں اور ان کے دشمنوں کی مخالفت کی بنیادی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ایک طرف تو مردانِ خدا ہیں جن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ انسان کے لیے نظامِ زندگی وضع کرے کیونکہ وہی انسان کا اور تمام اہلِ عالم کا رب ہے اور دوسری جانب طاغوت ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ انسان کی زندگی کا انتظام چلانے اور اس کے لیے قوانین وضع کرنے کے مجاز ہیں۔

ہجرت کے نویں سال میں عدی بن حاتم جو مسیحی مذہب کا پیرو تھا رسولِ اکرمؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ کچھ دیر مذاکرات کرنے کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا[1]۔ عدی نے اس

---

[1] ابن ہشام جلد ۴ - صفحہ ۵۷۸ - ۵۸۱ مطبوعہ مصطفیٰ السقاء ۱۳۷۵ھ طبع مصر

ملاقات کے دوران اپنے گلے میں ایک سنہری صلیب لٹکا رکھی تھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "اس بت کو جو تم نے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے اُتار پھینکو۔"

عدی نے صلیب اُتار پھینکی اور آپ کی خدمتِ اقدس سے روانہ ہوگیا۔ جب وہ دوبارہ حضور سے ملنے آیا تو اس نے سنا کہ آپ اس آیت کی تلاوت فرما رہے ہیں:

"ان لوگوں نے تو اپنے خدا کو چھوڑ کر اپنے دینی پیشواؤں کو اپنا پروردگار بنا ڈالا۔" (سورۂ توبہ۔ آیت ۳۱)۔ (اشارہ یہود اور نصاریٰ کی طرف ہے)۔

عدی نے عرض کیا: "ہم اپنے دینی پیشواؤں کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔"

رسول اکرمؐ نے فرمایا: "کیا وہ لوگ خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہیں کرتے تھے اور کیا تم لوگ ان کی بے چون وچرا پیروی نہیں کرتے تھے؟"[1]

یہ صورتِ حال اب بھی عیسائیوں میں موجود ہے۔ عیسائیوں کے کیتھولک فرقے کا روحانی پیشوا یا پاپائے روم مذہبی قوانین کو تبدیل کرنے کا حق رکھتا ہے اور وہ لوگ اس کا فیصلہ بلا تامل قبول کر لیتے ہیں۔ جو اناجیل اس وقت موجود ہیں ان کے مطابق کلیسا کو قانون وضع کرنے کے اختیار کا دعویٰ ہے اور اس کا کہنا ہے کہ وہ زمین پر جو فیصلہ کرے اسے آسمان پر شرفِ قبولیت حاصل ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ وہی چیز ہے جس کی جانب قرآن مجید نے مذکورہ بالا آیت میں اشارہ کیا ہے۔

متی کی انجیل میں لکھا ہے:

"اور میں بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ تو پطرس ہے اور میں اس پتھر پہ اپنا کلیسا بناؤں گا اور عالمِ ارواح کے دروازے اس پر غالب نہ آئیں گے۔ میں آسمان کی بادشاہی کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پہ بندھے گا اور جو کچھ تو زمین پر کھولے گا وہ آسمان پر کھلے گا۔"[2]

پس اگر قرآن مجید نے یہودیوں کے احبار (علماء) اور عیسائیوں کے راہبوں (زہاد)

---

[1] مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۲۳-۲۴۔ تفسیر البرہان جلد ۲ صفحہ ۱۲۱۔ درالمنثور جلد ۳ صفحہ ۲۳۰-۲۳۱

[2] متی کی انجیل۔ باب ۱۶ بند ۱۸-۱۹

کو "رب" کا نام دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین وضع کرتے تھے اور انسان کے نظامِ زندگی میں جانبداری سے کام لیتے تھے اور اللہ تعالٰی نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں انہیں حرام اور جو حرام قرار دی ہیں انہیں حلال قرار دیتے تھے۔

لہٰذا انبیائے کرامؑ کی معرکہ آرائی کا مقصد یہ تھا کہ انسان فقط خدا ئے بزرگ و برتر کو اپنا رب مانے اور فقط اسی کے احکام مانے اور حلال اور حرام اور ممنوع اور روا کے بارے میں فقط اسی کے فیصلے پر عمل کرے۔ دین کی روح بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اگر میں کسی سرزمین میں کسی جابر شخص یا طاغوت کا حکم ماننے پر مجبور ہو جاؤں جو ارشادِ الٰہی کے برعکس ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اسے اپنا رب مان لیا ہے۔ کسی غیر اللہ کو رب ماننے کا سوال صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کے ایسے احکام کی تعمیل برضا و رغبت کی جائے جو اللہ کے احکام کے خلاف ہوں مثلاً عیسائیوں کے مذہبی رہنما نے انھیں کہا کہ ختنہ نہ کرو اور انھوں نے ختنہ کرنا چھوڑ دیا یا اس نے کہا کہ شراب پیو، یہ دین میں جائز ہے اور انھوں نے شراب پینی شروع کر دی۔ ایسے موقع پر کہا جائے گا کہ ان لوگوں نے اسے اپنا رب مان لیا۔

آئندہ دقیق مطالعہ کے بعد ہم دیکھیں گے کہ اسلام کے دو مکاتب یعنی اہلِ سنت اور اہلِ تشیّع میں باہم کس قدر فرق ہے۔ ایک مکتب (= تشیّع) ارشادِ الٰہی کے علاوہ کسی چیز پر تکیہ نہیں کرتا اور دوسرا مکتب (= تسنن) انسانی آراء اور نظریات کو دین کے متن میں جگہ دیتا ہے۔ ان دونوں مکاتب کے طور طریقے سمجھ لینے کے بعد ہمارے لیے یہ جاننا ممکن ہو جائے گا کہ ائمہ اہلِ بیتؑ نے اسلامی معاشرے میں کیا کردار ادا کیا اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی (جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے) رسولِ اکرمؐ سے لیکر امام مہدیؑ تک سب بزرگانِ دین کا ایک ہدف اور ایک ہی طریق کار تھا۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ

●●●●●

دوسرا درس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ
سَيَاْتِیْ زَمَانٌ عَلٰۤى اُمَّتِیْ لَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا
رَسْمُهٗ وَلَا مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ يُسَمَّوْنَ بِهٖ
وَهُمْ اَبْعَدُ النَّاسِ عَنْهُ.

پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا:

"میری امت پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ قرآن میں سے اس کی رسم یعنی خط اور تحریر کے علاوہ کچھ باقی نہ بچے گا۔ لوگ اس نام — مسلمان — سے پکارے جائیں گے لیکن وہ باقی سب کے مقابلے میں اسلام سے زیادہ دور ہوں گے۔"[1]

اس وقت ہم مندرجہ بالا حدیث کے جس جملے کو زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے:

"اسلام میں سے اس کے نام کے علاوہ کچھ باقی نہ بچے گا۔"

رسولِ اکرمؐ نے ان الفاظ کے ذریعے ایک عجیب پیشین گوئی فرمائی ہے جس کے مطالعہ کے بعد چند سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں:

ا۔ رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں اسلام کی کیا شکل تھی؟

ب۔ اس اسلام کو بعد میں کیا ہوا؟ یعنی اسے کس طرح اس کے مندرجات سے خالی کر دیا گیا۔ کس طرح اس کی شکل میں تبدیلیاں لائی گئیں اور اس کے حقائق کو بدلا گیا یا چھپایا گیا؟

ج۔ جو صحیح اسلام اس وقت ہمیں دستیاب ہے اسے ائمہ علیہم السلام نے کس طرح اُمّت

---

[1] ثواب الاعمال صفحہ ۳۰۱، بحارالانوار جلد ۵۲ صفحہ ۱۹۰، منتخب الاثر صفحہ ۴۲۷۔

کو لوٹایا اور لوگوں کے سامنے اسی شکل میں پیش کیا جس میں وہ آنحضرتؐ کے زمانے میں تھا؟
ان سوالات کے جوابات سمجھ لینے کے بعد ہمیں پتا چلے گا کہ موجودہ دور میں اسلام کے بارے میں ہماری ذمے داری کیا ہے ؟ مندرجہ بالا سوالات کا خلاصہ ایک جملے میں ان الفاظ میں پیش کیا جا سکتا ہے :

اسلام کیا تھا ؟ کیا بن گیا ؟ اور اب کیا کرنا چاہیے ؟

جیسا کہ گزشتہ بحث میں بیان کیا گیا ہے ' قرآن مجید کی آیات کے دقیق مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ " رب " وہ پالنے والا ہے جو اپنے زیر تربیت ہستی کو نشو و نما دے یہاں تک کہ وہ کمال کی حد تک پہنچ جائے اور اس ہستی کی ضروریات پوری کرنا بھی " پروردگار " اور " رب " ہونے کے لوازمات میں سے ہے اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ انبیائے کرامؑ کی اپنی اقوام اور اپنے ادوار کے سرکش لوگوں سے کشمکش بھی اسی مسئلے پر تھی کہ " رب " کون ہے اور جیسا کہ قرآن کریم سے گواہی ملتی ہے عموماً اللہ تعالیٰ کی خلاقیت کے بارے میں کوئی جھگڑا نہیں تھا ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

" اے رسولؐ ! اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہدیں گے کہ اللہ نے ۔ " (سورۂ لقمان ۔ آیت ۲۵) ۔

" اے رسولؐ ! اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہدیں گے کہ ان کو بڑے واقف کار زبردست خدا نے پیدا کیا ہے ۔ " (سورۂ زخرف ۔ آیت ۹) ۔

" اور اگر تم ان سے پوچھو گے کہ ان کا پیدا کرنے والا کون ہے تو ضرور کہیں گے اللہ ۔ " (سورۂ زخرف ۔ آیت ۸۷) ۔

لہذا مشرکین کے ساتھ بحث اور معرکہ آرائی عموماً خلاقیت کے بارے میں نہیں بلکہ ربوبیت کے بارے میں رہی ہے ۔ یہی پیغمبروں کی سرکش لوگوں اور اپنی جہالت میں ڈوبی ہوئی اقوام کے خلاف جنگ کا اصلی مرکز ہے اور اس جنگ میں فتح یابی کی بنا پر ہی وہ دین کو قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں " رب " کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے زیر تربیت موجودات کی زندگی کے لیے قوانین وضع کرے اور یہی ربوبیت کی ممتاز خصوصیت ہے ۔ اللہ پیدا کرتا ہے

اور اپنی مخلوق کی زندگی کی کیفیت طے کرتا ہے۔ اُسے زندگی کا قانون دیتا ہے، اس کے زندہ رہنے کا نظام متعین کرتا ہے اور اسے وہ وسائل مہیا کرتا ہے جن کے ذریعے وہ حدِ کمال تک پہنچتا ہے اور اس راستے کی جانب اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

انبیائے کرام ؑ ربوبیت کی اسی بنیادی اور اصلی خصوصیت کا سہارا لیتے تھے اور فرماتے تھے:

"اے لوگو! تمہارا رب اور پروردگار وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ اس نے تمام موجودات کے لیے قانون وضع کیا ہے۔ اس نے آسمان و زمین اور آسمانی اور زمینی موجودات کی زندگی کو نظام بخشا ہے اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے قانون بنایا ہے اور تمہاری زندگی کے طور طریقے متعین فرمائے ہیں"۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں موجودات میں سے ہر ایک کی زندگی کے طور طریقے اس کی ساخت اور طبیعت کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جس کے بارے میں قرآن مجید تسخیر کی بات کرتا ہے۔ وہ جمادات کو قانونِ آفرینش کی مضبوط زنجیر میں مجبور اور مسخر گردانتا ہے۔ یہ اپنے کمال کا راستا اسی شکل میں طے کرتے ہیں اور اس سے ذرہ برابر انحراف نہیں کرتے کیونکہ خلقت کے قانون کے مطابق جو راہ ان کے لیے متعین کی گئی ہے اس سے دُوری اختیار کرنا ان کے نابود ہو جانے کے برابر ہے۔

"تمہارا رب وہی ہے جس نے چھ مرحلوں میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا۔ پھر عرش کے بنانے پر آمادہ ہوا۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے تو گویا رات، دن کو پیچھے پیچھے تیزی سے ڈھونڈتی پھرتی ہے اور اسی نے آفتاب، مہتاب اور ستاروں کو پیدا کیا ہے۔ یہ سب کے سب اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ دیکھو حکم کرنا اور پیدا کرنا بس خاص اسی کے لیے ہے۔ وہ خدا جو سارے جہان کا پروردگار ہے بڑا برکت والا ہے"۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۵۴)

یہ آیت "تمہارا رب" کے نام سے شروع ہوتی ہے اور ربوبیت کے لیے زندگی کی گردش اور دن رات کے ظاہر ہونے کی مثال دے کر اس کی "رب العالمین" کی صفت کے ساتھ تعریف کرتی ہے۔

"اور اسی نے آفتاب اور مہتاب کو مسخر کیا ہے کہ وہ سب کے سب اپنے اپنے مقررہ

وقت کے مطابق چلتے رہیں گے۔" (سورۂ زمر۔آیت ۵، سورۂ لقمان۔آیت ۲۹)۔

موجودات کے دوسرے گروہ کو خدا کی جانب سے جو ہدایت ملتی ہے، اس کی نوعیت الہام کی ہے۔ حیوانات خدا کی الہامی ہدایت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں اور اسی الہامی ہدایت کے تحت اپنے کمال کی منزلیں طے کرتے ہیں اور اس کی آخری حد تک پہنچتے ہیں۔ حیوانات کی دقیق، حساس اور بعض اوقات بے حد پیچیدہ زندگی کی رہنمائی سر تا سر خدا کی جانب سے الہام کے ذریعے ہوتی ہے۔

حیوانات کی زندگی اپنے اولین لمحلے سے آخری مرحلۂ کمال تک اور پھر اس وقت سے موت تک ایسی ہی ہدایت کے زیرِ سایہ جاری رہتی ہے۔ قرآن مجید میں ہمیں حیوانی زندگی کی ایک مثال ان الفاظ میں ملتی ہے:

"اے رسولؐ! تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تو پہاڑوں، درختوں اور ان جگہوں میں جنکو لوگ اونچی اونچی ٹٹیاں اور مکانات پاٹ کر بناتے ہیں اپنے چھتے بنا، پھر ہر طرح کے پھلوں کے پور سے ان کا عرق چوس۔ پھر اپنے پروردگار کی راہوں میں فرمانبرداری کیساتھ چلی جا" (سورۂ نحل۔آیات ۶۸-۶۹)۔

تاہم جہاں تک انسان کا تعلق ہے، چونکہ وہ ان تین گروہوں میں سے ممتاز ترین مخلوق ہے اس لیے اسے وحی کے ذریعے ہدایت کی جاتی ہے۔ نظامِ قدرت اپنا کام شروع کرتا ہے اور اس کے سرچشمے سے وحی مقرب فرشتوں کے ذریعے پیغمبروں پر نازل ہوتی ہے۔ یہ وحی انسان کی زندگی کے طور طریقے متعین کرتی ہے اور اس کے ہر پہلو کو نظام بخشتی ہے۔ اسے کمالاتِ انسانی کے حصول کا راستا دکھاتی ہے اور دونوں جہان کی خوش نصیبی حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔

اس نظام اور اس مجموعۂ قانون کو قرآن مجید کے الفاظ میں "اسلام" کہا جاتا ہے۔ انسان کی فطرت سے ہم آہنگ، اس کے وجود کے اندازے پر مبنی اور طبیعتِ انسانی سے صحیح صحیح مطابقت رکھنے والا دین جو اس کے پروردگار کی جانب سے بھیجا گیا ہے، اس نے "اسلام" نام پایا ہے۔ یہ حضرت خاتم الانبیاءؐ کی شریعت اور دین کا خاص نام نہیں۔ جو دین تمام انبیاءؑ (مثلاً نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ) لائے اس کا نام بھی اسلام ہی ہے۔

جہاں تک قرآن مجید سے نشاندہی ہوتی ہے حضرت نوح علیہ السلام سے پیشتر والے دور کے سلسلے میں یہ پتا نہیں چلتا کہ آسمانی دین کا کیا نام تھا لیکن ان کے زمانے سے لیکر بعد کے ادوار میں تمام آسمانی شریعتوں کا نام اسلام ہی رہا ہے۔

ہم اس موضوع پر اس سے پیشتر تفصیل سے بات کر چکے ہیں اور دیکھ چکے ہیں کہ قرآن مجید کی منطق کے مطابق:

"دین تو خدا کے نزدیک بس اسلام ہے اور اہلِ کتاب نے جو (اس دین حق سے) اختلاف کیا تو محض آپس کی شرارت اور اصلی امر معلوم ہو جانے کے بعد ہی کیا ہے"۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۹)۔

لہٰذا اس کی تعریف مختصر الفاظ میں یوں کی جا سکتی ہے:

"یہ ایسے قوانین کا مجموعہ ہے جو انسان کے پروردگار نے اس کی ساخت کی مناسبت سے اور انسانی طبیعت کے مطابق اس کے لیے وضع فرمائے ہیں"؛

اس کے بعد ہماری بحث اسلام کے بارے میں ہوگی کہ یہ اسلام (یعنی زندگی کے طور طریقے اور انسان کی سوچ بچار، اعتقاد اور اخلاق) کیا تھا اور آنحضرتؐ کے بعد اس کی کیا صورت ہوگئی اور یہ کیونکر اپنے مافیہ سے خالی ہوگیا اور اب اس کے بارے میں کیا کرنا چاہیے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تھا:

"اسلام میں سے نام کے علاوہ کچھ باقی نہیں بچے گا"۔

یہ اسلام کیا تھا اور کیونکر کھوکھلا اور بے اثر ہو کر رہ گیا کہ فقط اسکا نام باقی بچ سکا؟

دقیق تجزیہ کرنے کے بعد ہم اسلام کے چار وجود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام انسانی معاشرے میں چار قسم کے وجود رکھ سکتا ہے۔

۱۔ اسمی وجود

۲۔ مفہومی وجود

۳۔ عملی وجود یا اسلامی شخصیت کا وجود

۴۔ اسلامی معاشرے کا وجود

اسمی وجود

انفرادی اور اجتماعی احکام کے مجموعے اور اسلامی اخلاقیات اور اعتقادات کے مُطالعے کے سلسلے میں ہمارا سابقہ کئی ایک اصطلاحات سے پڑا ہے جو اس شریعت کے تمام پہلوؤں کی مانند اللہ کی جانب سے وضع کی گئی ہیں اور ہم نے دیکھا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ اسلام میں سے ان اصطلاحات کے علاوہ (جو اس کا وجود اسمی ہیں) کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔

جب خاتم المرسلینؐ مبعوث فرمائے جاتے ہیں تو آپ صلاۃ، وضو اور جہاد وغیرہ کے احکام لاتے ہیں۔

"وضو" عربی لغت میں پاکیزگی کے معنی میں اور "صلاۃ" تعریف کے معنی میں ہے اور "جہاد" دوسرے کئی ایک معانی کے علاوہ وسعت اور طاقت کے معنی میں آتا ہے۔ رسولِ اکرمؐ ان الفاظ کو اپناتے ہیں اور یہی نام کئی ایک ایسے اعمال اور افعال کے رکھ دیتے ہیں جن کی تعیین اور تنظیم وحی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس موقع پر یہ الفاظ اسلام میں الفاظ کے ایک ایسے سلسلے کی حیثیت سے وارد ہوتے ہیں جن کے خاص معنی ہیں اور یہ اسلامی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور اُن کا شمار اسلام کی خاص اصطلاحات میں ہوتا ہے اور بالآخر یہ دوسری اصطلاحات کے ساتھ مل کر وجود اسمی تشکیل دیتے ہیں۔

مفہومی وجود

اسلام کی تمام جوانب یعنی اس کے عملی، اخلاقی اور اعتقادی دائرہ ہائے عمل میں اس کے صحیح مفاہیم اسلامی اصطلاحات کا مفہومی وجود تشکیل دیتے ہیں۔ جب انبیائے کرامؑ مبعوث ہوتے ہیں تو یہ دونوں چیزیں اپنے ساتھ لاتے ہیں اور رسالت الٰہی کے طور پر ان دونوں کی تبلیغ کرتے ہیں اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں سب پیغمبروں کی اولین اور اصلی ذمے داری یہی رہی ہے کہ خدائے تعالیٰ کے پیغامات لوگوں تک پہنچا دیں۔

"پیغمبروں پر تو اسکے سوا کچھ بھی نہیں کہ احکام کو صاف صاف پہنچا دیں۔" (سورۂ نحل۔ آیت ۳۵)

”تمہارا فرض صرف احکام کا صاف صاف پہنچا دینا ہے۔“ (سورۂ نحل۔آیت ۸۲)۔
”تم نے (حکم خدا سے) منہ پھیرا تو سمجھ رکھو کہ ہمارے رسولؐ پر بس صاف صاف پیغام پہنچا دینا فرض ہے۔“ (سورۂ مائدہ۔آیت ۹۲)۔

ایک تجزیے کے نتیجے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر دوسروں کے مقابلے میں دو اہم شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں وہ مسلمان ہوتے ہیں بلکہ جیسا کہ قرآن مجید حضرت محمدؐ کے بارے میں تصریح کرتا ہے۔ (سورۂ انعام۔آیت ۱۶۳) وہ اپنی امت کے پہلے مسلمان ہوتے ہیں اور دوسرے مرحلے میں خدائے تعالےٰ کی جانب سے پیغام لاتے ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں میں سے ہر ایک کی بنا پر ان بزرگواروں کے کچھ وظائف ہوتے ہیں۔ اپنی پہلی شخصیت کی بنا پر یعنی اس لیے کہ وہ ایک مسلمان ہوتے ہیں، ان کی ذمے داری ہے کہ نماز پڑھیں، روزے رکھیں، لوگوں کو نیکی کی طرف بلائیں اور فساد اور تباہی سے باز رکھیں، جہاد کریں، حج کو جائیں اور مختصراً ایک مسلمان کی حیثیت سے جو ذمے داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں انہیں بطورِ احسن انجام دیں۔ تاہم جہاں تک ان کی دوسری یعنی پیغام لانے کی حیثیت کا تعلق ہے ان کی ذمے داری صرف یہ ہے کہ وہ پیغامِ خداوندی لوگوں تک پہنچا دیں۔

یہ بزرگوار چونکہ خدا کے پیغامبر ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ ارشادات خداوندی لوگوں تک پہنچائیں اور اس راستے میں موجود کسی رکاوٹ سے ہراساں نہ ہوں اور آخری دم تک ثابت قدم رہیں، انہیں خواہ سنگسار کیا جائے یا جلا وطن کیا جائے یا انہیں ہجرت پر مجبور ہونا پڑے لیکن وہ خدا کے کلام کو جس کا خلاصہ اسلامی اصطلاحات اور ان کے صحیح مفاہیم میں موجود ہوتا ہے لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے رہتے ہیں۔[1]

---

[1] مؤرخین نے رسول اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ مشرکانِ قریش کی مالی پیشکشوں کے مقابلے میں آپ نے فرمایا: ”اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَبْعَثْنِیْ لِجَمْعِ الدُّنْیَا وَالرَّغْبَۃِ فِیْھَا وَاِنَّمَا بَعَثَنِیْ لِاُبَلِّغَ عَنْہُ وَاَدُلَّ عَلَیْہِ“ (یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۷، مطبوعہ نجف)۔ علاوہ ازیں روایت میں آیا ہے: ”قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ یَا مَعَاشِرَ قُرَّاءِ الْقُرْاٰنِ! اِتَّقُوا اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ فِیْمَا حَمَّلَکُمْ مِنْ کِتَابِہٖ فَاِنِّیْ مَسْئُوْلٌ وَاِنَّکُمْ مَسْئُوْلُوْنَ، اِنِّیْ مَسْئُوْلٌ عَنْ تَبْلِیْغِ الرِّسَالَۃِ وَاَمَّا اَنْتُمْ فَتُسْئَلُوْنَ عَمَّا حُمِّلْتُمْ مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ وَسُنَّتِیْ (اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۶۰۶)

تاریخ کے ہر دور میں پیغمبر پیغاماتِ الٰہی کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ وہ اسلام کا نام (یعنی اصطلاحات) اور مفہوم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسا کرنا ان کے کام کی تکمیل نہیں بلکہ ابتدا ہے، مثلاً جب معاشرے کے لوگ "صلاۃ"، 'وضو' اور 'جہاد' اور انکے اسلامی معانی سے واقف ہو جاتے ہیں تو پیغمبر ایک نئی کوشش کا آغاز کرتے ہیں اور اس تگ و دو میں لگ جاتے ہیں کہ یہ سوچ بچار، یہ پہچان اور یہ پیغام فعلیت اور عمل کے مرحلے پہ پہنچ جائے یعنی ایسے لوگ وجود میں آجائیں جو اسلامی مفاہیم کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

پیغمبروں کی تبلیغ اور کوششوں سے لوگ خدا کے دین کے اسمی اور مفہومی وجود اور اس کے ایک ایک عمل اور طور طریقے اور اعتقاد کو سیکھ لیتے ہیں اور خوب اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔ وہ خاص اسلامی اصطلاحوں سے بھی اور ان میں پوشیدہ معانی سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ نبی کے سب معاصرین خواہ وہ ابوذرؓ ہوں یا ابولہب، عمارؓ ہوں یا ابوجہل، مومن ہوں یا کافر، تمام اسلامی مفاہیم کو سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اسلام کے عملی وجود کی نوبت آتی ہے اور پیغمبر کوشش کرتے ہیں کہ یہ مفاہیم عملی اور فعلی وجود حاصل کرلیں، نمازی پیدا ہو جائیں اور اسلام کے سب احکام اور اخلاقیات عملی جامہ پہن لیں۔

اسلامی شخصیت کا وجود

اس مقام پر پہنچ کر تیسرا اسلامی وجود یا اسلام کا عملی وجود ظاہر ہوتا ہے اور اسلامی شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ اسلامی شخصیت اس شخص میں نمایاں ہوتی ہے جو وضو کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، حج کو جاتا ہے، جہاد میں شریک ہوتا ہے اور اسلامی اخلاقیات کی پابندی کرتا ہے۔ مکے میں قیام کے دوران میں تبلیغ کے بعد رسول اکرمؐ کی تمام تر کوشش اسلامی شخصیتیں تعمیر کرنے پر مرکوز تھی۔ اس زمانے میں آپؐ علیؑ، خدیجہؑ، ابوذرؓ، عمارؓ، سمیہؓ، یاسرؓ، خبابؓ، بلالؓ وغیرہ کی شخصیتیں وجود میں لائے۔ آنحضرتؐ کے مکے میں قیام کے آخری ایام میں وجودِ اسلام کے یہ تین مرحلے مدینہ منتقل ہو گئے اور آپ کی غیر موجودگی میں انہوں نے (یعنی وجودِ اسلام کے تینوں مراحل نے) اپنے قدم وہاں جما لیے۔

یہ بات بجائے خود واضح ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ وجودِ اسلام کا تیسرا مرحلہ یعنی اسکا فعلی وجود

یا اسلامی شخصیت تو موجود ہو لیکن اس کا وجودِ اسمی اور وجودِ مفہومی موجود نہ ہوں۔ جب تک رسولِ اکرمؐ اسلامی اصطلاحات بیان نہ کریں اور ان کے صحیح معنی لوگوں کو نہ سمجھائیں اسلام کے تیسرے وجود یعنی اسلامی شخصیت یا عملی اسلام کا وجود میں آنا ممکن نہیں کیونکہ یہ دونوں وجود تیسرے وجود پر سبقت رکھتے ہیں۔

اسلامی معاشرے کا وجود

جب اسلام کا تیسرا وجود یعنی اسلامی شخصیت معاشرے میں صورت پذیر ہو جاتا ہے اور وجود میں آجاتا ہے تو رسول اکرمؐ اسلامی وجود کے چوتھے مرحلے یا اسلامی معاشرے کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جب اسلامی شخصیتیں آئیں اور انھوں نے حضورؐ کی بیعت کی تاکہ اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھیں۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں اسلام کے معاشرتی احکام نافذ کیے جائیں اور اسلام گھروں کی چار دیواری میں شگاف کر کے اقتصادیات، سیاست، صلح اور جنگ کے میدان میں قدم رکھے۔ اس منزل پر پہنچ کر ہم اسلام میں بیعت کے مفہوم اور فوائد کو سمجھ لیتے ہیں اور ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ بیعت کے ذریعے ہی اسلامی معاشرہ یا اسلام کا ممتاز ترین وجود صورت پذیر ہوتا ہے۔

لہٰذا رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں اسلام کے چار وجود تھے۔ اصطلاحات بھی بیان کی گئیں، ان کے مفاہیم کی تبلیغ بھی کی گئی، اسلام پر عمل کرنے کی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے لوگوں نے تربیت بھی حاصل کی اور بالآخر ایک اسلامی معاشرہ بھی قائم ہو گیا۔

انسانی تاریخ کے گزشتہ ادوار میں تمام رسولوں کے زمانوں میں بھی یہی اصطلاحات موجود تھیں جو آخری شریعت میں موجود ہیں یعنی "صلاۃ ـــ زکات ـــ صوم ـــ جہاد" وغیرہ اور ان کے معانی بھی یہی تھے۔ انبیائے سلف علیہم السلام ہر شکل میں ان اصطلاحات اور مفاہیم کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی شخصیت کی تعمیر بھی کی جاتی تھی۔ بلاشبہ اس تیسرے حصے میں بعض انبیاءؑ کو کم اور بعض کو زیادہ کامیابی ہوئی، تاہم ان میں سے بعض کے لیے (مثلاً موسیٰ، داؤد اور سلیمان علیہم السلام کے لیے) یہ ممکن ہو سکا کہ اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھیں اور بعض دوسروں کو یہ امکان حاصل نہیں ہو سکا۔

رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں اسلام اپنے تمام وجود لیے ہوئے اور تمام مراحل اور منازل طے کرکے معاشرے میں نمودار ہوا لیکن آنحضرتؐ کے بعد کیا صورت ہوئی؟ شاید آپ کو یہ جان کر حیرت ہو کہ جو اسلام عموماً مسلمانوں میں رائج ہے وہ اسلام کے نام کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں اور اس کا حقیقی مفہوم اور معانی معدوم ہو چکے ہیں کیونکہ مثال کے طور پر نماز سے کئی ایک شرائط وابستہ ہیں اور اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں تو نماز کا حقیقی وجود مفقود ہو جاتا ہے اور یہی صورت روزے، جہاد اور دوسرے اسلامی احکام کی ہے۔ اگر یہ احکام ضروری خصوصیات اور شرائط کے ساتھ بجا نہ لائے جائیں تو یہ اسلامی احکام نہیں کہلا سکتے۔

ہم اپنا سوال دہراتے ہیں:

اسلام کا لفظی اور معنوی وجود اور شخصیتِ اسلامی کا وجود اور اسلامی معاشرہ آنحضرتؐ کے دور میں اور اکثر دوسرے انبیاءؑ کے ادوار میں ظہور پذیر ہوئے لیکن انبیاءؑ کی رحلت کے بعد ان کی کیفیت کیا ہو گئی؟ گزشتہ انبیاءؑ کے سلسلے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی رحلت کے بعد اسلام مکمل طور پر معاشرے سے حذف ہو گیا اور یا تو تحریف اور تبدیلیوں کا شکار ہو گیا یا اُسے چھپا دیا گیا۔ بلاشبہ ایسا ایک ہی دن میں یا ایک ہی بار نہیں ہوا بلکہ یہ عمل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج مکمل ہوا، جو اسلام حضرت موسیٰؑ بن عمران لائے وہ رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا اور جو اسلام حضرت عیسیٰ بن مریمؑ لائے وہ بھی ان کے بعد نابود ہو گیا حتیٰ کہ اس کے نام کا وجود بھی باقی نہ رہا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو دین اللہ کی جانب سے بذریعہ وحی انبیائے کرامؑ پر نازل کیا گیا اس کا نام اسلام ہے اور جو شریعت حضرت موسیٰؑ لائے اس کا نام بھی اسلام ہی تھا لیکن اب وہ یہودیت میں تبدیل ہو گیا ہے اور اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی شریعت کو مسیحیت اور نصرانیت کہا جاتا ہے۔ یہ نام پروردگارِ عالم کی جانب سے نہیں بلکہ امتوں کے گھڑے ہوئے ہیں اور تحریف کرنے والوں کے ہاتھوں وجود میں آئے ہیں۔ پس گزشتہ ادوار میں تحریف کا عمل اس قدر بڑھ گیا تھا کہ نہ صرف وہ اسلامی معاشرہ جس کی بنیاد مثلاً حضرت موسیٰؑ بن عمران نے رکھی تھی مٹ گیا بلکہ ان کی تعمیر کردہ اسلامی شخصیت بھی الٹ پلٹ ہو کر رہ گئی حتیٰ کہ اسلام کے معنی اور اصطلاحات بھی نابود ہو گئیں۔ فقط ایک گروہ کے افراد (یہودی) اپنا رشتہ ان سے جوڑتے ہیں لیکن کیا یہ اعمال اور طور طریقے اور اعتقادات جو یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان موجود ہیں،

حضرت موسیٰؑ بن عمران یا حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے لائے ہوئے ہیں؟ کیا عیسائیوں میں شراب خوری، ختنہ نہ کرنے، حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے اور عقیدۂ تثلیث کی تبلیغ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی ہے؟ پس اسلامی معاشرہ اور اسلامی شخصیت اور اسلام کے الفاظ اور معانی سب کے سب مٹ گئے اور جو کچھ انبیائے کرامؑ لے کر آئے تھے اس میں سے اسلام میں کوئی چیز باقی نہ رہی حتیٰ کہ نام بھی باقی نہ رہا۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت خاتم الانبیاءؐ کی شریعت کی کیا حالت ہوئی؟ خود آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ: ''فقط اسلام کا نام باقی رہ جائے گا'' بلاشبہ اسلام کا فقط نام باقی رہ جائے گا اور قرآن کا رسم الخط۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس قول کو سمجھیں اور اس کے سیاق و سباق پر غور و خوض کریں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، انبیائے سلف علیہم السلام جو اسلام لائے اس کے وجود کے تمام مراحل میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا لیکن جہاں تک آنحضرتؐ کی شریعت کا تعلق ہے تو خود آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کے بعد اسلام کا فقط نام باقی رہے گا۔ بلاشبہ اس لفظ کے دقیق معنوں میں اس ناگوار حادثے کا تعلق امامت کے اولین دور سے ہے۔ اسلامی معاشرے میں ائمہ اہلبیتؑ کا کردار یہ تھا کہ وہ مردہ اور مفہوم سے خالی شدہ اور معاشرے سے نکال باہر کیے ہوئے اسلام کو دوبارہ معاشرے کو لوٹا دیں اور اس کے مفہومی اور عملی وجود کو زندہ کر دیں۔ ان بزرگواروں نے اسلام کے واقعی مفاہیم بھی معاشرے کو لوٹا دیے اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی شخصیت کی تعمیر بھی کی۔

گزشتہ امتوں میں تحریف اور اسکے مختلف پہلو

ہم ایک بحث میں گزشتہ امتوں کے مابین تحریف اور تبدیلی اور اخفا کا ایک مختصر مقابلہ اور تطبیق کرتے ہیں تاکہ آخری شریعت اور اس کے مقدر کا واضح طور پر ادراک کر سکیں۔ اس سلسلے میں ہم ادیانِ آسمانی کی تاریخ کے ناقابلِ تردید ماخذ یعنی قرآن کی جانب رجوع کرتے ہیں تاکہ اس امر کا پتا چلا سکیں کہ گزشتہ آسمانی شریعتیں کیونکر نابود ہوئیں۔

۱۔ کتمان (حقیقت کا چھپانا)

"اور اے رسولؐ! ان کو وہ وقت تو یاد دلاؤ جب خدا نے ان اہل کتاب سے عہد و پیمان لیا تھا کہ تم کتاب خدا کو صاف صاف بیان کر دینا اور (خبردار) اس کی کوئی بات چھپانا نہیں مگر ان لوگوں نے ذرا بھی خیال نہ کیا اور اسے پسِ پُشت ڈال دیا اور حقائق کو تھوڑی سی قیمت کے عوض بیچنے لگے۔ پس کیا ہی برا سودا ہے جو یہ لوگ خرید رہے ہیں۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۸۷)

"بے شک جو لوگ ہماری ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جنہیں ہم نے نازل کیا اس کے بعد چھپاتے ہیں جب ہم کتاب (توراۃ) میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں تو یہی لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۹)۔

"بے شک جو لوگ ان باتوں کو جو خدا نے کتاب میں نازل کی ہیں چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت لے لیتے ہیں، یہ لوگ بس انگاروں سے اپنے پیٹ بھرتے ہیں اور قیامت کے دن خدا اُن سے بات تک تو کرے گا نہیں اور نہ انہیں پاک کرے گا اور اُنہیں کے لیے دردناک عذاب ہے۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۷۴)۔

۲۔ حق اور باطل کو خلط ملط کرنا

"اے اہل کتاب تم کیوں جان بوجھ کر حق و باطل کو خلط ملط کرتے ہو اور حق کو مشتبہ بناتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۷۱)۔

"جانتے بوجھتے حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور حق کو نہ چھپاؤ جبکہ تم جانتے ہو۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۲)

۳۔ تحریف

"کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ (اہل کتاب) تم پر ایمان لائیں گے حالانکہ ان میں کا ایک گروہ ایسا تھا کہ خدا کا کلام سنتا تھا اور اچھی طرح سمجھنے کے بعد دانستہ اُس میں تحریف کر دیتا تھا حالانکہ

وہ خوب جانتا تھا۔" (سورۂ بقرہ آیت ۷۵)۔

"بعض یہودی ایسے ہیں جو جھوٹی باتیں سننے کے لیے ہمہ تن گوش رہتے ہیں۔۔۔ یہ لوگ خدا کے کلام کو اس کی اصل جگہ سے ہٹا کر تحریف کرتے ہیں۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۴۱)۔

"یہود میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کلام خدا میں ان کی اصل جگہ سے ___ حقیقی معانی اور واقعی مصداق ___ تحریف کر دیتے ہیں اور دین پر طعنہ زنی کی راہ سے تم سے کہتے ہیں ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۴۶)۔

گزشتہ آیات پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ سابقہ اقوام نے آسمانی حقائق اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ادیان کو الٹ پلٹ کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے۔ ایک گروہ نے حقائق پر پردہ ڈالا، دوسرے نے سچ کے ساتھ جھوٹ ملا کر اسے مشکوک بنا دیا اور تیسری قسم کے لوگوں نے دین کا راستا بدل دیا اور اس کے معانی میں تحریف کی اور اس کے ظاہر اور الفاظ سے بے نیاز ہو گئے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کے طریقے اختیار کر کے وہ آسمانی کتابوں میں تبدیلیاں کرتے تھے اور اس فعل میں اس قدر آگے بڑھ جاتے تھے کہ سچ کو جھوٹ سے الگ کرنے کا امکان باقی نہیں رہتا تھا۔

بلاشبہ اس تمام خیانت کاری اور حقائق کو الٹ پلٹ دینے کی محرک یہ چیز تھی کہ آسمانی حقائق ہر طور انسان کی کچھ نفسانی خواہشات سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ اس قسم کے حقائق کی قدر و قیمت، مقتدر اور ہوس پرست افراد کے خراب اعمال اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کا راستا روک دیتی ہے۔ پھر وہ یہی کر سکتے ہیں کہ یا تو بے شمار لذتوں اور راحتوں کو ترک کر دیں یا ان حقائق کی وقعت کو زائل کر دیں اور یا ان کا رنگ اور ماہیت تبدیل کر دیں۔

ہر قوم کے طاقتور افراد نے عموماً تیسرے راستے کا انتخاب کیا کیونکہ وہ پہلا راستا اپنانے اور اپنی خواہشات اور لذتوں کو ترک کرنے پر آمادہ نہ تھے اور دوسرا راستا بھی قابل عمل نہ تھا کیونکہ دینی حقائق سے یکبارگی انکار کرنے سے ان کی اپنی حیثیت متاثر ہوتی اور ان کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا۔ پس بہترین طریقہ یہ تھا کہ خود دین کے پردے میں اس کے تمام مفاہیم اور حقائق میں تحریف کی جائے اور انہیں زیر و زبر کر دیا جائے۔ سب آسمانی ادیان اور سابقہ شریعتوں کا حشر یہی ہوا ہے اور وہ اسی طرح بدلے جاتے رہے ہیں۔ قرآن مجید نے ان تمام

خیانت کاریوں اور جرائم کو "بغی" کے نام سے یاد کیا ہے جس کے معنی سرکشی، زیادتی اور تجاوز کے ہیں۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۱۳، سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۹، سورۂ شوریٰ۔ آیت ۱۴، سورۂ جاثیہ۔ آیت ۱۷)۔

ہم پیشتر دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے قوانین ـــــ جو ایسے واحد قوانین ہیں جو انسان کے لیے مناسب ہیں ـــــ وحی کے ذریعے پیغمبروں پر اتارے اور ان کے وسیلے سے ہم تک پہنچائے۔ ہم یہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ جو بزرگوار اللہ تعالیٰ کا پیغام لائے ہیں ان کی بحیثیت پیغام لانے والوں کے تبلیغ کے علاوہ اور کوئی ذمے داری نہیں ہوتی لیکن خدا کا پیغام لانے والا ہر شخص (یعنی نبی یا رسول) اس سے پیشتر کہ وہ پیغام لانے والے کی حیثیت کا حامل ہو ایک مسلمان ہوتا ہے اور مسلمان ہونے کی بنا پر جو ذمے داریاں ہماری ہیں وہی اس کی بھی ہوتی ہیں چونکہ وہ مسلمان ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ نماز پڑھے، روزے رکھے، حج کرے، جہاد کرے اور عادلانہ حکومت قائم کرے۔ یہ سب ذمے داریاں اس پر بحیثیت رسول نہیں، بلکہ بہ حیثیت مسلمان عائد ہوتی ہیں لیکن اس لحاظ سے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوتا ہے اس کی ذمے داری تبلیغ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اب جبکہ ہم نے تمہیدی نقاط سے واقفیت حاصل کر لی ہے، ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ائمہ اہلبیتؑ نے اسلامی معاشرے میں کیا کردار ادا کیا اور کیا وظیفہ انجام دیا۔

امامت اور خلافت

اسلام میں دو مکاتب اور دو زاویہ ہائے نگاہ موجود ہیں یعنی "مکتب امامت اور مکتب خلافت"۔ امامت کے مکتب میں امام کی کچھ خصوصیتیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ تمام گناہوں اور لغزشوں سے پاک ہو۔ دوسری یہ کہ اس کا تقرر صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ممکن ہے اور پیغمبر کا اس کے انتخاب میں کوئی دخل نہیں۔ اس کی (یعنی پیغمبر کی) ذمے داری صرف یہ ہے کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ انتخاب کرتا ہے اور پیغمبر اس انتخابِ خداوندی کی خبر لوگوں کو دیتا ہے۔

ائمہ علیہم السلام کے اس گروہ میں جس میں سے پہلے حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام

اور آخری حضرت حجت بن الحسن العسکریؑ ہیں جو کچھ ہم امام علیؑ کے بارے میں جانتے اور مانتے ہیں اس کا اطلاق امام مہدیؑ پر بھی ہوتا ہے اور جو کچھ امام علیؑ کے لیے ثابت ہوتا ہے یعنی عصمت، خدا کی جانب سے تقرر، الہام، ابدی اسلام کی ہمہ پہلو شناخت وغیرہ وہ سب اماموں کے لیے وجود رکھتا ہے اور ثابت ہوتا ہے۔

لیکن خلفاء کے مکتب میں خلیفہ کو لوگ مقرر کرتے ہیں اور وہ خلافت کا رتبہ لوگوں کے انتخاب کی بدولت حاصل کرتا ہے۔ یہاں بھی جو کچھ ابوبکر کے لیے ثابت ہوتا ہے وہی آخری عثمانی خلیفہ تک ثابت ہوتا ہے۔ خلافت، انتخاب اور بیعت سے ثابت ہوتی ہے اور اس بارے میں خلافت کی ابتدا سے انتہا تک کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

یہ بحث ایک بے حد مختصر تمہید تھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ امامت کے مکتب میں اور اس ذکاوت کی بنیاد پر جو اس میں وجود رکھتی ہے امیرالمومنین امام علیؑ کس طرح پہچانے جاتے ہیں اور رسول اکرمؐ نے ان کے بارے میں کیا فرمایا ہے۔ آنحضرتؐ کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ذریعے احکامِ الٰہی کی تبلیغ عموماً زمان اور مکان کے حوادث سے غیر مربوط نہیں ہوتی تھی مثلاً کوئی بھی واقعہ پیش آتا اور لوگ اس کے متعلق آنحضرتؐ سے رجوع کرتے تو اسی دوران میں حضرت جبرئیل علیہ السلام اس مسئلے کے بارے میں حکم بذریعہ وحی نازل کر دیتے تھے یا اجتماعی یا گھریلو مسائل کے بارے میں کوئی اختلاف رونما ہوتا یا کوئی شخص کوئی سوال پیش کرتا یا کسی دوست یا دشمن کی جانب سے کوئی مسئلہ آنحضرتؐ کے سامنے لایا جاتا تو اس کے لیے وحی نازل ہوتی اور اس کی روشنی میں اختلاف حل ہو جاتا اور سوال کا جواب مل جاتا۔

یہاں ہم تاریخ اسلام کے ایک بہت ہی اہم واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

ہجرت کا آٹھواں سال تھا۔ رسول اکرمؐ نے مکہ فتح کر لیا اور مدینہ منورہ لوٹ آئے۔ اس وقت مسلمان جزیرۃ العرب میں دوسرے سب لوگوں سے زیادہ قوی تھے۔ تاہم کچھ بکھری ہوئی قوتیں عرب کے مختلف نقاط میں موجود تھیں جو ابھی پرچم اسلام کے زیر سایہ نہیں آئی تھیں اور کچھ مشرک قبائل ایسے بھی تھے جو دورِ جاہلیت کے عربوں کی عادات پر کاربند رہتے ہوئے مکے میں آتے

تھے۔ یہ مشرکین مکے میں خانۂ خدا کا طواف کرتے تھے۔ وہاں سے مشعر آتے تھے اور پھر منیٰ جا کر وہاں قربانی دیتے، بال منڈواتے اور دوسرے مراسم بجالاتے تھے۔ اسلام کے غلبہ حاصل کرنے اور مکہ فتح ہو جانے کے بعد یہ تمام مراسم مسلمانوں کے انبوہ کے درمیان انجام دیے جانے۔ مسلمان اور مشرک دونوں حضرت ابراہیمؑ کی سنت پر عمل کرتے اور اپنے اپنے طور طریقوں پر کاربند رہتے اور ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہ رکھتے۔

سورۂ برأت جسے سورۂ توبہ بھی کہا جاتا ہے ایک قطعی فرمان کے طور پر نازل ہوئی تاکہ مسلمانوں اور مشرکین کا باہمی ارتباط ختم کر دیا جائے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ مشرکین کو صریح طور پر مطلع کرتا ہے کہ:

"خدا اور اس کا رسولؐ تم سے بیزار ہیں۔ آئندہ تم حج کے لیے آنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ تم لوگ جو مشرک ہو، تم لوگ جو کہ "اللہ" کے ساتھ ایک اور رب کے قائل ہو، یہ حق نہیں رکھتے کہ خانۂ خدا اور توحید کے صدر مقام میں داخل ہو سکو۔ خانۂ خدا اُن لوگوں کا مال ہے جو اُس کے سوا کسی دوسرے رب کے قائل نہیں۔ البتہ جن لوگوں نے رسولؐ کے ساتھ معاہدے کر رکھے ہیں ان کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کی میعاد تک ان کی پابندی کی جائے گی۔" (سورۂ توبہ آیات ۱-۴)

یوں عرب کے تمام مشرکین سے بیزاری اور جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ چونکہ یہ فرمان اللہ کی جانب سے تھا اس لیے ضروری تھا کہ اسے بت پرست عربوں اور مشرکین تک پہنچایا جائے۔ رسولِ اکرمؐ تبلیغ پر مامور تھے۔ قرآن مجید اور اللہ کے دوسرے احکام پہلی مرتبہ مخاطبین تک پہنچانا معصوم کی خاص شان ہے۔ یہ ضروری ہے کہ مکلف افراد اور اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کے مخاطبین پہلی دفعہ وہ حکم ایک معصوم کی زبانی سنیں۔

قرآن مجید تصریح کرتا ہے کہ جب صاحبانِ رسالت فرمانِ الٰہی کی تبلیغ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے غیبی مامورین یعنی فرشتے ہر جانب سے ان کی نگہبانی کرتے ہیں تاکہ یہ تبلیغ کسی غلطی یا لغزش کے خطرے کے بغیر انجام پذیر ہو اور آسمانی حقائق بالکل صحیح اور سالم شکل میں لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچیں[1]

---

[1] اس سلسلے میں سورۂ جن کی ۲۷ویں اور ۲۸ویں آیات دیکھیے۔

یہ وہی اصول ہے جس کا ذکر ہم نے تبلیغ کے بار اوّل محفوظ ہونے کے بارے میں کیا ہے اور یہ اس سنتِ الٰہی سے عبارت ہے کہ "پہلی دفعہ تبلیغ ایک معصوم کے ہاتھوں انجام پانی چاہیے۔"

یہاں ایک اشارہ کرنا لازمی ہے جس کے بغیر مطلب مناسب طور پر نہیں سمجھا جا سکتا اور وہ اشارہ یہ ہے کہ جن چیزوں کی لوگوں میں تبلیغ ضروری ہو ایک تقسیم کے مطابق اس کے دو حصے کیے گئے ہیں۔ ایک حصے میں تو وہ چیزیں آتی ہیں جن کے الفاظ اور معانی دونوں خدا کی طرف سے ہوں۔ اس زمرے میں قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابیں آتی ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معانی اور مفاہیم تو آسمانی ہوں لیکن الفاظ آنحضرتؐ کے ہوں۔ یہ حدیث اور سنت ہیں۔

خدائے متعال نے قرآن مجید رسولِ اکرمؐ پر وحی فرمایا۔ اس کے الفاظ اور عبارات بھی اور مفاہیم اور معانی بھی اسی کی جانب سے ہیں۔ بلاشبہ یہ قرآن عام اصولوں اور بڑے بڑے اسلامی مسائل پر مشتمل ہے اور عموماً چھوٹے چھوٹے مسائل سے بحث نہیں کرتا۔ ایسے مسائل کے بارے میں اسلامی احکام و معارف کا ایک سلسلہ ہے مثلاً نمازیں کتنی رکعتیں ہیں، ذکر، رکوع یا سجود کیا چیزیں ہیں اور تشہد کس طرح پڑھنا چاہیے۔ حج کے سلسلے میں بیت اللہ کا طواف کتنی دفعہ کرنا چاہیے۔ میقات کہاں کہاں ہیں۔ احرام کس طرح باندھنا چاہیے۔ کون کون سی چیزوں میں زکات واجب ہے اور ہر چیز کے بارے میں زکات کا نصاب کیا ہونا چاہیے۔ یہ اور ایسی ہی اور بہت سی جزویات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ رسول اکرمؐ کے لیے لازم ہے کہ وحی کی بنیاد پر لیکن اپنی عبارات اور الفاظ میں ان چیزوں کے بارے میں بیان کریں۔ اس قسم کے احکام میں معنی اور مفہوم تو اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں لیکن الفاظ آنحضرتؐ کے ہوتے ہیں۔

جس چیز کے الفاظ اور معانی اللہ کی طرف سے ہیں (یعنی قرآن مجید) مکلفین اور مخاطبین کو اس کی تبلیغ رسول اکرمؐ کی زندگی کے آخری سال میں مکمل ہوگئی اور یہ تبلیغ آنحضرتؐ نے بنفسِ نفیس فرمائی لیکن وہ مفاہیم اور حقائق جن کا سنتِ نبویؐ میں بیان کیا جانا ضروری تھا خود ان کی قسمیں دو ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس کی مسلمانوں کو حضورؐ کے زمانے میں ضرورت تھی۔

اس کی مکمل تبلیغ آپ نے خود فرمائی۔ دوسری قسم وہ ہے جس پر عمل کرنے کا وقت آنحضرتؐ کے دور میں نہیں آیا تھا اور یہ وقت بعد میں آیا۔ لازمی طور پر آپ کے زمانے میں اس کی فوری تبلیغ کی ضرورت نہیں تھی مثلاً یہ مسئلہ کہ اگر مسلمانوں کا حاکم معصوم نہ ہو یعنی نبی یا امامِ حق نہ ہو تو مسلمانوں کا وظیفہ کیا ہے؟ اور انہیں ایسے حاکم کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ آنحضرتؐ کے زمانے میں موردِ احتیاج نہیں تھا۔ نیز اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین جنگ ہو جائے تو جو گروہ زیادتی کرنے والا ہو' اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے اور جو مال ان سے چھینا جائے اس کے متعلق کیا حکم ہے اور اسی جیسے دوسرے احکام پر عمل درآمد کرنے کا موقع آنحضرتؐ کے زمانے میں نہیں آیا تھا۔ ایسی صورت حال امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے زمانے میں پیش آئی اور اس کے متعلق اسلامی حکم پر امام کے وسیلے سے عملدرآمد ہوا اور یا یہ مسئلہ کہ اگر مسلمان معصوم حاکم کے خلاف جنگ کریں تو ان میں سے جو قیدی بنا لیے جائیں ان سے کیا سلوک کیا جائے اور مالِ غنیمت پر کس صورت میں قبضہ کیا جائے۔ یہ سب مسائل ایسے ہیں جو بعد میں پیدا ہوئے ہیں اور آنحضرتؐ کے زمانے میں ان کی ضرورت نہیں تھی اس لیے بیان بھی نہیں کیے گئے۔

یہ تمام حوادث اور سیکڑوں ہزاروں دوسرے مسئلے ایسے تھے جن کے بارے میں احکام اور قوانین وضع کیے گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے وہ اپنے رسولؐ تک پہنچا دیے اور بذریعہ وحی ان کی توضیح بھی فرما دی لیکن اس قسم کے مسائل کے بارے میں (جو ابھی معرضِ شہود پر نہیں آئے تھے) رسولِ اکرمؐ نے متعلقہ احکام امیر المومنینؑ کی تحویل میں دیدیے اور آنحضرتؐ کے بعد ان کا بیان کرنا آپ (امام علیؑ) کی ذمے داری ہو گئی۔[1]

جن مسائل کی تبلیغ کی جاتی تھی ایک اور تقسیم کے مطابق کبھی تو وہ بے واسطہ اور پہلی مرتبہ لوگوں تک پہنچائے جاتے تھے اور کبھی ان کی تبلیغ بالواسطہ ہوتی تھی۔

---

[1] معتبر شیعہ روایات سے پتا چلتا ہے کہ انسان کے موردِ احتیاج مسائل کے بارے میں احکام آنحضرتؐ نے امام علیؑ کو لکھوا دیے اور آپ نے انہیں "جامعہ" نامی ایک کتاب میں جمع کر دیا جو ایک علمی میراث کی صورت میں اہلبیتؑ کے پاس موجود رہی۔ اہلِ سنت کی کتابوں میں بھی اس کتاب کے بارے میں کافی اشارات ملتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بحث میں اس کتاب کے بارے میں زیادہ ذکر آئے گا۔

جو احکام مکلفین تک پہنچنے ضروری ہوں وہ پہلے مرحلے میں ایک معصوم شخص کے ذریعے پہنچنے چاہئیں۔ لغزش اور خلل سے پاک ہونے چاہئیں اور حکم نماز کے بارے میں ہو یا روزے کے بارے میں، زکات کے بارے میں یا جہاد کے بارے میں یا اللہ کا کوئی اور حکم ہو اس کی تبلیغ ایک معصوم کے ذریعے ہونی چاہیے۔ ایک ایسے شخص کے ذریعے جس کا تقرر اللہ کی جانب سے ہوا ہو اور جو لغزش اور اشتباہ سے محفوظ ہو ورنہ ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ کا حکم کمی بیشی یا غلطی یا بھول چوک کا شکار ہو جائے۔ البتہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ جب احکام صحیح طور پر سیکھ لے تو ان کی تبلیغ دوسروں کے مابین کرے۔ ایک مسلمان دوسرے سے کہہ سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے مجھے نماز یوں سکھائی ہے یا یہ کہ آپؐ فلاں حکم کی خصوصیات کی تعلیم اس شکل میں دیتے تھے لیکن ایک عام غیر معصوم مسلمان کوئی واسطہ نقل کیے بغیر یہ نہیں کہہ سکتا کہ "تم پر خدا نے نماز یوں لازم کی ہے"۔ نہیں۔ ایک غیر معصوم کے لیے اصولاً کسی ایسے حق کا کوئی وجود نہیں۔ بنیادی اور دقیق نکتہ یہی ہے۔

اس بنیادی نکتے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن اسلامی احکام کی تبلیغ آنحضرتؐ کے زمانے میں نہیں ہوئی ان کی تبلیغ کس کے ذریعے ہونی چاہیے تھی؟ اس سوال کا جواب دیتے وقت ہم ائمہ اہلبیتؑ کے عمل اور کردار کے نزدیک ہو جاتے ہیں۔

ایک ایسا شخص جو مجھ سے ہے

آیاتِ برأت نازل ہوئیں اور ان آیات کے مخصوص مخاطب مشرکین ہیں۔ یہ مکے میں ہیں اور رسول اکرمؐ کی دسترس سے دور ہیں۔ ان آیات کے موردِ تبلیغ مدینے کے لوگ نہیں ہیں کیونکہ روئے سخن ان کی طرف نہیں ہے۔ ان آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جو احکام دیے گئے ہیں وہ فقط مشرکین کے لیے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اور بعد میں اس نکتے کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ ضروری ہے کہ مخاطبین کو تبلیغ معصوم کے واسطے سے کی جائے۔ ہمارے اس قول کی دلیل وہ واضح نکات ہیں جو داستان کے متن میں موجود ہیں رسول اکرمؐ نے ابوبکر کو طلب کر کے آیات ان کے سپرد کر دیں اور فرمایا:

"سوار ہو جاؤ اور مکے جاؤ اور یہ آیات ان کے مخاطبین یعنی مشرکین کو سنا دو"۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو وحی نازل ہوئی ہے اس کے مخاطب مدینے کے

مسلمان نہیں ہیں تاکہ آنحضرتؐ خود انہیں پڑھ کر سنا دیں اور پہلے مرحلے پر تبلیغ ایک معصوم کے وسیلے سے انجام پا جائے۔ اگر روئے سخن اہلِ مدینہ کی طرف ہوتا تو بلاشبہ ابوبکر جو خود انہیں میں سے ایک تھے، دوسرے مرحلے پر تبلیغ کے عنوان سے یہ آیات ہر جگہ اور ہر کسی کو پڑھ کر سنا دیتے۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں صورت یہ نہیں تھی اور روئے سخن بالخصوص مشرکین کی طرف تھا اور یہ بتانا مقصود تھا کہ آئندہ اسلام کے ساتھ ان کے تعلقات کی کیا نوعیت ہو گی لہٰذا ان آیات کا مکے میں رسولِ اکرمؐ کے وسیلے کے علاوہ پڑھا جانا صحیح نہ تھا۔

ابوبکر سوار ہوتے ہیں اور مکے کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس دوران میں جبرئیل علیہ السلام نازل ہوتے ہیں اور رسولِ اکرمؐ کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ قطعی فرمان لاتے ہیں: ”لَا یُبَلِّغُ عَنْکَ اِلَّا اَنْتَ اَوْ رَجُلٌ مِّنْکَ“ یعنی ”خداوند تعالیٰ کا حکم ہے کہ ان آیات کی تبلیغ کی جائے اور وہ بھی پہلے مرحلے پر۔ آپ یہ کام یا تو خود انجام دیں یا کسی ایسے شخص کے سپرد کریں جو آپ سے ہو۔“ یہ ہے اصل واقعہ۔

اب ہم ان احادیث کی جانب رجوع کرتے ہیں جو اس واقعے سے مربوط ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ جن احادیث کو ہم زیرِ بحث لائیں گے وہ سب اہلِ سنت کی معتبر کتابوں سے لی گئی ہیں اور شیعہ مصادر سے استفادہ نہیں کیا گیا اور اصولاً اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ اہلِ سنت کی معتبر روایات اس واقعے کے تقریباً تمام پہلو واضح کر دیتی ہیں۔

یہ واقعہ ترمذی نے صحیح میں، نسائی نے خصائص میں، احمد حنبل نے مسند میں اور بہت سے دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے اور ہم اسے صحیح ترمذی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

انس بن مالک نے روایت کی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے آیاتِ برائت ابوبکر کو دے کر اہلِ مکہ کی جانب بھیجا لیکن وہ ابھی راستے ہی میں تھے کہ انہیں واپس بلا لیا اور فرمایا: ”لَا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ اَنْ یُّبَلِّغَ ھٰذَا اِلَّا رَجُلٌ مِّنْ اَھْلِیْ“[1] یہ مناسب نہیں کہ کوئی شخص جو میرے اہلبیتؑ میں

---

[1] ترمذی: الجامع الصحیح جلد ۵ صفحہ ۲۷۵۔ کتاب تفسیر القرآن حدیث ۳۰۹۰۔ المسند جلد ۳ صفحہ ۲۸۳ (قدیم ایڈیشن)۔ الخصائص صفحہ ۲۰ اور ۲۱ مطبوعہ مصر۔

سے نہ ہو ان آیات کو لوگوں کے سامنے پڑھے۔"

اہل بیتؑ کون ہیں ؟ یہ وہی لوگ ہیں جو اس آیت شریفہ میں شامل ہیں : "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا (سورۂ احزاب۔آیت ۳۳)

اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہر قسم کی نجاست سے دُور ہیں[1]۔ یہ وہ گروہ ہے جو پہلے مرحلے کی تبلیغ کی شرط یعنی اللہ کی جانب سے معصوم اور محفوظ ہونے کی شرط پوری کرتا ہے اور اب جبکہ رسولِ اکرمؐ کے لیے مکے جاکر ان آیات کے مخاطبین کے سامنے ان کی تبلیغ کرنا ممکن نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ یہ ذمے داری ایک ایسا شخص قبول کرے جو پہلے مرحلے کی تبلیغ کی مخصوص شرائط پوری کرتا ہو لہٰذا آنحضرتؐ نے حضرت امام علیؑ کو اپنے پاس بلایا اور یہ آیات ان کے سپرد کیں تاکہ وہ اس سلسلے میں تبلیغ کی ذمے داری پوری کریں۔

اس بارے میں خود امیرالمومنین علیہ السلام سے بھی کچھ روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت میں جو زید بن یثیع نے آپ سے نقل کی ہے یوں مذکور ہے :

رسولِ اکرمؐ نے ابوبکر کو آیاتِ برائت دیکر اہلِ مکہ کی جانب روانہ کیا۔ ابوبکر کے چلے جانے کے بعد آپ نے امام علیؑ کو ان کے پیچھے روانہ کیا اور فرمایا : "وہ دستاویز (جس میں آیاتِ قرآنی درج ہیں) ابوبکر سے لے لو اور اسے مکہ پہنچاؤ۔"

امام علیؑ ابوبکر کے پیچھے گئے اور دستاویز ان سے لے لی اور جو فرض آپ کو سونپا گیا تھا اس کی ادائیگی کے لیے مکہ روانہ ہو گئے۔ ابوبکر بھی پریشانی کے عالم میں مدینہ واپس آگئے۔ وہ بے چین تھے اور انہیں خوف تھا کہ مبادا ان کے بارے میں کوئی وحی نازل ہوئی ہو لہٰذا مدینہ پہنچنے پر وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا :

"کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے ؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا : "تمہارے بارے میں اس سلسلے میں کوئی چیز نازل نہیں ہوئی بجز اس کے کہ مجھے حکم ملا ہے کہ ان آیات کی تبلیغ یا تو خود کروں یا اپنے اہلبیتؑ میں سے کسی کو یہ فریضہ

---

[1] اس آیت کے اہلبیتؑ پر منطبق ہونے کے بارے میں اہل سنت کی روایات کے لیے دیکھیے صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۱۳۰۔ سنن بیہقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۲ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۰۷ اور المستدرک جلد ۳ صفحہ ۱۴۷۔

انجام دینے کے لیے روانہ کروں"۔[1]

ایک اور روایت میں امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا: "یارسول اللہؐ! میں مقرر اور خطیب نہیں ہوں"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں اور یہ ضروری ہے کہ یا تو ہم خود یہ آیات لیکر جائیں اور یا تم انھیں پہنچاؤ"

امام علیؑ نے جواب دیا: "اب جبکہ مجبوری ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں لہٰذا میں یہ آیات لے جاؤں گا"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "جاؤ۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہاری زبان کو سچائی اور حقیقت پر ثابت رکھے گا اور تمہارے دل کو ہدایت فرمائے گا"

حضورؐ نے یہ الفاظ کہہ کر اپنا دستِ مبارک امام علیؑ کے دہان پر رکھ دیا۔[2]

ایک اور روایت میں جو امام علیؑ سے نقل کی گئی ہے۔ آپ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ برائت کی دس آیات رسول اکرمؐ پر نازل ہوئیں۔ آنحضرتؐ نے ابوبکر کو اپنے پاس بلایا اور آیات ان کے سپرد کیں تاکہ وہ مکے جاکر متعلقہ لوگوں کے سامنے ان کی تلاوت کریں لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد آپ نے مجھے بلوا بھیجا اور فرمایا:

"ابوبکر کے پاس پہنچو اور جہاں کہیں ان سے ملاقات ہو وہ دستاویز ان سے واپس لیکر مکے جاؤ اور متعلقہ اشخاص کے سامنے پڑھو"

میں ابوبکر سے "جحفہ" میں جا ملا اور دستاویز اُن سے حاصل کر لی۔ ابوبکر بھی رسول اکرمؐ کے پاس لوٹ گئے اور آپ سے عرض کیا: "یارسول اللہؐ! کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "نہیں! لیکن جبرئیلؑ میرے پاس آئے اور کہا: لَنْ يُّؤَدِّيَ عَنْكَ

---

[1] الخصائص جلد ۲۔ مطبوعہ مصر۔ تفسیر الطبری جلد ۱۰ صفحہ ۴۶۔

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۵۰ قدیم ایڈیشن جلد ۲ صفحہ ۳۱۹ حدیث ۱۲۸۶ تحقیق احمد محمد شاکر۔ الدر المنثور جلد ۳ صفحہ ۲۱۰۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۳۳۳۔

اِلَّا اَنْتَ اَوْ رَجُلٌ مِّنْكَ "[1]

"(اے نبی ص!) آپ کے یا ایسے شخص کے سوا جو آپ سے ہو کوئی شخص رسالت کا فریضہ ادا نہیں کر سکتا۔"

ایک اور روایت سعد ابن وقاص سے نقل کی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اکرم ص نے ابوبکر کو آیات برائت دیکر مکہ بھیجا۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ آنحضرت ص نے حضرت علی ع کو ان کے پیچھے بھیجا (تاکہ آیات ان سے واپس لے لیں اور تبلیغ کا فریضہ خود جا کر ادا کریں) امام علی ع نے آیات ان سے لے لیں اور مکہ چلے گئے۔ ابوبکر بہت رنجیدہ خاطر اور ملول ہو کر رسولِ اکرم ص کے پاس واپس آئے اور آپ سے شکوہ کیا۔

آنحضرت ص نے فرمایا: "لَا يُؤَدِّيْ عَنِّيْ اِلَّا اَنَا اَوْ رَجُلٌ مِّنِّيْ "[2]

اس روایت کے مطابق آنحضرت ص تبلیغ کو اپنے یا اپنے جیسے کسی شخص تک محدود کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: "یہ ضروری ہے کہ تبلیغ کی یہ ذمے داری اور اس آسمانی رسالت کی ادائیگی یا تو میں خود انجام دوں یا ایک ایسا شخص انجام دے جو مجھ سے ہو۔"

ابن عباس رض کی روایت زیادہ مفصل ہے۔ وہ نقل کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم ص نے ابوبکر اور عمر دونوں کو مکہ بھیجا لیکن جس کاغذ میں آیات درج تھیں وہ ابوبکر کے سپرد کیا۔ یہ دونوں اشخاص روانہ ہو گئے اور کچھ راستہ طے کر لیا۔ چلتے چلتے انہوں نے ایک شخص کو جو اونٹ پر سوار تھا اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھا اور آواز دیکر پوچھا کہ کون ہے؟ شتر سوار نے جواب دیا۔ "میں علی ع ہوں۔ اے ابوبکر! کاغذ (وہ کاغذ جس میں سورہ برائت کی آیات درج ہیں) مجھے دیدو۔" ابوبکر نے پوچھا کیا کوئی واقعہ رونما ہو گیا ہے؟

امیر المومنین ع نے فرمایا: "نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ کوئی برا حادثہ تمہارے بارے میں

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۲۲ حدیث ۱۲۹۶ - مجمع الزوائد جلد ۷ صفحہ ۲۹ - تفسیر ابن کثیر جلد ۲ - صفحہ ۳۳۳ - الدر المنثور جلد ۳ صفحہ ۲۰۹ -

[2] الخصائص - نسائی صفحہ ۲۰ مطبوعہ مصر - الدر المنثور جلد ۳ صفحہ ۲۰۹ میں بھی سعد کی حدیث کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

وقوع پذیر نہیں ہوا۔"

پھر امیر المومنینؑ نے وہ کاغذ اُن سے لے لیا اور مشرکین کے سامنے اس کا اعلام کرنے کی خاطر مکہ روانہ ہو گئے۔ عمر اور ابوبکر مدینہ واپس چلے آئے اور آنحضرتؐ سے دریافت کیا: "ہمارے بارے میں کیا تازہ بات ہے اور کونسا حادثہ وقوع پذیر ہوا ہے؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "کوئی بات نہیں لیکن قِيلَ لِي: إِنَّهُ لَا يُبَلِّغُ عَنْكَ إِلَّا أَنْتَ أَوْ رَجُلٌ مِنْكَ"[1] "ہمیں کہا گیا ہے اور فرمان آیا ہے کہ بجز آپ کے یا ایسے شخص کے جو آپ سے ہو کوئی دوسرا رسالت الٰہی کی تبلیغ نہیں کر سکتا۔"

آخری روایت ہم خود ابوبکر سے نقل کرتے ہیں۔ زید بن یثیع ابوبکر سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے انہیں سورہ برائت اور یہ اعلامیہ دیکر مکہ بھیجا:

"لَا يَحُجُّ بَعْدَ هٰذَا الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا يَطُوفُ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا نَفْسٌ مُسْلِمَةٌ مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ مُدَّةٌ فَأَجَلُهُ إِلَىٰ مُدَّتِهِ وَاللّٰهُ بَرِيءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ."

"اس سال کے بعد مشرک حج نہیں کریں گے اور آئندہ کوئی شخص زمانہ جاہلیت کی طرح برہنہ ہو کر خانہ خدا کا طواف نہیں کر سکتا اور مسلمانوں کے علاوہ کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی پیمان رکھتا ہے تو اس پیمان کی مدت ختم ہونے تک وہ قائم اور برقرار رہے گا اور اللہ اور اس کا رسولؐ مشرکوں سے بیزار ہیں۔"

ابوبکر یہ اعلامیہ اور آیات قرآنی لے کر روانہ ہو گئے تاہم ان کی غیر موجودگی میں آنحضرتؐ نے امام علیؑ کو بلا کر حکم دیا: "اَلْحِقْهُ فَرُدَّ عَلَيَّ أَبَا بَكْرٍ وَبَلِّغْهَا أَنْتَ"۔

"مکے کی جانب جاؤ اور اپنے آپ کو ابوبکر تک پہنچاؤ اور اسے میرے پاس واپس بھیج دو اور آیاتِ قرآنی کی اور میرے فرمان کی تبلیغ تم کرو۔"

امام علیؑ نے فرمانِ رسولؐ کی پوری پوری تعمیل کی۔ ابوبکر بھی مدینے واپس آ گئے اور

---

[1] مستدرک الصحیحین جلد ۳ صفحہ ۵۱ مطبوعہ آفسٹ ریاض۔

جب آنحضرتؐ کے پاس پہنچے تو پرنم آنکھوں سے کہا: "یارسول اللہؐ! کیا میرے بارے میں کوئی حادثہ وقوع پذیر ہوا ہے؟"

حضورؐ نے فرمایا: "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں لیکن اُمِرْتُ اَنْ لَّا یُبَلِّغَهٗ اِلَّا اَنَا اَوْ رَجُلٌ مِّنِّیْ"[1]

"مجھے خدائے تعالیٰ کی جانب سے حکم دیا گیا ہے کہ اس کی تبلیغ خود میرے یا ایسے شخص کے سوا جو مجھ سے ہو اور کوئی نہ کرے۔"

مذکورہ بالا واقعات اور امیرالمومنینؑ کے بارے میں رسولِ اکرمؐ کے ارشادات کا ذکر دوسرے راویوں کی روایات میں بھی کیا گیا ہے لیکن ہم انہیں نقل کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ جن صاحبان کو زیادہ تفصیل کی خواہش ہو وہ حدیث اور تفسیر کی کتابوں سے رجوع کریں۔

اس واقعہ کا تعلق سورۂ برائت کی تبلیغ اور رسالت سے ہے اور رسولِ اکرمؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ یہ تبلیغ بجز آپ کے یا ایک ایسے شخص کے جو آپ کی مانند ہو اور کوئی انجام نہ دے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس وقت آنحضرتؐ کے تمام صحابہ اور رشتے داروں میں فقط امام علیؑ کی ذات ہی ایسی تھی جسے اس رتبے کا اہل گردانا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ "فقط امام علیؑ ہی کی ہستی ایسی ہے جو رسول اکرمؐ کی مانند ہے۔"

تاریخ اسلام میں ایک اور واقعہ بھی ہے جس سے اسی مفہوم اور حقیقت کا پتا چلتا ہے اور "رجل منی" کے جملے پہ زیادہ روشنی پڑتی ہے اور اس کے معانی کے بارے میں جن نامناسب امکانات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے ذریعے امامؑ کے بارے میں اس کلام کی گہرائی کی اہمیت اور قدر و قیمت گھٹا کر پیش کی گئی ہے، وہ کالعدم ہو جائیں۔

اپنے تمام ناخوشگوار اور مشکل حالات کے ساتھ یہ غزوہ احد تھا۔ "محمدؐ قتل ہو گئے" کی شیطانی آواز سن کر مسلمان ثابت قدم رہنے کی بجائے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ رسول اکرمؐ زخمی ہو چکے تھے اور تنہا رہ گئے تھے اور چند آدمیوں کے علاوہ کوئی مسلمان آپ کے پاس نہ تھا۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۵۶ حدیث ۴ تحقیق احمد محمد شاکر مطبوعہ مصر ۱۳۶۸ھ قدیم ایڈیشن جلد ۱ صفحہ ۳۔

کچھ مورخین کی تصریح کے مطابق یہ اشخاص امام علیؑ اور دو دیگر صحابی تھے[1] اس جنگ میں امام علیؑ نے مشرکین کی فوج کے کئی ایک پرچم برداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اب جبکہ مسلمان بھاگ چکے تھے اور آنحضرتؐ تنہا رہ گئے تھے آپ (امام علیؑ) ہر لحظہ کسی نہ کسی سمت جاتے اور جو مشرکین حضورؐ پر حملہ آور ہونا چاہتے انہیں مار بھگاتے تھے۔ جب بھی رسول اکرمؐ یہ جملہ دہراتے "اے علیؑ! انہیں دفع کرو" آپ شمشیر بکف ان پر حملہ کرتے اور انہیں مار بھگاتے اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر آنحضرتؐ کی حفاظت کرتے۔ جبرئیلؑ نے جو اس معرکے میں رسول اکرمؐ کے پاس تھے کہا: "یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اِنَّ ھٰذِہٖ لِلْمُوَاسَاۃِ"

یعنی "اے رسولِ خدا! علیؑ کی یہ سرفروشی اور جاں نثاری آپ کے لیے غمخواری ہے"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "اِنَّہٗ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْہُ"

"میری خاطر علیؑ کی یہ سرفروشی کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں"

اس پر جبرئیلؑ نے عرض کیا: "وَ اَنَا مِنْکُمَا"

یعنی "میں بھی آپ میں سے (یعنی آنحضرتؐ اور امیرالمومنینؑ سے) ہوں"[2]

اس تاریخی واقعہ میں تمام تر گفتگو "مِنِّیْ" اور "مِنْکُمَا"[3] کے الفاظ کے گرد گھومتی ہے۔

رسول اکرمؐ فرماتے ہیں: "علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں"

جبرئیلؑ کہتے ہیں: "میں بھی آپ صاحبان میں سے ہوں"

---

[1] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۳۵ مطبوعہ نجف۔

[2] طبری: تاریخ الرسل والملوک جلد ۲ صفحہ ۵۱۴ مطبوعہ دارالمعارف، ابن اثیر: الکامل جلد ۲ صفحہ ۱۰۷ مطبوعہ دارالکتاب، شرح النہج جلد ۱۰ صفحہ ۱۸۲۔ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم مصر ۱۳۸۶ھ تذکرۃ الخواص صفحہ ۳۸ مطبوعہ نجف، الاغانی جلد ۱۴ صفحہ ۱۷۔ مطبوعہ ساسی، تاریخ مدینۃ دمشق ترجمہ علی بن ابی طالب جلد ۱ صفحہ ۱۴۸۔ ۱۵۰ مطبوعہ بیروت۔

[3] اغانی کے نسخے میں "مِنْکُمَا" کی بجائے لفظ "مِنْکُمْ" استعمال ہوا ہے۔

آنحضرتؐ بھی ان کے الفاظ کی نفی نہیں کرتے۔ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں؟ ان تین افراد کا ایک دوسرے سے ہونا کن معنوں میں آتا ہے؟ لفظ "مِنْ" یہاں کن معانی کا حامل ہے؟

جبرئیل بشر نہیں تھے اور آنحضرتؐ کے چچا زاد بھائی یا قریبی رشتے دار متصور نہیں ہوتے تھے کہ "میں آپ میں سے ہوں" کی توجیہہ ان معانی میں کی جا سکتی۔ ان کا آنحضرتؐ سے تعلق صرف اتنا تھا کہ وہ اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کے سلسلے میں آنحضرتؐ سے تعاون کرتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے وحی حاصل کرتے تھے اور آنحضرتؐ کو پہنچا دیتے تھے اور آنحضرتؐ بھی بارگاہِ الٰہی سے احکامات ملنے پر کبھی خود اور کبھی امام علیؑ کے وسیلے سے مسلمانوں میں تبلیغ فرماتے تھے۔

لہٰذا "اِنَّهُ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْهُ" اور "اَنَا مِنْكُمَا" کا مفہوم یہ ہے کہ ہم "تبلیغ" کے مقام پر ایک دوسرے سے مشابہ اور یکساں ہیں اور یہ مشابہت اس حد تک ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں ایک وجود کے تین حصے ہیں۔ رسول اکرمؐ کے وہ الفاظ جن سے یہ پتا چلتا ہے کہ امام علیؑ تبلیغ کے عظیم کام میں ان سے ایسی قرابت اور مشابہت رکھتے ہیں اور اتنا تعاون کرتے ہیں کہ یہ کہا جا سکے کہ گویا وہ آنحضرتؐ کے وجود کا ایک حصہ ہیں۔ یہ بات محض سورۂ برائت کی تبلیغ کے تاریخی واقعے تک ہی محدود نہیں ہے مثلاً حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرتؐ نے اپنے چند اہم ترین پیغامات اور وصیتیں لوگوں تک پہنچائیں۔ اس وقت اس حقیقت کی یاد دہانی بھی کرائی اور رسالت کے اصلی عمل یعنی تبلیغ کے سلسلے میں امام علیؑ کی بے نظیر قرابت اور نزدیکی اور اس میں شرکت اور ہمکاری کا مفصل ذکر فرمایا۔

صحابی حبشی بن جنادہ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرمؐ نے فرمایا: "عَلِيٌّ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْ عَلِيٍّ وَلَا يُؤَدِّيْ عَنِّيْ اِلَّا اَنَا اَوْ عَلِيٌّ"[1]

یعنی "علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں اور خود میرے اپنے یا علیؑ کے سوا کوئی میری جانب سے رسالت کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا"

ایک اور مشہور روایت میں یوں مذکور ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے امیرالمومنینؑ کو یمن بھیجا اور

---

[1] صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۳۶ حدیث ۳۷۱۹۔ سنن ابن ماجہ جلد ا صفحہ ۴۴ حدیث ۱۱۹۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۶۴۔ تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۶۹۔

فوج کی کمان ان کے سپرد کی۔ آپ سے پہلے خالد اسی مقصد سے روانہ ہو چکے تھے۔ فوجوں کو روانہ کرتے وقت آنحضرتؐ نے پہلی فوج کو خالد کی اور دوسری کو امام علیؑ کی ماتحتی میں دیتے ہوئے فرمایا: "اگر دونوں فوجیں آپس میں مل جائیں اور اکٹھی منزلِ مقصود پر پہنچیں تو دونوں کے کمانڈر علیؑ ہوں گے۔"[۱]

امام علیؑ اس جنگ میں تشریف لے گئے اور فتح یاب ہو کر واپس لوٹے۔ مدینہ واپس پہنچ کر بعض سپاہیوں نے خالد کے اکسانے پر آنحضرتؐ سے امام علیؑ کی شکایت کی۔ ان لوگوں کی اس حرکت پر رسولِ اکرمؐ کو بیحد غصہ آیا اور آپ نے فرمایا:

"تم علیؑ سے کیا چاہتے ہو؟ تم علیؑ سے کیا چاہتے ہو؟ تم علیؑ سے کیا چاہتے ہو؟ علیؑ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں، اور میرے بعد وہ ہر مومن کا ولی، سرپرست اور صاحبِ اختیار ہے۔"[۲]

ایک اور داستان میں کہ جس میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا تذکرہ بھی موجود ہے، اسی موضوع پر بات کی گئی ہے۔ یہ روایت "الریاض النضرۃ" نامی کتاب میں ہے۔

رسولِ اکرمؐ امام علیؑ سے فرماتے ہیں:

"تمہیں تین ایسی نعمتیں دی گئی ہیں جو کسی دوسرے شخص کو حتیٰ کہ مجھے بھی نہیں دی گئیں۔ تمہیں میری دامادی کا رتبہ حاصل ہے اور مجھے یہ فضیلت حاصل نہیں۔ تم میری بیٹی "صدیقہ" جیسی بیوی رکھتے ہو اور میری اس جیسی کوئی بیوی نہیں۔ علاوہ ازیں تمہیں حسنؑ اور حسینؑ جیسے دو فرزند دیے گئے اور میرے صلب سے ایسے فرزند وجود میں نہیں آتے۔ تاہم تم مجھ سے جدا نہیں ہو۔ تم اور حسنؑ اور حسینؑ مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔"[۳]

---

[۱] ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۶۴۱۔ طبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۶۹ عیون الاثر جلد ۲ صفحہ ۲۷۱ مطبوعہ بیروت ۱۹۷۴ء۔ البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۳۴۴۔

[۲] صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۳۲ حدیث ۳۷۱۲۔ المستدرک جلد ۳ صفحہ ۱۱۱-۱۱۰۔ البدایہ والنہایہ جلد ۷ صفحہ ۳۴۵۔ اسد الغابہ جلد ۴ صفحہ ۱۰۸-۱۰۷ مطبوعہ دار الشعب مصر۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۵۶

[۳] الریاض النضرۃ جلد ۲ صفحہ ۲۶۸۔ دوسرا ایڈیشن ۱۳۷۲ھ دار التالیف قاہرہ۔

ائمہ اہلبیتؑ کے بارے میں یہ بات مختلف صورتوں میں کہی گئی ہے اور موجود ہے۔
صحابیٔ رسولؐ مقدام بن معدی کرب کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے حضرت حسنؑ کو انکی صغر سنی کے عالم میں گود میں اٹھایا اور فرمایا: "هٰذَا مِنِّیْ "[1] یہ مجھ سے ہے اور حضرت حسینؑ کے بارے میں بھی فرمایا: "حُسَیْنٌ مِّنِّیْ وَاَنَا مِنْ حُسَیْنٍ "[2] یعنی "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔

اہلبیتؑ کے آخری فرد یعنی اس خاندان کے آخری امام، حضرت حجت بن الحسن امام مہدیؑ کے بارے میں بھی آپ نے فرمایا: "اَلْمَهْدِیُّ مِنِّیْ"[3] یعنی "مہدی مجھ سے ہے" یا "اَلْمَهْدِیُّ مِنَّا اَهْلِ الْبَیْتِ "[4] یعنی مہدیؑ ہمارے اہلبیتؑ میں سے ہے۔

ان تمام باتوں سے پتا چلتا ہے کہ تبلیغ کرنا اس پورے کے پورے گروہ کی ذمہ داری ہے۔ آنحضرتؐ اللہ تعالیٰ کے پیغامات لوگوں تک پہنچانے کے ذمے دار ہیں۔ ائمہ اہلبیتؑ کی ذمے داری بھی یہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ امام علیؑ اور دوسرے ائمہؑ خدا کے پیغامات رسولِ اکرمؐ سے حاصل کرتے ہیں اور آنحضرتؐ یہ پیغامات خود خدا سے حاصل کرتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہمارے ائمہؑ اپنے آخری فرد یعنی حضرت حجت بن الحسنؑ تک جو سب کے سب اہلبیت رسولؐ ہیں بطور ایک بنیادی وظیفے کے تبلیغ کے ذمے دار ہیں۔ یہ ایک ایسا وظیفہ ہے جو ملتوی نہیں کیا جا سکتا اور یہ بزرگوار اس کی ادائیگی کے لیے اپنی جان تک کی بھی رتی بھر پروا نہیں کرتے اور اپنا تن من دھن غرضیکہ سبھی کچھ نثار کر دیتے ہیں۔ البتہ ائمہ اہلبیتؑ کے دوسرے کاموں کی حیثیت ان کی شانوں میں سے ایک شان کی ہوتی ہے مثلاً جماعت کا قیام ان کی شانوں میں سے ہے۔ اسلامی معاشرے اور حکومتِ عادلہ کے قیام کی بھی یہی کیفیت ہے اور وہ ان معنوں میں کہ اگر لوگ ان کا ساتھ نہ دیں اور ان کی مدد نہ کریں تو ممکن ہے کہ حکومت عادلہ

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۳۲ قدیم ایڈیشن۔ نیز کنز العمال سے بھی رجوع کریں۔
[2] صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۵۹-۶۵۸ حدیث ۳۷۷۵۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۵۱ حدیث ۱۴۴ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۷۲۔
[3] سنن ابی داؤد جلد ۴ صفحہ ۱۰۷ حدیث ۴۲۸۵۔ [4] مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۸۴۔

قائم نہ ہو سکے یا اسلامی احکام نافذ نہ ہو سکیں تاہم دوسروں کے مدد کرنے یا نہ کرنے کی بنا پر تبلیغ کا کام معطل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وظیفہ مشروط نہیں بلکہ مطلق ہے لیکن دوسری شانیں جن میں سے ہر ایک واجب وظیفہ ہے مشروط ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان بزرگواروں نے اپنا یہ اصلی وظیفہ کیونکر انجام دیا اور کس چیز کی تبلیغ کی اور کس شکل میں کی۔ یہ ایسے موضوعات اور سوالات ہیں جن پہ آئندہ مباحث میں روشنی ڈالی جائے گی۔ ائمہ طاہرینؑ شریعت کے حامل اور دینِ اسلام کے محافظ اور نگہبان تھے۔ انہوں نے صحیح اسلام کی حفاظت اور تبلیغ کا وظیفہ بہترین طور پہ انجام دیا۔ ہم اس موضوع کا مطالعہ اگلے صفحات میں کریں گے۔

جیسا کہ سابقہ امتوں میں شریعتیں نابود ہوتی رہیں اسی طرح حضرت ختمی مرتبتؐ کی شریعت بھی ختم ہو گئی اور جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ اسلام کی شکل ایک ایسے چغے کی ہو گئی جسے الٹا دیا گیا ہو۔[1]

طولِ تاریخ میں طاقتور لوگوں کی یہی کوشش رہی ہے کہ چند کرائے کے عالم نما اشخاص کی مدد سے اللہ کے دین میں تحریف کی جائے۔ اس امت میں بھی اسلام کا یہی حشر ہوا حتیٰ کہ نام کے علاوہ اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ یہ ائمہ اہل بیتؑ کی ان تھک کوششوں اور قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ حضرت خاتم النبیینؐ کا دین ایک دفعہ پھر زندہ ہو گیا اور معاشرے کو دستیاب ہو گیا اور زمان و مکان کے طول و عرض میں نافذ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کو اسلام کی حفاظت اور نگہبانی کے لیے مقرر فرمایا تھا۔

انہوں نے پہلے مرحلے میں اسلام کے تمام احکام، معارف اور حقائق پر عبور حاصل کیا اور دوسرے مرحلے میں تبلیغ کرنے، تحریفات اور ردّ و بدل کو کالعدم کرنے پر مامور ہوئے۔ ہم اس بات کو دہراتے ہیں کہ انبیائے کرامؑ کے وظیفے کی طرح ائمہ اہلبیتؑ کا خاص وظیفہ بھی فقط ایک لفظ تک محدود ہے اور وہ ہے "تبلیغ"۔

---

[1] لُبِسَ الإِسْلَامُ لُبْسَ الْفَرْوِ مَقْلُوْبًا نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۸، صبحی صالح صفحہ ۱۵۸ نیز أَيُّهَا النَّاسُ سَيَأْتِي عَلَيْكُمْ زَمَانٌ يُكْفَأُ فِيْهِ الإِسْلَامُ كَمَا يُكْفَأُ الإِنَاءُ بِمَا فِيْهِ نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۳ صفحہ ۱۵۰۔

اس اُمّت میں جن چیزوں کی انسان کو ضرورت تھی اور وہ ضرورت آنحضرتؐ کے زمانے میں پیش آئی ان کے بارے میں احکام کی تبلیغ خود آپ کے ذریعے ہوئی اور جن احکام پر عمل کا وقت ابھی نہیں آیا تھا وہ امام علیؑ کے سپرد کیے گئے تاکہ وہ خود اور ان کے گیارہ بیٹے ان احکام کی حفاظت کریں اور تمام زمانوں میں نظریاتِ اسلام کا پرچار کریں۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ

تیسرا درس

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُل لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ.

"سچا دین تو خدا کے نزدیک یقیناً اسلام ہی ہے اور اہلِ کتاب نے اس دینِ حق سے جو اختلاف کیا تو محض آپس کی شرارت اور اصلی امر معلوم ہو جانے کے بعد کیا ہے اور جس نے خدا کی نشانیوں سے انکار کیا تو وہ سمجھ لے کہ یقیناً خدا اس سے بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ (اے رسولؐ!) اگر یہ لوگ تم سے خواہ مخواہ حجت کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں نے خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے اور نیز یہ کہ انہوں نے بھی جو میرے تابع ہیں۔ تم اہلِ کتاب اور جاہلوں سے پوچھو کہ کیا تم بھی اسلام لائے ہو؟ پس اگر وہ اسلام لائے ہیں تو راہِ راست پر آگئے ہیں اور اگر وہ منہ پھیریں تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینا فرض ہے اور خدا اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔" (سورہ آل عمران۔ آیات ۱۹-۲۰)۔

ہم نے اپنے تمہیدی مباحث کی بنیاد اِلٰہ ، عَبد ، رَبّ اور اِسلام جیسی اہم اسلامی اصطلاحوں کے مطالعے پر رکھی تھی۔ پہلی تین اصطلاحوں کے بارے میں تحقیق کے بعد ہم اصطلاح "اسلام" کے متعلق بحث تک پہنچے اور اس کے مطالعے کے سلسلے میں رسولِ اکرمؐ کی مشہور حدیث پیش کی۔

گزشتہ باب میں رسولِ اکرمؐ کی جو حدیث بطور شہادت پیش کی گئی تھی اس میں کہا گیا ہے کہ "ایک وقت ایسا آئے گا جب قرآن سے اس کی رسم یعنی تحریر کے علاوہ اور اسلام

سے اس کے نام کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔ لوگ اس نام سے منسوب تو ہوں گے لیکن وہ اسلام سے بہت دور ہوں گے۔"

ہماری گفتگو حدیث کے اس حصے کے بارے میں تھی کہ "اسلام سے اس کے نام کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ بچے گا" اور ہم یہ جاننا چاہتے تھے کہ رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں اسلام کی صورت کیسی تھی اور بعد میں کیسی ہو گئی؟

اب تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ خلّاقِ عالم کے لیے اپنی ربوبیت کی بنیاد پر لازم ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی تربیت کرے، اسے نشوونما دے اور کمال کی سرحد تک پہنچا دے۔ حقیقی ربوبیت کے لیے ضروری ہے کہ مربوب کی احتیاجات کو مکمل طور پر سمجھا جائے اور جس قدر لازم ہو اور افراط و تفریط کی حدود سے باہر ہو، اس حد تک یہ احتیاجات پوری کی جائیں۔ ساری مخلوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ناقابلِ تغیر قوانین اور عالمِ بشریت کے لیے اس کے وضع کردہ قواعد و ضوابط اس کی ربوبیت کے سرچشمے ہی سے برآمد ہوئے ہیں اور آفرینش کی تمام تر وسعتوں میں تخلیقی اور تشریعی کمال کی جانب ایک راستہ ہیں۔

ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ انبیائے کرامؑ کی اپنے اپنے عہد کے طاغوتوں اور قوموں سے کشمکش بالعموم اللہ کی ربوبیت قبول کرنے کے مسئلے پر رہی ہے اور انبیائے کرامؑ بھی کوشش کرتے تھے کہ انسان اللہ کے تمام کائنات کے لیے مقرر کردہ نظام کا پابند ہو جائے اور اپنی زندگی اس کے نظام کے مطابق ڈھال لے۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ تمہارا رب اور تمہاری زندگی کو نظام بخشنے والا وہی آسمانوں، زمین، سورج، چاند اور ستاروں کا رب اور ان کو نظام بخشنے والا ہے جس نے انہیں بتدریج ترقی دی اور یہ موجودات کسی صورت میں بھی اللہ کے مقرر کردہ نظام سے انحراف نہیں کرتے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ انسانی زندگی میں نظامِ خداوندی کا نام "اسلام" ہے اور یہ حضرت خاتم الانبیاءؐ کی شریعت کا مخصوص نام نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ "اللہ کے نزدیک دین تو بس اسلام ہے لیکن اہلِ کتاب نے حقیقت جان لینے کے بعد اس دین سے اختلاف کیا اور ہر ایک نے ایک جداگانہ سمت (یہودیت و مسیحیت) اختیار کر لی اور ایسا محض ان کی طرف سے ظلم اور زیادتی کرنے کے باعث ہوا۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۹)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:

"اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستا مقرر کیا جس پہ چلنے کا نوحؑ کو حکم دیا تھا اور اسی کی ہم نے تمہارے پاس وحی بھیجی ہے اور اسی کا حکم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھی دیا تھا۔" (سورہ شوریٰ۔ آیت ۱۳)۔

یہ اسلام معاشرے میں چار مرحلوں میں ظاہر ہوا ہے اور اس کے چار وجود ہیں:

۱۔ لفظی وجود

ہم نے یہ دیکھا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ اسلام کے ظہور اور وجود میں سے اس کے نام کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

۲۔ مفہومی وجود

اس سے مراد شرعی کلمات اور اصطلاحات کے وہ معنی اور مفاہیم ہیں جو رسولِ اکرمؐ نے بیان فرمائے ہیں۔ آنحضرتؐ نے کئی ایسے الفاظ استعمال کیے جنہیں عموماً لوگ پہلے سے جانتے تھے لیکن آپ نے ان الفاظ کو نئے معنی دیے جو بلا شبہ ان کے لغوی مفہوم سے غیر مربوط نہیں تھے[1]۔

ابھی تک عمل کا مرحلہ نہیں آیا تھا اور آنحضرتؐ کی کوشش تھی کہ جہاں تک ممکن ہو یہ الفاظ اپنے نئے مفاہیم کے ساتھ لوگوں میں مشتہر ہو جائیں اور ان کی تبلیغ ہو جائے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انبیائے کرامؑ کی محنت کا پہلا اور اصلی ماحصل بھی تبلیغ اور رسالت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں۔

۳۔ فعلی وجود

اب رسولِ اکرمؐ کوشش فرماتے ہیں کہ یہ اسلامی مفہوم فعلیت کے مرحلے پہ پہنچ جائے

---

[1] عربی لغت اور زبان میں صلوٰۃ کے معنی دعا کرنے، صوم کے معنی پرہیز کرنے، حج کے معنی قصد کرنے اور زکات کے معنی پاک کرنے کے ہیں۔

اور عملی اور فعلی وجود پیدا کرے۔ جب ایک مسلمان نے وضو کر لیا، نماز پڑھ لی، زکات دیدی، جہاد کر لیا اور لوگوں کو نیکی کا حکم دیدیا (یعنی امر بالمعروف پر عمل پیرا ہوا) تو اسلام عملی طور پہ وجود میں آگیا۔

دوسرے مرحلے تک یعنی اسلام کے لفظی اور مفہومی وجود کو آنحضرتؐ کے زمانے میں مسلمان اور غیر مسلمان سب ہی سمجھتے تھے۔ مخالف صف میں ابو لہب، ابو جہل اور ابوسفیان اور موافق صف میں عمارؓ، ابوذرؓ اور خبابؓ "صلوٰۃ" اور "زکات" کا نام سنتے تھے اور انکے معنی سمجھتے تھے۔ یہ لوگ اسلام کی اصولی اصطلاحات مثلاً "رَبّ" اور "اِلٰہ" کے الفاظ ان کے درست معنوں کے ساتھ پہچانتے تھے[1] پس آنحضرتؐ کے زمانے میں ان تمام اصطلاحات کے معنی سے مسلمان اور غیر مسلمان یکساں طور پہ واقف تھے اور مسلمان کا غیر مسلمان سے جدا ہونے کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔ رسول اکرمؐ تبلیغ کے بعد محنت اور کوشش کرتے ہیں تاکہ یہ اسلامی اصطلاحیں اور مفاہیم فعلی اور عملی وجود حاصل کر لیں اور یہی وہ مرحلہ ہے جس پر اسلامی شخصیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات ممکن نہیں کہ اسلام کا فعلی وجود یعنی اسلامی شخصیت تو قائم ہو جائے اور اس کا اسمی وجود اور مفہومی وجود مفقود ہوں، لہٰذا کسی ایسے مسلمان کا موجود ہونا ممکن نہیں جو اسلام کو نہ پہچانتا ہو۔ جب تک رسولِ اکرمؐ اسلامی اصطلاحات لوگوں کو نہ بتائیں، ان کے مفہوم کی تبلیغ نہ کریں اور ان اصطلاحات کے الفاظ اور معنی موجود نہ ہوں تیسرے مرحلے یعنی اسلامی شخصیت کا وجود میں آنا محال ہے۔

---

[1] جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ رسول اکرمؐ کی دعوت کے جواب میں آپ پر پتھر برساتے تھے، آپ کو برا بھلا کہتے تھے اور مختلف طریقوں سے آزار پہنچاتے تھے تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ آنحضرتؐ کے ارشادات اور ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھتے تھے اور اپنے مادی منافع اور بیہودہ عقائد پہ ان کے اثرات سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے خلاف ان کا رویہ اتنا سخت تھا (انساب الاشراف جلد ۱ صفحہ ۲۰، ۲۱۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۱۹۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۷-۱۸، الاکتفا جلد ۱ صفحہ ۲۷۹-۲۸۵۔ تاریخ اسلام جلد ۲ صفحہ ۸۶-۸۷ نیز ۱۰۱-۱۰۲) اور اگر وہ ان پر مفہوم لفظوں کو اس طرح دیکھتے اور سمجھتے جیسے کہ یہ ہم میں سے بیشتر لوگوں کے لیے مہمل اور بے معنی ہیں تو انہیں تسلیم کر لینے میں ان کو تامل نہ ہوتا۔

اسلامی معاشرہ

جب تیسرا وجود مکے یا مدینے میں تیار ہو گیا تو رسولِ اکرمؐ چوتھے وجود کی بنیاد رکھنا شروع کرتے ہیں جس کا نام اسلامی معاشرہ ہے۔ اسلامی معاشرے کی بنیاد اس وقت رکھی جا رہی تھی جب اسلامی شخصیتوں نے رسول اکرمؐ سے اس بات کا عہد کیا کہ وہ سو فیصد اسلامی معاشرہ قائم کریں گی۔ سابقہ پیغمبروں نے بھی جو سب کے سب اسلام کی تبلیغ پر مامور تھے اسی آرزو اور امّید پر اپنی کوششیں مرکوز کر دی تھیں اور ان میں سے چند ایک مثلاً موسیٰؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ اس امر میں کامیاب ہو گئے کہ اسلام کے چوتھے وجود کی بنیاد رکھ کر اس کی تکمیل کریں۔ حضرت محمدؐ کے زمانے میں بھی اسلام کے ان چاروں وجودوں کی تعمیر ہوئی اور انھیں ظاہر ہونے کا موقع ملا۔

اسلامی زندگی کی تمام تر تاریخ میں ایک قطعی سنت موجود رہی ہے۔ یہ سنت جسے ایک آفاقی قانون سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے مختصراً ان جملوں میں بیان ہو سکتی ہے۔

ہر سچی بات اور ہر صحیح راہ و رسم جو ہوا و ہوس سے برسرِ پیکار ہو اور معدودے چند لوگوں کے انسانی اور قدرتی وسائل اور ذرائع سے غیر معقول فائدہ اٹھانے میں مانع ہو اپنے لیے طاقتور دشمنوں کا ایک گروہ وجود میں لے آتی ہے جو ہر ممکن طریقے سے اسکی مزاحمت کرتا ہے لیکن چونکہ خدا کا دین اور بالخصوص حضرت خاتم النبیینؐ کا آیئن غیبی تائید سے بہرہ مند رہا ہے[1] اور پہلے

---

[1] یقیناً خدا نے جنگِ بدر میں تمہاری مدد کی اور تم فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے باوجودیکہ تم دشمن کے مقابلے میں بالکل بے حقیقت تھے۔ پس تم تقویٰ الٰہی اختیار کرو اور دشمن کے مقابلے میں پیغمبرؐ کے حکم کی مخالفت نہ کرو تاکہ تم اس کی نعمتوں کے شکر گزار بن سکو۔ (اے رسولؐ!) اس وقت تم مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتے آسمان سے بھیج کر تمہاری مدد کرے۔ ہاں! آج بھی اگر تم ثابت قدم رہو اور تقویٰ کو اپنا شیوہ قرار دو تو اگر کفار اپنے زعم میں تم پر چڑھ بھی آئیں تو تمہارا پروردگار ایسے پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جو نشانِ جنگ لگائے ہوئے ڈٹے ہوں گے۔

(سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۱۲۳ - ۱۲۵)۔

مرحلے میں اس کی کامیابی کی ضمانت خدا نے دی ہے[1] لہٰذا طاقتور اور مکّار دشمن اس بات پر مجبور ہوگئے کہ نفاق کی چادر اوڑھ لیں لیکن پیغمبروں کی وفات اور غیبی مدد کے منقطع ہوجانے کے بعد ان لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا اور انھوں نے اپنے دل میں جو کینہ چھپا رکھا تھا اسے ظاہر کردیا۔

اسی بنیادی سبب سے اس گروہ کے ہاتھوں سچی شریعت اور خدا کے دین میں تحریف کی گئی اور اسے الٹ پلٹ دیا گیا۔ ان دانا دشمنوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے جہاں تک ممکن ہوسکا آسمانی اور دینی حقائق میں پھیر بدل کیا لیکن دین کا خول برقرار رکھا اور اس کے نام کی آڑ میں اللہ کے بندوں کا استحصال کرتے رہے اور اپنی آراء اور نظریات ان پر ٹھونستے رہے۔

ان تمام مقدمات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی شاید یہ چیز آپ کے لیے تعجب انگیز ہو کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ جو نماز، روزہ، زکات وغیرہ اور جو خیالات اور اعتقادات رسولِ اکرمؐ نے لوگوں تک پہنچائے تھے مسلمانوں کے بڑے بڑے گروہوں میں ان کا وجود باقی نہیں ہے۔ بلاشبہ ان چیزوں کے نام موجود ہیں لیکن جو چیز کالعدم ہوچکی ہے وہ ان کے صحیح معانی اور مفاہیم ہیں مثلاً تین مرتبہ طلاق دینے کا حکم جو اسلام کے صحیح احکام میں سے ہے مشروط ہے اور اگر اس کی شرط موجود نہ ہو تو وہ کالعدم اور نابود ہو جائے گا اور جو کچھ باقی رہے گا وہ نام کا اسلامی حکم ہوگا۔

زمانۂ قدیم میں انبیائے سلف کے ادوار میں بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کلی طور پر نابود ہوتا رہا ہے۔ جو اسلام حضرت موسیٰ بن عمرانؑ لائے اور جس کی انھوں نے تبلیغ کی وہ مکمل طور پر نابود اور برباد ہوگیا لہٰذا ایک اور صاحبِ شریعت پیغمبر یعنی حضرت عیسیٰؑ کو بھیجا گیا تاکہ وہ ایک مرتبہ پھر اسلام کا احیاء کریں۔ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ نے جس دین کی تبلیغ کی ان کی وفات کے بعد لوگوں نے اسے بھی رفتہ رفتہ بھلا دیا لہٰذا ایک اور نبی کی بعثت ضروری ہوگئی۔

کیا یہ درست نہیں کہ جو دین اللہ تعالیٰ نے تمام انبیائے عظامؑ پر نازل فرمایا وہ اسلام تھا اور کیا یہ بھی درست نہیں کہ گزشتہ زمانوں میں تحریف کرنے والوں نے اس نام تک کو بھی

---

[1] ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں ضرور مدد کریں گے اور جس دن گواہ گواہی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ (سورۂ مومن۔ آیت ۵۱)۔

نہیں چھوڑا اور اس میں بھی تحریف کر دی ؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی شریعت کا نام اسلام تھا جو یہودیت میں تبدیل ہو گیا اور نتیجے کے طور پر اس کا اسمی وجود باقی نہ رہا ؟ کیا یہ درست نہیں کہ جو شریعت حضرت عیسیٰؑ پر نازل کی گئی تھی اس کا نام بھی اسلام تھا لیکن اس میں اس قدر ردّ و بدل ہوا کہ اس کا نام بھی تبدیل ہو کر نصرانیت اور مسیحیت پڑ گیا ؟ ہمارے نزدیک ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے۔

مسیحی اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ بن مریمؑ سے نسبت دیتے ہیں لیکن کیا آپ یہ اعمال اور عقائد لائے ہیں (جن پر مسیحی عمل پیرا ہیں)۔ کیا انھوں نے شراب خوری کو ایک مذہبی فریضہ قرار دیا ہے[1]؟ کیا انھوں نے ختنہ نہ کرنے کا حکم دیا ہے[2]؟ کیا انھوں نے خدا کو تین اقنوم یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس کی شکل میں لوگوں سے متعارف کرایا ہے[3]؟ یقیناً ایسا نہیں ہوا۔

---

[1] روٹی اور شراب کی تقدیس جسے عشائے ربانی کہا جاتا ہے، بنی اسرائیل کی مصر سے نجات یعنی "عید فصح" کی یادگار کے طور پر انجام پاتی ہے۔ یہ رسم مسیحیوں کی اہم ترین مذہبی رسوم میں سے ہے۔ مسیحیوں کے عقیدے کے مطابق پادری ان رسوم کی ادائیگی کے دوران معجزہ دکھاتا ہے اور روٹی اور شراب کو حضرت عیسیٰؑ کے گوشت اور خون میں تبدیل کر دیتا ہے۔ (متی کی انجیل۔ باب ۲۶ بند ۲۶ تا ۲۸ اور لوقا کی انجیل۔ باب ۲۲ بند ۱۹ اور ۲۰)۔

[2] ختنہ کرنے کا حکم تورات کے مسلمہ احکام میں سے ہے: "تم میں سے ہر مذکر کا ختنہ کیا جائے گا" تکوین ۱۷/۱۱ اور "اگر ایک حاملہ عورت ایک لڑکے کو جنم دے ... تو آٹھویں دن اس کے غلفہ کے گوشت کا ختنہ کیا جائے گا" لویان ۱۲/۳ اور ۴۔ تاہم مسیحیت میں پولس رسول وغیرہ کے فیصلے کے مطابق یہ حکم منسوخ کر دیا گیا یا دوسرے الفاظ میں دین میں تحریف کی گئی۔ (گلتیوں کے نام پولس رسول کا خط ۲/۷ تا ۱۰۔ رسولوں کے اعمال۔ باب ۱۵)۔

[3] ۳۲۵ء کے موسم گرما میں مشرقی ممالک کے تقریباً تین سو اسقف قسطنطنیہ کے نزدیک ساحل باسفورس پر واقع شہر نیقیا (NIGAE) میں جمع ہوئے۔ کافی بحث مباحثے کے بعد انھوں نے مسیحیت کے لیے ایک رسمی اعتقاد نامے کی منظوری دی جس پر مسیحی اعتقادات کی بنیاد رکھی گئی اسکی عبارت یوں ہے:
"ہم خدائے واحد باپ" پر یقین رکھتے ہیں جو قادر مطلق ہے اور مرئی اور غیر مرئی (جاری ہے)

عیسوی شریعت کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اس کا نام مٹ چکا ہے، اس کا مفہوم نابود ہو چکا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کی تربیت کردہ شخصیتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اس اسلامی معاشرے کا نشان تک باقی نہیں رہا جس کی بنیاد ممکن ہے آپ نے رکھی ہو یا بہرصورت دوسرے انبیاءؑ نے رکھی تھی لہٰذا "جو اسلام انبیائے سلف لائے تھے اس کا نام باقی نہیں رہا" لیکن جہاں تک خاتم النبیینؑ کی شریعت کا تعلق ہے، آپ نے خود فرمایا تھا کہ:

"ایک زمانہ آئے گا جب اسلام کا صرف نام رہ جائے گا اور اس کے علاوہ اس کا کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔"

بلاشبہ آنحضرتؐ کی پیشین گوئی کے مطابق ایسا وقت آیا اور بہت جلد آیا۔ چند سالوں میں ہی تمام اسلامی مفاہیم الٹ پلٹ ہو گئے اور اسلام کا صرف نام باقی رہ گیا۔

حضرت خاتم الانبیاءؐ کی شریعت میں تحریف آپ کی وفات کے وقت سے ہی شروع ہو گئی۔ تحریف کے انتہائی عروج کا زمانہ معاویہ کا طویل دورِ حکومت تھا۔ وہ اور اس کے کرائے کے آدمی جن میں سے بعض رسولِ اکرمؐ کے صحابی بھی کہلاتے تھے بڑی مستعدی سے اصلی اسلام کے تمام پہلوؤں کو زیر و زبر کرنے میں لگ گئے۔ اسی زمانے میں اس رسمی اسلام کی بنیاد پڑی جس پر آجکل دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت اعتقاد رکھتی ہے۔

چیز کا خالق ہے اور ہم خدا کے بیٹے عیسیٰ مسیح خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہیں جو باپ سے خارج ہوا، جو باپ کا یگانہ فرزند اور مولود ہے اور باپ کی ذات سے ہے۔ خدا سے خدا۔ نور سے نور۔ خدائے حقیقی سے خدائے حقیقی۔ جو مولود ہے نہ کہ مخلوق۔ جو باپ کے ساتھ ایک ذات ہے۔ جس کے وسیلے سے ہر چیز نے وجود پایا جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ ہم آدمیوں کی خاطر اور ہماری نجات کے لیے اس نے نزول کیا اور مجسم ہوا اور انسان بنا اور دکھ اٹھاتے اور تیسرے دن جی اٹھا اور آسمان کی طرف بلند ہوا اور پھر آئیگا تاکہ زندوں اور مردوں کے درمیان انصاف کرے۔ ہم روح القدس پر ایمان رکھتے ہیں..."

و۔ م۔ میلر: قدیم کلیسا کی تاریخ صفحہ ۲۴۴۔ ترجمہ علی تختین۔ مطبوعہ ۱۹۳۱ء۔ نیز دیکھیے تاریخ تمدن۔ مؤلفہ ول دوراں جلد ۹ صفحہ ۳۴۵۔ ترجمہ علی اصغر سروش۔ تاریخ جامع ادیان۔ مؤلفہ جان ناس صفحہ ۴۲۵۔ ترجمہ علی اصغر حکمت مطبوعہ ۱۳۴۴ھ۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ائمۂ اہلبیتؑ کے کندھوں پر اس تحریف شدہ اسلام کے مقابلے کے لیے کتنی کٹھن ذمہ داری اور دلوں پر کتنی بڑی مصیبت آپڑی اور انھیں اپنے کندھوں پر رنج والم کا کتنا عظیم بار اٹھانا پڑا جبکہ وہ ایک طرف تو حقیقی اسلام کو بنیادی طور پہ پہچانتے تھے اور دوسری طرف رسولِ اکرمؐ کی اس میراث کو اپنی آنکھوں کے سامنے اسلامی معاشرے میں تاراج ہوتا دیکھ رہے تھے۔ یہی وہ مقام ہے جس پہ ہم ائمۂ اہلبیتؑ پر عائد ہونے والی اہم ذمے داری کو سمجھ پاتے ہیں۔ ہم اس بات پہ یقین رکھتے ہیں اور انشاءاللہ ثابت کریں گے کہ یہی وہ بزرگوار تھے جنھوں نے اسلام کے چاروں وجود معاشرے کو لوٹا دیے۔

تحریف امم

گزشتہ مباحث میں قرآن مجید سے استناد کرتے ہوئے ہم نے آسمانی شریعتوں کی تحریف، تبدیلی اور تباہی کی وجوہات پر روشنی ڈالی تھی۔ اب ہم آئندہ بحث کی تمہید کے طور پہ مختصراً ان علل واسباب کو دہراتے ہیں۔

۱۔ "خدا نے اہلِ کتاب سے عہد و پیمان لیا تھا کہ تم کتابِ خدا کو صاف صاف بیان کر دینا اور اس کی کوئی بات نہ چھپانا مگر ان لوگوں نے ذرا بھی خیال نہ کیا اور خدا سے کیے ہوتے پیمان کو پسِ پشت ڈال دیا اور اسے پورا نہ کیا بلکہ اسے معمولی سی قیمت میں بیچ ڈالا۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۸۷)۔

۲۔ "جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، ان سے بھی ہم نے عہد و پیمان لیا تھا مگر جن جن باتوں کی انہیں یاد دہانی کرائی گئی تھی وہ ان میں سے ایک حصے کو بھلا بیٹھے۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۴)۔

۳۔ "یہودیوں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی باتوں ہیں ان کے محل و موقع سے پھیر بدل کر کے اسے دوسرے معنی پہنا دیتے ہیں۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۴۶)۔

۴۔ "اے اہلِ کتاب تم حق اور باطل کو کیوں خلط ملط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو۔" (سورۂ آل عمران۔ آیت ۷۱)۔

ان آیات میں خداوند عالم نے اہل کتاب کی چند حرکات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ

حقیقت کو چھپاتے تھے اور حق کو باطل کا لباس پہنا کر حق کو مشکوک بنا دیتے تھے اور ان دونوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیتے تھے اور یہ کام انجانے میں نہیں بلکہ جان بوجھ کر کرتے تھے۔

ان آیات سے اور بہت سی ایسی دوسری آیات سے جو اسی موضوع پر ہیں پتا چلتا ہے کہ سابقہ امتیں اپنے پیغمبروں کی وفات کے بعد جوں جوں وقت گزرتا جاتا کچھ حقائق کو فراموش کر دیتی تھیں اور بعض پر پردہ ڈال دیتی تھیں اور انھیں چھپا دیتی تھیں۔ وہ بعض اوقات حق اور باطل کو گڈمڈ کر کے حاصل مطلب کو مشکوک بنا دیتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے دل سے باتیں گھڑ لیتی تھیں اور انہیں لوگوں کے سامنے منجانب اللہ کے طور پر پیش کرتی تھیں۔ اس طرح وہ اپنی آسمانی کتابوں کو بدل ڈالتیں اور ان میں تحریف کر دیتیں۔

آخری اُمّت

بہت سی احادیث میں جو معتبر شیعہ اور سنی کتابوں میں موجود ہیں رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

"یہ اُمّت بھی پہلی امتوں کی مانند عمل کرے گی اور ہو بہو ان کی پیروی کریگی"

امام صادق علیہ السلام اپنے آبائے کرامؑ کے توسط سے رسولِ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "كُلُّ مَا كَانَ فِي الْأُمَمِ السَّالِفَةِ فَإِنَّهُ يَكُونُ فِي هٰذِهِ الْأُمَّةِ مِثْلُهُ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ وَالْقُذَّةِ بِالْقُذَّةِ"

"جو کچھ سابقہ امتوں میں وقوع پذیر ہوا ہے وہ اس امت میں بھی واقع ہو گا۔ جس طرح ایک تیر دوسرے سے ملتا ہے جوتوں کے جوڑے میں سے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے اسی طرح اس امت میں بھی دوسری امتوں سے مشابہت پائی جائے گی"[1]

ایک اور روایت میں امام صادق علیہ السلام اپنے آبائے طاہرینؑ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: "وَالَّذِي بَعَثَنِي بِالْحَقِّ نَبِيًّا وَبَشِيرًا لَتَرْكَبُنَّ أُمَّتِي سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَهَا حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى لَوْ أَنَّ حَيَّةً مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ دَخَلَتْ فِي جُحْرٍ لَدَخَلَتْ فِي هٰذِهِ الْأُمَّةِ حَيَّةٌ مِثْلُهَا."

---

[1] صدوق: اکمال الدین و اتمام النعمہ صفحہ ۵۷۶ مطبوعہ تہران ۱۳۹۰ھ۔ بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۳ مطبوعہ کمپانی علاوہ ازیں دیکھیے مجمع البیان جلد ۱۰ صفحہ ۴۶۲ تفسیر البرہان جلد ۴ صفحہ ۴۴۴ تفسیر الصافی جلد ۲ صفحہ ۸۰۲

"اس ذات کی قسم جس نے مجھے پیغمبر اور مبشر بنا کر بھیجا کہ میری امت اسی راستے پر چلے گی جس پر سابقہ امتیں چلیں حتیٰ کہ اگر بنی اسرائیل میں ایک سانپ ایک بانبی میں گھسا ہوگا تو اس امت میں بھی ایک سانپ اس بانبی میں گھسے گا۔"[1]

تاہم اہل سنت کی معتبر کتابوں میں ابوسعید خدری سے نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "لَتَتَّبِعُنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْهُمْ ! قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَلْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى قَالَ : فَمَنْ ؟ ."

"اے میری امت کے لوگو! تم سابقہ لوگوں کے طور طریقوں کی پیروی کروگے اور وجب بہ وجب اور ذراع بہ ذراع اسی راستے پر چلوگے جس پر سابقہ امت کے لوگ چلے تھے۔ اگر وہ ایک وجب (بالشت) چلے تھے تو تم بھی ایک وجب چلوگے اور اگر وہ ایک ذراع (ہاتھ) جائیں گے تو تم بھی ایک ذراع جاؤگے حتیٰ کہ اگر ان میں سے کوئی شخص سوسمار کے بل میں گھسے گا تو تم میں سے بھی کوئی شخص سوسمار کے بل میں گھسے گا۔"

اصحاب نے عرض کیا: "کیا سابقہ لوگوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور کیا ہم یہود و نصاریٰ کی مانند ہوں گے اور انھیں کی طرح عمل کریں گے؟"

آپ نے فرمایا: "ان کے علاوہ میں اور کس کی بات کر رہا ہوں؟"[2]

ان کتابوں کی ایک اور روایت کے مطابق جو ابوہریرہ سے منقول ہے رسول اکرمؐ نے فرمایا: "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَاْخُذَ اُمَّتِىْ بِاَخْذِ الْقُرُوْنِ قَبْلَهَا شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ ! فَقِيْلَ : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! كَفَارِسٍ وَالرُّوْمِ ؟ فَقَالَ : وَمَنِ النَّاسُ اِلَّا اُولٰٓئِكَ ."

---

[1] شیخ صدوق: اکمال الدین و اتمام النعمہ صفحہ ۵۷۶ مطبوعہ تہران ۱۳۹۰ھ، بحار الانوار جلد ۸ صفحہ ۳ مطبوعہ کمپانی۔ علاوہ ازیں دیکھیے مجمع البیان جلد ۱۰ صفحہ ۴۶۲، تفسیر البیان جلد ۴ صفحہ ۴۴۴، تفسیر الصافی جلد ۲ صفحہ ۸۰۲۔

[2] مسند الطیالسی حدیث ۲۱۷۸۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۸۴ اور ۹۴۔ صحیح مسلم کتاب العلم شرح نووی جلد ۱۶ صفحہ ۲۱۹۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاءؑ جلد ۲ صفحہ ۱۷۱۔ کنز العمال جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۔

"قیامت اس وقت تک برپا نہ ہوگی جب تک میری امت سابقہ امتوں کے طور طریقوں پر عمل نہ کرلے اور ہُو بہو ان کی پیروی نہ کرلے۔"

صحابہ نے عرض کیا: "یارسول اللہؐ! اہلِ فارس اور اہلِ روم کی مانند؟"

آپ نے فرمایا: "کیا ان کے علاوہ بھی کوئی لوگ ہیں؟"[1]

احادیث تو بہت ہیں لیکن ہمارا مقصد ان سب کو نقل کرنا نہیں ہے، جو حضرات دلچسپی رکھتے ہوں ہم انھیں تفصیلی کتابوں سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے ہیں[2]

مختصر یہ کہ ہم نے قرآن مجید کے ارشادات کی روشنی میں یہ دیکھا کہ سابقہ امتوں میں تحریف ہوتی تھی اور حقائق کو بدل دیا جاتا تھا چنانچہ لازم ہے کہ اس امت میں بھی تحریف کا عمل واقع ہو۔ سابقہ انبیاءؑ کے پیرو حق و باطل کو خلط ملط کردیتے تھے لہٰذا لازم ہے کہ اس امت میں بھی ایسا ہی ہو۔

ان سب باتوں پر کہ مذکورہ حوادث کس شکل میں وقوع پذیر ہوئے، حقائق کو کس طرح چھپایا گیا اور احکام و عقائد میں کس طرح تحریف کی گئی اور یہ تحریف کہاں تک پہنچی اور اس نے صحیح اسلام پر کیا اثر ڈالا، انشاء اللہ آئندہ ابواب میں روشنی ڈالی جائے گی۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے اس بات کا بار بار ذکر کیا ہے کہ ہر شریعت میں متعلقہ پیغمبر کے بعد تحریف کی گئی اور یہ تحریف اس حد تک پہنچی کہ پھر حقائق کا پتا چلانا ممکن نہ رہا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک نیا پیغمبر بھیجا تاکہ کالعدم شدہ دین کا احیاء کرے۔ یہی قانون نوحؑ، ابراہیمؑ، اور عیسیٰؑ کے بارے میں کارفرما رہا اور جب عیسوی شریعت یوں نابود ہوئی کہ انسان اپنا پورا زور لگانے کے باوجود اس کے حصول میں ناکام رہا تو حضرت خاتم النبیینؐ مبعوث ہوئے۔ آپ نے اسلام کو زندہ کیا اور اسے مکمل ترین شکل میں بنی نوعِ انسان کے سامنے پیش کیا۔ اب حکمتِ ازلی اس امر کی مقتضی ہے کہ یہ شریعت قیامت تک باقی رہے کیونکہ آپ کی

---

[1] صحیح بخاری، شرح فتح الباری جلد ۱۷ صفحہ ۶۳ - سنن ابن ماجہ حدیث ۳۹۹۴ - مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۲۷ - ۳۶۷ - ۴۵۰ - ۵۱۱ اور ۵۲۷ - کنز العمال جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۳

[2] خمسون ومائة صحابی مختلق جلد ۲ صفحہ ۴۵ - ۵۲۔

لائی ہوئی شریعت اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور رسولِ اکرمؐ انسانوں کے لیے کامل ترین رہنما ہیں[1]۔ چونکہ رسولِ اکرمؐ اسلام کی تبلیغ اور اس کے معارف اور احکام کی تعبیر، حفاظت اور اشاعت کے ذمے دار تھے اور اسلامی اصطلاحات اور مفاہیم کا بیان کرنا بھی آپ کا فریضہ تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ آپ اسلامی شخصیت اور مسلمانوں کا معاشرہ تشکیل دیں لہٰذا آپ کی رحلت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد کا وجود امت میں باقی رکھا جو اصطلاحات اور مفاہیم کی حفاظت اور اشاعت کے ذمے دار ہوں اور اسلامی شخصیت اور معاشرے کی تعمیر کریں۔ یہ وہی اہم ذمے داری ہے جو ائمہ اہلبیتؑ میں سے ہر ایک کی اصلی کارکردگی تشکیل دیتی ہے اور امام مہدیؑ تک سب نے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کی کوشش، صلح، جنگ، شہادت، قید، قیام اور قعود کا مقصد اسی فریضے کا انجام دینا رہا ہے۔

اس امت نے اپنے پیغمبرؐ کے بعد سابقہ امتوں کی طرح ہی عمل کیا۔ اسلام کے حقائق اور احکام میں تحریف کی گئی، انھیں بدلا گیا اور چھپایا گیا حتیٰ کہ معاویہ کے زمانے میں "اسلام کا بجز اس کے نام کے اور قرآن کا بجز اس کی تحریر کے کچھ باقی نہ رہا"۔

سیدالشہداء امام حسینؑ کا قیام تحریف کے مقابلے میں ایک لازوال اقدام ثابت ہوا۔ اس کے بعد کوئی بنیادی تحریف انجام نہیں پائی۔ اسلام کا احیاء جس کی اصطلاحات اور جس کے ناموں کے علاوہ کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی ــــ امام محمد باقرؑ کے زمانے سے شروع

---

[1] ہم قرآن مجید میں رسول اکرمؐ کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ: "لوگو! محمدؐ تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ اور خاتم النبیینؐ ہیں"۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۴۰)۔

اور آپ کی لائی ہوئی کتاب کے بارے میں یوں ارشاد ہے: "ہم نے تم پر کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کا شافی بیان ہے"۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۸۹)۔

سچائی اور انصاف میں تو تمہارے پروردگار کی سچی اور موزوں بات پوری ہو گئی۔ کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں۔ وہ بڑا سننے والا اور واقف کار ہے"۔ (سورۂ انعام۔ آیت ۱۱۵)۔

"یقیناً یہ قرآن ایک عالی رتبہ کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے ہی سے پھٹک سکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے"۔ (سورۂ حٰم سجدہ۔ آیت ۴۲)۔

ہوا۔ ائمہ امّت کی مسلسل مجاہدت اور کوشش کے نتیجے میں صحیح مفاہیم اور معانی معاشرے کو واپس مل گئے، اسلامی شخصیتوں کی دوبارہ تربیت ہوئی اور اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی گئی۔ المختصر اسلام اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ لوگوں کے پاس واپس پہنچ گیا۔[1]

وَالصَّلوٰۃُ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ

●●●●●

---

[1] یہ قول انشاء اللہ آئندہ مباحث میں ثابت کیا جائے گا۔

چوتھا درس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلَاۃُ
وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہِ الطَّاہِرِیْنَ.

گزشتہ مباحث میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کے سلسلے میں گفتگو ہوئی کہ:

"میری امت پر ایک دن ایسا آئے گا کہ اسلام کے نام کے علاوہ اور قرآن کی تحریر کے سوا کچھ باقی نہ بچے گا۔"

اس حدیث کے سمجھنے کے لیے جو تمہید باندھی گئی اس میں آپ نے مشاہدہ فرمایا کہ پروردگارِ عالم کا ابدی آئین یعنی اسلام چار وجود رکھتا ہے۔

پہلا وجود

یہ اسلام کا اسمی وجود ہے اور ان اصطلاحات پر مشتمل ہے جو اسلام نے عربی لغت اور زبان سے اپنائیں اور انہیں ایک نئے مفہوم کے ساتھ معاشرے کے سامنے پیش کیا۔

دوسرا وجود

یہ اسلام کا مفہومی اور ذہنی وجود ہے اور ان معانی سے عبارت ہے جو شارع اسلام نے اپنی منتخب کردہ اصطلاحات کو دیے ہیں۔

تیسرا وجود

یہ اسلام کے پیروؤں میں اس دین کا عملی وجود ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس پر اسلامی شخصیت ظاہر ہوتی ہے یعنی ایک ایسا شخص وجود میں آتا ہے جو ان اصطلاحات اور معانی کو سمجھتا ہے اور انہیں عملی جامہ پہناتا ہے۔

چوتھا وجود

یہ اسلامی معاشرہ ہے جو پہلے تین وجودوں پر مبنی ہے اور ان کی عدم موجودگی میں خود اس کے وجود کا کوئی امکان نہیں۔ اس وجود یعنی اسلامی معاشرے کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے جب رسولِ اکرمؐ ان لوگوں کے ذریعے معاشرے کی تعمیر کریں جو اسلام پر عمل کریں اور آپ سے اطاعت اور وفاداری کا عہد و پیمان باندھیں۔ ایک طرف اس گروہ کی بیعت یعنی وفاداری کے عہد سے اور دوسری طرف رسول اکرمؐ کی رہنمائی سے اسلامی معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے۔

اسلامی معاشرے اور عادل حکومت کے قیام کا عظیم فریضہ امتِ مسلمہ کے ہر فرد کی گردن پر ایک بھاری ذمے داری ہے اور اس سلسلے میں نبی اور امام سرِ فہرست ہیں لیکن نبی یا امام کے لیے ہی خاص طور سے یہ واجب نہیں ہے کہ وہ کوئی ساتھی اور معاون نہ ہوتے ہوئے بھی اس فریضے کی ادائیگی کے ذمے دار ہوں۔ نہیں! ایسا نہیں ہے بلکہ ان بزرگواروں پر لازم ہے کہ اس سلسلے میں کوشش کریں اور دوسروں پر لازم ہے کہ ان کی اعانت کریں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ امام علیؑ نے فرمایا ہے:

"اس خدا کی قسم جس نے دانے کا دل چیرا اور انسان کو پیدا کیا، اگر لوگ میرے پاس بیعت کے لیے نہ آتے اور حامیوں کی موجودگی کی بنا پر مجھ پر حجت تمام نہ ہو جاتی اور اگر خدا نے عالموں سے یہ عہد و پیمان نہ لیا ہوتا کہ وہ ظالم کی سیری اور مظلوم کی بھوک پر چین سے نہیں بیٹھیں گے تو میں ہر صورت میں حکومت کی نکیل اس کے کوہان پر ڈال دیتا اور اب بھی اور پہلے بھی اس

سے منہ پھیر لیتا۔"[1]

دوسرا مطلب جو ہم نے موردِ بحث قرار دیا تھا وہ یہ تھا کہ ان متواتر احادیث کی بنا پر جو شیعہ اور سنی محدثین نے نقل کی ہیں آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ جو کچھ سابقہ امتوں میں وقوع پذیر ہوا وہ اس امت میں بھی ہوگا۔ اس سلسلے میں ہم نے قرآن مجید کی آیاتِ کریمہ میں پڑھا کہ سابقہ امتوں نے آسمانی شریعتوں میں تحریف کی، کچھ حقائق پر پردہ ڈالا اور کسی ایک کو بدل دیا۔ بعض اوقات انہوں نے باطل کو حق کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ ارشادِ نبویؐ کے مطابق یہ تمام کام لازماً اس امت میں انجام پائیں گے۔ یہ دعویٰ ہماری موجودہ بحث کی بنیاد ہے اور انشاءاللہ آئندہ بحث اور مطالعہ میں ہم اسے پایۂ ثبوت تک پہنچائیں گے۔

پیغمبرؐ اور سنت کی اشاعت

خداوند تبارک وتعالیٰ نے اسلام کے اعتقادات، اخلاقیات اور احکامات کے دو مجموعے قرار دیے ہیں اور بنی نوعِ انسان کو ان کی تبلیغ فرمائی ہے۔

ان میں ایک مجموعہ قرآن مجید ہے جو اسلام میں بلند ترین مطالب، تمام حقائق اور احکام کا حامل ہے اور اگر ہم فقط اسی پر اکتفا کریں تو لامحالہ ہم بنیادی طور پر مسلمان ہی نہیں ہو سکتے یعنی نہ تو ہم روزہ رکھ سکتے ہیں، نہ مناسکِ حج ادا کر سکتے ہیں، نہ شادی بیاہ کا طریقہ جان سکتے ہیں اور نہ ہی طلاق دے سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان سب چیزوں کے بنیادی احکام قرآن مجید میں ہی ہیں لیکن انکی شرح، بیان اور تفصیل رسول اکرمؐ کو اور دوسرے اولین مبلغین کو سونپی گئی ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ان اولین مبلغین کا سلسلہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شروع ہو کر امام مہدیؑ پر ختم ہوتا ہے۔ اس موضوع پر پہلے دلائل دیے جا چکے ہیں اور آئندہ بحثوں میں یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائیگی۔ پس حاصلِ کلام یہ ہے کہ اسلام قرآن مجید، رسول اکرمؐ اور آپکے اوصیائے کرامؑ کے ارشادات میں یعنی ان دو عظیم مجموعوں میں ہے جو ہماری گرانقدر اسلامی میراث ہیں۔[2]

---

[1] نہج البلاغہ۔ تیسرا خطبہ۔ شرح محمد عبدہ مصری صفحہ ۲۵ مطبوعہ بیروت ۱۳۰۷ھ ق۔ معانی الاخبار صفحہ ۳۶۲ تحقیق علی اکبر غفاری۔ علل الشرائع شیخ صدوق جلد ا صفحہ ۱۵۱ مطبوعہ نجف ۱۳۸۵ھ ق۔ الارشاد شیخ مفید ۱۳۷-۱۳۸ مطبوعہ ایران۔ امالی طوسی جلد ا صفحہ ۳۸۳ مطبوعہ نجف ۱۳۸۴ھ ق۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ الف ملاحظہ فرمایئے۔

[2] مَآ اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا (صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۶۳، حدیث ۳۷۸۸)۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جو لوگ رسولِ اکرمؐ کے بعد اسلام میں تحریف کرنا چاہتے تھے انہوں نے کیا کیا؟ اس سوال کے فصیح صحیح جواب کے لیے ایک تمہیدی مطالعے کی ضرورت ہے تاکہ غلطی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ اس سلسلے میں ہم آنحضرتؐ کے زمانے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

رسول اکرمؐ فرماتے ہیں: "نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَوَعَاهَا وَبَلَّغَهَا مَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَیْرُ فَقِیْهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰی مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ."

"اللہ اس بندے کو خوش رکھے جو ہماری بات سنے، اسے دل سے مانے، سمجھے، یاد کرے اور پھر ان لوگوں تک پہنچائے جنہوں نے اسے نہ سنا ہو"

(زور آنحضرتؐ کے ارشادات کی تبلیغ پر ہے)۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص علم و دانش کا حامل ہوتا ہے لیکن اسے سمجھ نہیں پاتا اور اکثر علم و دانش کا حامل اسے اپنے سے زیادہ سمجھ دار شخص تک پہنچا دیتا ہے یعنی اس امانت کو اس شخص تک پہنچاتا ہے جو اس سے بیشتر استفادہ کر سکے[1]

حضور نبی کریمؐ یہ بھی فرماتے ہیں: لِیُبَلِّغُ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، فَاِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰی اَنْ یُّبَلِّغَ مَنْ هُوَ اَوْعٰی لَهٗ مِنْهُ.

"جو لوگ موجود ہیں اور ہماری باتیں سن رہے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ یہ باتیں اُن لوگوں تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ بات سننے والا اسے اپنے سے زیادہ دانا شخص تک پہنچا دے[2]"

تیسری روایت میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں: مَنْ اَدّٰی اِلٰی اُمَّتِیْ حَدِیْثًا تُقَامُ بِهٖ سُنَّةٌ اَوْ تُثْلَمُ بِهٖ بِدْعَةٌ فَلَهُ الْجَنَّةُ.

---

[1] سنن ابو داؤد جلد ۳ صفحہ ۳۲۲ حدیث ۳۶۶۰۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۸۴-۸۶ حدیث ۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲ اور ۲۳۶۔ سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۷۴-۷۵۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۲۵۔ جلد ۴ صفحہ ۸۰ اور ۸۲ اور جلد ۵ صفحہ ۱۸۳۔ صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۳-۳۴ تحقیق ابراہیم عطوہ عوض۔ بدیع المنن جلد ۱ صفحہ ۱۴۔ بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ اور ۱۴۸ اور مستدرک الوسائل جلد ۳ صفحہ ۱۸۱۔ [2] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۴ مطبوعہ بولاق مصر کتاب العلم باب قول النبیؐ رُبَّ مُبَلَّغٍ۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۸۵ حدیث ۲۳۳ بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۵۲ حدیث ۴۲۔

"اگر کوئی شخص ایک حدیث میری امت کی طرف لے جائے اور اس وسیلے سے ایک سنت قائم ہو جائے یا ایک بدعت مٹ جائے تو اس شخص کی جزا بہشت ہو گی۔"[1]

ایک اور موقع پر آپؐ فرماتے ہیں: "مَنْ تَعَلَّمَ حَدِيثَيْنِ اثْنَيْنِ يَنْفَعُ بِهِمَا نَفْسَهُ أَوْ يُعَلِّمُهُمَا غَيْرَهُ فَيَنْتَفِعُ بِهِمَا كَانَ خَيْرًا مِنْ عِبَادَةِ سِتِّينَ سَنَةً."

"جو شخص دو حدیثیں سیکھے تاکہ ان سے فائدہ اٹھائے یا کسی دوسرے کو ان کی تعلیم دے تاکہ وہ ان سے بہرہ مند ہو تو یہ فعل اس شخص کی ایسی ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے جو علم و معرفت سے خالی ہو۔"[2]

امیرالمومنین امام علیؑ فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ: اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِي، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِي، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِي، قِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! وَمَنْ خُلَفَاؤُكَ؟ قَالَ: اَلَّذِينَ يَأْتُونَ مِنْ بَعْدِي يَرْوُونَ حَدِيثِي وَسُنَّتِي.

رسول اللہؐ نے فرمایا: "خداوندا! میرے خلفاء کو اپنی رحمت کا مورد قرار دے" اور آپ نے یہ جملہ تین بار دہرایا۔

لوگوں نے عرض کیا: "آپ کے خلفاء کون ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا: "وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے، میری احادیث اور سنت نقل کریں گے اور اسے دہرائیں گے۔"[3]

گزشتہ بحثوں میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن مجید کی تصریح کی بنا پر[4] اللہ تعالیٰ کا پیغام لانے والے کی حیثیت سے پیغمبر کا خاص فریضہ فقط رسالت و شریعت کا لانا اور اس کی تبلیغ کرنا ہے اور یہی وہ کام ہے جس کے لیے اس کا خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کا خلیفہ وہ شخص ہوتا ہے جو

---

[1] بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۵۲ حدیث ۴۳   [2] بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۵۲

[3] معانی الاخبار صفحہ ۳۷۴ - ۳۷۵ - عیون الاخبار جلد ۲ صفحہ ۳۶ مطبوعہ نجف عراق - من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۴ صفحہ ۳۰۲ تحقیق علی اکبر غفاری - بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۴۵ حدیث ۷ -

[4] سورۂ مائدہ - آیت ۹۲، سورۂ نحل - آیت ۳۵ اور ۸۲ -

اس کی غیر موجودگی میں اسی کی طرح عمل کرتا ہے یعنی احکام اور حقائق لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ بلا شبہ پیغمبر واحد حاکم برحق اور اپنے زمانے کی حکومت کا حقدار بھی ہوتا ہے اور یہ منصب بھی وہ اپنے جانشین کے سپرد کر دیتا ہے یعنی وہ بھی واحد حاکم برحق اور اپنے زمانے کی حکومت کا حقدار ہوتا ہے تاہم یہ منصب' خلافت کے مقام سے ربط نہیں رکھتا اور پیغمبر اور اس کے وصی کی دوسری شانوں میں سے ایک شان ہے۔ پیغمبر حاکم ہے اور اس کا خلیفہ بھی حاکم ہے لیکن یہ نہیں کہ پیغمبر کے معنی حاکم کے ہیں یا خلیفہ کے معنی جانشین حاکم کے ہیں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ حکومت' خلافت سے ایک الگ چیز ہے۔

جن معنوں میں ہم نے خلافت کو سمجھا ہے ان معنوں میں یہ پیغمبر کے وصی سے الگ ہونیوالی یا سلب ہوجانیوالی چیز نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر صورت میں خلافت کی ذمےداریاں انجام دے اور وہ انہیں انجام دیتا بھی ہے لیکن حکومت میں جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں دوسروں کا عمل دخل بھی ہوتا ہے اور اس معنی میں حکومت قائم کرنے کے واجب فریضے میں دوسرے مسلمان بھی حصہ دار ہوتے ہیں اور سب کے لیے ضروری ہے کہ کمر ہمت باندھیں اور کوشش کریں تاکہ اسلامی معاشرہ اور عادلانہ حکومت تشکیل پائیں۔

اسلامی علوم میں دو قسم کی اصطلاحات وجود رکھتی ہیں جن میں سے ایک اصطلاحاتِ شرعی اور دوسری اصطلاحاتِ متشرعہ کہلاتی ہیں۔ "اصطلاح وضع کرنا" نام رکھنے کا ہم معنی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک شخص یا گروہ ایک ایسی لغت کو جو کسی زبان میں موجود ہو اپنا لیتا ہے اور اسے ایسے معنی دیتا ہے جو اس کے اصلی معنی سے غیر مربوط نہیں ہوتے۔ اس صورت میں یہ نام رکھنا یا اصطلاح وضع کرنا اس شخص یا گروہ سے منسوب ہو جاتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے علم طبابت میں طبابت کی اصطلاحیں یا علوم ریاضی میں ریاضی کی اصطلاحیں ہوتی ہیں لہٰذا اگر یہ نام شارع یعنی اللہ تعالیٰ یا رسول اکرمؐ کی جانب سے دیا جائے تو یہ شرعی اصطلاح کہلاتی ہے لیکن اگر عام مسلمان یا علمائے اسلام کوئی نام دیں تو وہ متشرعہ اصطلاح ہو گی۔ مثلاً لفظ صلاۃ، وضو اور حج شرعی اصطلاحات ہیں اور شارع نے ان اعمال کے یہ خاص نام رکھے ہیں جن کی ادائیگی کا اس نے حکم دیا ہے تاہم اہلسنت

کی فقہ میں اجتہاد[1]، قیاس اور استحسان جیسی اصطلاحات موجود ہیں۔ یہ ایسی اصطلاحات ہیں جنہیں شارع کی تائید حاصل نہیں ہے۔ مسلمانوں نے انہیں عام معنوں میں استعمال کیا اور رفتہ رفتہ ان پر شرعی رنگ چڑھ گیا۔

خلیفہ کے لفظ کے بارے میں جو امامت اور امت کی پیشوائی کے مباحث سے متعلق ایک بے حد مشہور اصطلاح ہے بہت بڑا اشتباہ واقع ہوا ہے۔ سبھی لوگ حتیٰ کہ اہل علم حضرات بھی خیال کرتے ہیں کہ لفظ خلیفہ اپنے مشہور معانی[2] کے ساتھ اسلام کی ایک شرعی اصطلاح ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے یعنی رسول اکرمؐ نے امت کی رہنمائی اور اس پر حکومت کرنے کے لیے اپنے جانشین کے لیے خلیفہ کی اصطلاح وضع نہیں فرمائی۔

اسی طرح جس خلیفہ کا قرآن مجید میں ذکر ہے وہ خلیفۂ رسولؐ نہیں ہے بلکہ خلیفۃ اللہ ہے اور انہیں معنوں میں حضرت آدمؑ خلیفہ ہیں یا پھر حضرت داؤدؑ خلیفہ ہیں۔ یہ جو ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں کہ: "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۳۰) یا "اِنَّا جَعَلْنَاكَ

---

[1] "اجتہاد کی اصطلاح اہلِ بیتؑ کے مکتب میں بھی موجود ہے لیکن اس کے وہ معنی نہیں ہیں جو خلفاء کے مکتب نے عملی طور پر اسے دیئے ہیں کیونکہ ان کے ہاں عملاً اجتہاد میں "ذاتی رائے کے اظہار" کا عنصر بھی موجود ہے جبکہ اہل بیتؑ کے مکتب میں اجتہاد فقط اللہ تعالیٰ کے احکام کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے اور مجتہد کسی صورت میں بھی اپنے آپ کو اپنی ذاتی رائے کے اظہار کی اجازت نہیں دیتا البتہ اس اصطلاح کی تعریف کرتے وقت ہر دو مکاتب کی اصولی کتابوں میں ایک ہی جملہ استعمال ہوتا ہے (کفایۃ الاصول جلد ۲ صفحہ ۴۲۲۔ قوانین الاصول جلد ۲ صفحہ ۱۰۰۔ ۱۰۱ مطبوعہ خوانساری۔ التعریف صفحہ ۸ مطبوعہ فلوگل) لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے خلفاء کے مکتب میں فقیہ یا غیر معصوم صحابی کی رائے کا بھی احکام میں دخل ہے اور اہلبیتؑ کا مکتب صرف اللہ تعالیٰ اور رسول اکرمؐ کے ارشادات کو معتبر گردانتا ہے۔

[2] ابن خلدون کہتا ہے: "وَالْخِلَافَةُ ... فِی الْحَقِیْقَةِ خِلَافَةٌ عَنْ صَاحِبِ الشَّرْعِ فِیْ حِرَاسَةِ الدِّیْنِ وَسِیَاسَةِ الدُّنْیَا بِهٖ" مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۹۱ مطبوعہ بیروت۔ فرید وجدی نے لکھا ہے: "اَلْخِلَافَةُ رِئَاسَةٌ دِیْنِیَّةٌ وَّ دُنْیَوِیَّةٌ ظَهَرَتْ فِی الْاِسْلَامِ هٰذِهِ الْوَظِیْفَةُ عَقَبَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ" دائرۃ المعارف القرن العشرین جلد ۳ صفحہ ۷۵۵ مطبوعہ مصر

خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ "(سورہ صٓ۔ آیت ۲۶)۔

تو لفظ خلیفہ ان آیات میں خلیفۃ اللہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ امر تو واضح ہے کہ حضرت داؤدؑ کسی پیغمبر کے خلیفہ نہیں تھے بلکہ خود پیغمبر تھے اور یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ حضرت آدمؑ کسی سابقہ پیغمبر کے خلیفہ نہیں تھے کیونکہ اصولاً ان سے پہلے کوئی نبی ہوا ہی نہیں۔

شرعِ مقدس اسلام کی اصطلاح میں حکام کو خلیفہ نہیں بلکہ "اولی الامر" کہا جاتا ہے۔

حاکمِ اسلامی کے معنوں میں خلیفہ کا لفظ "متشرعہ اصطلاح" ہے۔ یہ نام پہلے عام لوگوں نے استعمال کرنا شروع کیا اور بعد میں فقہاء اور متکلمین نے اسے ایک علمی اصطلاح کی شکل دیدی۔

شروع شروع میں خلیفہ کا لفظ ایک اور اضافے کے ساتھ استعمال ہوتا تھا مثلاً قرآن مجید کے خلیفۃ اللہ اور معاشرے میں زیرِ استعمال "خلیفۃ ابیہ" کے مقابلے میں "خلیفۃ رسول اللہ" کہا جاتا تھا۔

ان تمام استعمالات میں لفظ خلیفہ کے لغوی معنی لیے جاتے تھے اور یہ ہمیشہ مضاف الیہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ بعد میں کثرت استعمال کی بنا پر لفظ خلیفہ کے معنی ــــ بغیر کسی لفظ کا اضافہ کیے ہوئے ــــ حاکمِ اسلام لیے جانے لگے یعنی وقت گزرنے کے ساتھ کثرتِ استعمال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے خلیفہ کا نام جو تین الفاظ پر مشتمل تھا مختصر کر دیا اور صرف خلیفہ کہنا شروع کر دیا۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے اس لفظ نے بھی اسلامی معاشرے کے حکام کے اسمِ خاص کی شکل اختیار کر لی۔ اسی مرحلے پر لوگوں کو مغالطہ ہوا اور وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ یہ نام وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد کافی مدت گزر جانے پر اختیار کیا گیا۔[1]

پس حدیث نبویؐ میں جہاں کہیں لفظ "خلیفہ" دیکھنے میں آئے اس کے کوئی اور معنی نہیں بلکہ وہی لغوی معنی ہوں گے جو عربی زبان میں تھے لہٰذا جس حدیث میں "اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ خُلَفَائِی" کہا گیا ہے اس میں رسولِ اکرمؐ کے بعد حاکموں کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا بلکہ خلافت کے خاص معنوں میں آنحضرتؐ کے جانشینوں کے متعلق گفتگو ہوئی ہے اور یہ جانشین اور خلفاء وہی حضرات ہیں جو آپ کی حدیث اور سنت سے بخوبی واقف

---

[1] ہمارے کچھ علماء نے اپنی علمِ کلام کی تصانیف میں اسی اصطلاح کی پیروی کی ہے (الکتب الاعتقادیۃ)۔

ہیں اور اسے لوگوں کے سامنے دہراتے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث میں جو لفظ "خلیفہ" استعمال ہوا ہے اس کے معنی واضح ہو جانے کے بعد اب ہم اصل موضوع کی جانب آتے ہیں۔

جو احادیث ہم نے نقل کی ہیں ان سب میں ایک حقیقت کا تذکرہ ہے اور وہ یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ مسلمانوں کو اس امر کی ترغیب دیتے تھے کہ آپ کی حدیث دوسروں تک پہنچائیں اور جو کچھ آپ بیان فرمائیں مسلمان اسے نقل کریں اور دوسروں کے سامنے دہرائیں۔ ان احادیث کے علاوہ آنحضرتؐ سے کچھ ایسی روایات نقل کی گئی ہیں جن میں حدیثوں کے لکھنے کا حکم دیا گیا ہے یعنی نہ فقط احادیث کے نقل کرنے کے لیے بلکہ لکھنے کے لیے بھی کہا گیا ہے۔

مثلاً ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا: "قَیِّدُوا الْعِلْمَ" علم کو قید کرو۔

لوگوں نے پوچھا: "وَمَا تَقْیِیْدُهٗ؟" "علم کو کیسے قید کیا جا سکتا ہے؟"

حضورؐ نے فرمایا: "کِتَابَتُهٗ" "علم کا قید کرنا اسے تحریر میں لے آنا ہے"[1]

عبد اللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرمؐ سے عرض کیا: "کیا میں علم کو قید کروں؟"

حضورؐ نے فرمایا: "ہاں!"

میں نے عرض کیا: "یہ کام میں کس طرح انجام دوں؟"

آپؐ نے فرمایا: "لکھ کر"[2]

اہل سنت کی صحیح بخاری اور سنن ترمذی جیسی معتبر کتابوں میں ایک روایت موجود ہے جس میں ابو شاۃ نامی ایک یمنی شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جب یہ شخص رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر تھا، آنحضرتؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ ابو شاۃ نے آپ کے ارشادات سن کر عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ میرے لیے لکھ دیجیے۔"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "ہمارے اقوال ابو شاۃ کے لیے لکھ دو۔"[3]

---

[1] و [2] بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۵۱-۱۵۲ حدیث ۱۸-۳۵ اور ۱۴۷ جدید ایڈیشن۔

[3] صحیح بخاری، کتاب العلم، باب کتاب العلم جلد ۱ صفحہ ۳۳-۳۴ مطبوعہ بولاق مصر۔ صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۹ مطبوعہ بیروت حدیث ۲۶۶۷۔ اُسد الغابہ جلد ۶ صفحہ ۱۶۲ ترجمہ ۵۹۸۹ مطبوعہ کتاب الشعب۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے خود اپنی احادیث اور اقوال کے لکھنے کا حکم دیا ہے اور اس میں شک وشبہ کا کوئی مقام نہیں اور سبھی نے اسے نقل کیا ہے۔ شاید بعض حضرات یہ خیال کریں کہ یہ سب کچھ کہنے کا مقصد کیا ہے۔ رسول اکرمؐ کی حدیث کا معاملہ ہے اسے ضرور لکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اور کوئی فرض وجود نہیں رکھتا۔ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو پہچاننے کا اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے۔

بلاشبہ سوچنے کا یہ انداز بالکل صحیح ہے۔ ایک مسلمان جس کی طرزِ فکر درست ہو اس کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا لیکن بدقسمتی سے جیسا کہ ہم اگلے صفحات میں پڑھیں گے اس وقت کے مقتدر لوگوں نے بڑی شدت سے آنحضرتؐ کی احادیث لکھنے اور نقل کرنے کی ممانعت کی۔

پہلے ہم یہ ثابت کریں گے کہ رسولِ اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ آپ کی احادیث لکھی جائیں اور انہیں دوسروں کی خاطر نقل کیا جائے اور بعدازاں آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد مقتدر لوگوں نے جو کچھ کیا اس کا مطالعہ کریں گے۔ ایک اور حدیث میں جو عبداللہ بن عمرو عاص سے مروی ہے یوں کہا گیا ہے:

میں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! جو کچھ میں آپ سے سُنتا ہوں کیا اسے لکھ لیا کروں؟"

آپؐ نے فرمایا: "ہاں!"

میں نے عرض کیا: "خواہ آپ خوشی کی حالت میں ہوں خواہ غصّے کی حالت میں؟"

آپؐ نے فرمایا: "ہاں! کیونکہ میں خوشی کی حالت میں بھی اور غصے کی حالت میں بھی حق کے سوا اور کچھ نہیں کہتا۔"[1]

یہ نمونے جو ہم نے آپ کے لیے نقل کیے ہیں بہت سی احادیث میں سے محض چند ایک ہیں۔ ہم ان سب احادیث کو نقل کرنے سے معذور ہیں کیونکہ اس طرح ایک مختصر بحث بہت طویل ہو جائے گی۔

اب ہم احادیث کے ایک مجموعہ کی جانب رجوع کرتے ہیں اور ان میں سے چند ایک کو موردِ مطالعہ قرار دیتے ہیں۔

---

[1] بحارالانوار جلد ۲ صفحہ ۱۴۷، مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۱۶۲-۱۹۲-۲۰۷ اور ۲۱۵۔ سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۱۲۵۔

سُنّت قرآن کے مساوی ہے

صحیح ترمذی، سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی اور مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے لیکن جو عبارت ہم نقل کر رہے ہیں، وہ سنن ابوداؤد سے لی گئی ہے۔ یہ حدیث صحابیٔ رسولؐ مقدام بن معدیکرب سے مروی ہے۔ وہ ناقل ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "اَلَا! اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ"

"آگاہ رہو کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے اپنی کتاب قرآن بھیجی ہے اور اس کے ساتھ اس سے ملتے جلتے اور بہت سے حقائق بھی"۔

اس ارشادِ رسولؐ کی توضیح میں ہم کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ پر دو قسم کی وحی نازل ہوتی تھی۔ ایک وہ جس میں الفاظ اور معانی دونوں خداوند تعالیٰ کی جانب سے ہوتے تھے اور وہ قرآن شریف ہے۔ اس لحاظ تمام آسمانی کتابیں قرآن کے ساتھ شریک ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ فصاحت اور بلاغت کی رُو سے قرآن مجید معجزہ ہے لیکن سابقہ آسمانی کتابیں اعجاز کی اس کیفیت کی حامل نہیں۔ وحی کی دوسری قسم میں فقط معانی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتے تھے اور الفاظ رسولِ اکرمؐ کے ہوتے تھے۔ وحی کی اس قسم میں مفہوم اور معانی وحی کے مرموز طریقے سے آنحضرتؐ پر نازل ہوتے تھے اور پھر آپ کے ان الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے تھے جنہیں حدیث اور روایت کہا جاتا ہے۔

رسول اکرمؐ اپنی اس گفتگو میں فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہم پر عنایت کی ہے اور ہم پر قرآن نازل فرمایا ہے اور قرآن کی مانند اور تقریباً اتنی ہی غیر قرآنی وحی بھی ہم پر نازل کی گئی ہے۔ اس کے بعد اضافہ فرماتے ہیں: "آگاہ رہو! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک شخص کا شکم سیر ہو جائے تو وہ اپنی مسند پر ٹیک لگائے اپنا پیٹ بھرا ہونے کی وجہ سے کہتا ہے جہانتک

---

[۱] صحیح ترمذی جلد ۱۰ صفحہ ۱۳۲، باب مانھی عنه ان یقال عند حدیث النبیؐ۔ سنن ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۵۵۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۶، باب تعظیم حدیث رسول اللہؐ۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۳۰-۱۳۲۔ سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۱۴۰ باب السنة قضیه علی کتاب اللہ۔

اس قرآن کا تعلق ہے تمہیں چاہیے کہ جو کچھ اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔" صحیح ترمذی کے نسخے کے مطابق اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا:

"پیغمبرؐ نے اپنی حدیث میں جس چیز کو حرام قرار دیا ہے وہ ان حرام چیزوں کی مانند ہے جنہیں خداوند تعالیٰ نے قرآن میں حرام قرار دیا ہے۔"

ایک اور روایت میں جو مسند احمد بن حنبل میں ہے، رسول اکرمؐ نے ایک عجیب و غریب بات کہی ہے اور وہ ان معنی میں کہ آپ اپنے ساتھیوں اور صحابیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اے میرے ساتھیو اور صحابیو! وہ وقت نزدیک ہے جب تم میں سے ایک شخص میری تکذیب کرے گا اور اس حال میں کہ جب وہ اپنے تخت پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو گا کہے گا 'تمہارے اور میرے درمیان خدا کی کتاب قرآن ہے۔ جو کچھ اس میں حرام ہے ہم اسے حرام جانیں گے اور جو کچھ اس میں حلال ہے اسے حلال سمجھیں گے' (نہیں! یہ بات نہیں)۔ یہ جان لو کہ جو کچھ پیغمبرؐ نے حرام کیا ہے وہ اسی کی مانند ہے جو خدا نے حرام قرار دیا ہے۔"

مشہور صحابی ابو رافع کے فرزند عبیداللہ بن ابی رافع سے منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے اصحاب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ایسا نہ ہو کہ جب تم میں ایک شخص اپنے تخت پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو اور اس کے سامنے میرے اوامر و نواہی میں سے کوئی چیز بیان کی جائے تو وہ کہے: "نہیں! میں اسے نہیں جانتا (اور قبول نہیں کرتا)، میں اس قانون اور حکم پر عمل کرتا ہوں جسے قرآن میں پاتا ہوں۔" (ایک اور نسخے کے مطابق): "میں اسے خدا کی کتاب میں نہیں پاتا۔"

ہمارے زمانے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں اور بعینہٖ یہی جملہ دہراتے ہیں۔ کیا آنحضرتؐ کی ناگواری اور اعتراض ان لوگوں پر صادق نہیں آتا اور ان پر

---

[۱] سنن ابو داؤد۔ کتاب السنۃ باب لزوم السنۃ جلد ۲ صفحہ ۲۵۶۔ صحیح ترمذی کتاب العلم باب ۱۰ جلد ۵ صفحہ ۳۷ حدیث ۲۶۶۳۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۶-۷ حدیث ۱۳۔

[۲] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۸۔

گراں نہیں گزرتا؟"

عرباض بن جاریہ سلمی نقل کرتے ہیں کہ ہم نے رسولِ اکرمؐ کے ہمراہ خیبر میں پڑاؤ ڈالا۔ قلعے فتح ہو گئے۔ خیبر کا یہودی حاکم جو ایک گستاخ، بدمزاج اور تندخو شخص تھا آنحضرتؐ کے پاس آیا اور بڑی بدتمیزی سے کہنے لگا:

"اے محمدؐ! کیا تم لوگوں کے لیے جائز ہے کہ ہمارے حیوان ذبح کرو، ہمارے درختوں کے میوے کھاؤ اور ہماری عورتوں اور عزت و آبرو پر دست درازی کرو؟"

آنحضرتؐ کو یہ سن کر بڑا رنج ہوا اور آپ نے عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا:

"اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور بہ آواز بلند کہو کہ بہشت ایک مومن کے علاوہ کسی کے لیے سزاوار نہیں، سب کے سب نماز کے لیے جمع ہو جاؤ۔"

اسلامی قوانین کی رو سے رسولِ اکرمؐ کے ساتھ نمازِ جماعت پڑھنا مستحب مؤکد ہے اور نماز جمعہ واجب ہے لیکن جس وقت "اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃ" (سب نماز کے لیے حاضر ہو جاؤ) کی آواز بلند ہوتی تھی تو نماز جماعت بھی واجب ہو جاتی تھی اور لوگوں کے لیے ضروری ہو جاتا تھا کہ جمع ہو جائیں اور نمازِ جماعت آنحضرتؐ کے ساتھ ادا کریں لہٰذا یہ آواز سن کر سب مسلمان جمع ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف لے گئے اور ان الفاظ میں خطبہ ارشاد فرمایا:

"کیا تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں جبکہ وہ اپنی تکیہ گاہ پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو یہ خیال کرتا ہے کہ خدا نے تم پر کوئی چیز حرام نہیں کی بجز اس کے جو قرآن میں مذکور ہے؟ وہ گمان کرتا ہے کہ حرام بس وہی ہے جو قرآن میں موجود ہو اور اس کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں۔ آگاہ رہو کہ خدا کی قسم میں نے تمہیں نصیحتیں کی ہیں۔ اچھے کاموں کا حکم دیا ہے اور برے کاموں سے منع کیا ہے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ واجب یا حرام ہونے کی حیثیت میں ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن میں ہے۔ خدا نے تمہارے لیے اس چیز کو جائز قرار نہیں دیا کہ تم بلا اجازت اہلِ کتاب کے گھروں میں داخل ہو جاؤ۔"[1]

مُسند احمد بن حنبل میں ایک اور حدیث ہے جس کے مطابق رسول اکرمؐ نے یوں ارشاد

---

[1] سنن ابوداؤد، کتاب الخراج، باب تعشیر اہل الذمہ جلد ۳ صفحہ ۱۷۰ حدیث ۳۰۵۰

فرمایا ہے: لَا اَعْرِفَنَّ اَحَدًا مِّنْکُمْ اَتَاہُ عَنِّیْ حَدِیْثٌ وَھُوَ مُتَّکِئٌ فِیْ اَرِیْکَتِہٖ فَیَقُوْلُ: اُتْلُ بِہٖ عَلَیَّ قُرْاٰنًا۔

"ایسا نہ ہو کہ میں سنوں کہ تم میں سے کوئی شخص میری حدیث اس کے سامنے بیان کرے اور وہ کہے: میرے لیے قرآن پڑھو، قرآن میں سے احکام لاؤ"[1]

ان احادیث میں موجود پیشین گوئیاں بعد میں حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔ آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری لمحات سے لیکر اموی حکومت کے زمانے تک اس سیاسی منصوبے کی بنیاد پر عمل ہوتا رہا کہ: "نہ تو حدیث لکھو اور نہ ہی اسے بیان کرو۔ ہمارے لیے بس قرآن کافی ہے"۔

مجموعۂ اسلام

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے کچھ احادیث میں تو تاکید فرمائی کہ: "میری احادیث نقل کرو۔ میری احادیث لکھو اور کچھ اور احادیث میں فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ جب ہماری حدیث اس شخص کے سامنے پڑھی جائے جو رجا ہوا ہو تو وہ کہے کہ میرے لیے قرآن میں سے کچھ پڑھو (یعنی احکام قرآنی بیان کرو) نہیں! یہ بات درست نہیں۔ ایسی باتیں مت کہو۔ میں وحی کے سوا کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالتا اور حق کے علاوہ کچھ نہیں کہتا"۔

ان مقدمات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم ان تحریفات کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو آنحضرتؐ کے بعد وجود میں آئیں۔ اسی وقت سے آپ کے وہ ساتھی جنہیں مخاطب کر کے یہ باتیں کہی گئی تھیں پوری سنجیدگی سے مخالفت پر تل گئے اور یہ چیز حقائق اسلام میں تحریف کا ایک عظیم پیش خیمہ بن گئی۔

ہم آگے چل کر یہ ثابت کریں گے کہ آنحضرتؐ نے اسلام کے احکام کا مجموعہ امیرالمومنین امام علیؑ کو املا فرما دیا تھا اور امام علیؑ نے بھی اسے "الجامعہ" نامی ایک کتاب میں لکھ لیا

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۶۷ (قدیم ایڈیشن)۔

تھا۔ اگر آپ نے سن رکھا ہے کہ شیعہ احادیث میں "جفر" اور "جامعہ" کے نام آتے ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ "جامعہ" اسی کتاب کا نام ہے۔ یہ گرانبہا علمی مجموعہ امام علی بن ابی طالبؑ کے بعد یکے بعد دیگرے دوسرے ائمۂ اہلبیتؑ کے پاس رہا اور وہ بزرگوار اسے وقتاً فوقتاً لوگوں کو دکھاتے تھے[1] اور اس سے حدیثوں کا استخراج کرتے تھے۔ ان معتبر مصادر کے مطابق جو کہ دستیاب ہیں، یہ مجموعہ گائے کے چمڑے پر لکھا گیا تھا اور اس کی لمبائی ستر ذراع تھی[2]۔

پس رسول اکرمؐ نے امیرالمومنینؑ کو اپنی حدیث سے یعنی ان تمام چیزوں سے جو آپ پر وحی کی گئیں اور جن کی ضرورت بنی نوعِ انسان کو قیامت تک پڑے گی روشناس کرادیا اور آپ نے ان سب چیزوں کو لکھ لیا اور اپنے بعد آنے والے ائمۂ اہل بیتؑ کے لیے چھوڑ گئے۔

رسولِ اکرمؐ نے وہ تمام احکام اپنے اصحاب کو پہنچا دیے جن کی آپ کے زمانے کے مسلمانوں کو ضرورت تھی یعنی ان مسائل کے بارے میں احکام جو آپ کے زمانے میں پیدا ہوئے اور لوگوں نے ان کے متعلق پوچھا یا ان کا ذکر کرنا آپ نے ضروری سمجھا لیکن کچھ مسائل ایسے بھی تھے جن کا وقت ابھی نہیں آیا تھا لہٰذا آپ نے انھیں اپنے وصی امام علیؑ کے پاس بطور امانت رکھوا دیا تاکہ مناسب وقت پر وہ خود یا ان کے فرزند انہیں لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ جن چیزوں کی آنحضرتؐ کے زمانے میں لوگوں کو ضرورت تھی ان کے بارے میں احکام آپ نے لوگوں پر واضح کر دیے اور پھر انہیں حکم دیا کہ آپ کے ارشادات دوسروں کے لیے نقل کریں اور ان کی حفاظت کرنے اور انہیں آئندہ نسلوں کو

---

[1] بصائر الدرجات صفحہ ۱۴۳ حدیث ۵، صفحہ ۱۴۴ حدیث ۹، صفحہ ۱۴۵ حدیث ۱۷ اور صفحہ ۱۶۵ حدیث ۱۴۔ اصول کافی جلد ۲ صفحہ $\frac{219}{220}$، جلد ۷ صفحہ ۸۱، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۱۱۹ اور ۱۲۵۔

[2] بصائر الدرجات صفحہ ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۷ اور ۱۴۸۔ اصول کافی جلد ا صفحہ ۲۳۹-۲۴۱ الوافی جلد ۲ صفحہ ۱۳۵۔ جامعہ کے بارے میں کافی معلومات کے لیے مصنف کی کتاب مقدمہ مرآۃ العقول جلد ۲ صفحہ ۱۰۲-۱۲۲ ملاحظہ فرمائیے۔

منتقل کرنے کی خاطر انھیں لکھ لیں۔ قرآن اور آنحضرتؐ کے اس قسم کے ارشادات سے یا آپ کی دینی روش کے بیان سے جنہیں ملا کر سنتِ پیغمبرؐ کہا جاتا ہے اور جو دو حصوں یعنی حدیث اور سیرت پر مشتمل ہے اسلام تشکیل پا رہا تھا۔

حدیثِ رسولؐ نقل کرنے کی ممانعت

رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد کیا ہوا؟ ذہبی جو اہلِ سنت کے ایک مشہور عالم ہیں فرماتے ہیں کہ خلیفہ ابوبکر نے عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد مسلمانوں اور صحابہ کو جمع کیا اور کہا:

"تم رسولِ کریمؐ سے حدیث نقل کرتے ہو اور بلاشبہ اس بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہو اور مزید اختلافات پیدا کرو گے۔ تمہارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ یقیناً بہت بڑے اختلافات کا شکار ہو جائیں گے لہٰذا رسول اللہؐ سے کوئی چیز نقل نہ کرو۔ جب بھی کوئی شخص تم سے سوال کرے تو کہو: ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہے۔ اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام سمجھو[1]۔"

(ہم دیکھتے ہیں کہ کیسا عجیب بہانہ بنایا گیا اور کیونکر باطل کو حق کا لباس پہنایا گیا اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کس حد تک اور کس قدر صحیح طور پر رسول اکرمؐ کی پیشین گوئیاں پوری ہوئیں)۔

قرظہ بن کعب جو ایک صحابی ہیں ایک اور واقعہ نقل کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

"جب خلیفہ عمر نے مجھے عراق کا حاکم بنا کر بھیجا تو "صرار" تک پیدل میرے ساتھ آئے اور مجھ سے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہاری مشایعت کیوں کی ہے؟"

میں نے جواب دیا: "آپ میری عزت افزائی کرنا چاہتے ہیں۔"

انھوں نے کہا: "اس کے علاوہ ایک اور بات بھی میرے ذہن میں تھی، وہ یہ کہ میں تمہیں بتاؤں کہ تم ایک ایسے شہر میں جا رہے ہو جہاں کے لوگوں کے قرآن پڑھنے کی آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کانوں میں پہنچتی ہے چنانچہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم رسولِ خداؐ کی احادیث نقل کر کے انہیں تلاوتِ قرآن سے باز رکھو۔ ان لوگوں کو احادیث نہ سنانا۔ میں اس

---

[1] شمس الدین ذہبی، تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۲-۳ مطبوعہ ہندوستان۔

کام (کے ثواب) میں تمہارے ساتھ شریک ہوں۔"

قرظہ کہتے ہیں کہ خلیفہ کی یہ باتیں سننے کے بعد میں نے رسول اللہ ؐ کی ایک بھی حدیث نقل نہیں کی۔

اہلِ عراق نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور انھوں نے رسول اکرم ؐ کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ تازہ مسلمان جنھوں نے اپنے پیغمبر ؐ کو نہیں دیکھا تھا ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں گے اور ان کی خواہش ہوگی کہ آپ کی احادیث سنیں اور آپ کی سنت سے آشنا ہوں لہٰذا بدیہی امر ہے کہ وہ قرظہ سے کہتے ہوں گے کہ ہمیں احادیث سناؤ اور قرظہ جواب دیتے ہوں گے کہ" میں احادیث نقل نہیں کر سکتا کیونکہ خلیفہ عمر نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا ہے[1]۔"

اسی سلسلے کی ایک اور روایت ہے جو بہت عجیب ہے اور دیکھنے میں آتا ہے کہ اس میں بڑے دقیق معنی پنہاں ہیں۔ اگر سابقہ امتوں کے لوگ خود آسمانی حقائق کو چھپاتے تھے تو یہاں اس بات کی شدید ممانعت کی گئی کہ لوگ حدیث کو چھپائیں اور روایات کو نقل نہ کریں۔

مورخین کا کہنا ہے کہ اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل خلیفہ عمر نے ایک ایلچی کو عالمِ اسلام کے مختلف مقامات پر بھیجا اور رسول اکرم ؐ کے کچھ اصحاب کو مدینہ بلوایا۔ یہ اصحاب ابوذر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن حذیفہ، ابودرداء اور عقبہ بن عامر وغیرہ تھے۔ جب وہ سب جمع ہوگئے تو انھوں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا: "یہ احادیث کیا ہیں جو تم نے دنیا میں پھیلا رکھی ہیں؟"

انھوں نے کہا: "کیا تم ہمیں احادیث نقل کرنے سے منع کرتے ہو؟"

انھوں نے کہا: "نہیں! میں تمہیں منع نہیں کرتا۔ تم لوگ یہیں مدینہ میں میرے پاس رہو۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں تم میری نظروں سے اوجھل نہیں رہو گے اور اس شہر سے باہر نہیں جاؤ گے۔ ہم زیادہ دانا ہیں اور بہتر جانتے ہیں کہ

---

[1] سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۸۵۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۱۲ حدیث ۲۸۔ شمس الدین ذہبی تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۷۔ جامع بیان العلم جلد ۲ صفحہ ۱۴۷۔ خطیب بغدادی: شرف اصحاب الحدیث صفحہ ۸۸۔

جو احادیث تم نقل کرتے ہو ان میں سے کون سی قبول کریں اور کون سی رد کریں لیکن دوسرے لوگ نہیں جانتے کہ کیا قبول کریں اور کیا رد کریں۔"

یہ اصحابِ رسولؐ خلیفہ کے مرنے تک مدینہ سے باہر اور خلیفہ کے پاس سے دُور نہیں گئے اور فی الواقع زیرِ نگرانی رہے۔[1]

یہ کیسی احادیث ہیں جنہیں حاکمِ وقت پہچانتا ہے اور ان میں سے قابلِ قبول اور ناقابلِ قبول کو ایک دوسری سے جدا بھی کر سکتا ہے لیکن دوسرے صحابہ نہ تو ان سے واقف ہیں اور نہ ہی انہیں ایک دوسری سے الگ کر سکتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خلیفہ ان افراد کو (یعنی صحابۂ رسولؐ کو) جھوٹ بولنے کا الزام نہیں دیتا۔ اصولاً ان میں ابوذرؓ جیسی ہستی بھی شامل ہے جس سے زیادہ راستگو آدمی پر آسمان نے سایہ نہیں ڈالا۔[2]

مجبوراً اس کا تجزیہ یوں کر سکتے ہیں کہ ناقابلِ قبول احادیث وہ تھیں جو اس وقت کی حکومت کی سیاست سے موافقت نہیں رکھتی تھیں لہٰذا یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان احادیث کے بیان کرنے والوں کو زیرِ نگرانی رکھا جائے تاکہ وہ انہیں نشر نہ کر سکیں۔

کچھ مؤرخین کا کہنا ہے کہ خلیفہ عمر نے تین صحابہ یعنی ابن مسعود، ابن درداء اور ابو مسعود انصاری کو مدینہ میں نظر بند کر دیا اور ان کا جرم یہ بتایا کہ وہ زیادہ حدیثیں نقل کرتے تھے انھوں نے کہا کہ: "تم نے رسولِ اکرمؐ سے بہت زیادہ حدیثیں روایت کی ہیں۔"[3]

یہ مدارک کے اس سلسلے کے چند نمونے تھے جو حدیثوں کی نشر و اشاعت کی ممانعت کے بارے میں موجود ہیں تاہم مسئلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے بلند تر ہے۔ دوسرے خلیفہ کے زمانے میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے لیے احادیث جمع کر کے انہیں

---

[1] کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۲۳۹ حدیث ۴۸۶۵، پہلا ایڈیشن۔ منتخب کنز العمال برحاشیہ المسند جلد ۴ صفحہ ۶۱۔ المستدرک جلد ۱ صفحہ ۱۱۰۔

[2] ابوذرؓ کے فضائل کے بارے میں رسول اکرمؐ کے ارشادات (صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۶۹، حدیث ۳۸۰۱۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۵۵ حدیث ۱۵۶۔ المسند جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ اور ۱۷۵)۔

[3] شمس الدین ذہبی: تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۷، خطیب بغدادی: شرف الحدیث صفحہ ۸۷۔

لکھ لیا تھا مثلاً ایک صحابی نے جنہیں پچاس حدیثیں یاد تھیں انہیں چمڑے یا شانے کی ہڈی وغیرہ پر لکھ کر احادیث کا ایک چھوٹا سا رسالہ تیار کر لیا۔ دوسرے نے تیس حدیثیں جمع کرلیں اور تیسرے نے اسی طرح کسی اور تعداد میں حدیثیں جمع کرلیں لہٰذا آنحضرتؐ کی احادیث پر مبنی بہت سی تحریریں لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ ایک دن خلیفہ نے منبر پہ بیٹھ کر لوگوں کو قسم دی کہ ایسی تمام تحریریں لے آئیں۔ خلیفہ بے حد مقتدر تھا اور کسی میں مخالفت کی ہمت نہ تھی لہٰذا اس کے حکم کے مطابق تمام تحریریں لائی گئیں اور پھر اس نے حکم دیا کہ ان سب کو جلا دیا جائے۔[1]

حدیث کا یہ حشر اور اس کی نشر و اشاعت کی یہ کیفیت خلیفہ عمر کے زمانے میں ہوئی اور جہاں تک مدارک سے پتا چلتا ہے خلیفہ عثمان کے دور میں بھی اس بارے میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ خلیفہ عثمان نے اپنے عہدِ حکومت میں بر سرِ منبر اعلان کیا کہ: "جو احادیث خلیفہ ابوبکر اور خلیفہ عمر کے زمانے میں بیان نہیں کی گئیں وہ اب بھی بیان نہ کی جائیں البتہ جو احادیث خلیفہ عمر کے زمانے میں اور ان کی اجازت سے نقل کی گئی تھیں وہ اب بھی نقل کی جا سکتی ہیں۔"[2] اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں خلیفہ عمر نے کہا تھا "عملی اور عبادی مسائل کے علاوہ کوئی روایت نقل نہ کی جائے۔"[3]

لہٰذا حدیث کی اشاعت اور نقل اور روایاتِ نبوی کے بیان پر پابندی خلیفہ عثمان کے طویل دورِ حکومت میں بھی برقرار تھی اور حکومت کی مشینری اپنی پوری قوت سے اس چیز کو کنٹرول کیے ہوئے تھی۔

معاویہ کے زمانے میں بھی حالات اسی نہج پر تھے بلکہ ان میں زیادہ شدت آگئی تھی۔ اس نے برسرِ منبر کہا تھا: "اے لوگو! رسول اکرمؐ کی احادیث لکھنے سے پرہیز کرو سوائے ان احادیث کے جو خلیفہ عمر کے زمانے میں بیان کی گئی تھیں۔"[4]

---

[1] ابن سعد: طبقات الکبریٰ جلد ۵ صفحہ ۱۴۰ مطبوعہ بیروت۔ شرف اصحاب الحدیث؛ تقیید العلم صفحہ ۵۲

[2] منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۶۴

[3] البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۰۷ مطبوعہ بیروت

[4] خطیب بغدادی: شرف اصحاب الحدیث صفحہ ۹۱۔ تحقیق ڈاکٹر محمد سعید خطیب اوغلی۔

یقیناً مسئلے کا صرف یہی ایک پہلو نہیں تھا اور یہ نہیں ہوا کہ حدیث نقل کرنے کی ممانعت کی عظیم تحریک کا کوئی مقابلہ ہی نہ ہوا ہو۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس بہت بڑی تخریب کاری کا احساس کرتے ہوئے اس کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ ہم اس موضوع پر فقط دو تین تاریخی واقعات بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

حق و حقیقت کے میدان میں

حضرت ابوذرؓ حج کے ایام میں جمرۂ وسطیٰ میں (پتھر کا وہ ستون جس پر مجسم شیطان کی علامت کے طور پر حاجی کنکریاں مارتے ہیں) بیٹھے ہیں۔ وہ رسولِ اکرمؐ کے برگزیدہ صحابی ہیں۔ لوگ انہیں پہچانتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ کچھ اشخاص ان کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے ہیں اور ان سے سوالات پوچھ رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ سوالات دینی مسائل کے متعلق ہیں۔ ابوذرؓ بھی جواب دے رہے ہیں لیکن اپنی رائے سے نہیں بلکہ ارشاداتِ رسولؐ کی بنا پر۔ اس گفتگو کے دوران ایک شخص آپ کے پاس آکھڑا ہوا اور کہنے لگا:

"کیا تمہیں فتویٰ دینے سے منع نہیں کیا گیا ہے؟"

ابوذرؓ نے سر اٹھایا اور اس شخص پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا: "کیا تمہیں مجھ پر مامور کیا گیا ہے؟ اگر تم اپنی تلوار یہاں رکھ دو (پھر اپنی گردن کی جانب اشارہ کیا) اور یہ چاہو کہ میرا سر کاٹ ڈالو اور مجھے بھی معلوم ہو کہ میرا سر حدیث بیان کرنے کی بنا پر کاٹا جا رہا ہے تب بھی اگر تمہاری تلوار کے میرے گلے تک پہنچنے میں اتنا فاصلہ ہو کہ میں فرموداتِ پیغمبرؐ میں سے ایک لفظ اپنے منہ سے ادا کر سکوں تو میں وہ لفظ ادا کروں گا۔"[1]

یہ حدیث دارمی نے اپنی سنن میں اور ابن سعد نے طبقات الکبریٰ میں نقل کی ہے۔ بخاری نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے لیکن جیسا کہ اس کا طریقہ ہے اس نے اس کے حساس نقاط کو اس انداز میں حذف کیا ہے کہ (خلفاء اور امراء کے طبقے میں سے) کسی کی شخصیت پر آنچ نہ آئے۔

---

[1] سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۱۳۶-۱۳۷ مطبوعہ محمد احمد دھمان۔ طبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۳۵۴ مطبوعہ بیروت۔ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۶ مطبوعہ بولاق مصر۔

حکومت کی مشینری اور خلفائے وقت ابوذرؓ کو خاموش اور رام نہ کر سکے لہٰذا انہوں نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ ابوذرؓ کو مدینہ سے، جہاں ان کے محبوب نبیؐ کا جسدِ اطہر مدفون تھا، شام بھیج دیا گیا۔ وہ شام میں بھی احادیث بیان کرتے رہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل پیرا رہے۔ وہ رسولِ اکرمؐ کے ارشادات کو معطل شدہ احکام کی حیثیت سے نقل کرتے تھے۔ بنی تمیم کا رئیس احنف بن قیس تمیمی کہتا ہے کہ میں شام میں نماز جمعہ پڑھنے گیا۔ نماز کے بعد میں نے ایک شخص کو دیکھا جو مسجد کے جس گوشے میں بھی جاتا تھا لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ بہت خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا اور بیٹھ گیا (احنف نے ایک عجیب منظر دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس پیرمرد کو کیا ہو جاتا ہے کہ جس طرف بھی یہ جاتا ہے لوگ راہِ فرار اختیار کرتے ہیں)۔ میں نے پوچھا: "اے بندۂ خدا! آپ کون ہیں؟"

اس شخص نے کہا: "تو کون ہے؟"

میں نے جواب دیا: "میں احنف بن قیس ہوں۔"

تب وہ شخص کہنے لگا: "فوراً اٹھو اور میرے پاس سے چلے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری بدبختی تم تک پہنچ جائے۔"

میں نے کہا: "تمہاری بدبختی مجھ تک کیسے پہنچے گی؟ کیا تمہیں کوئی متعدی مرض ہے جو مجھے لگ جائے گا؟"

اس نے جواب دیا: "اس شخص (معاویہ) نے حکم دے رکھا ہے کہ کوئی شخص میرے پاس نہ بیٹھے۔"[۱]

جب دیکھا گیا کہ حکومتِ وقت کے احکام ابوذرؓ پر کوئی اثر نہیں کرتے اور وہ فراموش شدہ اسلام یعنی آنحضرتؐ کی احادیث لوگوں تک پہنچانے کی ذمے داری سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں اور جلاوطنی اور دھمکیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تو حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص ان کے پاس نہ بیٹھے اور ارشاداتِ خداوندی اور احادیثِ رسولؐ ان سے نہ سنے۔

۱۔ طبقات الکبریٰ جلد ۴ صفحہ ۲۲۹ مطبوعہ بیروت۔

کیا حقائق اسلام کا اس سے زیادہ اخفاء بھی ممکن ہے؟ ابوذرؓ نے شام میں بھی ارباب حکومت کی جانب سے جاری کردہ فرامین کی کوئی پروا نہ کی اور برابر احادیثِ رسولؐ نقل کرتے رہے اور ایسی باتیں کہتے رہے جو حکومتِ وقت، معاویہ اور خلیفہ عثمان کے سیاسی مفادات کے خلاف تھیں۔[1]

معاویہ نے ابوذرؓ سے چال چلنے کی کوشش کی لیکن یہ نڈر اور خدا ترس پیر مرد رام ہونیوالا نہ تھا۔ معاویہ عاجز آچکا تھا۔ ایک رات سو دینار کی رقم ابوذرؓ کے لیے لائی گئی۔ یہ رقم معاویہ نے بھیجی تھی۔ ابوذرؓ نے وہ ساری رقم راتوں رات فقراء میں تقسیم کر دی۔ صبح ہوئی تو معاویہ کا آدمی آیا اور کہنے لگا: "میں غلطی سے وہ رقم آپ کے پاس لے آیا تھا وہ واپس کر دیجیے اور میری مدد فرما کر مجھے مصیبت سے نجات دلائیے۔"

ابوذرؓ نے جواب دیا: "صبر کرو۔ میں نے وہ رقم حاجتمندوں میں تقسیم کر دی تھی، اب جاتا ہوں اور جمع کر کے لاتا ہوں۔"[2]

دولت، طاقت، لالچ یا دھمکیوں نے ابوذرؓ پر کوئی اثر نہ کیا لہٰذا معاویہ نے خلیفہ عثمان کو لکھا کہ اگر تمہیں شام کی ضرورت ہے تو ابوذرؓ کو واپس بلا لو۔ خلیفہ نے حکم بھیجا کہ ابوذرؓ کو مدینہ بھیج دیا جائے چنانچہ آپ کو مدینہ واپس بھیج دیا گیا۔

شام سے مدینے تک کے طویل سفر کے دوران جو آپ نے بغیر پالان کے اونٹ پر طے کیا چند لوگ آپ کی نگرانی پر مامور تھے۔ وہ آپ کو اترنے کی اجازت دیے بغیر اونٹ کو بیابانوں میں بھگاتے ہوئے لے آئے۔ اس سختی کی وجہ سے جو آپ کو راستے میں برداشت کرنی پڑی، آپ کی رانوں کا گوشت ادھڑ گیا۔[3]

ابوذرؓ اسی ناگفتہ بہ حالت میں زخمی بدن کے ساتھ دربارِ خلافت میں وارد ہوئے۔ خلیفہ کا پرانا دوست عبدالرحمٰن بن عوف فوت ہو چکا تھا اور اس کی چھوڑی ہوئی دولت خلیفہ

---

[1] انساب الاشراف جلد ۵ صفحہ ۵۲ مطبوعہ یروشلم ۱۹۳۸ء، تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۴۸-۱۴۹ مطبوعہ نجف، عراق۔ [2] سیر اعلام النبلاء جلد ۲ صفحہ ۵۰ مطبوعہ مصر۔

[3] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۴۹ مطبوعہ نجف، عراق۔

کے پاس لائی گئی تھی تاکہ وہ اسے عبدالرحمٰن کے وارثوں میں تقسیم کردے۔ اس کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ دربار میں دوسری طرف کھڑا ہوا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ خلیفہ چاہتا تھا کہ یہ تمام دولت وارثوں میں تقسیم کردے۔

خلیفہ نے کہا: "میں عبدالرحمٰن کے لیے بھلائی اور نیک بختی کی امید رکھتا ہوں۔ وہ صدقہ دیتا تھا، مہمانداری کرتا تھا اور جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ چھوڑ کر مرا ہے۔"

کعب الاحبار نے جواب میں کہا: "یا امیرالمومنین! آپ نے بجا فرمایا ہے۔"

ابوذرؓ نے اپنی خستہ حالت میں اپنا عصا بلند کیا اور کعب الاحبار کے سر پر مارا اور کہا:
"اے یہودی کی اولاد تو ہمیں ہمارا دین سکھاتا ہے۔" پھر یہ آیت پڑھی: "وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ" یعنی جو لوگ سونا اور چاندی اکٹھا کرکے رکھتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی وعید سنا دو۔[1]"

بلاشبہ یہ سونے اور چاندی کا ذخیرہ کرنا املاک رکھنے سے الگ چیز ہے۔ باغ، مالِ تجارت اور سرمایہ وغیرہ کا مالک ہونا حرام نہیں ہے اور اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ شرعِ مقدس اسلام میں اگر روپیہ پیسہ گردش میں رکھا جائے، اسے بازار میں لایا جائے تو خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو کوئی حرج نہیں اور وہ روپیہ پیسہ حرام نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ روپیہ پیسہ کا ذخیرہ کرنا پسند نہیں فرماتا۔ کنز (خزانہ) پر بحث اسلام میں بجائے خود ایک خاص مبحث کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس مختصر بحث میں اس کے مطالعے کی گنجائش نہیں۔[2]

کچھ مورخین نے خلیفہ عثمان اور کعب الاحبار کی مجلس اور ابوذرؓ کے مقابلے کو ایک اور صورت میں پیش کیا ہے۔ گفتگو کی تکمیل کے لیے ہم اس کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

عثمان: جو شخص اپنے مال کی زکات دیدے کیا اس کی دولت پر کوئی اور حق بھی رہ جاتا ہے؟

کعب الاحبار: نہیں یا امیرالمومنین!

---

[1] سورۂ توبہ۔ آیت ۳۴، مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۳۴۰ مطبوعہ بیروت۔
[2] اس موضوع پر تفصیلی معلومات کے لیے علامہ السید محمد حسین طباطبائی کی تفسیر المیزان جلد ۹ صفحہ ۲۶۰/۲۷۸ مطبوعہ تہران دیکھیے۔

ابوذرؓ نے کعب کے سینے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا اور کہا: اے یہودی کی اولاد تو نے جھوٹ بولا۔"

پھر یہ آیۂ شریفہ تلاوت کی: لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ..... وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ..... "

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق اور مغرب کی جانب پھیر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ خدا کی محبت کی راہ میں مال خرچ کرو۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۷۷)۔

عثمان: "کیا اس میں کوئی حرج ہے کہ ہم مسلمانوں کے بیت المال میں سے کچھ لے لیں اور اسے اپنے کام میں صرف کریں اور پھر لوٹا دیں؟"

کعب الاحبار: "کوئی حرج نہیں۔"

ابوذرؓ نے اپنا عصا کعب کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا اور کہا: "تم کتنی لاپروائی سے ہمارے دین کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہو؟"[1]

خلیفہ عثمان خود اپنے سامنے اور اپنے دربار کے عالم کے ساتھ ابوذرؓ کی یہ تلخ گفتگو برداشت نہ کر سکے، بالخصوص جب ان باتوں کی تائید آنحضرتؐ کی مختلف احادیث سے ہو گئی[2] لہٰذا ابوذرؓ ہجرت کر کے جس مکان میں آئے تھے انہیں اس میں سے نکال دیا گیا اور ربذہ کے غیر آباد بیابان میں بھیج دیا گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں کوئی نہ ہو جو ان کی بات سنے اور نہ وہ کسی کو اپنے خلیل نبیٔ اکرمؐ کی حدیث سنا سکیں یا اسلام کے احکام بیان کر سکیں۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

میثم تمارؓ اور رُشید ہجریؓ کی شہادت اور موت کی وجہ بھی یہی تھی۔ میثم تمارؓ امیرالمومنین امام علی بن ابی طالبؑ کے ممتاز شاگرد تھے۔ انہوں نے آپ سے احادیث روایت کی ہیں اور اسلام کی معرفت بھی آپ ہی کے ذریعے حاصل کی۔ میثمؓ اپنی زندگی کے آخری سال میں

---

[1] مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۳۳۹-۳۴۰ مطبوعہ یوسف اسعد داغر بیروت ۱۹۶۵ء بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ سومؓ کی مجلس میں ابوذرؓ کا کعب الاحبار سے کئی مرتبہ ٹکراؤ ہوا۔

[2] مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۳۴۰-۳۴۱۔

۵۸ھ یا ۶۰ھ میں حج کے لیے گئے اور وہاں سے مدینہ آئے۔ مدینے میں وہ ام المومنین ام سلمیٰؓ کے مکان پر گئے۔ ام سلمیٰؓ نے ان کے احترام کے طور پر انہیں اپنی ڈاڑھی معطر کرنے کے لیے ایک خاص عطر دیا جس کا نام غالیہ تھا۔

میثمؓ نے کہا: "اگر اس وقت میری ڈاڑھی اس عطر سے معطر ہو رہی ہے تو وہ دن بھی دور نہیں جب اس خاندان کی محبت میں یہ خون سے رنگین ہو جائے گی"۔

ام سلمیٰؓ نے فرمایا: "وَاللّٰهِ لَرُبَمَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَذْكُرُكَ وَيُوْصِي بِكَ عَلِيًّا" "میں نے سنا ہے کہ رسولِ خداؐ اکثر تمہیں یاد کرتے تھے اور علیؑ سے تمہاری سفارش فرماتے تھے"۔[1]

میثمؓ[2] ایک آزاد کردہ غلام تھے اور انہوں نے امیر المومنینؑ سے تربیت پائی تھی اور قرآن کی تفسیر اور تاویل آپ ہی سے سیکھی تھی۔

ام المومنین ام سلمیٰؓ کے ہاں سے باہر آنے پر میثمؓ کی ملاقات حبر الامہ ابن عباسؓ سے ہو گئی۔ میثمؓ نے ابن عباسؓ سے جو اس زمانے میں اول درجے کی علمی شخصیت تھے کہا: "اے ابن عباسؓ! کاغذ اور قلم لائیے اور بیٹھیے تاکہ میں آپ کے لیے قرآن مجید کی تفسیر بیان کروں جو میں نے امیر المومنین علیہ السلام سے سیکھی ہے"۔

ابن عباسؓ بیٹھ گئے اور لکھنے لگے۔ جو کچھ میثمؓ نے کہا اس کی نوعیت بلا شبہ واضح ہے۔ وہ امام علیؑ کے واسطے سے رسولِ اکرمؐ سے حدیث روایت کرتے تھے اور ان دو بزرگ معلموں کی تفسیر امت کے لیے دہراتے تھے۔ گفتگو کے دوران میثمؓ نے اپنے مستقبل کے بارے میں پیشگوئی کی اور ابن عباسؓ سے کہا: "اگر آپ مجھے سولی پر دیکھیں تو کیسا محسوس کریں گے۔ جن نو آدمیوں کو سولی پر لٹکایا جاتے گا ان میں سے نواں میں ہوں گا۔ میری سولی کی لکڑی سب سے چھوٹی ہو گی اور زمین سے زیادہ نزدیک ہو گی"۔

---

[1] الکنیٰ والالقاب جلد ۳ صفحہ ۲۱۸ (چوتھا ایڈیشن ۱۳۹۷ھ) سفینۃ البحار، مادہ میثم جلد ۲ صفحہ ۵۲۳-۵۲۴۔ بحار الانوار جلد ۴۲ صفحہ ۱۲۴۔

[2] آپ ایرانی النسل تھے۔

یہ باتیں ابنِ عباسؓ کے لیے سخت تعجب انگیز تھیں لہٰذا انھوں نے کہا: "کیا تم کاہن ہو گئے ہو اور کہانت کرنے لگے ہو اور غیب کی باتیں بتانے لگے ہو؟" یہ کہہ کر ابنِ عباسؓ نے ہاتھ بڑھایا تاکہ جو تفسیرِ قرآن میثمؓ نے لکھوائی تھی اسے پھاڑ دیں۔

میثمؓ نے کہا: "ہاتھ روک لیجیے۔ جو پیشین گوئی میں نے کی ہے اگر وہ درست ثابت ہو اور یہ واضح ہو جائے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے درست ہے تو پھر آپ اس تحریر سے استفادہ کر سکتے ہیں اور اگر میری باتیں غلط ثابت ہوں تو پھر یہ کاغذ بےشک پھاڑ دیجیے گا۔"

میثمؓ کوفہ واپس چلے گئے۔ یہ اس کے تمام ظلم و ستم اور خونخواری کے ساتھ عبیداللہ ابن زیاد کا دورِ حکومت تھا۔ دو دن بعد ابن زیاد کے کارندوں نے میثمؓ کو گرفتار کر لیا اور حاکم کے پاس لے گئے۔ ان دونوں کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

ابن زیاد: کیا تم میثمؓ ہو؟

میثمؓ: ہاں میں میثمؓ ہوں۔

ابن زیاد: کیا تم ابوتراب سے برأت اور بیزاری چاہتے ہو؟

میثمؓ: میں ابوتراب کو نہیں جانتا۔

ابن زیاد: کیا تم علی ابن ابی طالبؑ سے بیزاری چاہتے ہو؟

میثمؓ: اگر میں یہ کام نہ کروں گا تو کیا ہوگا؟

ابنِ زیاد: میں تمہیں قتل کر دوں گا۔"

میثمؓ: امیرالمومنینؑ نے مجھے کہا تھا کہ تو (یعنی ابن زیاد) مجھے جلد ہی سولی پر لٹکا دیگا اور مار ڈالے گا اور میری زبان بھی کاٹ دیگا۔

ابن زیاد: مَیں علیؑ کی پیشین گوئی کا جھوٹا پن ثابت کروں گا۔ مَیں تیرے ہاتھ پاؤں کاٹ دونگا اور تجھے سولی پر لٹکا دوں گا لیکن تیری زبان باقی رہنے دوں گا۔

پھر اس نے حکم دیا کہ میثمؓ کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں اور انھیں سولی پر لٹکا دیا جائے۔

اس زمانے میں سُولی یا صلیب ایک لکڑی ہوتی تھی جس کے دونوں سرے دو پایوں پر ٹکے ہوتے تھے۔ سزایافتہ شخص کے ہاتھ اس پر باندھ دیے جاتے تھے اور اسے اسی حالت

میں چھوڑ دیا جاتا تھا حتیٰ کہ اس کی موت واقع ہو جاتی۔ میثمؓ نے سولی پر لٹکے ہوئے پکارا: "اَیُّهَا النَّاسُ مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّسْمَعَ الْحَدِیْثَ الْمَکْنُوْنَ عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ."

یعنی اے لوگو! تم میں سے جو شخص ایسی احادیث سننا چاہتا ہو جو ابھی تک علی ابن ابی طالبؑ سے نقل نہ کی گئی ہوں تو وہ آئے اور حدیث سنے۔[1]

لوگ جمع ہو گئے اور میثمؓ نے سولی پر لٹکے ہوئے تعجب انگیز احادیث بیان کرنی شروع کر دیں۔ یہ وہ احادیث تھیں جو سینوں میں دبی ہوئی تھیں اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو انہیں جانتے ہوئے بھی ان کے اظہار کی جرأت کر سکیں، اور ماحول پر جو شدید پریشانی کی کیفیت طاری تھی وہ بھی ان کی نشر و اشاعت کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اب یہی احادیث امیر المومنینؑ کے جانباز اور سر فروش ساتھی میثمؓ کی زبانی سولی پر سے سنی جا رہی تھیں۔ لوگوں نے ابن زیاد کو اطلاع دی کہ اگر اس شخص کی زبان نہ کاٹی گئی تو ڈر ہے کہ وہ کوفہ کے لوگوں کو تمہارے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دے گا۔ اس پر اُس نے حکم دیا کہ ایک کارندہ جائے اور اس کی زبان کاٹ لے۔ کارندہ میثمؓ کی سولی کے پاس آیا اور کہنے لگا: "اے میثمؓ! اپنی زبان باہر نکالو۔ امیر نے مجھے اس کے کاٹنے پر مامور کیا ہے۔"

میثمؓ نے جواب دیا: "یہ بدکار لونڈی کا بیٹا چاہتا تھا کہ مجھے اور میرے مولا کو جھوٹا ثابت کرے۔ آؤ یہ رہی میری زبان!"

کارندے نے ان کی زبان کاٹ لی۔ میثمؓ اپنے خون میں لتھڑے ہوئے کچھ دیر تڑپے اور پھر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔[2]

رُشید ہجریؓ کی زندگی کا خاتمہ بھی اسی انداز میں ہوا۔ انہوں نے بھی حدیث بیان کرنے کی خاطر اپنی زبان کٹوائی اور قتل کر دیے گئے۔ جب انہیں ابن زیاد کے سامنے لایا گیا تو اس نے کہا: "اپنے مولا کے کچھ جھوٹ ہمیں بھی سناؤ۔"

رُشیدؓ نے کہا: "خدا کی قسم نہ میں جھوٹا ہوں اور نہ میرے مولا جھوٹے تھے اور انہوں

---

[1] رجال الکشی صفحہ ۸۰ مطبوعہ کربلا۔ عراق اور صفحہ ۸۶-۸۷ مطبوعہ مشہد، ایران۔ بحار الانوار جلد ۴۲ صفحہ ۱۳۳

[2] اختیار معرفۃ الرجال صفحہ ۷۹-۸۷۔ الارشاد صفحہ ۱۵۲-۱۵۴۔ بحار الانوار جلد ۴۲ صفحہ ۱۲۷-۱۳۳

نے واقعی مجھے بتایا ہے کہ تو میرے ہاتھ پاؤں اور زبان کاٹ ڈالے گا۔"

"ابن زیاد نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو خدا کی قسم میں اس کو جھوٹ ثابت کر دونگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے باہر پھینک دو۔"

جب رشیدؓ کو اس حالتِ زار میں ان کے گھر لے جایا گیا تو ان کی بیٹی نے پوچھا: "کیا آپ کو درد محسوس ہوا؟"

انہوں نے جواب میں کہا: "نہیں جانِ پدر! خدا کی قسم! نہیں ہوا۔ صرف اتنی تکلیف ہوئی جتنی اس شخص کو ہو جو ہجوم میں پھنس جائے اور وہ ہجوم اسے دھکا پیل سے دبا دے۔"

پھر آپ کے ہمسائے اور ملنے والے آئے اور رشیدؓ کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر رونے لگے۔ رشیدؓ نے کہا: "روؤ نہیں بلکہ کاغذ اور قلم لاؤ تاکہ جو کچھ میرے مولا امیرالمومنینؑ نے مجھے سکھایا ہے وہ تمہیں لکھوا دوں۔"

پھر انہوں نے امیرالمومنینؑ کی احادیث بیان کرنی شروع کیں۔ اس واقعہ کی خبر ابن زیاد تک پہنچی۔ اس نے اپنے کارندے حجام کو بھیجا تاکہ وہ انکی زبان کاٹ لے۔ رشید دلاورؓ نے اسی رات داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔[1]

یہ جو میثمؓ ابوذرؓ اور رشیدؓ نے حدیث کی نشر و اشاعت کی خاطر اپنی زبانیں اور زندگیاں قربان کر دیں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ دین کے تعارف کا اصلی مقام یہی ہے اور اسی نقطے پر عدم توجہ کے باعث اسلام تاراج اور انسانیت کی راہ و رسم فنا اور برباد ہو سکتی ہے۔ وہ صحیح اسلام کے گہرے اور عمیق علم کی بنیاد پر جانتے تھے کہ اسلام کے لیے ایک بنیادی خطرہ اور اسلام کی عمارت کے انہدام کے عوامل میں سے قوی ترین عامل احادیث نبویؐ کا اخفا ہے۔[2] لہٰذا انھوں نے اس راہ میں جان تک کی بازی لگا دی کیونکہ اس مقصد کے حصول کے لیے

---

[1] الارشاد صفحہ ۱۵۴۔ اختیار معرفۃ الرجال صفحہ ۷۵-۷۸۔ بحار الانوار جلد ۴۲ صفحہ ۱۲۱-۱۲۲۔

[2] کیا یہ حقیقت نہیں کہ سنت نبویؐ اسلام کا دوسرا رکن ہے جبکہ پہلا رکن قرآن مجید ہے اور یہ اہلبیت رسولؐ ہیں جو سنتِ نبویؐ کے محافظ اور قرآن کے ہمدوش ہیں۔

جان کی قربانی دینا ایک معمولی چیز تھی۔

یہ گروہ جو حق کی صف میں ہے حدیث نشر کر کے حقائق اسلام کی حفاظت کرتا ہے۔ دوسرا گروہ بھی جانتا ہے کہ تحریف کرنے سے پہلے لازمی ہے کہ رسولؐ کی حدیث نشر نہ ہو چنانچہ وہ حکم دیتا ہے کہ کوئی شخص نہ تو حدیث نقل کرے اور نہ ہی اسے لکھے ممانعت کے حکم میں نقلِ حدیث کے معاملے کو محدود کر دیا گیا[1] کیونکہ اصولاً نقلِ حدیث کا مکمل طور پر بند کر دینا ممکن نہ تھا لیکن حدیث لکھنے کی ممانعت کا حکم ۱۰۰ھ تک جاری رہا۔ اس سال خلیفہ نے حدیث لکھنے کا اجازت نامہ صادر کیا۔ اس سے پہلے برسوں میں کوئی حدیث رسمی طور پر نہیں لکھی گئی اور حدیث کا کوئی مجموعہ یا مدوّن کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی[2]

حدیث لکھنے کا کام ان پسندیدہ کاموں میں شامل ہے جو خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (۹۹ھ۔۱۰۱ھ) نے انجام دیے۔ انہوں نے نہ صرف فدک خاندانِ رسولؐ کو واپس کیا[3] اور نہ صرف امیرالمومنینؑ پر سب و شتم ممنوع قرار دیا[4] بلکہ اپنی خلافت کے دوران میں مدینہ کے لوگوں کو ایک حکمنامہ بھیجا کہ حدیثِ رسولؐ کے متعلق تمہیں جو کچھ معلوم ہو لکھ دو کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم و دانش نابود نہ ہو جائے[5]۔ اس فرمان کے اجراء کے نتیجے میں جو کام پہلے مسلمانوں پر حرام ہو چکا تھا وہ حلال ہو گیا۔ بلاشبہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا کیونکہ حکم خلیفہ کا حکم تھا۔

اس کے بعد بہت سی احادیث نقل کی گئیں اور بہت سی لکھی گئیں۔ حدیث کے بڑے بڑے مجموعے منظرِ عام پر آ گئے۔ حدیث کی مجالسِ درس تشکیل پائیں جن میں بڑی تعداد میں شاگرد

---

[1] اس محدودیت کا مشاہدہ ہم خلیفہ دوم، خلیفہ سوم اور معاویہ کے فرامین میں کر چکے ہیں۔

[2] بلاشبہ یہاں خلفاء کے مکتب کی اکثریت مقصود ہے نہ کہ امامت کے مکتب کی اقلیت کیونکہ موخرالذکر کے تمام یا بیشتر اکابر مثلاً سلمان فارسیؓ کی چھوڑی ہوئی کتابیں موجود ہیں۔

[3] تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۴۸۔ معجم البلدان جلد ۴ صفحہ ۲۳۹ اور الروض المعطار صفحہ ۴۳۸۔

[4] تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۴۸۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۱۸۴۔ الفخری صفحہ ۱۷۶۔ تجارب السلف صفحہ ۷۹۔ تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۴۳۔

[5] فتح الباری۔ باب کتابۃ العلم جلد ۱ صفحہ ۲۱۸۔

شرکت کرنے لگے۔ ہمیں یہ علم نہیں کہ ان احادیث کا کیا بنا جو رسولِ اکرمؐ سے منسوب کر کے گھڑلی گئی تھیں کہ آپ کی حدیث نقل نہ کی جائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیثیں اچانک فراموش کر دی گئیں جیسے کہ ان کا کبھی کوئی وجود ہی نہ تھا۔ ہاں! یہ حرام، حلال ہو گیا کیونکہ خلیفہ نے اسے حلال قرار دیا تھا۔ یہ ممنوع روا ہو گیا کیونکہ خلیفہ کی یہ خواہش تھی۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ خلیفہ "اُولِی الامر" ہے؟ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (سورۂ نساء۔ آیت ۵۹)

یعنی خدا کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے صاحبانِ حکومت ہوں انکی اطاعت کرو۔

ایک خلیفہ نے حکم دیا کہ حدیث نہ لکھو تو لوگوں نے نہ لکھی اور دوسرے خلیفہ نے حکم دیا کہ حدیث لکھو تو لکھنا شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نوے سال تک اہل بیتؑ کے مکتب یعنی امام علیؑ، امام حسنؑ، امام حسین علیہم السلام اور ابوذر، سلمان، عبید اللہ بن ابی رافع، میثم اور رشید رضوان اللہ علیہم وغیرہ کے علاوہ کسی نے حدیث نہ لکھی اور حدیث کا نقل کرنا بھی خلفاء اور مقتدر لوگوں کی مصلحتوں میں محدود ہو کر رہ گیا۔ اس قول کی تفصیل انشاء اللہ بعد میں پیش کی جائے گی۔

اشاعتِ حدیث کی ممانعت اسلام میں تحریف کا بنیادی سبب بنی۔ خلافت کی مشینری ایسے اسلام کی نشر و اشاعت چاہتی تھی کہ اگر معاویہ بن ابوسفیان شام میں کاخِ خضراء تعمیر کرائے تو کوئی یہ کہنے والا نہ ہو کہ رسول اکرمؐ نے یہ کہا ہے اور آپ کے ارشاد کی بنا پر اس محل کی تعمیر ممنوع ہے۔ اگر یزید بن معاویہ شراب خور اور فاسق و فاجر ہوتے ہوئے خلیفہ بن بیٹھے تو کوئی یہ نہ کہے کہ آنحضرتؐ کے اعمال اور طور طریقے یوں تھے کہ وہ اس خلیفہ کی حرکتوں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے لہٰذا جب تک رسولِ اکرمؐ کی حدیث، سیرت اور آپکی زندگی کی صحیح تاریخ موجود ہو مسلمانوں کا منہ بند نہیں کیا جا سکتا اور ممکن ہے کہ کسی وقت بھی کوئی خدا ترس مسلمان فریاد بلند کرے اور تجاوز کرنیوالوں کو رسوا کرے۔ اسی لیے ضروری سمجھا گیا کہ حدیثِ رسولؐ نہ بیان کی جائے اور نہ لکھی جائے اور اس کو نقل کرنا ممنوع قرار پائے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس عمل سے کیا نتائج حاصل کیے گئے اور حقائق میں کس طرح تحریف کی گئی اس کا جواب انشاء اللہ اگلے صفحات میں دیا جائے گا۔

وَالصَّلَاةُ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ

پانچواں درس

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطَانِ الرَّجِیمِ
بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ
اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ وَالصَّلاۃُ وَالسَّلامُ
عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّآلِہِ الطَّاہِرِینَ سِیَّمَا بَقِیَّۃَ اللّٰہِ فِی
الاَرَضِینَ وَلَعنَۃُ اللّٰہِ عَلیٰ اَعدَائِھِم اَجمَعِینَ.

بات اس مسئلے پر ہو رہی تھی کہ شیعہ اور سنی کتابوں میں موجود متواتر احادیث کے مطابق رسولِ اکرمؐ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ جو کچھ سابقہ امتوں میں وقوع پذیر ہوا ہے وہ اس امت میں بھی وقوع پذیر ہوگا۔ اس کے بعد ہم نے گزشتہ امتوں میں جو تحریف، تبدیلی اور اخفا ہوا اس کا مشاہدہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ضروری ہے کہ ایسے ہی ناگوار حوادث اس امت میں بھی ظہور پذیر ہوں اور بطورِ خلاصہ ہم نے یہ بھی کہا کہ اس امت میں بھی اخفائے حق کا وجود رہا اور یوں اسلام ہر پہلو سے تحریف کا شکار رہا ہے اور جب نتیجے کے طور پر اس دین کی شکل ایسی ہوگئی جیسے کہ ایک چوغہ الٹا دیا گیا ہو یا برتن اوندھا کر دیا گیا ہو تو اللہ تعالیٰ نے لطف و کرم فرمایا اور ائمہ اہلبیتؑ کی کوششوں سے اسے دوبارہ زندہ کیا اور معاشرے کو لوٹا دیا۔

یہ تھی بنیادی بات۔ اب ہم ان وسائل کی طرف آتے ہیں جن کی مدد سے مقتدر لوگ اسلام میں تحریف کرنے میں کامیاب ہوئے جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ ان کا پہلا وسیلہ سابقہ امتوں کی طرح اخفائے حق تھا۔

ارشاد خداوندی ہے:

"بے شک جو لوگ ہماری ان دلیلوں اور ہدایتوں کو جنہیں ہم نے نازل کیا ہے اس کے بعد چھپاتے ہیں جبکہ ہم توراۃ میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے تو یہی

لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنیوالے بھی لعنت کرتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۹)۔

یہی اخفائے حق" اسلام میں تحریف کی بنیاد بنا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس چیز کو چھپایا گیا ہے؟ اسی کتاب کے گزشتہ مباحث میں ہم مشاہدہ کر چکے ہیں کہ رسول اکرمؐ کی احادیث اور ارشادات یعنی اسلام کے دوسرے رکن کو چھپایا گیا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس چیز کو نہ صرف متعلقہ لوگوں نے خود چھپایا بلکہ رسولِ اکرمؐ کے رفقاء اور صحابہ کی بھی زبان بندی کر دی تاکہ وہ آنحضرتؐ کی حدیث نقل نہ کر پائیں حتّٰی کہ اس گروہ کا معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ انہوں نے بسترِ مرگ پر رسول اکرمؐ کو بھی اس امر کی اجازت نہ دی کہ وہ اپنی وصیّت لکھ سکیں۔[1]

یہاں سننے والوں نے یہ قضیہ پیش کیا کہ اس قول کی بنا پر رسولِ اکرمؐ کو وصیّت کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اس سوال اور قضیے کے جواب نے ہماری بحث کو منقطع کر دیا اور سلسلۂ سخن امامت کی جانب مڑ گیا کیونکہ آنحضرتؐ کی مکرر اور قطعی وصیّتیں اس (امامت) کی ایک محکم ترین سند ہیں۔

میری بحثیں ہمیشہ اس سلسلے کی ہوتی ہیں جو ائمۂ اہلبیتؑ کے زمانے میں کی جاتی تھیں اور غیبتِ صغریٰ کے زمانے تک جاری رہیں لیکن بعد میں زیادہ تر بھلا دی گئیں اور تقریباً ہزار سال سے ان کی جانب بہت کم توجہ دی گئی ہے لیکن کچھ ایسے مباحث بھی ہیں جو اس وقت سے موجودہ زمانے تک ہمیشہ زیرِ غور رہے ہیں اور شیعہ علماء نے ان کے مختلف پہلوؤں کی وسیع تحقیقات کی ہے اور بحث کا حق ادا کر دیا ہے۔ اب ان موضوعات کی تکرار کی گنجائش نہیں تاکہ میں ان کے متعلق کچھ کہہ سکوں۔ امامت کے بارے میں بحث بھی ان کئی ایک بحثوں میں سے ہے جن کے متعلق تحقیق کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا اور میرا یہ خیال نہیں تھا کہ اب بھی اس کی ضرورت ہو گی لہٰذا میں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس مسئلے کو کبھی نہیں چھیڑا اور اس سے پہلو بچا کر نکل جاتا تھا۔ ان سوالات نے جو گزشتہ بحثوں میں بیان کردہ مطالب کے سلسلے میں پیش کیے گئے مجھے مجبور کر دیا کہ کچھ دیر کے

---

[1] اس قول کی تفصیل اور اسکے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ درس ۶ میں ملاحظہ فرمائیے۔

لیے اس موضوع پر گفتگو کروں اور اختصار کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر اپنی معروضات پیش کروں۔

دو مکاتب کے خیالات کی بنیاد

رسولِ اکرمؐ کی وفات سے لیکر دورِ حاضر تک عالمِ اسلام میں دو مکاتب موجود رہے ہیں یعنی **مکتبِ امامت اور مکتبِ خلافت۔**

آنحضرتؐ کے بعد حاکم اور پیشوا کے بارے میں دو مکاتب کیا کہتے ہیں؟

خلافت کا مکتب کہتا ہے کہ پیشوا اور حاکم چنا جانا چاہیے جبکہ امامت کا مکتب کہتا ہے کہ پیشوا اور حاکم نصب کیا جاتا ہے۔

جو گروہ یہ کہتا ہے کہ پیشوا کا تعین انتخاب کی بنیاد پر ہونا چاہیے وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ انتخاب لوگوں کے ذریعے انجام پانا چاہیے اور پیغمبرؐ کے بعد حاکم کا انتخاب کرنا عوام کا کام ہے لیکن امامت کا مکتب کہتا ہے کہ پیشوا کا تعین انتصاب یعنی نامزدگی کی بنیاد پر ہوتا ہے اور یہ نامزدگی پیغمبرؐ کی جانب سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہوتی ہے۔ نامزدگی خدا کرتا ہے اور پیغمبرؐ اس نامزدگی کے بارے میں لوگوں کو مطلع کرتا ہے۔

یہ تھا دونوں مکاتب کے نظریات کا خلاصہ۔ اب ہم ان نظریات کا مفصل مطالعہ کرتے ہیں اور پہلے مکتبِ خلافت کی آراء تشخیص کرتے ہیں۔

مکتبِ خلافت کے علماء کے پاس ایسی کتابیں موجود ہیں جن میں دوسرے معاملات کے علاوہ حکومت کی تشکیل کا قانون، طور طریقے اور اس کے واجبات، حاکم کی ذمے داریاں، لوگوں پر اسلامی حکومت کے حقوق، والی اور وزیر کا انتخاب کیسے کرنا چاہیے، امامِ جمعہ اور قاضی کا تعیّن کیونکر ہونا چاہیے، ٹیکس کیسے وصول کیے جائیں اور زکات، خراج اور جزیہ کی کیا شرح ہے اور انہیں کون وصول کرے اور کیسے وصول کرے جیسے معاملات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتابیں معتبر اور مشہور علماء کی رسمی تحریریں ہیں اور خلفاء کے مکتب میں قابلِ اعتماد مانی جاتی ہیں۔ ہم مسلمانوں کے حاکم کے تعین اور اس کے انتخاب کی نوعیت کے بارے میں خلفاء کے مکتب کے نظریات کا استخراج اس قسم کی کتابوں سے کر کے اسکی تشخیص کرینگے۔

ہم مشاہدہ کر چکے ہیں کہ خلفاء کے مکتب میں پیشوا کو خلیفہ کا نام دیا گیا ہے۔ جس شخص کا انتخاب لوگ کرتے ہیں وہ "خلیفۂ رسولؐ" کا نام اختیار کرتا ہے جو بعد میں مختصر ہو کر "خلیفہ" میں تبدیل ہو گیا۔ ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ اسلام میں ایسے نام موجود ہیں جو خود رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں رکھے گئے۔ بلا شبہ ان ناموں کا انتخاب یا تو خود آنحضرتؐ نے کیا یا یہ اللہ کی جانب سے تجویز فرمائے گئے اور آنحضرتؐ نے ان کی تبلیغ کی۔ اس قسم کے ناموں کو "مصطلحاتِ اسلامی" اور "مصطلحاتِ شرعی"[1] کا نام دیا گیا ہے یعنی وہ اصطلاحات یا نام جن کا انتخاب شرع اور شارع کے وسیلے سے ہوا ہے لیکن کچھ نام ایسے بھی ہیں جو مسلمانوں یا علمائے اسلام نے رکھے ہیں اور انہیں "مصطلحات متشرعہ" کہا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ لفظ "خلیفہ" اپنے موجودہ مفہوم کے ساتھ (یعنی مسلمانوں کے دین اور دنیا کے پیشوا کے معنوں میں) ایک شرعی اصطلاح نہیں ہے یعنی رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا اور یہ سب کیا دھرا مسلمانوں کا ہے اور یہ خلفاء کے مکتب کے پیرو ہیں جنہوں نے یہ نام رکھا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید اور حدیث میں جہاں کہیں لفظ "خلیفہ" دیکھنے میں آتے وہ اپنے لغوی معنوں میں ہو گا یعنی انہیں معنوں میں جن میں ایک عرب انہیں سمجھتا ہے اور جو اس کے خالص لغوی معنی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک عالِم کسی شخص کو اپنی جگہ بٹھا دے اور اپنے تمام کام اس کے سپرد کر دے۔ اس صورت میں وہ شخص "خلیفۃ العالِم" ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک تاجر کسی شخص کو اپنی جگہ بٹھا دے اور دکان اور تجارتی کاروبار میں اسے اپنا جانشین قرار دے، ایسا شخص "خلیفۃ التاجر" ہو گا۔

قرآن کریم میں لفظ "خلیفہ" چونکہ اللہ کے ساتھ اضافے کے طور پر استعمال ہوا ہے اس لیے "خَلِیفَۃُ اللہ" کے معنوں میں ہے اور وہ (یعنی خلیفۃ اللہ) ایک ایسا شخص ہے جو اللہ کی جانب سے دنیا میں تصرف کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور خدائی کام کرتا ہے۔ حدیثِ رسولؐ میں خلیفہ سے مراد وہ شخص ہے جو آنحضرتؐ کا خاص کام یعنی پہلے مرحلے کی تبلیغ کا کام انجام دیتا ہے اور در حقیقت آپ کا عمل جاری رکھنے کا ذمے دار ہے پیغمبرؐ کا ایک ایسا

---

[1] انہیں "اصول فقہ" میں "حقیقتِ شرعی" کہا جاتا ہے۔

وظیفہ جسے ترک نہیں کیا جاسکتا اسلام کے احکام کی تبلیغ ہے اور ان کا خلیفہ بھی احکامِ اسلام کا مبلغ ہے۔

پس قرآن یا حدیث میں لفظ "خلیفہ" اسلامی حکمران کے معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ رسولِ اکرمؐ کی حدیث میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے (مثلاً امام علیؑ کے بارے میں کہا گیا: "خَلِيفَتِي فِيكُمْ") حاکم کے معنوں میں نہیں آیا بلکہ حضورؐ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ: "میرے بعد تبلیغ اسلام اس کی ذمے داری ہے۔ قرآن مجید کی توضیح اور تفسیر اس کا کام ہے۔ احکام کا بیان کرنا اس کا وظیفہ ہے[1]۔"

یہ مطلب واضح ہو جانے کے بعد اب ہم دونوں مکاتب کے دلائل کا آغاز کرتے ہیں۔
مکتبِ خلافت کے نظریہ کے دلائل ہم ان کتابوں سے نقل کریں گے جن کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں اور جو "اَلْاَحْکَامُ السُّلْطَانِيَّة" کہلاتی ہیں۔ قاضی ماوردی (متولد ۴۵۰ ھ) اور قاضی ابویعلیٰ (متولد ۴۵۸ ھ) نے جو دونوں اپنے اپنے زمانے میں قاضی القضاۃ رہے ہیں اپنی کتابوں میں جن کا ایک ہی نام ہے مسئلہ اس شکل میں پیش کیا ہے:

خلفاء کے مکتب میں

امامت یعنی رسولِ اکرمؐ کے بعد خلافت تین شکلوں میں قائم ہوتی ہے:
ایک خلیفہ اپنے جانشین یعنی آئندہ خلیفہ کا تعین کرتا ہے اور وہ ان معنوں میں کہ اگر ہارون الرشید کہے کہ میرے بعد امین اور مامون خلیفہ ہوں گے تو مسلمان انہیں قبول کرنے پر مجبور ہیں اور یہ خلیفہ شرعی اور اسلامی ہوگا اور اس کا قبول کرنا دینی لحاظ سے واجب ہوگا۔ یہ دو عالم کہتے ہیں: وَاَمَّا انْعِقَادُ الْاِمَامَةِ بِعَهْدِ مَنْ قَبْلَهٗ فَهُوَ مِمَّا انْعَقَدَ الْاِجْمَاعُ عَلٰى جَوَازِهٖ وَوَقَعَ الْاِتِّفَاقُ عَلٰى صِحَّتِهٖ لِاَمْرَيْنِ عَمِلَ الْمُسْلِمُوْنَ بِهِمَا وَلَمْ يَتَنَاكَرُوْهَا اَحَدُهُمَا: اَنَّ اَبَا بَكْرٍ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ عَهِدَ بِهَا اِلٰى عُمَرَ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ فَاَثْبَتَ الْمُسْلِمُوْنَ اِمَامَتَهٗ بِعَهْدِهٖ.

---

[1] یہ مطلب آئندہ صفحات میں وضاحت سے بیان کیا جائے گا۔

"اس معاملے میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس شکل میں خلیفہ کے قبول کرنے پر اجماع اور اتفاق ہے۔ اس قسم کی خلافت اور اس کی اصالت اور صحت کے بارے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ ابوبکر نے اپنے بعد لوگوں پر حکومت کے لیے عمر کو نامزد کیا اور کسی نے اس رائے کی مخالفت نہیں کی۔ عام لوگوں کی قبولیت اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ انہوں نے اس طریقے اور روش کو صحیح سمجھا لہٰذا خلیفہ کا اس قسم کا انتخاب جو سابقہ خلیفہ کے ہاتھوں انجام پائے ابوبکر کے عمل اور لوگوں کے اعتراض نہ کرنے کی بنا پر صحیح ہے اور اس روش کی اصالت اور صحت کے بارے میں خلفاء کے مکتب میں کوئی اختلاف موجود نہیں[1]۔"

خلیفہ لوگوں کے انتخاب کے ذریعے متعین ہوتا ہے۔ اس طرح خلیفہ کے تعین کے بارے میں خلفاء کے مکتب کے علماء میں اختلاف ہے۔ ماوردی کا نظریہ ہے:

"اَقَلُّ مَنْ تَنْعَقِدُ بِهٖ مِنْهُمُ الْاِمَامَةُ خَمْسَةٌ يَجْتَمِعُوْنَ عَلٰى عَقْدِهَا اَوْ يَعْقِدُهَا اَحَدُهُمْ بِرِضَا الْاَرْبَعَةِ۔"

"خلیفہ کا انتخاب پانچ ایسے اشخاص کے ذریعے ہوتا ہے جو ارباب حل وعقد یعنی قوم کے بزرگ اور عقلمند لوگ ہوں یا یہ کہ ایک شخص انتخاب کرے اور چار دوسرے آدمی اس کی تائید کریں[2]۔"

اس نظریے کی تائید میں جو دلیل پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خلیفہ ابوبکر کے انتخاب کے معاملے میں پانچ اشخاص نے ان کی بیعت کی اور یہ پانچ اشخاص عمر بن خطاب، ابوعبیدہ جراح، ابوحذیفہ کا آزاد کردہ غلام سالم، نعمان بن بشیر اور اسید بن حضیر تھے[3]۔ اس انداز میں سقیفہ میں بیعت ہوئی اور ابوبکر خلافت پر فائز ہو گئے۔ پھر سقیفہ میں منتخب شدہ خلیفہ کو لوگوں

---

[1] ماوردی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۰ تیسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۳۹۳ھ۔ ابویعلیٰ حنبلی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۲۵ دوسرا ایڈیشن مطبوعہ مصر ۱۳۸۶ھ۔ نیز دیکھیے قاضی روزبہان: سلوک الملوک دستور حکومت اسلامی صفحہ ۴۴/۴۵ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۸۶ھ۔ [2] ماوردی صفحہ ۷ اور ابویعلیٰ صفحہ ۲۳ علاوہ ازیں دیکھیے سلوک الملوک صفحہ ۴۳-۴۴ [3] ماوردی صفحہ ۷۔ سقیفہ اور اس کے واقعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے عبداللہ بن سبا جلد ۱ صفحہ ۷۸-۱۳۹ چوتھا ایڈیشن مطبوعہ تہران ملاحظہ فرمائیے۔

کے سامنے پیش کیا گیا اور انہوں نے بھی خواہی نخواہی اسے قبول کر لیا۔[1]

پس اس دلیل کے مطابق ۔یعنی چند اشخاص کے عمل کی رو سے ۔خلیفہ کا انتخاب پانچ ایسے اشخاص کی بیعت اور مرضی سے مکمل ہوجاتا ہے جو اہل حل و عقد ہوں۔ دوسری دلیل اس نظریے کی یہ ہے کہ خلیفہ عمر نے اپنے بعد خلیفہ متعین کرنے کے لیے جو مجلس شوریٰ تشکیل دی اسکے سلسلے میں کہا گیا کہ اگر چھ اشخاص میں سے پانچ کسی ایک شخص کو بطورِ خلیفہ قبول کر لیں تو وہ خلیفہ ہوگا۔ اس مکتب کے بیشتر علماء اس عقیدے پر متفق ہیں۔

مکتبِ خلافت کے علماء کے ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ خلافت عقد ازدواج کی مانند ہے۔ جس طرح عقد نکاح میں ایک عاقد اور دو شاہد ضروری ہیں اسی طرح خلافت میں بھی ایک شخص بیعت کرتا ہے اور دو اشخاص اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہیں اور اہل حل و عقد میں سے لوگوں کی اتنی تعداد ہی خلیفہ اور حاکم مقرر کرنے کے لیے کافی ہے۔

تیسرے گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص خلیفہ کی بیعت کرلے تو کافی ہے۔ ایک شخص کے انتخاب اور اسی کی بیعت سے عظیم امتِ اسلامی کے خلیفہ کا تقرر ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ عباس بن عبدالمطلب نے امام علیؑ سے کہا: "اپنا ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔ لوگ کہیں گے کہ رسول اللہؐ کے چچا نے رسولؐ کے ابن عم کی بیعت کرلی اور پھر کوئی بھی اس امر کی مخالفت نہیں کرے گا۔"

دوسری دلیل یہ ہے کہ بیعت حاکمِ شرع کے حکم اور فرمان کی مانند ہے اور انسان ایک حاکمِ شرع کے حکم اور فرمان کا پابند ہوتا ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں۔ ان دو دلائل کی بنا پر اگر ایک شخص بھی دوسرے کو خلیفہ مانتے ہوئے اس کی بیعت کرلے تو اس کی خلافت قائم ہوجاتی ہے اور رسمیت اور شرعیت حاصل کرلیتی ہے۔[2]

خلیفہ بزورِ شمشیر اور جنگی فتوحات کی بدولت خلافت حاصل کرتا ہے۔ اس نظریے

---

[1] طبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۳۴۸ ۔ مروج الذہب جلد ۲ صفحہ ۲۰۰ ۔ الامامۃ والسیاسۃ جلد ا صفحہ ۴

[2] یہ تمام اقوال ماوردی کی الاحکام السلطانیہ صفحہ ۷ ، مطبوعہ مصر ۱۳۹۳ھ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

کی بنا پر اگر مسلمانوں پر فوجی قوت اور غلبے کی بدولت حکومت حاصل کر لی جائے تو حاکم خلیفہ برحق ہو گا اور اس کی خلافت رسمی اور اسلامی ہو گی۔ قاضی ابو یعلیٰ کے مطابق: "اگر کوئی شخص تلوار یا قوت کے بل بوتے پر اسلامی معاشرے پر غلبہ پالے اور خلیفہ بن جائے اور امیر المومنین کہلوانے لگے تو پھر جو شخص اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے جائز اور روا نہیں ہے کہ رات کو اس حالت میں دن تک رہنے دے کہ اسے امام نہ سمجھتا ہو خواہ خلیفہ ایک بدکردار شخص ہو یا پاکدامن شخص[۱]۔"

خلافت کے یوں تشکیل پانے کے بارے میں خلفاء کے مکتب کے معتبر فقیہہ فضل اللہ بن روزبہان اپنی کتاب سلوک الملوک میں رقمطراز ہیں کہ "بادشاہت اور امامت کے قیام کا چوتھا طریقہ غلبہ اور طاقت ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ جب ایک امام فوت ہو جائے اور کوئی شخص بغیر اس کے کہ کوئی اور اس کی بیعت کرے یا اسے خلیفہ بنائے امامت کا کاروبار سنبھال لے اور قوت اور لشکر کے ذریعے لوگوں پر قابو پالے تو بغیر بیعت کے اس کی امامت قائم ہو جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ وہ قریشی ہو یا نہ ہو۔ عرب ہو، عجمی ہو یا ترک اور خواہ وہ (امامت کی) شرائط پوری کرتا ہو یا فاسق اور جاہل ہو۔۔۔ اس پر امام اور خلیفہ کے نام کا اطلاق ہو سکتا ہے[۲]۔"

خلیفہ اور مسلمان

اگر کوئی شخص مذکورہ بالا طریقوں سے یعنی طاقت سے یا ایک شخص یا تین اشخاص یا پانچ اشخاص کی بیعت سے یا سابقہ خلیفہ کے نامزد کرنے سے خلافت حاصل کر لے تو عام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اسے اس کے نام اور ذات سے پہچانیں جیسے کہ واجب ہے کہ اللہ اور رسول ص کو پہچانیں۔ یہ ایک نظریہ تھا لیکن اکثریت کا اعتقاد یہ ہے کہ لوگوں کے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ خلیفہ کون ہے۔ المختصر کہ تفصیلی شناخت کی ضرورت نہیں اور اجمالی شناخت ہی کافی ہے[۳]۔

---

[۱] ابو یعلیٰ کی الاحکام السلطانیہ صفحہ ۲۳۔ [۲] سلوک الملوک، دستور حکومت اسلامی صفحہ ۴۷۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ [۳] ماوردی: الاحکام السلطانیہ صفحہ ۱۵

یہ علماء اپنی معتبر ترین کتابوں میں ممتاز ترین راویوں سے کچھ روایات نقل کرتے ہیں اور ان کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا امام اور خلیفہ خواہ کوئی بھی کام کرے اور کسی بھی ظلم و ستم اور فسق و فجور کا مرتکب ہو اس کے خلاف "تلوار اٹھانا" اس کی مخالفت کرنا اور اس پر خروج کرنا جائز نہیں۔

حذیفہ ناقل ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "میرے بعد ایسے پیشوا ہوں گے جو میرے راستے پر نہیں چلیں گے اور میری روش پر عمل نہیں کریں گے اگرچہ بظاہر انسان ہوں گے لیکن ان کے دل شیطان کے دل کی طرح ہوں گے۔"

حذیفہ نے کہا: "یا رسول اللہؐ اگر میں اس زمانے میں ہوں تو میرا ردِّ عمل کیا ہونا چاہیے؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا: "سو فیصد سننا اور پوری اطاعت کرنا، اگر وہ تیری پیٹھ پر ضرب لگائے اور تیرا مال چھین لے، تب بھی تجھے چاہیے کہ اس کی فرمانبرداری کرے اور اس کے احکام پر کان دھرے۔"[1]

ابن عباس رسولِ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں: "اگر کوئی شخص اپنے پیشوا اور حاکم میں کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو اسے چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ اگر کوئی شخص خلافت کے نظام اور اس کی پیروی کرنے والی مسلمانوں کی جمعیت سے ایک بالشت بھی دور ہو جائے اور اسی حالت میں مرجائے تو وہ ایامِ جاہلیت میں مرنے والوں کی موت مرے گا۔"[1]

ایک اور روایت میں ابنِ عباس آنحضرتؐ سے یوں نقل کرتے ہیں: "کوئی شخص ایک حکومت سے دوری اختیار نہیں کرتا حتّٰی کہ ایک بالشت بھی کیونکہ اگر وہ اس حالت میں مر جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی اور وہ دنیا سے شرک کی حالت میں جائے گا۔"[2]

اہلِ سنت کے ایک بہت بڑے عالم ان احادیث کے ذیل میں "لزوم طاعۃ الامراء" کے عنوان کے تحت ایک باب میں کہتے ہیں:

1۔ صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۲۰-۲۲ باب الامر بلزوم الجماعہ۔ مطبوعہ محمد علی صبیح بمیدان الازہر۔
2۔ صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۲۲ باب الامر بلزوم الجماعہ مطبوعہ مصر ۱۳۳۴ھ۔

"عام طور پر اہل سنت یعنی فقہاء، محدثین اور متکلمین کہتے ہیں کہ حاکم فسق، ظلم اور لوگوں کے حقوق پامال کرنے کی بنا پر معزول نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اسے ہٹایا جا سکتا ہے اور اصولاً یہ جائز اور روا نہیں کہ اس کے خلاف بغاوت کی جائے بلکہ واجب ہے کہ اس کو پند و نصیحت کی جائے اور اللہ اور قیامت سے ڈرایا جائے کیونکہ اس موضوع پر رسولِ اکرمؐ کی احادیث ہم تک پہنچی ہیں جو ہمیں حاکم کے خلاف خروج سے منع کرتی ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ پیشوا خواہ فاسق اور ستمگر ہی کیوں نہ ہو اس کے خلاف قیام تمام مسلمانوں کے اجماع کے مطابق حرام ہے۔"

اس نظریے کی بنا پر یزید بن معاویہ جیسے شرابی، کتے پالنے والے اور قاتل و مجرم کے خلاف خروج اور عبد الملک (جس کے فوجیوں نے منجنیقوں کے ذریعے خانہ کعبہ کو منہدم کر دیا تھا) کے خلاف بغاوت اور ولید (جس نے قرآن مجید پر تیر چلائے تھے) کے خلاف جنگ جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔

صحیح مسلم کا فاضل شارح نووی مندرجہ بالا اقوال کے سلسلے میں رقمطراز ہے کہ:

"بہت سی متواتر روایات مذکورہ بالا اقوال (کی صحت) کو ثابت کرتی ہیں اور اس کے علاوہ اہل سنت نے اجماع کیا ہے کہ فسق و فجور کی بنا پر حاکم امامت سے معزول نہیں ہوتا۔"

یہ عالم یہاں اس آیۂ شریفہ "اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ" (سورۂ نساء۔ آیت ۵۹) کو بطور سند پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حکام چونکہ اولیائے امور ہیں اس لیے ان کی اطاعت کرنا لازم ہے۔

یہ تھا خلاصہ ان اقوال کا جو خلفاء کے مکتب کی علمی کتابوں اور حدیث کی معتبر شرحوں میں تحریر ہیں۔

---

[1] مسلم کی شرح نووی، باب الامر بلزوم الجماعۃ جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۹۔ سنن بیہقی جلد ۸ صفحہ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ منتخب کنز العمال بر حاشیہ المسند جلد ۲ صفحہ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹ اور بعد کے صفحات۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۹۳۔ ۳۰۶۔ ۳۸۱۔ ۴۸۸ اور جلد ۳ صفحہ ۱۱۴ اور جلد ۴ صفحہ ۱۲۶ اور ۲۰۲۔ سنن ابوداؤد جلد ۴ صفحہ ۲۴۱۔ ۲۴۲ حدیث ۴۷۵۸۔ ۴۷۵۹ اور ۴۷۶۲۔ صحیح ترمذی جلد ۴ صفحہ ۴۸۸ حدیث ۲۱۹۹۔

اہلبیتؑ کے مکتب میں

جہاں تک اہلبیتؑ کے مکتب کا تعلق ہے مسئلے کی صورت مختلف ہے اور جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں یہاں امامت کی بنیاد انتصابِ الٰہی پر ہے۔ اس مکتب کے پیشوا اور علماءِ قرآن مجید کی یہ آیت بطورِ سند پیش کرتے ہیں :

"خدا نے کلمات کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ وہ تائید الٰہی سے اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔ خدا نے جواب میں فرمایا : میں نے تمہیں لوگوں کا امام قرار دیا" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)۔

جن کلمات سے خدا نے ابراہیم خلیل علیہ السلام کا امتحان فرمایا ان کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ آپ کے اپنے فرزند دلبند حضرت اسماعیلؑ کے ذبح کرنے کا مسئلہ تھا یا اس وقت کے عظیم طاغوت نمرود سے جنگ کا سوال تھا یا آتشِ نمرود میں کود پڑنے اور بکمال خوشنودی سے اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر دینے کے حکم کی تعمیل تھی یا یہ سبھی باتیں تھیں ؟ قرآن مجید کے الفاظ سے یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہے[1]

لیکن جو کچھ بھی ہوا ایک عظیم حادثہ تھا کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ایک بہت بڑا امتحان قرار دیا گیا ہے لہٰذا جب اولوالعزم پیغمبر اس امتحان کے پیچ وخم سے بخیر وخوبی عہدہ برآ ہوئے اور انھوں نے ہمیشہ کی طرح بندگی اور اخلاص کے اظہار کے طور پر اپنا سر بارگاہِ ایزدی میں زمین پر رکھ دیا تو انھیں امامت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کر دیا گیا۔ امامت کا مقام کتنا گرامی قدر ہوگا کہ نبوت، اولوالعزمی اور خُلّت (خدا کی دوستی) کے مراتب حاصل کرنے کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ کو یہ مقام عطا ہوتا ہے تو آپ وجد میں آجاتے

---

[1] شاید یہ کہا جاسکے کہ لفظ 'کلمات' سے جو قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے وہ تمام امتحانات مقصود ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے لیے یعنی وہ تمام امتحانات جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ساری زندگی میں اس وقت تک دیے اور تائید الٰہی سے ان میں سرخرو ہوئے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مفرد لفظ 'کلمہ' نہیں بلکہ جمع کا لفظ 'کلمات' استعمال کیا ہے۔

ہیں اور اپنی اولاد کے لیے بھی اس مقام کی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ امامت کی بنیاد خدا کی جانب سے تقرر اور تنصیب پر ہے اور اس میں فقط حکم الٰہی قابلِ اطلاق ہے اور بس۔

خدا کا یہ پیغام سننے اور اس عالی رتبے پر فائز ہونے کے بعد حضرت ابراہیمؑ بہ مقتضائے بشریت خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ یہ رتبہ آپ کی اولاد میں بھی برقرار رکھا جائے۔ انسانی فطرت کے مطابق آپ کو اپنی اولاد سے محبت ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے بھی یہ روحانی سرفرازی حاصل کریں۔ "قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴) اور خدا نے جواب میں فرمایا: "لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۴)۔ امامت اپنے بندے کے ساتھ میرا خاص عہد ہے اور یہ عہد ستمگار اور ظالم کو نہیں پہنچتا۔

ظالم کسے کہتے ہیں؟ قرآن مجید کی زبان اور لغت میں بعض اوقات اس شخص کو جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے ظالم کہا جاتا ہے مثلاً جو شخص بُت کو پوجتا ہے یا شراب پیتا ہے یا خودکشی کرتا ہے وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اور اس بنا پر اسلام اسے ظالم کہتا ہے۔ بعض اوقات جو شخص دوسروں پر ظلم ڈھاتا ہے اور ان کے حقوق میں تجاوز کرتا ہے اسے ستمگار کہا جاتا ہے مثلاً جو شخص دوسروں کا مال ہتھیاتا ہے یا ان سے سود وصول کرتا ہے یا کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے اور ہر وہ شخص جو کسی شکل میں بھی خدا کے حکم کی مخالفت کرتا ہے قرآن اور اسلام کی نظر میں ظالم ہے۔ (سورۂ طلاق۔ آیت ۱)۔

جس شخص نے ایک لحظہ بھی خود اپنے یا دوسروں کے ساتھ ظلم کرنے میں بسر کیا ہو وہ نظامِ ربانی کے دقیق معیار کی بنیاد پر ظالم ہے اور وہ امامت کا اہل نہیں ہے لہٰذا قرآن مجید کے اس واضح استدلال کی بنا پر امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ معصوم ہو۔

اس آیتِ کریمہ کے علاوہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی امامت کا ذکر آیا ہے اور اس کی بنیاد خدا کی جانب سے تقرر اور تنصیب ہی بتائی گئی ہے۔

"ہم نے ان سب کو لوگوں کا امام بنایا جو ہمارے حکم سے ان کی ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان کے پاس نیک کام کرنے، نماز پڑھنے اور زکات دینے کی وحی نازل کی اور یہ سب کے سب ہمارے مطیع بندے تھے۔" (سورۂ انبیاء۔ آیت ۷۳)۔

"ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں سے کچھ لوگوں کو جو زحمتیں برداشت کرتے تھے اور ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے امام بنایا وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے"[1]

اہلبیتؑ کے مکتب میں امامت کا تعارف قرآن مجید کی بنیاد پر اس شکل میں کرایا جاتا ہے کہ وہ فقط اللہ کی جانب سے تعین، تقرر اور تنصیب کی بنیاد پر امکان پذیر ہے اور بس۔

دوسرا مرحلہ جسے امامت میں زیرِ غور لایا جاتا ہے امام کی عصمت کا مسئلہ ہے جس کی تصریح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں کی گئی ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کی امامت کا ذکر آیا ہے اور جسے ہم نے مختصراً موردِ بحث قرار دیا ہے۔ اب اگر ہم ایک دفعہ پھر قرآن مجید سے رجوع کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ارشاد ہوا ہے: "اللہ نے ارادہ کیا ہے کہ تم (اہلبیتؑ) سے ہر قسم کی نجاست کو دُور رکھے"

لفظ "اہلبیت" جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے شرعی اصطلاحات میں سے ہے کیونکہ یہ قرآن مجید کے وسیلے سے وضع ہوا ہے۔ رسول اکرمؐ نے بھی اس گروہ کے ان تمام افراد کو جو آپ کے زمانے میں موجود تھے قطعی طور پر معین فرما دیا تھا۔ آپ نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو اپنی چادر کے نیچے[2] جمع کیا اور اس آیت کی تلاوت فرمائی جو اُن کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ یوں آپ نے واضح طور پر طے کر دیا کہ آپ کی بیویاں "اہلبیت" میں سے نہیں ہیں لہٰذا "اہلبیت" اس خاص گروہ کا نام ہو گیا اور اسلام میں جہاں کہیں اہلبیت کا ذکر آتا ہے یہی نفوس قدسیہ مقصود ہوتے ہیں اور یہی معصوم ہیں۔ یہ امامت کی دوسری شرط ہے۔

پہلی شرط کا مزید مطالعہ

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اہلبیتؑ کے مکتب میں امامت انتصابی چیز ہے اور ضروری ہے کہ یہ انتصاب منجانب اللہ ہو۔ رسول اکرمؐ کی ذمے داری صرف یہ ہے کہ اس (نامزدگی)

---

[1] ماہرین تفسیر اور ماہرین لغت کی رائے جاننے کے لیے اس کتاب کا ضمیمہ ب ملاحظہ فرمائیے۔
[2] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۲۸۶ - ۲۸۷ - الوافی جلد ۲ صفحہ ۶۳ باب ۳۰ -

کی تبلیغ کریں اور یہ نہیں کہ آپ علیؑ کو امام نامزد کریں یا ان کی حکومت کے بارے میں وصیت کریں۔ جس طرح آنحضرتؐ نماز کی تبلیغ فرماتے ہیں اور اس کام کے انجام دینے میں فقط اللہ کا حکم بجا لاتے ہیں اور حج کی تبلیغ کرتے ہیں اور یہ حکم بھی اللہ کی جانب سے ہے اور آپ فقط اللہ کا پیغام لوگوں کو پہنچاتے ہیں، بعینہٖ یہی صورت امامت کے مسئلے کی بھی ہے۔ رسولِ اکرمؐ اللہ کی جانب سے امامت کی تبلیغ کرتے ہیں اور تقرر اللہ کی جانب سے ہے۔ پس جو کچھ نبیٔ اکرمؐ امامت کے بارے میں بتاتے ہیں وہ ایسے ہی ہے جیسے آپ نماز، حج، زکات اور جہاد کے متعلق بیان کرتے ہیں اور اسکی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ نماز کے بارے میں فرماتے ہیں وضو یوں کرنا چاہیے، سورۂ حمد پہلی اور دوسری رکعت میں پڑھنی چاہیے، رکوع اور سجود یوں کیسے جانے چاہئیں۔ آپ ہی بتاتے ہیں کہ نماز میں کتنی رکعتیں پڑھنی چاہئیں اور اس کے مقارنات اور مقدمات کیا ہیں۔ بلاشبہ یہ سب باتیں آنحضرتؐ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیان کرتے ہیں لہٰذا یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو کچھ رسول اکرمؐ نے امامت کے بارے میں کہا وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ "مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى"۔ (سورۂ نجم۔ آیت ۳)۔

اب ہم اس مختصر بحث کی حدود میں رسول اکرمؐ کی ان احادیث اور روایات کا مطالعہ کرتے ہیں جو مسئلہ امامت کے سلسلے میں دستیاب ہیں۔ اس قسم کی نصوص کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ وہ احادیث جن کا تعلق بالعموم ائمۂ اہلبیتؑ سے ہے۔

۲۔ وہ احادیث جن میں ائمۂ اہلبیتؑ میں سے کسی امام کے نام کا بالصراحت ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے حصے کی احادیث میں کسی امام کا نام بطور خاص نہیں لیا گیا بلکہ بالعموم اہلبیتؑ کی امامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے ہم اس قسم کی احادیث کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱- حدیثِ ثقلین

پہلی روایت ہم صحیح مسلم[1] سے نقل کرتے ہیں اگرچہ یہ دوسری بہت سی معتبر کتابوں مثلاً مسند احمد بن حنبل، سنن دارمی، سنن بیہقی اور مستدرک علی الصحیحین[2] وغیرہ میں موجود ہے۔ زید بن ارقم فرماتے ہیں: مکہ اور مدینہ کے راستے کے بیچ میں (حجۃ الوداع سے واپسی کے سفر کے دوران) رسولِ اکرمؐ نے ایک تالاب (غدیر) کے کنارے جس کا نام "خم" تھا لوگوں کے درمیان یوں خطبہ ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! یاد رکھو، میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔ وہ وقت قریب ہے جب مجھے (عالمِ بقا کی جانب) بلایا جائے اور میں خداوند تعالیٰ کی یہ دعوت قبول کر لوں۔ میں تمہارے درمیان دو گرانبہا چیزیں بطورِ میراث چھوڑ رہا ہوں۔ ایک تو اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے۔ اسے نہ چھوڑنا اور اس پر اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑے رکھنا اور دوسرے میرے اہل بیتؑ ہیں۔ میں اپنے اہلبیتؑ کے بارے میں تمہیں خدا کی یاد دلاتا ہوں۔"

اور مستدرک کے نسخے کے مطابق آپ نے ان الفاظ کا اضافہ فرمایا:

"خیال رکھو کہ میرے بعد ان دو نشانیوں کے ساتھ تم کیسا سلوک کرتے ہو۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پہ مجھ سے آ ملیں۔"

آنحضرتؐ کے ارشاد کے آخری جملے پر تکیہ کرتے ہوئے ہم اس بات کے معتقد ہیں کہ ائمہ اہلبیتؑ (جن کی تعداد بھی دوسری معتبر روایات کی رو سے طے ہو چکی ہے) میں سے ایک کی عمر اتنی طویل ہونی چاہیے کہ وہ دنیا کے خاتمے تک زندہ رہے اور اس کے نتیجے میں قرآن مجید کے پہلو بہ پہلو ہمیشہ انسانی معاشرے میں موجود رہے اور ان دونوں کے جُدا نہ ہونے کے بارے میں آنحضرتؐ کا ارشاد صحیح ثابت ہو۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۱۲۲-۱۲۳ مطبوعہ مصر ۱۳۳۴ھ ق۔ [2] المستدرک جلد ۳ صفحہ ۱۰۹ اور ۱۴۸۔ باقی مدارک کے لیے مُعجَمُ المُفہرِس لِاَلفاظِ الحَدیثِ النّبوِیؐ سے رجوع کیجیے۔

جابرؓ انہیں سے ملتے جلتے الفاظ آنحضرتؐ کے خطبۂ عرفہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں نے ایامِ حج میں آنحضرتؐ کو عرفہ میں دیکھا۔ آپ اپنی عضباء نامی اونٹنی پر سوار تھے اور لوگوں کے سامنے یوں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے:

"اے لوگو! میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑ رہا ہوں جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ کتابِ خدا اور میری عترت میرے اہلبیتؑ۔"[1]

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد ترمذی کہتے ہیں کہ ابوذر، ابو سعید خدری، زید بن ثابت اور حذیفہ بن اُسید نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

یہ روایت مختلف صورتوں میں اور متفاوت افراد کے وسیلے سے اس قدر نقل ہوئی ہے کہ ان کا ذکر اور مطالعہ کرنا خاص فرصت کا محتاج ہے۔ ہم ان احادیث پر تکیہ کرتے ہوئے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے امامت کو اپنے اہل بیتؑ میں محدود کر دیا ہے اور انہیں قرآن مجید کا ہمدوش اور ہم پلہ قرار دیا ہے کیونکہ آپ کے ارشاد کے مطابق ہدایت کا سرچشمہ قرآن مجید اور آپ کے اہل بیتؑ ہیں اور آپ نے ان کے دامن کو تھامنے کو گمراہی اور ضلالت سے قطعی نجات کا موجب قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ: "ہوشیار رہو اور غور کرو کہ میرے بعد تم ان دونوں سے کیسا سلوک کرو گے اور یہ جان لو کہ یہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے اور حوضِ کوثر پر مجھ سے آملیں گے جو کہ قیامت کے دن نجات پانے والوں کے ورود کا مقام ہے۔"

یہ ایک مسلمہ قرآنی حقیقت ہے کہ آسمانی کتابیں لوگوں کی امام ہیں اور نظری نقطۂ نگاہ سے ان کی فکر، اعتقاد، اخلاق اور عمل کی پیشوا ہیں[2]۔ اسی اصول کی جانب توجہ اور اس پر انحصار کی بنا پر اہلبیتِ رسولؐ کو قرآن مجید کے پہلو بہ پہلو رکھے جانے سے ان کی امامت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور بلا شبہ یہ عمل کے لحاظ سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں علمی لحاظ سے اسلام کی تصویر کشی قرآن مجید میں کی گئی ہے اور عملی صورت میں اور خارجی تجسم کے طور پر وہ اہلبیتؑ میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور چونکہ ہم ایک شکل میں قرآن مجید کی امامت قبول

---

[1] ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۶۳ حدیث ۳۷۸۶ [2] سورۂ احقاف۔ آیت ۱۲

کرتے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ دوسری شکل میں ہم اہلبیتؑ کی امامت بھی قبول کریں۔
علاوہ ازیں چونکہ رسول اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق ہدایت آپ کی اس گرانقدر میراث میں منحصر ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی ہدایت کا تعلق اسلام کے تمام اعتقادی' اخلاقی اور عملی مسائل سے ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ قرآنی اسلام کی توضیح اور تشریح اہلبیتؑ کی ذمے داری ہو تاکہ ہدایت اتمام پذیر اور کامل ہو جائے۔

ب۔ ائمہ کی تعداد کے بارے میں روایات

روایات کے ایک مجموعے میں آنحضرتؐ کے بعد آنے والے ائمہ' خلفاء اور حکام کی تعداد معین کر دی گئی ہے البتہ ان کے افراد میں سے کسی کا نام اس میں نہیں آتا۔ اب تک مجھے یہ روایات رسولِ اکرمؐ کے چار صحابہ سے ملی ہیں۔ ان میں سے ایک بزرگ جابر بن سمرہؓ ہیں اور ان کی روایات صحیح مسلم' صحیح بخاری' سنن ابوداؤد' سنن ترمذی' مسند طیالسی اور مسند احمد بن حنبل وغیرہ میں موجود ہیں[1]

جابر کی روایت صحیح مسلم کے نسخے سے نقل کی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں اپنے باپ کے ساتھ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: "دین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا" تا وقتیکہ قیامت برپا ہو جائے اور تم پر بارہ خلیفہ ہوں جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔"

اس روایت میں اس سے زیادہ نقل نہیں کیا گیا لیکن امیرالمومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اس حصے کا اضافہ فرمایا ہے جو اس روایت میں سے محذوف ہے۔

آپ کا ارشاد ہے: "بلاشبہ ائمہؑ قریش میں سے ہوں گے جو اسی قبیلے کی ایک

---

[1] صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۲-۴ کتاب الامارہ۔ باب الناس تبع القریش۔ صحیح بخاری جلد ۹ صفحہ ۸۱۔ کتاب الاحکام' باب الاستخلاف۔ صحیح ترمذی جلد ۲ صفحہ ۳۵ (مطبوعہ ہندوستان) اور جلد ۴ صفحہ ۵۰۱ حدیث ۲۲۲۵ (مطبوعہ مصر)' سنن ابوداؤد جلد ۴ صفحہ ۱۰۶۔ تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید۔ اس کے علاوہ مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۸۶ سے ۱۰۷۔

شاخِ بنی ہاشم کی کشت زار سے اُبھریں گے۔ نہ امامت کسی اور کو زیب دیتی ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی اس کا اہل ہو سکتا ہے[۱]۔"

ایک اور روایت میں جو مسند احمد بن حنبل اور مستدرک حاکم وغیرہ میں مسروق سے مروی ہے کہ ہم کوفہ میں عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ہمیں قرآن کا درس دے رہے تھے۔ ایک شخص نے ان سے سوال کیا: "اے ابوعبدالرحمٰن! کیا آپ نے رسول اکرمؐ سے یہ نہیں پوچھا کہ اس امت میں کتنے خلیفہ ہوں گے؟"

عبداللہ نے کہا: "جب سے میں عراق میں آیا ہوں کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں پوچھا۔" پھر کہا: "ہاں ہم نے رسول اکرمؐ سے اس مسئلے کے بارے میں سوال کیا تھا اور آنحضرتؐ نے فرمایا تھا: بارہ افراد — جتنی کہ بنی اسرائیل کے نقیبوں کی تعداد تھی[۲]۔"

یہ روایت انس بن مالک اور عبداللہ بن عمرو بن عاص سے نقل کی گئی ہے۔ بلاشبہ ان روایات میں سے ہر ایک اتنے زیادہ افراد نے نقل کی ہے کہ اس کے نتیجے میں انکی روایات تواتر کی حد تک پہنچ گئی ہیں اور مکمل طور پر قابلِ اطمینان ہیں۔

حدیث کی تفسیر اور شارحین کی سرگردانی

اس قسم کی احادیث سے اہل سنت ناظرین اور شارحین سخت الجھن کا شکار رہیں اور ان کے لیے ایسے معانی دریافت کرنے سے قاصر رہیں جو خلفاء کے مکتب کے مقبول عقائد سے ہم آہنگ ہوں اور وہ صحیح طور پر معین نہیں کر پاتے کہ یہ بارہ اشخاص کون ہیں اور یکے بعد دیگرے کیونکر آئیں گے تاکہ قیامت تک باقی رہیں اور یہ گروہ جس کے ساتھ اسلام کی عزت اور سربلندی وابستہ ہے کن کن خصوصیات کا حامل ہوگا۔ نیز یہ کہ آیا ہر شخص خواہ اس

---

۱ نہج البلاغہ، مرتبہ صبحی صالح، خطبہ ۱۴۴ صفحہ ۲۰۱ مطبوعہ بیروت۔ ۲ مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۳۹۸ اور ۴۰۶۔ مستدرک علی الصحیحین جلد ۴ صفحہ ۵۰۱۔ کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۲۶-۲۷ منتخب الکنز جلد ۵ صفحہ ۳۱۲ برحاشیہ المسند۔ صواعق محرقہ صفحہ ۲۰ (دوسرا ایڈیشن ۱۳۸۵ھ)۔ مجمع الزوائد جلد ۵ صفحہ ۱۹۰۔ الجامع الصغیر جلد ۱ صفحہ ۷۵۔ تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۰ (مطبوعہ پاکستان)۔

کی شخصیت کیسی ہی کیوں نہ ہو اس رتبے پر فائز ہو سکتا ہے یا قطعاً ضروری ہے کہ خلیفہ عادل ہو۔

اوّل ـــ مشہور فقیہہ ابن العربی صحیح ترمذی کی شرح میں کہتے ہیں : ہم رسولِ خداؐ کے خلفاء کو شمار کرتے ہیں اور انہیں یوں پاتے ہیں :

ابوبکر ـــ عمر ـــ عثمان ـــ علیؑ ـــ حسنؑ ـــ معاویہ ـــ یزید بن معاویہ ـــ معاویہ بن یزید ـــ مروان ـــ عبدالملک ـــ ولید ـــ سلیمان ـــ عمر بن عبدالعزیز ـــ یزید بن عبدالملک ـــ مروان بن محمد بن مروان ـــ سفّاح ـــ منصور۔

وہ اسی طرح خلفاء کی گنتی کرتے ہوئے اپنے زمانے (۵۴۳ھ) تک ۲۷ اور اشخاص کے نام لیتے اور پھر کہتے ہیں : "اگر ہم ابتدائے خلافت سے بارہ اشخاص گنیں اور ان اشخاص کو نظر میں رکھیں جو بظاہر خلافتِ نبویؐ کے حامل رہے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سلیمان بن عبدالملک تک بارہ افراد ہو جاتے ہیں لیکن اگر ہم انہیں شمار کریں جو درحقیقت اور صحیح معنوں میں خلافتِ نبویؐ کے حامل رہے ہیں تو وہ پہلے چار خلفاء اور عمر بن عبدالعزیز سے عبارت رہے ہیں لہٰذا اس حدیث کے معنی میری سمجھ میں نہیں آتے۔[1]"

"اس سوال کے جواب میں کہ بارہ افراد سے زیادہ خلیفہ ہوئے ہیں۔ اہلِ سنت کے نامور محدّث قاضی عیاض کہتے ہیں : "یہ اعتراض باطل ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ بارہ اشخاص کے علاوہ اور خلیفہ نہیں ہوں گے نہ انہوں نے کہا کہ اتنے خلیفہ ہی ہوں گے جتنے بلاشبہ ہوئے ہیں اور آنحضرتؐ کا یہ ارشاد اس بات سے مانع نہیں کہ اس تعداد سے زیادہ بھی ہوں۔[2]"

ایک اور عالم کا کہنا ہے کہ : "رسول اکرمؐ کی مراد یہ ہے کہ اسلام میں قیامت تک بارہ خلیفے ایسے ہوں گے جو حق پر عمل کریں گے اور اس گروہ میں تسلسل بھی ضروری نہیں۔ اس بنا پر "اس کے بعد افراتفری ہو گی" کے جملے سے آنحضرتؐ کی مراد قیامت کی نشانیاں اور اس سے پہلے دجال کے خروج جیسے فتنے ہیں۔ بارہ خلفاء سے مراد پہلے چار خلفاء اور

---

[1] شرح صحیح ترمذی جلد ۹ صفحہ ۶۸۔۶۹ [2] شرح نووی بر مسلم جلد ۱۲ صفحہ ۲۰۱۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری جلد ۱۶ صفحہ ۳۳۹ اور ۳۴۱۔

حسنؑ، معاویہ، عبداللہ بن زبیرؓ اور عمر بن عبدالعزیز ہیں (جن کی مجموعی تعداد آٹھ بنتی ہے) اور اس بات کا احتمال ہے کہ ان میں مہدی عباسی (۱۲۸ھ-۱۶۹ھ ہجری) کا اضافہ بھی کیا جا سکے کیونکہ وہ عباسیوں میں ایسا ہی ہے جیسا عمر بن عبدالعزیز امویوں میں ہے اور ظاہر عدل و انصاف کی بنا پر اسے بھی اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ نتیجے کے طور پہ دو اشخاص باقی رہ جاتے ہیں جن میں سے ایک مہدیؑ (موعود آخر الزماں) ہیں جو اہل بیت میں سے ہوں گے[۲]۔

مزید کہا گیا کہ: اس حدیث میں رسول اکرمؐ کی مراد یہ ہے کہ خلافت کی عزّت اور شوکت اور اسلام کی قوت اور انتظام امور کے زمانے میں بارہ خلیفہ ہوں گے۔ اس بنا پر آنحضرتؐ کے موردِ بحث خلفاء وہ اشخاص ہیں جن کے ادوار میں اسلام عزیز رہا ہو اور سب مسلمان ان کی شخصیت کے بارے میں اتفاق نظر رکھتے ہوں[۳]۔

اہل سنّت کے نامور محدث اور شارح بیہقی اس نظریے کے بارے میں توضیح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: مذکورہ صفات کے حامل ہونے کے ساتھ یہ تعداد ولید بن یزید بن عبدالملک کے زمانے تک مکمل ہو گئی اور اس کے بعد بہت بڑی افراتفری اور بدنظمی وجود میں آئی اور پھر حکومت عباسیوں کو حاصل ہو گئی۔ بلاشبہ اگر ہم مذکورہ صفات کو نظر انداز کر دیں تو تعداد بارہ سے بڑھ جائے گی اور اگر ہم افراتفری کے بعد کے خلفاء کو فہرست میں شامل کر لیں تب بھی یہی صورت ہو گی[۴]۔

اس نظریے کی مزید توضیح کرتے ہوئے کہا گیا کہ: جو اشخاص خلافت میں موردِ اتفاق

---

[۱] اس شخص نے نماز جمعہ کے چالیس خطبوں میں رسول اکرمؐ پر درود نہیں بھیجا اور خود آنحضرتؐ کے اہل خاندان سے کہا کرتا تھا کہ میں چالیس سال سے تمہارے خلاف اپنے دل میں بغض اور دشمنی پال رہا ہوں (مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۷۹-۸۰)۔

[۲] صواعق محرقہ صفحہ ۲۱ مطبوعہ مصر۔ تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۶۔ مطبوعہ پاکستان۔

[۳] فتح الباری جلد ۱۶ صفحہ ۳۳۸-۳۴۱۔ نووی: شرح مسلم جلد ۱۲ صفحہ ۲۰۲-۲۰۳۔ تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۲۔

[۴] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ جلد ۶ صفحہ ۲۴۹۔

رہے ہیں ان میں سے ابتدا میں ہم تین خلفاء کو جانتے ہیں اور ان کے بعد جنگِ صفین میں مسئلہ تحکیم پیش آنے کے وقت تک علیؑ ہیں۔ اس دن معاویہ نے خود کو خلیفہ کا نام دیا۔ (اور علیؑ کی خلافت کے بارے میں اتفاق ختم ہو گیا) اس کے بعد بھی حالات اسی نہج پر رہے حتیٰ کہ امام حسنؑ کی صلح کے بعد سب نے معاویہ (کی خلافت) پر اتفاق کیا اور اس کے بعد اس کے بیٹے یزید کے بارے میں کوئی اختلاف وجود میں نہ آیا۔ حسینؑ کے حالات اور ان کی خلافت کو بھی انتظام حاصل نہ ہوا اور وہ جلد ہی مارے گئے۔ یزید کی موت کے بعد دوبارہ اختلاف ہوا حتیٰ کہ نوبت عبدالملک بن مروان کی خلافت تک پہنچی۔ اس کے بارے میں عام اتفاق وجود میں آیا۔ بلاشبہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اتفاق عبداللہ بن زبیر کے قتل ہونے (۷۳ھ ہجری) کے بعد ظاہر ہوا۔ عبدالملک کے بعد اس کے چار بیٹوں کی خلافت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ یہ چار اشخاص ولید، سلیمان، یزید اور ہشام تھے اور سلیمان اور یزید کے درمیان سلیمان کی وصیت کی بنا پر خلافت عمر بن عبدالعزیز کو ملی۔ اس گروہ کا بارہواں شخص جس پر لوگوں نے اتفاق کیا ولید بن عبدالملک تھا جس نے چار سال حکومت کی۔

شافعی مذہب کے بزرگ محدث اور مشہور فقیہہ ابن حجر کہتے ہیں "مذکورہ احادیث کی توجیہات میں سے یہ بہترین توجیہہ ہے۔"

آٹھویں صدی کے نامور مؤرخ، محدث اور مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ راستا جس پر بیہقی چلا ہے اور ایک گروہ نے اس کے ساتھ موافقت کی ہے کہ اس حدیث سے مراد وہ خلفاء ہیں جو مسلسل ولید بن یزید بن عبدالملک فاسق تک گزرے ہیں وہ ایسا راستا ہے جس کے بارے میں بہت تامل ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس ولید کے زمانے تک خلفاء کو جس طریقے سے بھی شمار کریں ان کی تعداد اس سے زیادہ بنتی ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ چار خلفاء یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور علیؑ کی خلافت موردِ اتفاق اور مسلم ہے۔ اس کے بعد حسنؑ بن علیؑ ہیں کیونکہ علیؑ نے ان کے اور ان کی خلافت کے بارے میں وصیت کی تھی اور اہلِ عراق نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی حتیٰ کہ انہوں نے اور معاویہ نے صلح کر لی۔ معاویہ کے بعد یزید اور اس کے بعد معاویہ بن یزید اور پھر مروان، پھر عبدالملک بن مروان، پھر اس کا بیٹا ولید بن عبدالملک، پھر سلیمان بن عبدالملک اور پھر عمر بن عبدالعزیز، پھر یزید بن عبدالملک اور

پھر ہشام بن عبد الملک حاکم اور خلیفہ ہوئے ہیں۔ یہ سب مل کر پندرہ اشخاص بنتے ہیں۔ ان کے بعد ولید بن یزید بن عبد الملک ہوا ہے (جسے بیہقی نے بارھواں شمار کیا ہے) اور اگر عبد الملک سے پہلے عبد اللہ بن زبیر کی حکومت کو بھی شامل کر لیا جائے تو تیرہ اشخاص بنتے ہیں۔ (ابتدائے خلافت سے گنتی کے مطابق) رسول اکرمؐ کے پسندیدہ بارہ خلفاء کے بارے میں ان تمام دشواریوں کے باوجود یزید بن معاویہ ان میں شامل ہو جاتا ہے اور عمر بن عبد العزیز جیسا شخص جس کی سب بزرگوں نے تعریف کی ہے اس فہرست میں سے خارج ہو جاتا ہے حالانکہ اسے خلفائے راشدین میں شمار کیا گیا ہے اور سبھی اس کی عدالت کے بارے میں متفق ہیں اور اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کا زمانہ اسلامی حکومت کے عادلانہ ترین زمانوں میں سے تھا حتیٰ کہ رافضی بھی اس مسئلے کا اعتراف کرتے ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ ہم فقط ان اشخاص کو معتبر خیال کرتے ہیں جن پر امت اجماع کرے تو ہمیں اس مشکل سے دوچار ہونا پڑے گا کہ علی بن ابی طالبؑ اور انکے فرزند حسنؑ کو خلفاء کی فہرست سے خارج کر دیں کیونکہ لوگوں نے ان کی خلافت پر اتفاق نہیں کیا اور تمام اہل شام نے ان دو اشخاص کی خلافت پر بیعت نہیں کی۔

اس گفتگو کے بعد ابن کثیر ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں: ایک عالم معاویہ، یزید اور معاویہ بن یزید کو بارہ خلفاء میں شمار کرتا ہے لیکن مروان اور عبد اللہ بن زبیر کو ان میں شامل نہیں کرتا کیونکہ امت نے ان میں سے کسی ایک پر بھی اتفاق نہیں کیا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہم یہ مسلک خلفاء کو شمار کرنے کے سلسلے میں قبول کر لیں تو ہمیں چاہیے کہ ان کی گنتی یوں کریں:

ابوبکر ـــ عمر ـــ عثمان ـــ معاویہ ـــ یزید ـــ عبد الملک ـــ ولید ـــ سلیمان ـــ عمر بن عبد العزیز ـــ یزید اور پھر ہشام ـــ جو سب ملکر بارہ افراد بنتے ہیں۔ ان کے بعد ولید بن یزید بن عبد الملک فاسق ہے لیکن اصولاً ممکن نہیں کہ یہ راستا قابلِ قبول ہو کیونکہ اس کی پیروی سے لازم آتا ہے کہ علیؑ اور ان کے فرزند کو ان بارہ افراد سے خارج کر دیں اور یہ بات اہل سنت اور شیعہ علماء کی تصریحات کے خلاف ہے اور اس روایت کے بھی خلاف ہے جو سفینہ نے آنحضرتؐ سے نقل کی ہے یعنی:

"میرے بعد تیس سال تک خلافت ہے۔ اور اس کے بعد کاٹنے والی بادشاہت ہو جائے گی[1]۔"

ابن جوزی نے اپنی کتاب "کشف المشکل" میں ان احادیث کو حل کرنے کے دو طریقے بتائے ہیں:

۱۔ رسول اکرمؐ نے اپنی حدیث میں ان حوادث کی جانب اشارہ فرمایا ہے جو خود آپ کے اور آپ کے اصحاب کے بعد رونما ہونے تھے اور درحقیقت آنحضرتؐ اور آپ کے اصحاب اس سلسلے میں منسلک اور یکساں ہیں۔ رسول اکرمؐ ان حکومتوں کے متعلق خبر دیتے ہیں جو آپ کے بعد قائم ہونی تھیں اور ان ارشادات کے ذریعے ان حکومتوں میں موجود خلفاء کی تعداد کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور شاید "لَا یَزَالُ الدِّیْنُ ...[2]" کے الفاظ سے یہ مراد ہے کہ جب تک بارہ خلفاء موجود ہوں گے حکومت مستحکم، برقرار، عالی قدر اور طاقتور رہے گی اور اس کے بعد اس کی شکل بدل جائے گی اور اس کے حالات و واقعات بے حد مشکل ہو جائیں گے۔ آنحضرتؐ کے خلفاء میں سے پہلا فرد بنی امیہ میں سے ہے اور وہ یزید بن معاویہ ہے اور ان کا آخری فرد مروان حمار ہے اور ان کی کل تعداد تیرہ ہے۔ عثمان، معاویہ اور عبداللہ بن زبیر اس گنتی میں شامل نہیں ہیں کیونکہ ان کا شمار صحابہ میں ہے۔ پس اگر اس تعداد میں سے مروان بن حکم کو اس بنا پر حذف کر دیں کہ اس کے صحابی ہونے میں شک ہے یا اس لیے کہ اس نے خلافت زور اور غلبہ سے حاصل کی اور اس زمانے کے لوگوں نے برضا و رغبت عبداللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی تو پھر بارہ افراد کی تعداد مکمل ہو جاتی ہے (اور یوں آنحضرتؐ کی پیشین گوئی درست ثابت ہو جاتی ہے)۔ جب خلافت بنی امیہ کے خاندان سے نکل گئی تو بہت بڑا فساد برپا ہوا اور بڑے عظیم حوادث رونما ہوئے اور یہ صورت اس

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۶ صفحہ ۲۵۰ مطبوعہ آفسٹ، بیروت۔

[2] جیسا کہ مسلم نے جلد ۶ صفحہ ۴ مطبوعہ مصر ۱۳۳۴ھ میں نقل کیا ہے: "جب تک بارہ خلفاء موجود ہوں گے دین قائم رہے گا اور ...."۔ درحقیقت روایت کے متن میں موجود لفظ "دین" کے معنی بدل دیئے گئے ہیں اور اسے حکومت گردانا گیا ہے جو کہ اس سے بالکل بے ربط ہے۔

وقت تک قائم رہی جب تک بنی عباس کی خلافت قائم نہیں ہوگئی اور اس کے بعد بھی خلافت کے حالات میں بڑی واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

ابن حجر کتاب فتح الباری میں یہ الفاظ نقل کرنے کے بعد انہیں رد کرنے کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور ان میں مضمر مشکلات گنواتے ہیں[1]

۲۔ اس بات کا احتمال ہے کہ بارہ افراد سے عبارت اس خلافت کا تعلق امام مہدیؑ کے وقت سے بعد کے دور سے ہو جو کہ آخری زمانے میں خروج کریں گے۔ میں نے کتاب دانیال میں یہ لکھا دیکھا ہے کہ جب مہدیؑ دنیا سے رحلت فرما جائیں گے تو ان کے بعد سبطِ اکبر (حضرت امام حسنؑ) کی اولاد میں سے پانچ اشخاص حکومت حاصل کریں گے اور پھر سبطِ اصغر (حضرت امام حسینؑ) کی اولاد میں سے پانچ اشخاص اس رتبے پر فائز ہوں گے۔ اس گروہ کا آخری فرد وصیت کرے گا کہ سبطِ اکبر کی اولاد میں سے ایک شخص اس کا جانشین ہو اور وہ خلافت کرے۔ پھر اس کا فرزند خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالے گا اور یوں مذکورہ بالا بارہ حکام کی تعداد مکمل ہو جائے گی اور ان میں سے ہر ایک ہدایت یافتہ (مہدی) امام ہوگا۔

ان جملوں کے بعد ابن جوزی کہتے ہیں کہ "ایسی روایت بھی موجود ہے جس کے مطابق اس کے (مہدیؑ کے) بعد بارہ افراد حکومت پر فائز ہوں گے جن میں سے چھ امام حسنؑ کی اولاد میں سے پانچ امام حسینؑ کی اولاد میں سے اور ایک دوسروں میں سے ہوگا۔ جب وہ فوت ہوگا تو زمانہ فاسد ہو جائے گا[2]"

ابن حجر ہیثمی اس حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ "یہ روایت قطعاً بے حقیقت ہے لہٰذا اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا[3]"

علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ "یوں معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اس حدیث میں اپنے بعد رونما ہونے والے عجائب کی خبر دی ہے اور ان زمانوں میں وقوع پذیر ہونیوالی

---

[1] فتح الباری جلد ۱۶ صفحہ ۳۴۰ ملاحظہ فرمائیں۔

[2] فتح الباری فی شرح صحیح البخاری جلد ۱۶ صفحہ ۳۴۱ (پہلا ایڈیشن مصر)

[3] صواعق محرقہ صفحہ ۲۱ (دوسرا ایڈیشن مصر)۔

بدنظمی اور افراتفری کے بارے میں پیشین گوئی کی ہے۔ یہ وہ زمانے ہوں گے جب لوگ بیک وقت بارہ امراء کے گرد جمع ہو جائیں گے اور اگر رسولِ اکرمؐ کا کوئی اور چیز کہنے کا ارادہ ہوتا تو آپ یقیناً فرماتے کہ بارہ امیر ہوں گے جن میں سے ہر ایک یہ یہ کام کرے گا۔" چونکہ حضورؐ نے ان افراد کے متعلق کوئی خبر نہیں دی لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا مقصد یہ تھا کہ تمام خلفاء ایک ہی وقت میں ہوں گے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ پیشین گوئی متذکرہ بالا مفہوم کے ساتھ پانچویں صدی میں پوری ہوئی کیونکہ اس زمانے میں اندلس میں چھ اشخاص ایسے تھے جن میں سے ہر ایک نے خلیفہ کا لقب اختیار کر رکھا تھا۔ ان چھ خلفاء کے علاوہ مصر کا حاکم (فاطمی خلیفہ) اور بغداد میں عباسی خلیفہ بھی تھے (یوں مجموعی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے)۔ ان کے علاوہ کچھ اور مدعیان خلافت بھی تھے جو خوارج اور ان علویوں پر مشتمل تھے جنہوں نے اس زمانے میں خروج کیا اور عباسی خلفاء کی اطاعت کا جوا گردن سے اتار پھینکا اور حکومت اور خلافت کے دعویدار بن گئے۔

یہ قول نقل کرنے کے بعد ابن حجر کہتے ہیں: "یہ باتیں بالخصوص وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں صرف بخاری کی مختصر روایت کا علم ہے اور جنہوں نے حدیث کے دوسرے ذرائع پر نظر نہیں ڈالی (جن میں بارہ خلفاء کے بارے میں کافی توضیحات موجود ہیں)۔ علاوہ ازیں ان بہت سے خلفاء کی موجودگی بجائے خود تفاوت اور جدائی کا موجب ہے لہٰذا وہ آنحضرتؐ کی مراد اور مقصود قرار نہیں دی جا سکتی۔"[1]

یہ تھیں مذکورہ بالا احادیث کے بارے میں خلافت کے مکتب کی تشریحات اور توجیہات جو اوپر بیان کی گئیں۔

آئیے تحقیق کریں

اب ہم واپس لوٹتے ہیں اور روایات کے مجموعے پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ

---

[1] فتح الباری جلد ۱۶ صفحہ ۳۳۸ - ۳۳۹ اور شرح نووی جلد ۱۲ صفحہ ۲۰۲

ان کا حقیقی مفہوم کیا ہے تاکہ ہم ان سب روایات کی نادرستی کو ــــ جن میں سے کوئی بھی ایک دوسری کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی ــــ واضح طور پر سمجھ سکیں۔ ان احادیث کو بنظرِ غائر دیکھنے سے جن باتوں کا پتا چلتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ رسولِ اکرمؐ کے خلفاء اور اسلام کے پیشواؤں کی تعداد بارہ سے تجاوز نہیں کرتی اور وہ سب کے سب قریش سے ہیں۔ ہمارے اس دعوے کی دلیل وہ واضح اور صریح الفاظ ہیں جو اس قسم کی احادیث میں سے چند ایک میں موجود ہیں مثلاً: یَكُونُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ اثْنَا عَشَرَ قَيِّمًا ..... كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ۔[1]

اس اُمّت کے بارہ[12] سرپرست ہیں جو سب کے سب قریش میں سے ہیں یا يَمْلِكُ هٰذِهِ الْأُمَّةَ اثْنَا عَشَرَ خَلِيفَةً[2] یہ امت بارہ خلفاء کی مالک ہو گی یا يَكُونُ بَعْدِي اثْنَا عَشَرَ خَلِيفَةً كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ[3] "میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے جو سب کے سب قریش میں سے ہوں گے۔"

"میرے بعد بارہ خلفاء ہوں گے اور یہ امت بارہ خلفاء کی مالک ہو گی اور ان سے ملتے جلتے جملوں سے پتا چلتا ہے کہ خلفاء اور امت کے سرپرستوں کی تعداد قطعی طور پر بارہ تک محدود ہے۔"

۲۔ یہ پیشوا اور خلفاء روزِ قیامت تک مسلسل (بلافصل) امت کے درمیان موجود ہوں گے۔ اس قول کو ثابت کرنے کے لیے بھی ہم ان روایات سے رجوع کرتے ہیں جو دستیاب ہیں۔

مسلم اپنی 'صحیح' میں آنحضرتؐ سے نقل کرتے ہیں کہ "جب تک دنیا میں فقط دو آدمی بھی باقی ہوں گے امرِ خلافت قریش میں ہی رہے گا۔"[4]

یہ حدیث، جو اہلِ سنت کے معتبر ترین مصادر میں نقل کی گئی ہے، واضح طور پر بتاتی ہے کہ خلفاء کا سلسلہ روزِ قیامت تک مسلسل جاری رہے گا۔ اب ہم اس حدیث کو

---

[1]، [2]، [3] کنز العمال جلد ۱۳ صفحہ ۲۷ احادیث ۱۶۴ - ۱۶۵ - ۱۶۶۔
[4] صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۳ (مطبوعہ مصر)۔

دہراتے ہیں جو پہلے بھی نقل کی گئی ہے:

"یہ دین قیامت تک اور تم پر بارہ خلفاء کی خلافت تک باقی رہے گا"[1]

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں یہ حدیث دین کے قیامت تک قائم رہنے کی خوشخبری سناتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بارہ خلفاء کی خلافت کی خبر بھی دیتی ہے اور وہ ان معنوں میں کہ رسولِ اکرمؐ تصریح فرماتے ہیں کہ "میرا دین قیامت تک باقی رہے گا اور یہ بارہ خلفاء کے عہد خلافت کی مدت ہے اور یہ ضروری ہے کہ ان خلفاء میں سے کم از کم ایک خلیفہ کی عمر اتنی دراز اور طولانی ہو کہ خلافت کے اس طویل مدت کے برابر ہونے کا امکان پیدا ہو سکے"۔[2]

۳۔ رسول اکرمؐ نے ان خلفاء اور امراء کو واضح طور پر بنی اسرائیل کے بارہ نقیبوں[3] سے تشبیہ دی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ: "اس میں شک نہیں کہ اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا تھا اور ہم نے ان پر ان میں سے بارہ نقیب مقرر کیے"۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۲)۔

بنی اسرائیل بارہ قبیلوں میں تقسیم تھے۔ یہ تقسیم تاریخی حیثیت رکھتی تھی اور اسکا سلسلہ حضرت یعقوبؑ سے مربوط تھا جن کے بارہ فرزند تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی اولاد بڑے بڑے قبیلے

---

[1] صحیح مسلم جلد ۶ صفحہ ۴۔ کنز العمال جلد ۱۳ صفحہ ۲۷، حدیث ۱۶۲

[2] ملاحظہ فرمائیے "انتظار امام" مؤلفہ آیت اللہ سید محمد باقر صدر، مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی

[3] "اَلنَّقِيْبُ: اَلْبَاحِثُ عَنِ الْقَوْمِ وَاَحْوَالِهِمْ وَجَمْعُهٗ نُقَبَاءُ" المفردات۔ مادہ نَقَبَ

"اَلنَّقِيْبُ: اَلْعَرِيْفُ وَهُوَ شَاهِدُ الْقَوْمِ وَضَمِيْنُهُمْ وَالْجَمْعُ النُّقَبَاءُ" صحاح اللغہ۔ مادہ نقب جلد ۲ صفحہ ۲۲۷۔

"اَلنُّقَبَاءُ جَمْعُ نَقِيْبٍ وَهُوَ كَالْعَرِيْفِ عَلَى الْقَوْمِ الْمُقَدَّمُ عَلَيْهِمُ الَّذِيْ يَتَعَرَّفُ اَخْبَارَهُمْ وَيُنَقِّبُ عَنْ اَحْوَالِهِمْ ..... وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ جَعَلَ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنَ الْجَمَاعَةِ الَّذِيْنَ بَايَعُوْهُ بِهَا نَقِيْبًا عَلٰى قَوْمِهٖ وَجَمَاعَتِهٖ لِيَاْخُذُوْا عَلَيْهِمُ الْاِسْلَامَ وَيُعَرِّفُوْهُمْ شَرَائِطَهٗ وَكَانُوْا اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا كُلُّهُمْ مِّنَ الْاَنْصَارِ" نہایۃ اللغہ۔ مادہ نقب جلد ۵ صفحہ ۱۰۱۔

وجود میں لائی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں اور بنی اسرائیل کے قوت حاصل کرنے کے بعد بقول قرآن ان بارہ قبیلوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک سرپرست منتخب کیا گیا اور اس کے اعزّہ و اقربا کا انتظام اسی کے سپرد کر دیا گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ زیرِ بحث روایات میں بارہ خلفاء کو بارہ نقیبوں سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اوّلاً تو یہ ہے کہ بارہ کی قطعی اور مسلّم تعداد کے مطابق وہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں اور ثانیاً سرداری اور سرپرستی کے معاملے میں وہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں ثالثاً یہ کہ یہ نقباء اللہ تعالیٰ کی جانب سے متعارف ہونے کے معاملے میں خلفاء سے ملتے جلتے ہیں۔

اب اس حساس نکتے کی جانب توجہ دینا ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ اس قسم کی احادیث کیونکر نقل کی گئیں اور دوسرے اور بہتر لفظوں میں خلافت اور بالخصوص اموی خلافت کی انتظامیہ کی سخت سنسر شپ اور بے پناہ دباؤ کے چنگل سے کس طرح بچ نکلیں۔ میرا خیال ہے کہ جب آنحضرتؐ کے صحابہ نے پہلی مرتبہ یہ احادیث نقل کیں اس وقت خلفاء کی تعداد کم تھی اور بلاشبہ یہ بالکل سیدھی سی بات ہے کہ ہم تصور کریں کہ وہ اس وقت اس چیز کی پیش بینی نہیں کر سکتے تھے کہ بعد میں توجیہ اور تفسیر کی خاطر انہیں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر وہ اس وقت اس دقت کو بھانپ لیتے تو مکتبِ خلافت کی معتبر ترین کتابوں میں مندرج احادیث ہم تک یا تو پہنچ نہ پاتیں اور یا انہیں اسی طرح بے اثر بنا دیا جاتا جس طرح اور بہت سی معتبر اور واضح احادیث بے اثر بنا دی گئی ہیں۔ اس بنا پر ہماری زیرِ بحث حدیث کی نشر و اشاعت کا سبب یہ ہے کہ جس وقت وہ نقل کی گئی اس وقت تک خلفاء کی تعداد بھی بارہ تک نہیں پہنچی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو احادیث معاویہ یا یزید بن معاویہ کے عہدِ حکومت تک نقل کی گئیں ان کا تعلق اس زمانے سے ہے جب رسمی خلفاء کی تعداد ابھی چھ یا سات سے متجاوز نہیں ہوئی تھی لہٰذا خلافت کی انتظامیہ کو اس کی نشر و اشاعت سے کسی خطرے کا احساس نہ ہوا اور جب خلفاء کی تعداد بارہ سے بڑھ گئی تو پھر اس حدیث کی اشاعت کو روکنے یا اس میں تحریف کرنا ممکن نہ رہا۔

حدیث کی توجیہ میں جو مختلف اور حقیقت سے بعید باتیں فرض کی گئیں انہیں دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فقط اہلبیتؑ کا مکتب ہی مذکورہ بالا حدیث کے ساتھ

مطابقت رکھتا ہے۔ آخر میں ہم یاد دہانی کرانا چاہتے ہیں کہ اس حدیث کی اہمیت اسی بنا پر بہت زیادہ ہے کہ یہ اہل سنت کی صحاح، سنن، مسانید اور حدیث پر لکھی گئی دوسری کتابوں میں موجود ہے اور سبھی اس کے صحیح اور معتبر ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

وہ روایات جن میں امام کے نام کی تصریح کی گئی ہے

جیسا کہ ہم نے مشاہدہ کیا کہ مذکورہ بالا احادیث میں خلفاء کے نام فرداً فرداً نہیں لیے گئے۔ اب ہم ان احادیث کی جانب آتے ہیں جن میں آنحضرتؐ کے بعد خلیفہ اور حاکم کے نام کی تصریح کی گئی ہے۔ ان احادیث کے تجزیے کے بعد ہم اپنی بحث مکمل کرتے ہیں۔

دعوت ذوالعشیرہ کے موقع پر پیشین گوئی

اس موضوع پر پہلا متن جس سے ہم استناد کریں گے حدیثِ انذار یا حدیث یوم الدار ہے۔ یہ حدیث اہل سنت کے بہت سے معتبر تاریخی اور روائی مصادر و مدارک مثلاً تاریخ طبری، تاریخ ابن اثیر، تاریخ ابوالفداء، مسند احمد، کنزالعمال، تاریخ ابن الوردی اور دلائل النبوۃ بیہقی وغیرہ میں موجود ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجمال اور تفصیل کے نقطۂ نظر سے ان کی روایات ایک دوسری سے قدرے متفاوت ہیں۔ ہم مذکورہ بالا واقعہ کو تاریخ طبری سے نقل کریں گے جو اس موضوع پر ہمارے قدیم مصادر میں سے ہے اور خلفاء کے مکتب کی معتبر ترین تاریخی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

"امیرالمومنین امام علیؑ فرماتے ہیں کہ جب آیت کریمہ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ نازل ہوئی تو رسولِ اکرمؐ نے مجھے طلب فرمایا اور کہا: اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے اعزہ و اقربا کو اللہ کی جانب سے دعوت دوں اور انہیں خبردار کروں۔" یہ پہلا موقع تھا کہ رسول اکرمؐ دعوت کو اپنے گھر سے ــــ جس میں آپ خود، علیؑ، خدیجہؓ اور زیدؓ رہتے تھے ــــ باہر لے گئے۔ بعثت کے بعد تیسرے سال کے اس دن تک اسلام آنحضرتؐ کے گھر تک محدود تھا اور صرف اس گھر میں رہنے والے لوگ روئے زمین کے تنہا مسلمان تھے۔" پھر آنحضرتؐ نے فرمایا: "جب سے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ہے میرا دل مضطرب ہے کہ میں ابولہب جیسے

لوگوں کا کیا کروں ؟ اگر میں بات کہنی شروع کروں تو وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور میرے کیے دھرے پر پانی پھیر دیں گے اور شائد آئندہ میری دعوت کا اثر الٹا ہو لیکن جبرئیلؑ نے بار بار آکر کہا ہے کہ اس فرمان کی عدم بجا آوری ممکن نہیں اور اگر بالفرض تم اسکی تعمیل نہیں کرو گے تو عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو جاؤ گے ۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو تم خوراک کا انتظام کرو اور تمام بنی ہاشم کو ہمارے ہاں کھانے پر مدعو کرو "

امام فرماتے ہیں :" اس وقت عبد المطلب کے فرزندوں کی تعداد چالیس تھی اور وہ سب کے سب جمع ہو گئے ۔ رسولِ اکرمؐ نے اپنے ہاتھوں سے کھانا پیش کیا اور فرمایا ؛" اللہ کا نام لیکر شروع کرو " سبھی نے کھایا اور سیر ہو گئے ۔ میں اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضے میں علیؑ کی جان ہے کہ جو کچھ میں لایا تھا اسے ایک شخص بھی کھا سکتا تھا لیکن چالیس اشخاص نے کھایا اور سیر ہو گئے اور پھر بھی کھانا بچ رہا ۔ پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ انھیں سیراب کرو ۔ میں لسی لے آیا جو میں نے تیار کی تھی اور وہ بھی سبھی نے سیر ہو کر پی " جلدباز ابولہب نے آنحضرتؐ سے پہل کی اور کہا :" تمہارے ساتھی نے عجیب جادو کیا ہے "

آنحضرتؐ نے سکوت فرمایا اور کچھ نہ بولے ۔ آپ کو دعوتِ اسلام دینے کا حکم دیا گیا تھا اور آپ نے اسی لیے ان لوگوں کو جمع کیا تھا لیکن جس مجلس میں آپ کے کام کو جادو کا نام دیا گیا اس میں کچھ کہنا آپ کے لیے مناسب نہ تھا[1] اسی بنا پر مجلس ختم ہو گئی اور سبھی اپنے گھروں کو چلے گئے ۔

دوسرے دن پھر امام کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں کو دعوت دیں اور پہلے دن کی طرح مہمانداری کا اہتمام کیا گیا البتہ اس مجلس میں آنحضرتؐ نے ابولہب کو بولنے کا موقع نہ دیا اور اپنے اعزہ کو مخاطب کر کے فرمایا :

" اے عبد المطلب کے فرزندو ! خدا کی قسم میں عرب کے کسی ایسے شخص کو نہیں

---

[1] یہ بات قرینِ عقل ہے کہ جب آنحضرتؐ کے کچھ فرمانے سے پہلے کوئی شخص آپ کی تکذیب کر دے اور آپ کے کلام کو بے اثر بنا دے تو پھر آپ کچھ نہ کہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جب خلیفہ عمر نے کہا کہ " اِنَّ الرَّجُلَ لَيَهْجُرُ " (یہ شخص ہذیان بول رہا ہے) تو آپ خاموش رہے ۔

جانتا جو اپنی قوم کے لیے اس تحفے سے بہتر کوئی چیز لایا ہو جو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔ میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لایا ہوں۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کی جانب دعوت دوں۔ تم میں سے کون ایسا شخص ہے جو تکلیفوں میں میرا ساتھ دے اور رسالت کی ادائیگی میں میری مدد کرے تاکہ وہ تمہارے درمیان میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہو۔"

[جو اشخاص خلافت سے زعامت اور حکمرانی مراد لیتے ہیں وہ اس جملے کے معنی یوں کرتے ہیں: "اور میرے بعد تمہارا حاکم ہو" لیکن ہم خلافت کا مفہوم اسلام کی تبلیغ، نشر و اشاعت اور حفاظت کی خاطر جانشینی سمجھتے ہیں]۔

امامؑ فرماتے ہیں: تمام لوگ خاموش ہو کر رہ گئے۔ کسی نے آنحضرتؐ کی بات کا مثبت جواب نہیں دیا۔ تاہم میں نے جو اُن سب میں چھوٹا تھا کہا: "اَنَا یَا نَبِیَّ اللهِ اَکُوْنُ وَزِیْرَكَ عَلَیْهِ" یا نبی اللہؐ! میں بارِ رسالت اٹھانے میں آپ کا وزیر اور مددگار ہوں گا۔[1]

رسولِ اکرمؐ نے اپنا ہاتھ میری گدی پر رکھا اور فرمایا: "اِنَّ هٰذَا اَخِیْ وَوَصِیِّیْ وَخَلِیْفَتِیْ فِیْكُمْ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْا" یہ میرا وصی ہے، یہ تمہارے درمیان میرا خلیفہ ہے۔ اس کی فرمانبرداری کرو اور جو کچھ یہ کہے اور جس بات کا حکم دے اس پر کان دھرو۔"

بنی ہاشم کے بڑے بوڑھے اور قبیلے کے بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ تمسخر آمیز انداز میں ہنس رہے تھے اور ابوطالب سے کہہ رہے تھے: "تمہارا بھتیجا تمہیں حکم دے رہا ہے کہ تم اپنے خورد سال بیٹے کی فرمانبرداری کرو حالانکہ تم قریش کے شیخ اور رئیس ہو۔"[2]

---

[1] جیسا کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے وزیر تھے (قرآن کریم سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۲۹ تا ۳۳) "اور میرے کنبہ والوں میں میرے بھائی ہارونؑ کو میرا وزیر بنا دے، اس کے ذریعے میری پشت مضبوط کر دے اور میرے کام میں اس کو میرا شریک بنا" (سورۂ فرقان آیت ۳۵) "اور البتہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (تورات) عطا کی اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارونؑ کو ان کا وزیر بنایا۔"

[2] طبری: تاریخ الرسل والملوک جلد ۲ صفحہ ۳۱۹-۳۲۱ مطبوعہ دار المعارف ۱۹۶۸ء مصر۔ تفسیر طبری جلد ۱۹ صفحہ ۷۴-۷۵ الکامل فی التاریخ، ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۴۱-۴۲ مطبوعہ دار الکتاب العربی۔

یہ پہلا دن تھا جب رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو امت کے امام کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اس دن جبکہ پہلی دفعہ اسلام کی رسمی اور علانیہ دعوت دی گئی۔ آنحضرتؐ نے تین بنیادی چیزوں کی دعوت دی یعنی اللہ کی جانب، رسالت کی جانب اور حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی وزارت، خلافت اور وصایت کی جانب۔ جس کا پہلا عنوان آپ کی وزارت ہے جو رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے زمانے سے وابستہ ہے اور دوسرے اور تیسرے عنوانات وصایت اور خلافت ہیں جن کا تعلق آنحضرتؐ کی وفات کے بعد کے زمانے سے ہے۔ وزارت سے مراد تبلیغ کا بھاری بوجھ اٹھانے میں امام علیؑ کا رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں ان کے ساتھ اتحادِ عمل ہے اور وصایت اور خلافت کا مفہوم آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد امام علیؑ کا وہی بوجھ تن تنہا اٹھانا ہے۔

ہم پہلے اس حقیقت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ہر شخص کا خلیفہ وہی کام کرتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، چنانچہ پیغمبر کا خلیفہ بھی پیغمبر کے کام کا ذمے دار ہوتا۔ وہ اس کی زندگی میں اس کے خاص کام یعنی تبلیغ میں اس کا شریک ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کام کو جاری رکھتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حکومت کا حامل ہوتا ہے۔ بلاشبہ حکومت پیغمبر کی جدا ہونیوالی شانوں میں سے ایک شان ہے لیکن یہ اس کی پیغمبری کے مکمل ہونے کے لیے ضروری نہیں۔ اسی بنا پر یہ خلیفہ کی شانوں میں بھی ہے لیکن اس کی شخصیت کی تکمیل کے لیے ضروری نہیں۔ پیغمبر کو حاکم ہونا چاہیے اور اس کے زمانے میں کوئی دوسرا حاکم برحق نہیں ہوتا اور دوسرے شخص کی حکومت صحیح اور جائز نہیں ہوتی لیکن پیغمبر اس لیے نہیں آتا کہ حکومت کرے اور اگر اسے حکومت حاصل نہ ہو تو اس کی پیغمبری میں خلل اور تناقض واقع ہو جائے۔ حضرت عیسیٰؑ کو ان کی ساری زندگی میں حکومت اور مادی قدرت حاصل نہیں ہوئی اور انھوں نے اپنی عمر احکاماتِ الٰہی کی تبلیغ میں گزار دی لیکن کیا اس بنا پر ان کی پیغمبری میں کوئی خلل واقع ہوا؟

حضرت خاتم النبیینؐ نے ہجرت سے پہلے جو تیرہ سال مکہ میں گزارے اس دوران میں وہ حاکم نہ تھے اور حکومت کی قدرت نہیں رکھتے تھے لیکن ان کی پیغمبری کو کوئی نقص، خدشہ یا خلل لاحق نہیں ہوا لہٰذا اگر امام علیؑ ایک وقت میں حاکم ہوں اور ایک وقت میں حاکم نہ ہوں تو اس سے ان کی خلافت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور ان کی امامت کی بنیاد

کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

یہ جو رسول اکرمؐ نے اس موقع پر امام علیؑ کا تعارف بطورِ خلیفہ کرایا ہے اس سے آپ کے پیش نظر کیا چیز تھی ؟ کیا وہ آپ کو اسلامی معاشرے کے حاکم کے طور پر متعارف کرانا چاہتے تھے اور اپنے بعد ان کی حکومت کو مستحکم کرانا چاہتے تھے ؟ نہیں! انھوں نے حاکم کا تعین نہیں کیا بلکہ آپ کے لیے حاکم سے بھی برتر اور بالاتر مقام تجویز کیا ہے اور آپ کو پیغمبرؐ کے وصی اور وزیر اور پیغمبرؐ کے بعد اللہ تعالی کے احکام کے مبلغ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ اس مفہوم کے ساتھ کہ خلافت ایک بلند مقام کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس میں خالص اور غیر تحریف شدہ اسلام کی حفاظت اور اشاعت، عادلانہ اسلامی حکومت اور قضاوت کا عظیم عہدہ اور جمعہ وجماعت کی امامت سبھی چیزیں شامل ہیں لیکن یہ باقی چیزوں کو چھوڑ کر ان میں سے فقط کسی ایک چیز کے برابر نہیں ہے۔

رسول اکرمؐ کے بعد سرپرست

ایک اور روایت میں جس کی جانب ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اور جس کا ذکر امیر المومنینؑ کی یمن کی جنگی مہم کے سلسلے میں آیا تھا ہم نے دیکھا کہ آنحضرتؐ نے فوج کے دو دستے یمن بھیجے۔ ان میں سے ایک دستہ امام علیؑ کی سرکردگی میں اور دوسرا خالد بن ولید کے زیر کمان بھیجا گیا اور رسولِ اکرمؐ نے فرمایا کہ اگر دونوں لشکر وہاں اکٹھے پہنچیں تو کمانڈر کے فرائض علیؑ انجام دیں گے۔ خالد نے جس میں زمانہ جاہلیت کی عادات اور خصائل بدرجہ اتم موجود تھیں، اس فیصلے پر بہت برا منایا لہٰذا اس مشن کے مکمل ہونے کے بعد اس نے چند افراد کو بھیجا تاکہ وہ حضرت رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں امام علیؑ کے خلاف ایک شکایت نامہ پیش کریں۔

صحابئ رسولؐ بریدہؓ جو شکایت نامہ لے کر گئے، کہتے ہیں کہ: "میں نے وہ چٹھی جو میرے پاس تھی آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کی اور وہ پڑھ کر آپ کو سنائی گئی۔ اسے سنکر آنحضرتؐ کو اس قدر غصہ آیا کہ اس کے آثار مجھے حضورؐ کے روئے مبارک پر دکھائی دیے۔ اس موقع پر میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔ چٹھی خالد

نے بھیجی ہے اور مجھے آپ کی خدمت میں پہنچانے کا حکم دیا ہے چونکہ وہ میرا سردار ہے اس لیے میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی ہے۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "علیؑ کی برائی مت کرو۔ وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں اور میرے بعد وہ تمہارا ولی، سرپرست اور صاحب اختیار ہے[1]۔"

حدیث کے ایک اور متن میں مندرجہ بالا حدیث میں اضافہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب بریدہ نے رسولِ اکرمؐ کی روش اور غصہ دیکھا تو گویا اسے اپنے اسلام میں شک ہوگیا لہٰذا اس نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! میں آپ کو رفاقت کے ان حقوق کی قسم دیتا ہوں جو ہمارے درمیان موجود ہیں کہ چونکہ میں نے آپ کو غصہ دلایا ہے اس لیے آپ دوبارہ اپنا ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں ایک دفعہ پھر آپ کے ہاتھ پر اسلام کے لیے بیعت کروں اور میرا گناہ بخشا جائے[2]۔"

اس روایت کی بنیاد پر امام علیؑ رسولِ اکرمؐ کے بعد مسلمانوں کے سرپرست، صاحبِ اختیار اور ولی ہیں یعنی صحیح معنوں میں اس ولایت کے مقام پر آنحضرتؐ کے جانشین ہیں جو آپ کو لوگوں کی جان و مال پر حاصل ہے تاکہ وہ اس قوت اور اختیار کو ہر پہلو میں ان کی (یعنی عوام کی) دینی اور دنیاوی مصلحت کے مطابق استعمال میں لائیں۔

ایک اور روایت میں ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول اکرمؐ نے امیرالمومنینؑ سے فرمایا: "اَنْتَ وَلِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِیْ" "میرے بعد تم ہر مومن کے ولی، سرپرست اور صاحبِ اختیار ہو[3]۔"

چوتھی روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب راوی امامؑ کے بارے میں شکایت لیکر رسولِ اکرمؐ کے پاس پہنچتا ہے تو آپ فرماتے ہیں: "نہیں! اس قسم کی باتیں علیؑ کے بارے میں

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۵۶۔ خصائص نسائی صفحہ ۲۴۔ مجمع الزوائد جلد ۹ صفحہ ۱۲۷۔ کنز العمال جلد ۱۲ صفحہ ۲۰۷۔ ۲۱۲۔ [2] مجمع الزوائد جلد ۹ صفحہ ۱۲۸

[3] مسند طیالسی جلد ۱۱ صفحہ ۳۶۰۔ ایک دوسری روایت میں یوں ہے: "اِنَّکَ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ بَعْدِیْ"

مت کہو۔ وہ میرے بعد ہر شخص سے بڑھ کر لوگوں پر ولایت، حکم اور ارادہ نافذ کرنے کے حقدار ہیں"۔

ان روایات کی بنا پر جو اب تک ہماری نظر سے گزر چکی ہیں رسول اکرمؐ نے علی ابن طالبؑ کے لیے اپنی خلافت، وزارت اور وصایت کے مقامات کا بالتصریح ذکر کیا ہے اور ان کا تعارف ان درجات اور مراتب کے ساتھ کرایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ خود آپ کے بعد سب مومنین کے ولی ہیں۔

انگشتری اور مسجد میں سائل کو اس کی بخشش کی داستان اور آیت شریفہ: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ۔ (سورۂ مائدہ۔ آیت ۵۵) کے نزول میں بھی امامؑ کی ولایت عامہ کی تصریح کی گئی ہے اور اہل سنت کی کتابوں میں موجود متعدد روایات میں اس امر کی جانب اشارہ ہوا ہے۔ یہ تمام اہل سنت کی معتبر کتابوں کی روایات تھیں جن سے پتا چلتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے کس طرح وصیت کی ہے۔ پس آپ کے مرضِ وفات میں حالات نے کیا رخ اختیار کیا؟ ان حالات میں آنحضرتؐ چاہتے تھے کہ اپنے آخری ارشادات جو خلیفہ، وصی اور لوگوں کے حاکم کے بارے میں تھے لکھ دیں اور ان پر گواہ بھی حاصل کرلیں۔

ایسے مواقع پر آنحضرتؐ کے فرمان کے مطابق ایک دستاویز تیار کی جاتی تھی اور آپ اس پر مہر ثبت کرتے تھے اور دستخط کرتے تھے اور گواہیاں ڈلواتے تھے اور پھر مثلاً عرب قبائل یا غیر عرب سرداروں کو روانہ کرتے تھے۔ اپنی عمر کے آخری لمحوں میں بھی آپ کا یہی ارادہ تھا لیکن آپ کو اس کی اجازت نہیں دی گئی اور آپ سے ایسی باتیں کہی گئیں جنہوں نے معاشرے میں آپ کی نبوت کی قبولیت کی بنیاد کو ہی معرضِ خطر میں ڈال دیا۔ یہی وہ موقع تھا جب آپ نے خاموشی کو ترجیح دی۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ یہ مسئلہ فقط اسی وقت پیش نہیں ہوا بلکہ آنحضرتؐ کی عمر کے تمام حساس لمحات میں یعنی جنگ اور صلح اور اسلام کی زندگی کی تمام اہم ساعتوں میں جانشینی کے مسئلے کا ہر پہلو سے اعلان کیا گیا ہے حتیٰ کہ مابعد کے ادوار میں جس طرح لوگوں کا گلا گھونٹا گیا اور امویوں اور عباسیوں کے ہاتھوں جس طرح انکا خون بہا اور ہاتھ پاؤں

کاٹے گئے تاکہ یہ میراث نقل نہ ہو اور آئندہ نسلوں کے دلوں میں ان ذوات مقدسہ کی محبت پیدا نہ ہو اس کے باوجود آج یہ معتبر نصوص اہل سنت کے اول درجے کے مصادر کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔

گزشتہ تمام تحقیقات کی بنا پر تشیع کی تمہید یہ ہے کہ امامت اللہ کی جانب سے منصوص ہے اور رسولِ اکرمؐ نے لوگوں کے مابین اس حکم کی تبلیغ کی ہے۔

وَالصَّلَاةُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِہٖ

●●●●●

چھٹا درس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ عَلٰى
مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّاهِرِيْنَ سِيَّمَا بَقِيَّةَ اللّٰهِ
فِي الْاَرَضِيْنَ.

ہم اس مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ امتِ اسلامی نے حضرت خاتم النبیینؐ کی شریعت میں کس طرح تحریف کی اور یہ دیکھا کہ گزشتہ ادوار میں مقتدر لوگ' دنیا پرست علماء کے تعاون سے اپنے پیغمبر کی شریعت میں تحریف کیا کرتے تھے اور نوبت یہاں تک پہنچتی تھی کہ اس امت کے پیغمبر کی شریعت میں سے کوئی ایسی چیز باقی نہ رہ جاتی تھی جو لوگوں کی ہدایت کا موجب ہو۔ وہ حق کو باطل سے اس طرح ڈھانپتے تھے اور آسمانی حقائق کو یوں بدل ڈالتے تھے کہ اگر تمام بشریت بھی کوشش کرتی تو شریعت اور راہِ خدا تک نہ پہنچ پاتی۔ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ ایک اولوالعزم پیغمبر کو مبعوث فرما کر دین کی تجدید کرتا اور اسے از سرِ نو زندہ کر دیتا۔

آخری امت کے سلسلے میں خداوند تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا یہ ہوا کہ پیغمبری کو حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر دیا جائے۔ بلا شبہ ربوبیت کے تقاضے کے تحت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کو ارتقاء بخشنے والا قانون اس کی دسترس میں دیدے۔ ان حالات میں جب آفرینش کے اٹل قوانین کی بنیاد پر دین مقتدر لوگوں کے ہاتھوں زیر و زبر ہو گیا ہو تو لوگوں کی ذمے داری کیا ہے اور انہیں کیا کرنا چاہیے؟ جب کسی نئے پیغمبر کے آنے کا کوئی سوال نہیں اور لوگ ایک ارتقائی قانون کے بغیر صحیح زندگی بھی بسر نہیں کر سکتے تو پھر وہ کیا کریں؟

اس موقع پر خداوند تبارک وتعالیٰ نے اسی امت کے دائرے میں خاتم الانبیاءؐ کی شریعت کی تجدید اور اعادہ فرمایا۔ ائمۂ اہلبیتؑ میں سے ہر ایک کا معاشرتی کردار صحیح اسلام کو معاشرے کی جانب لوٹانے کی علت تامہ کا ایک حصہ رہا ہے جس کی تشخیص ہم کتمان اور تحریف کی بحث کے بعد کریں گے اور بنظر غائر دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے امام حسنؑ کی صلح، امام حسینؑ کی شہادت، امام موسیٰ کاظمؑ کے محبوس ہونے، امام باقرؑ، امام صادقؑ اور امام رضاؑ کے ارشادات اور امام مہدیؑ کی غیبتِ صغریٰ کے ذریعے کیونکر اسلام کو دوبارہ مستقل بنیادوں پر قائم کیا۔

پچھلی بحث میں ہم نے اسلام میں تبدیلی کے ایک وسیلے اور عامل کا ذکر کیا تھا جس کی مدد سے امت کے زور آور لوگوں نے حقیقی اسلام کو معاشرے سے دور کر دیا اور وہ عامل تھا رسول اکرمؐ کی احادیث اور ارشادات کو نقل کرنے کی ممانعت۔ میرا خیال تھا کہ اس موضوع پر جتنی بحث ہو چکی ہے کافی ہے لیکن گزشتہ بحث کے بعد جو سوالات پیش کیے گئے ان سے پتا چلا کہ اس سلسلے میں مفصل تر بحث کی ضرورت ہے۔

اس بارے میں جو سوال کیا گیا وہ یہ تھا کہ خلفاء اور امت کے مقتدر لوگوں کی جانب سے حدیث رسولؐ نقل کرنے کی ممانعت کی وجہ کیا تھی؟ ہم پوچھتے ہیں کہ آیا اصولاً یہ سوال مناسب بھی ہے یا نہیں؟ "کیا وجہ تھی" سے کیا مراد ہے؟ کیا کوئی چیز اس عمل کی توجیہ کر سکتی ہے؟ فرض کیجیے حضرت موسیٰ بن عمرانؑ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوتے ہیں کہ ان کی رہنمائی کریں اور وہ لوگوں کو اور اپنی امت کو اللہ تعالیٰ کی شریعت سے آگاہ کرتے ہیں اور پھر حضرت ہارونؑ کی اولاد جو لوگوں کی مذہبی پیشوا ہے موسیٰؑ کے بعد لوگوں سے کہتی ہے: "نہیں، موسیٰؑ کے اقوال اور نظریات نقل نہ کرو۔"

ظاہر ہے اس حکم کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی، اس کے باوجود ہم ذیل میں اس ممانعت کے عوامل کو موردِ تحقیق قرار دیتے ہیں اور حدیث کی نشر و اشاعت کی ممانعت کرنے والوں نے اس کی وجوہ کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اسے انہی کی زبان میں دہراتے ہیں اور اس کی تشخیص کرتے ہیں۔

۱۔ ام المومنین بی بی عائشہ نقل کرتی ہیں: "میرے والد نے احادیثِ رسولؐ میں سے

پانچ سو احادیث ایک کتاب میں جمع کر رکھی تھیں۔ انہوں نے اس کو بطور امانت میرے سپرد کر دیا تھا۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر میں بے چین ہیں اور بار بار پہلو بدل رہے ہیں اور انہیں نیند نہیں آرہی۔ میں نے پوچھا: کیا آپ کی طبیعت ناساز ہے یا کوئی بری خبر ہے جس کی وجہ سے آپ اس قدر پریشان ہیں؟ صبح ہوئی تو انہوں نے مجھے حکم دیا: "بیٹی جو احادیث تمہارے پاس ہیں وہ لے آؤ۔" پھر آگ منگوائی اور وہ کتاب جس میں نبی اکرمؐ کی احادیث درج تھیں نذرِ آتش کر دی۔ کتاب جلا دینے کے بعد ان کا اضطراب اور بے چینی جاتی رہی۔ میں نے ان سے وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا: "مجھے ڈر تھا کہ میں نے جو احادیث اس کتاب میں لکھی ہیں ممکن ہے کہ ان میں کوئی ایسی حدیث بھی ہو جو صحیح نہ ہو اور میں اطمینان کی بنا پر وہ حدیث کسی دوسرے کے سامنے نقل کر دوں اور یوں جوابدہ ٹھہروں[1]۔"

۲۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ خلیفہ عمر نے اپنے دورِ خلافت میں احادیث جمع کرنے اور انہیں لکھنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اصحابِ رسولؐ سے رائے طلب کی اور سب نے اس کام کے حق میں رائے دی۔ خلیفہ عمر نے اس بارے میں مہینہ بھر غور کیا اور پھر اپنے آخری فیصلے پر پہنچے۔ صبح کے وقت انھوں نے لوگوں کو اپنے فیصلے سے ان الفاظ میں آگاہ کیا: "میرا خیال تھا کہ سنتِ نبویؐ کے بارے میں روایات لکھوں لیکن مجھے خیال آیا کہ جو قومیں تم سے پہلے گزری ہیں انھوں نے کتابیں لکھیں اور بے حد مشغول ہو گئیں جس کے نتیجے میں انہوں نے آسمانی کتابوں کو ترک کر دیا اور میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں خدا کی کتاب کو کسی چیز سے مخلوط اور ملوث نہیں کروں گا[2]۔"

ہم ان دو روایات کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ حدیث کی نشر و اشاعت اور کتابت کی ممانعت کی وجہ دریافت کر سکیں۔ ان دو خلفاء نے پہلے مرحلے میں یہ سوچا کہ اگر ہو سکے تو کوئی ایسا انتظام کریں جس کے ذریعے رسولِ اکرمؐ کی احادیث کی نقل اور نشر و اشاعت

---

[1] شمس الدین ذہبی: تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۵ (مطبوعہ ہندوستان)۔
[2] ابن عبد البر: جامع بیان العلم وفضلہ جلد ۱ صفحہ ۷۷ مطبوعہ مصر ۱۳۸۸ھ ق۔

اور تحریر کو اپنے کنٹرول میں لے آئیں اور وہ ان معنوں میں کہ آنحضرتؐ کی صرف وہ احادیث نقل کی جائیں یا لکھی جائیں جو اس دور کی خلافت اور حکومت کی سیاست کے منافی نہ ہوں۔ یہ پہلا مرحلہ تھا لیکن مزید غور و فکر کے بعد جس نے خلیفہ ابوبکر کی نیند اڑا دی اور خلیفہ عمر کو ایک مہینے تک سوچ بچار میں مبتلا رکھا انہوں نے دیکھا کہ فقط محدود اور کنٹرول کی ہوئی احادیث کی نشر و اشاعت ممکن نہیں اور اگر یہ طے ہو کہ خلیفہ ابوبکر آنحضرتؐ کی احادیث لکھیں اور خواہشمند لوگوں کے سامنے پیش کریں تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے اور لوگوں کو یقین دلایا جا سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی احادیث فقط یہی ہیں اور دوسری احادیث حضورؐ کی احادیث نہیں ہیں؟ اس صورت میں سلمانؓ بھی کہیں گے کہ مجھے کچھ احادیث یاد ہیں اور میں انھیں لکھوں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم لکھو اور میں نہ لکھوں۔ تم نے آنحضرتؐ کو سمجھا ہے تو میں نے بھی سمجھا ہے۔ اگر تم نے ان کے ارشادات سنے ہیں اور کردار کا مشاہدہ کیا ہے تو یہ سب کچھ میں نے بھی کیا ہے لہٰذا ہماری احادیث میں باہم کوئی فرق نہیں ہوگا۔

اسی طرح یہی بات ابوذرؓ بھی کہہ سکیں گے۔ وہ بھی اس بات پہ قادر ہوں گے کہ احادیث لکھیں اور پھر کسی کو حدیث لکھنے والوں کو ممانعت کرنے کی مجال نہ ہوگی۔ عمارؓ بھی لکھیں گے مقدادؓ بھی کہیں گے کہ میں بھی لکھتا ہوں۔ خزیمہ ذوالشہادتینؓ اور سہل بن حنیفؓ وغیرہ بھی کسی نہ کسی صورت میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کریں گے۔ پھر اس بات کی کوئی وجہ نہ ہوگی کہ اربابِ خلافت تو حدیث نقل کریں اور لکھیں اور دوسرے ایسا نہ کر سکیں۔ اس بنا پر خلیفہ ابوبکر کے شروع شروع حدیث لکھنے اور خلیفہ عمر کے ایک زمانے میں یہ کہنے کی وجہ کہ "لوگ فقط عبادت سے مربوط اعمال کے بارے میں احادیث نقل کریں"[1] یہ تھی کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ حدیث کو کنٹرول کریں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ طریقہ عملی طور پر ممکن نہیں تو خود خلیفہ ابوبکر نے اپنی احادیث کی کتاب نذرِ آتش کر دی اور خلیفہ عمر نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: "اے لوگو! میں نے سنا ہے کہ تمہارے پاس کتابیں ہیں۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کتاب وہ ہے جس کی بنیاد سب سے زیادہ عدالت اور راستی پر ہو۔ جس

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۸ صفحہ ۱۰۷ مطبوعہ بیروت

کسی کے پاس کتاب ہو، وہ میرے پاس لے آئے تاکہ میں ان کتابوں کے بارے میں غور و فکر کروں۔"

لوگوں نے خیال کیا کہ خلیفہ انہیں پڑھنا چاہتا ہے اور ان کے اختلافات دور کرنے کے لیے ان میں اصلاح کرنا چاہتا ہے چنانچہ سبھی کتابیں لے آئے خلیفہ عمر نے ان سب کو جلا دیا۔[1]

خلیفہ ابوبکر نے کہا: "مجھے ڈر تھا کہ ممکن ہے میں نے کوئی حدیث کسی سے سنی ہو جس پر مجھے اعتماد ہو لیکن وہ صحیح نہ ہو اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس غیر صحیح حدیث کی نشر و اشاعت کی ذمے داری اپنے سر لوں۔"

اگر واقعی ان کا یہ قول حقیقت پر مبنی تھا تو ایک اور موقع پر انہوں نے یہ کیوں کہا کہ رسولِ اکرمؐ سے حدیث نقل نہ کرو؟ کیا دوسروں کے نقل کرنے سے حتیٰ کہ ان مطمئن افراد کے نقل کرنے سے جنہوں نے آنحضرتؐ کے ارشاد خود سنے ہوں اور وہ انہیں یاد ہوں خلیفہ پر کوئی ذمے داری عائد ہوتی ہے؟ وہ دلیل دیتے ہیں کہ احادیث نقل کرنے میں تمہارا ایک دوسرے سے اختلاف ہے اور دوسری نسلیں بھی آئیں گی اور ان کے اختلافات تم سے زیادہ ہوں گے۔[2]

جب تک ہم اختلافات کا مفہوم نہ جان لیں ان کی بات کے صحیح معنی ہماری سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اگر ایک حدیث لفظوں میں دوسری حدیث سے اختلاف رکھتی ہو تو اسے اختلاف شمار نہیں کیا جاتا۔ اس قسم کے اختلاف کو "علم الحدیث" کی اصطلاح میں "نقل بہ معنی" کہا جاتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اگرچہ الفاظ میں معمولی سا فرق بھی ہو تب بھی مفہوم مکمل طور پر محفوظ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں بھی اس کی کافی مثالیں ملتی ہیں مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: "وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ" یعنی "مفلسی کے سبب اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔" (سورۂ انعام - آیت ۱۵۱)۔

---

[1] خطیب بغدادی: تقیید العلم صفحہ ۵۲ مطبوعہ مصر ۱۹۷۴ء طبقات الکبریٰ جلد ۵ صفحہ ۱۸۸۔ مطبوعہ بیروت۔ [2] شمس الدین ذہبی: تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۲ اور ۳۔

ایک اور مقام پر کہا گیا ہے: وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ۔
یعنی "اپنی اولاد کو بھوک کے خوف سے مت قتل کرو۔" (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۱)۔

ان دو آیات کے الفاظ میں باہم تھوڑا سا فرق ہے لیکن ان کے اصلی معانی ایک ہی ہیں اور ایک ہی مقصد کو مدّنظر رکھا گیا ہے۔ اسے اختلاف نہیں کہتے بلکہ فقط "نقل بہ معنیٰ" ہوئی ہے یعنی ایک ہی مفہوم اور معنی کو دو عبارتوں میں پیش کیا گیا ہے لہٰذا "نقل بہ معنیٰ" کو کسی وجہ سے بھی اختلاف نہیں کہا جا سکتا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ لفظی اختلاف جس کا نتیجہ "نقل بہ معنیٰ" میں نکلتا ہے کیونکر وجود میں آتا ہے۔ اس قسم کے اختلاف کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں:

۱۔ کبھی رسولِ اکرمؐ نے ایک حقیقت مختلف اوقات یا مقامات پر مکرر بیان فرمائی ہے اور بلاشبہ یہ تکرار اس حقیقت کی بہت زیادہ اہمیت یا دوسرے مصالح کی بنا پر ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں آنحضرتؐ نے جتنی دفعہ اپنے قول کی تکرار فرمائی ہے خاص زبان اور الفاظ میں (یعنی نئے لفظوں میں) فرمائی ہے اور دوسرے نے دوسری نقل کی ہے۔ یہ جو ہم نے دیکھا ہے کہ ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "عَلِیٌّ وَلِیُّكُمْ بَعْدِیْ" یعنی میرے بعد علیؑ تمہارے سرپرست اور صاحبِ اختیار ہیں اور ایک اور جگہ فرمایا کہ "عَلِیٌّ وَلِیُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِیْ" یعنی میرے بعد علیؑ ہر مومن کے ولی ہیں تو یہ دو الگ الگ حدیثیں ہیں اور ایک حدیث نہیں جسے الفاظ کے اختلاف کے ساتھ نقل کیا گیا ہو لہٰذا ایسی صورت میں اسے احادیث کا اختلاف نہیں کہا جا سکتا کیونکہ خود رسولِ اکرمؐ نے دو دفعہ ارشاد فرمایا ہے اور احادیث کی عبارت میں ہمیں یہ بات لکھی ملی ہے کہ آنحضرتؐ نے اس مقام پر (جگہ بھی معین شدہ ہے) یہ الفاظ کہے ہیں اور دوسری حدیث میں دوسرے مقام پر (وہ جگہ بھی متعین ہے) دوسرے الفاظ میں ارشاد فرماتے ہوئے وہی حقیقت بیان فرمائی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ نے دو مختلف مقامات پر دو عبارات میں خطاب فرمایا ہے جو ایک خاص معنی کی حامل ہیں۔ اس قسم کے لفظی اختلاف کو اصولاً اختلاف نہیں کہتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بہت سے افراد نے رسولِ اکرمؐ سے ایک مجلس میں کوئی حدیث سنی اور سبھی نے اس کے معانی بھی سمجھ لیے لیکن اس حدیث کو دہراتے وقت

آنحضرتؐ کے عین الفاظ یاد نہ ہونے کی وجہ سے ہر شخص نے اپنے سمجھے ہوئے معانی کو اپنے الفاظ میں ادا کر دیا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں اس صورت میں بھی حقیقی اختلاف نہیں ہوتا اور علم الحدیث کی اصطلاح میں اسے "نقل بہ معنی" کہا جاتا ہے۔

پس اختلاف کہاں اور کس صورت میں ہوتا ہے؟ حقیقی اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب تناقض پیدا ہو جاتے اور نفی، اثبات یا اثبات، نفی بن جائے مثلاً ایک روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ "میری حدیث لکھو" اور ایک روایت میں آیا ہے کہ "میری حدیث نہ لکھو"۔ یہ ہے حقیقی اختلاف!

لیکن جو کچھ خلیفہ ابوبکر نے کہا ہے اور جس اختلاف کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ اس معنی اور مفہوم میں نہ تھا بلکہ وہی لفظی اختلاف تھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اگر ان کی مراد ایسا اختلاف ہوتا جو تناقض کی حد تک ہو اور جس سے بڑا اختلاف وجود ہی نہیں رکھتا تو پھر تصور نہیں کیا جا سکتا کہ آئندہ نسلیں آئیں اور اختلاف شدید تر ہو جائے۔ نیز اگر اختلاف سے ان کی مراد کوئی اور چیز نہیں بلکہ تناقض ہوتا تو چاہیے تھا کہ تمام کی تمام نہیں بلکہ ایسی احادیث ممنوع قرار دی جاتیں (جن میں تناقض ہوتا) اور بالآخر اگر ــــ خلیفہ ابوبکر کے قول کی بنیاد پر ــــ حدیث نقل نہ کی جاتے تو پھر اسلام کو کہاں سے سمجھا جائے؟ کیا اسلام کے بارے میں آنحضرتؐ سے نہیں دریافت کرنا چاہیے؟ کیا قرآن مجید کی تفسیر اور توضیح آپ سے نہیں حاصل کرنی چاہیے؟ کیا نماز، روزے، حج اور زکات کے احکام کی تفصیل آپ سے اخذ نہیں کرنی چاہیے؟[1] اور خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کیا اسلام قرآن مجید اور آنحضرتؐ کی سیرت اور سنت میں نہیں ہے اور کیا یہ درست نہیں کہ اگر آنحضرتؐ سے کوئی چیز نقل نہ ہو تو اسلام

---

[1] قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ: "ہم نے تم پہ قرآن نازل کیا ہے تاکہ جو احکام لوگوں کے لیے نازل کیے گئے ہیں تم ان سے صاف صاف بیان کر دو تاکہ وہ لوگ خود سے کچھ غور کریں"۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۴۴)۔

"اور ہم نے تم پہ کتاب (قرآن) تو اسی لیے نازل کی ہے تاکہ جن باتوں میں یہ لوگ جھگڑا کرتے ہیں تم انھیں صاف صاف بیان کر دو اور یہ کتاب ایمان والوں کے لیے سراسر ہدایت اور رحمت ہے"۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۶۴)۔

کی شناخت اور اس کا سمجھنا ممکن نہیں۔ اس مقام پر خلیفہ اول کی جانب سے حدیث کی ممانعت کا اصلی مقصد کسی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔

خلیفہ دوم نے یہ جو کہا تھا کہ "میں اللہ کی کتاب کو کسی چیز سے مخلوط نہیں کرتا کیونکہ گزشتہ امتوں نے ایسا کیا اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا" تو اس کے متعلق ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ قرآن مجید لکھا جاتا اور کہا جاتا کہ یہ قرآن ہے اور اسے ایک کتاب کی شکل میں محفوظ کر لیا جاتا اور حدیث بھی لکھی جاتی اور کہا جاتا کہ یہ حدیث ہے اور اسے بھی محفوظ کر لیا جاتا۔ ان لوگوں نے اللہ کی کتاب کو جمع کیا اور جب قرآن لکھا جا چکا تو عالم اسلام کے تمام علاقوں میں بھجوایا۔ ایک نہیں بلکہ ایک ہزار نسخے تیار کیے گئے اور اس کے حدیث کے ساتھ خلط ملط ہونے کا امکان اور احتمال جاتا رہا۔ پھر آخر ۱۰۰ ہجری تک حدیث لکھنے کی ممانعت کیوں جاری رہی؟

اگر سرکاری عہدہ دار اور خلفاء خود رسولِ اکرمؐ کی احادیث جمع کرتے اور وہ اس طرح کہ صحابۂ رسولؐ کے اس گروہ کو جو اسلام میں پیش قدم تھے (مثلاً عبد اللہ بن مسعودؓ، عمار یاسرؓ، خبابؓ، ابوذرؓ، بلالؓ، سہل بن حنیفؓ اور ذو الشہادتین) اکٹھا کرتے اور حدیث جمع کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دیتے اور پھر عام صحابہ میں جن میں سے ۹۹ فیصد مدینے میں تھے منادی کرا دیتے کہ جس شخص نے آنحضرتؐ سے کوئی حدیث سنی ہو وہ ان ممبران کے پاس آئے اور انہیں مطلع کرے اور کمیٹی بھی ان احادیث کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں تحریر کر لیتی اور پھر رسول اکرمؐ کی احادیث کے اس مجموعے کو اس طرح لکھ کر اس پر مسلمانوں کی آراء طلب کر لی جاتیں تاکہ حدیث کے معتبر ہونے کے بارے میں خیالات یکساں ہو جاتے (جیسے قرآن مجید کے ساتھ کیا گیا اور قرآن مجید جس کی اس طرح تدوین ہوئی کہ آج تک عالمِ انسانیت کے پاس موجود ہے اور اس کے بارے میں کوئی خدشہ نہیں) تو اس طرح معتبر احادیث جمع ہو جاتیں اور قرآن مجید سے بھی ہرگز خلط ملط نہ ہوتیں جیسا کہ جس دن سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم لکھی گئی ہیں اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں۔

لہٰذا یہ امر واضح ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حدیث کی ممانعت کی حقیقی وجہ نہیں ہے۔ اب ہم دو تاریخی روائی اسناد کی جانب اشارہ کرتے ہیں جن میں حدیث کی نشر و اشاعت کی ممانعت کی اصل وجہ کی وضاحت کی گئی ہے:

۱۔ پہلی روایت عبد اللہ بن عمرو بن عاص سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دہانِ مبارک سے جو لفظ نکلتا تھا، میں اسے لکھ لیتا تھا۔ قریشیوں نے مجھے اس کام سے منع کیا اور کہا : "تم رسول خدا کی زبان سے جو کچھ سنتے ہو لکھ لیتے ہو۔ وہ بھی ایک انسان ہیں اور خوشی اور غصے کی حالت میں باتیں کرتے ہیں۔"
(یعنی آنحضرتؐ کا خوشی اور غصے کے عالم میں باتیں کرنا حقیقت اور واقعیت کی بنا پر نہیں بلکہ ان حالتوں کی وجہ سے ہوتا ہے)۔

قریشیوں کی یہ باتیں سننے کے بعد میں نے احادیثِ رسولؐ کو لکھنے سے پرہیز کیا۔ ایک دن یہ واقعہ میں نے آنحضرتؐ سے بیان کیا۔ آپ نے ہاتھ سے دہانِ مبارک کی جانب اشارہ فرمایا اور کہا : "لکھتے رہو۔ مجھے اس کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس دہان سے حق کے علاوہ کوئی بات نہیں نکلتی۔"

اس حدیث کے ادراک کے لیے لازم ہے کہ ہم مذکورہ بالا باتیں کرنے والوں کو پہچانیں۔ وہ قریشی جنہوں نے عبد اللہ کو احادیث لکھنے سے منع کیا کون اشخاص تھے؟ ہمیں معلوم ہے کہ مدینے میں اصحابِ رسولؐ دو دستوں میں تقسیم تھے یعنی مہاجرین اور انصار۔ مہاجرین زیادہ تر وہ قریشی تھے جو مکے سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ انصار، مدینہ کے مقامی لوگ تھے جنہوں نے آنحضرتؐ اور آپ کے مہاجر صحابہ کی معاونت کی اور اسی لیے انصار کہلائے۔

انساب کی اصطلاح میں اور تاریخ کی خاص اصطلاح میں انصار کو سبائی قحطانی اور مہاجرین کو قریش مضری کہا جاتا ہے لہٰذا جن لوگوں نے عبد اللہ بن عمرو بن عاص کو حدیث رسولؐ لکھنے سے منع کیا وہ قریش یعنی مہاجرین تھے۔ یہاں بحث کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے ہم عرب معاشرے کے گروہوں کو پہچاننے کی کوشش کریں۔

جن گروہوں نے عہد نبویؐ میں اسلام کے خلاف جنگیں لڑیں وہ دو بڑے دستوں یعنی یہود اور قریش پر مشتمل تھے۔
جو جنگیں آنحضرتؐ کے خلاف لڑی گئیں وہ زیادہ تر قریش کے ذریعے برپا ہوئیں۔

جنگِ بدر میں ایک ہزار قریش جنگجوؤں نے حصہ لیا۔ جنگِ احد میں بھی مکہ اور قریش کے تین ہزار افراد اور ان کے حلیف شریک ہوئے۔ جنگِ خندق کی قیادت بھی قریش کے جنگجو سرداروں کے ہاتھوں میں تھی۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے سالہا سال تک مکہ میں مسلمانوں پر بے انتہا مظالم توڑے تھے اور انہیں بیابانوں اور دوسرے ملک میں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی تھے جنہوں نے بارہا آنحضرتؐ کو قتل کرنے کے منصوبے تیار کیے تھے اور ان پر عملدرآمد کے مرحلے کے قریب تک آ گئے تھے انہوں نے ہی رسولِ اکرمؐ کے دندان مبارک شہید کیے اور آپ کی پیشانی مضروب کی تھی۔

انھوں نے آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا۔ اسی قبیلے کے لوگ مثلاً ابوجہل، ابولہب، ابوسفیان، حکم، عتبہ، شیبہ، عاص وغیرہ اسلام اور رسول اکرمؐ کے سخت ترین دشمن تھے۔ اسلام کی کامیابیوں کے بعد انہوں نے یا ان کے پسماندگان نے نفاق کا چوغہ پہن لیا۔

یہودی اگرچہ طاقتور، ضدی اور چالاک تھے لیکن انہوں نے رسول کرمؐ کی ثابت قدمی اور اسلام کی قوت کے مقابلے میں شکست کھائی اور فتح خیبر کے بعد وہ عرب کے سیاسی اور معاشرتی میدانِ عمل سے خارج ہو گئے۔

اب رہ گیا اسلام اور اس کے قریشی دشمن جن میں سے ایک گروہ یہ چاہتا تھا کہ اسلام اور اس کے پیغمبرؐ سے اپنی دشمنی فراموش کیے بغیر نفاق کے پردے میں چھپ کر اپنے آپ کو اسلام کی تیز بین نگاہوں سے محفوظ رکھے۔ وہ تمام آیات جو منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہیں اور ان کی جانب سے لاحق عظیم خطرے سے آگاہ کرتی ہیں، اسی گروہ اور منافقین مدینہ کے بارے میں ہیں البتہ قریشی منافقین زیادہ خطرناک تھے کیونکہ وہ زیادہ پوشیدہ تھے اور ان کی پہچان مقابلتاً مشکل تھی۔

حکم بن ابی العاص مکہ سے مدینہ آیا اور اسلام بھی لے آیا لیکن کبھی کبھی وہ آنحضرتؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور مذاق اڑانے کی خاطر آپ کی مخصوص رفتار کی نقل اتارتا۔ رسول اکرمؐ جب راستا چلتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا گویا بلندی سے نیچے آ رہے ہوں یا کیچڑ والی زمین میں سے گزر رہے ہوں۔ آپ اپنے پاؤں بڑی شدت سے زمین سے بلند کرتے تھے

اور کندھوں کو جھٹکا دیتے تھے۔ حکم بھی آپ کے پیچھے پیچھے اسی انداز میں چلتا تھا اور آپ کی نقل اتارتا تھا اور کبھی کبھی اپنی زبان بھی منہ سے باہر نکالتا تھا۔ جب کافی مدت تک اس نے بے حیائی سے اپنی روش جاری رکھی تو ایک دن آنحضرتؐ نے مڑ کر فرمایا:

"فَكَذٰلِكَ فَلْتَكُنْ"[1] یعنی "تو جس طرح ہے اسی طرح رہے"

حکم نے پھر کبھی بھی اس لعنت سے چھٹکارا نہیں پایا اور مرتے دم تک اس کی یہی مضحکہ خیز شکل باقی رہی۔ یہ شخص (حکم) چوتھے اموی خلیفہ مروان کا باپ تھا اور خود مروان اپنے بعد تمام اموی خلفاء (عبدالملک، ولید وغیرہ) کا جد تھا۔

ایک دن رسول اکرمؐ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے۔ حکم آیا اور دروازے کے سوراخ میں سے کمرے کے اندر جھانکنے لگا۔ امام علیؑ بھی اس وقت موجود تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "اے علیؑ! اسے اندر لے آؤ"

امام علیؑ تیزی سے باہر گئے اور حکم کو یوں کھینچ کر اندر لائے جیسے ایک بھیڑ کو لایا جاتا ہے اور آنحضرتؐ کے سامنے حاضر کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا: "یا اللہ! اپنی لعنت اس کے اور اس کی اولاد کے شاملِ حال فرما۔ بجز ان کے جو ان میں سے مومن ہیں اور وہ بہت کم ہیں"

قریش کے سرداروں میں سے ایک اور شخص ابوسفیان تھا۔ قریش پر حکومت کے زمانے میں وہ پوری قوت سے پیغمبر اکرمؐ سے نبرد آزما رہا اور ہر ذریعے سے اسلام کو نابود کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ فتح مکہ کے بعد اس نے بظاہر اسلام قبول کر لیا اور مدینہ چلا آیا۔ ایک دن جبکہ قریش کا یہ سابق شیخ اور رئیس گدھے پر سوار تھا، اس کا ایک بیٹا گدھے کے آگے اور دوسرا پیچھے چل رہا تھا۔ جب یہ لوگ رسولِ اکرمؐ کے سامنے سے گزرے تو آپ نے فرمایا: "بارِ الٰہا! اس سواری کے سوار، رہنما اور ہانکنے والے پر لعنت کر"[2]

---

[1] استیعاب جلد ۱ صفحہ ۳۵۹ مطبوعہ مصر۔ اُسد الغابہ جلد ۲ صفحہ ۳۴ مطبوعہ دارالشعب مصر میں "كُنْ كَذٰلِكَ" کے الفاظ ہیں۔ اِصابہ جلد ۱ صفحہ ۳۴۵ پہلا ایڈیشن ۱۳۲۸ھ

[2] نصر بن مزاحم: واقعہ صفین صفحہ ۲۱۹ مطبوعہ ایران۔

ہم جانتے ہیں کہ ابو سفیان کے جو دو بیٹے اس کے ہمراہ تھے ان میں سے ایک معاویہ تھا جو بعد میں شام کا اور پھر تمام مسلمانوں کا حاکم بنا اور دوسرا یزید تھا جو بعد میں شیخین کے زمانے میں فوج کا کمانڈر بنا اور جزیرۃ العرب کے شمالی علاقوں کی فتوحات میں حصے دار تھا۔ یہ دو نمونے تھے، اور نمونے بھی ہیں مثلاً معاویہ کے مشیر اور اسلامی مصر کے حاکم عمرو کا باپ عاص بھی ان میں سے ایک ہے۔ اس کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جو رسول اکرمؐ کی لعنت میں گرفتار ہوتے ہیں۔

رسول اکرمؐ کے ایسے بہت سے اقوال ہیں جو اُن قریشیوں کے دامن کو سخت داغدار کرتے ہیں جو آپ کے بعد حاکم بن گئے۔ کیا یہ صحیح سیاست نہ تھی کہ یہ لوگ حکومت حاصل کرنے کے بعد آپ کی احادیث کی نشر و اشاعت کی ممانعت کر دیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد زمام کار قریش کے ہاتھوں میں آگئی۔ معاویہ اور مروان بن حکم اور ان سے پہلے یا بعد کے افراد خلیفہ، حاکم اور مقتدر اشخاص بن گئے۔ سیدھی سی بات ہے کہ وہ ہر وسیلے سے اس قسم کے کلمات نقل کرنے کی ممانعت کرتے جو ان کی اور ان کے وابستگان کی شخصیت کو مجروح کرتے۔ اور بہانہ یہ کیا گیا کہ قرآن کے حدیث سے خلط ملط ہونے کی روک تھام ہونی چاہیے۔ ان کے حقیقی خیالات وہی تھے جو عبداللہ بن عمرو عاص نے نقل کیے ہیں یعنی "رسول اکرمؐ بشر ہیں اور غصے یا خوشی کی حالت میں باتیں کرتے ہیں۔"

جیسا کہ ہم نے مشاہدہ کیا دوسرے خلیفہ نے لوگوں کو حکم دیا کہ صرف عملی معاملات کے بارے میں حدیث نقل کریں گو یہ بھی بلا شبہ ابتدائی وقت میں تھا۔ بعد میں اتنی آزادی بھی لوگوں سے سلب کر لی گئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ فقط ایسی حدیثیں نقل کی جائیں جن کا تعلق نماز روزے اور حج وغیرہ سے ہو لیکن ایسی حدیثیں نقل نہ کی جائیں جن میں مثلاً کہا گیا ہو کہ: "میرے بعد علیؑ لوگوں کے ولی اور سرپرست ہیں یا سلمان فارسیؓ میرے اہلبیتؑ میں سے ہیں یا ابوذرؓ زہد میں عیسیٰؑ کے مانند ہیں یا ابوسفیان ملعون ہے یا حکم اور معاویہ وغیرہ یوں ہیں یا سیرت رسول خداؐ کی وہ روایات جن میں غزوۂ بدر میں دو خلفاء کی گفتگو نقل کی

گئی ہو[۱] یا جن میں ان کے غزوہ خیبر سے[۲] اور خلیفہ عثمان کے غزوہ احد سے[۳] فرار کا ذکر ہو۔ جلد ہی اس مختصر آزادی کی جگہ بھی مطلق ممانعت نے لے لی۔

یہاں ہم وہ داستان نقل کرتے ہیں جو کم و بیش سبھی نے سنی ہے تاکہ حدیث کی نشر و اشاعت کی ممانعت کی وجہ واضح طور پر سمجھ میں آسکے۔ رسولِ اکرمؐ بستر مرگ پر تھے۔ یہ وہ آخری لمحات تھے جن میں انسانوں کا آسمان سے رابطہ منقطع ہونیوالا تھا اور نزول وحی کا سلسلہ ختم ہونے کو تھا۔ چند صحابہ آنحضرتؐ کے بستر کے اردگرد جمع تھے۔ وہیں ایک پردے کے پیچھے ازواجِ رسولؐ اور یقیناً حضرت صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ بھی موجود تھیں۔ اس واقعہ کے ناقل خلیفہ عمر بن خطاب ہیں اور وہ اسے ابن عباس کے لیے نقل کرتے ہیں:

ہم رسول اکرمؐ کے پاس حاضر تھے۔ ہمارے اور عورتوں کے درمیان ایک پردہ لٹکا دیا گیا تھا۔ رسول اکرمؐ گفتگو کرنے لگے اور کہنے لگے: "ہمیں سات چھوٹی مشکوں سے نہلاؤ (اس زمانے میں بعض اقسام کے بخار کے لیے ٹھنڈے پانی سے استفادہ کیا جاتا تھا)۔ جب اس ہدایت پر عمل کر چکو تو ایک کاغذ اور دوات لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک دستاویز لکھ دوں جس کے ہوتے ہوئے تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔" (یہاں لَنْ تَضِلُّوْا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے معنی ہیں کہ "تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے" کیونکہ لَنْ کا لفظ ابدی نفی کے لیے استعمال ہوتا ہے)۔ رسولِ اکرمؐ کی عورتوں نے پیچھے سے کہا: "رسول اکرمؐ جو کچھ چاہتے ہیں لے آؤ۔" بس (عمر) نے کہا: "خاموش رہو۔ تم ان عورتوں کی مانند ہو جو یوسفؑ کے گرد جمع ہو گئی تھیں اور ان پر للچائی ہوئی نگاہ رکھتی تھیں۔ اگر رسولِ اکرمؐ بیمار

---

[۱] دیکھیے واقدی، کتاب المغازی جلد ۱ صفحہ ۴۸ تحقیق ڈاکٹر مارسڈن جونز اور مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۱۹ اور ۲۵۸۔

[۲] دیکھیے مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۳۷-۳۸ اور مجمع الزوائد ہیثمی جلد ۹ صفحہ ۱۲۴ اور کنز العمال مطبوعہ دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد دکن سال ۱۳۱۲ ھ ق (جلد ۵ صفحہ ۲۷۴-۲۸۳ اور ۲۸۴ اور جلد ۶ صفحہ ۳۹۴)۔

[۳] دیکھیے تفسیر فخر رازی (آیت: اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْکُمْ الخ کی تفسیر) اور کتاب الاصابہ (ترجمہ رافع بن المعلی الانصاری اور سعید بن عثمان الانصاری)۔

ہو جائیں تو تم آنکھیں بھینچتی ہو اور آنسو بہاتی ہو اور اگر تندرست ہوں تو ان کا دامن پکڑتی ہو اور خرچ مانگتی ہو۔" رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "وہ تم سے بہتر ہیں۔"[۱]

جابر روایت کرتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے موت کے وقت اپنی عمر کے آخری لمحات میں کاغذ مانگا تاکہ وہ اپنی امت کے لیے ایک دستاویز لکھ دیں جس کی رو سے نہ وہ خود گمراہ ہوں اور نہ دوسروں کو گمراہ کریں۔ جو لوگ آپ کے بستر کے ارد گرد موجود تھے انہوں نے اتنا ہنگامہ برپا کیا اور اتنی بیکار باتیں کہیں کہ آنحضرتؐ نے اس کا ارادہ ترک کر دیا۔"[۲]

ابن عباس کہتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے مرض الموت میں فرمایا: "کاغذ اور دوات لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک ایسی دستاویز لکھ دوں کہ اس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔" عمر بن خطاب نے شور و غوغا بلند کیا اور کہنے لگے: "نہیں! یہ تمام شہر ابھی باقی ہیں اور فتح نہیں ہوئے۔ انہیں فتح کرنا چاہیے۔ پھر انہیں کون فتح کرے گا؟" رسولِ اکرمؐ کی زوجہ زینب بنت جحش نے کہا: "رسولؐ کے حکم کی تعمیل کرو۔ کیا تم سن نہیں رہے کہ وہ وصیت کرنا چاہتے ہیں؟" ایک دفعہ پھر شور بلند ہوا۔ اس موقع پر آنحضرتؐ نے فرمایا: "یہاں سے اٹھو اور باہر چلے جاؤ۔" جونہی لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکلے رسول اکرمؐ دنیا سے رحلت فرما گئے۔[۳]

جو اختلاف ان احادیث اور ان احادیث میں موجود ہے جو بعد میں نقل کی جائیں گی، میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ رسول اکرمؐ نے اپنا ارشاد کئی دفعہ دہرایا ہے اور مخالف گروہ نے بھی مزاحمت کی خاطر ہر بار کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ آنحضرتؐ کو ان لوگوں کی ہدایت سے جو شدید لگاؤ تھا اس کی بنا پر آپ (دوات اور کاغذ کے لیے) اصرار کر رہے تھے اور وہ بھی شور و غل مچا کر آپ کے ارشاد کی تعمیل کی راہ روک رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ جب آنحضرتؐ نے وصیت لکھنے کی خاطر پہلی بار کاغذ اور دوات لانے کو کہا تو وہاں موجود لوگوں نے جو جانتے تھے کہ آپ کیا لکھوائیں گے کہا: "نہیں۔ اس کی ضرورت

---

[۱]، [۲] و [۳] طبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۲۴۳ - ۲۴۴ - ۲۴۳ مطبوعہ بیروت

نہیں۔ ہمارے درمیان قرآن موجود ہے اور وہ ہمارے لیے کافی ہے۔" جب آنحضرت ص نے مکرّر ارشاد فرمایا تو کہا گیا کہ "رسولِ اکرم ص پر بیماری کا غلبہ ہے۔ قرآن ہمارے لیے کافی ہے اور ہم کسی اور چیز کے محتاج نہیں۔" جب حضور ص نے اپنی فرمائش تیسری مرتبہ دہرائی تو کہا گیا کہ "یہ ہذیان بول رہے ہیں۔ ہمارے لیے قرآن کافی ہے۔"

صحیح بخاری میں اس واقعہ کے متعلق سعید بن جبیر کی روایت کردہ ایک حدیث موجود ہے۔ وہ ابن عباس رض سے نقل کرتے ہیں جو خود اس واقعے کے عینی شاہد تھے۔ ابن عباس رض نے کہا: "جمعرات کا دن! آہ وہ جمعرات کا دن کیسا تھا۔" پھر ان پر رقت طاری ہوگئی اور وہ اس قدر روئے کہ سنگریزے تر ہو گئے۔ پھر انھوں نے کہا: "اس دن رسولِ اکرم ص کی علالت شدت اختیار کر گئی۔ آپ نے فرمایا: میرے لیے ایک کاغذ لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک دستاویز لکھ دوں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ جو لوگ موجود تھے انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ ایک گروہ کہہ رہا تھا کہ رسولِ اکرم ص کے حکم کی تعمیل کرو اور دوسرا گروہ کہہ رہا تھا کہ نہیں! کاغذ مت لاؤ۔ اگر ایسے حالات میں کوئی شخص چاہے کہ ایک کام انجام نہ پائے تو ممکن ہے کہ وہ اس قدر شور و غل مچائے اور افراتفری پیدا کرے کہ اصلی مطلب فوت ہو جائے اور اس پر عملدرآمد کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ اس معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ طرفین جھگڑا کرتے لگے حالانکہ اس قسم کا جھگڑا، شور و غل اور اختلاف رسولِ اکرم ص کی موجودگی میں قطعاً نامناسب تھا۔ قرآن کریم نے فرمایا ہے: اپنی آواز پیغمبر ص کی آواز سے زیادہ بلند نہ کرو۔" (سورۂ حجرات۔ آیت ۲)۔

پھر ابن عباس رض کہتے ہیں کہ مخالفین نے کہا کہ "آنحضرت ص ہذیان بول رہے ہیں۔" (اَلعِیَاذُ بِاللہ)۔

آنحضرت ص نے بھی ایک ایسے مہربان اور ہمدرد باپ کی طرح جسے اپنے فرزند کی شدید نافرمانبرداری، برائی اور بے ادبی سے دوچار ہونا پڑے دل شکستہ ہو کر فرمایا: "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میرے لیے یہ درد اور تکلیف تمہاری (توہین آمیز) باتوں سے زیادہ گوارا ہے۔"[1]

---

[1] صحیح بخاری، باب مرض النبی ص و وفاتہ کتاب المغازی جلد ۴ صفحہ ۱۱ مطبوعہ بولاق مصر۔

صحیح مسلم میں اسی راوی کی روایت یوں نقل کی گئی ہے: "جمعرات کا دن! وہ جمعرات کا دن کتنا منحوس تھا!" پھر ابن عباسؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں انکے رخساروں پر آنسوؤں کو موتیوں کی مانند دیکھ رہا تھا۔ پھر آپ نے فرمایا: "بھیڑ کے شانے کی ہڈی اور دوات (یا مٹی کی تختی اور دوات) لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک ایسی تحریر لکھ دوں کہ تم ہرگز گمراہ نہ ہو۔" لوگوں نے کہا: "رسول خداؐ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں"[1]۔

ایک اور روایت صحیح بخاری میں نقل ہوئی ہے جس کے مطابق ابن عباسؓ کہتے ہیں: "جب رسولِ خداؐ کی وفات کا وقت قریب آ رہا تھا، آپ کے حجرے میں کچھ آدمی موجود تھے جن میں عمر بن خطاب بھی تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "کوئی چیز لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک دستاویز لکھ دوں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔" عمر نے کہا "پیغمبرؐ پر مرض نے غلبہ کر لیا ہے اور ان کی باتیں صحت اور کافی ادراک پر مبنی نہیں (اَلْعِیَاذُ بِاللّٰہ) اور تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہے اور اللہ کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے۔" جو لوگ کمرے میں موجود تھے ان میں اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک عمر کے ساتھ تھا اور دوسرا اس کا مخالف تھا۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا: میرے پاس سے اٹھ جاؤ۔ میرے سامنے شور و غل، اختلاف اور جھگڑا جائز نہیں"[2]۔

آپ نے دیکھا کہ جب رسولِ اکرمؐ اپنا آخری پیغام لکھوانا چاہتے تھے اور اپنا آخری اور اہم ترین ہدایت نامہ لوگوں کے لیے بطور میراث چھوڑنا چاہتے تھے تو ان کے سامنے اور ان کے منہ پر کیا کہا گیا اور کیا کیا گیا۔ اس وقت رسولِ مقبولؐ کی کیا حالت ہو گی اور ان کے اور اسلام کے عزیزوں یعنی امام علیؑ، بی بی فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو کتنی تکلیف

---

[1] صحیح مسلم باب ترک الوصیۃ جلد ۳ صفحہ ۱۲۵۹ تحقیق محمد فواد عبدالباقی حدیث ۲۱ هجرُ المریضِ فی کلامہ هجرًا: خَلَطَ وَهَذیٰ المصباح المنیر، مادۃ ہجر جلد ۲ صفحہ ۳۴۷۔ تَغَیَّرَ کَلَامُہُ وَاخْتَلَطَ لِاَجَلِ مَا بِہٖ مِنَ الْمَرَضِ النہایہ، مادۃ ہجر جلد ۵ صفحہ ۲۴۶۔ الھجر: الھذیانُ الصحاح مادہ ہجر جلد ۲ صفحہ ۸۲۵۔

[2] صحیح بخاری باب قولُ المریضِ "قُوْمُوْا عَنِّیْ" کتاب الطب جلد ۷ صفحہ ۱۵۶ اور باب کراھیۃ الخِلاف جلد ۹ صفحہ ۱۳۷ مطبوعہ بولاق مصر۔

پہنچی ہوگی۔ اگر زندگی کے حساس ترین لمحات میں یعنی موت کے وقت ایک انسان، ایک عالم اور ایک بزرگ کو اس کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ اپنی بات کہہ سکے یا وصیت کر سکے تو یہ بڑے دکھ کی بات ہے۔ اب اندازہ لگائیے کہ اگر یہی صورت اس وقت پیدا ہو جائے جب ایک امت کی ہدایت، لاکھوں کروڑوں انسانوں کی ہدایت بلکہ روزِ ابد تک تمام عالمِ انسانیت کی ہدایت کا سوال ہو تو یہ کتنے دکھ کی بات ہوگی۔

ایک اور مقام پر کہا گیا کہ جب شور و غل اور اختلاف بڑھ گیا اور رسول اکرمؐ کو اس صورتِ حال سے تکلیف پہنچی تو آپ نے فرمایا: "اٹھ کھڑے ہو۔" بعض روایات میں ابن عباسؓ اس جملے کا اضافہ کرتے ہیں: "مصیبت بالائے مصیبت یہ تھی کہ وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وصیت نامہ لکھنے میں مانع ہوئے۔"[1]

یہ بات مکمل طور پر واضح ہے کہ انبیاءؑ اور اوصیاءؑ کے لیے قتل ہو جانا مصیبت اور رنجیدہ نہیں ہوتا کیونکہ خدا کی راہ میں شہادت ان کے لیے موجبِ فخر ہے بلکہ مصیبت اور رنج کا مقام وہ ہے جب ایک پیغمبرؐ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنی امت کے لیے اپنا آخری پیغام لکھنا چاہے ـــ وہ پیغام جس میں ان کی قطعی نجات مضمر ہو، وہ پیغام جو ان کے ممکنہ تباہ کن اختلافات کی روک تھام کرے ـــ اور اس کے ساتھی اسے ایسا نہ کرنے دیں، یعنی ہدایت میں مانع ہوں اور نجات کی راہ میں روڑے اٹکائیں۔ ہم رسول اکرمؐ کے عظیم روحانی کرب کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: کسی پیغمبر کو اتنا دکھ نہیں دیا گیا جتنا مجھے دیا گیا۔ کیا کسی پیغمبر کے ساتھیوں نے اپنے پیغمبر کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے؟ آیئے غور سے دیکھیں کہ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کرنے دیا؟

ایک روایت میں آیا ہے کہ خلیفہ عمر کے ان آخری الفاظ کے بعد کہ "یہ شخص ہذیان بول رہا ہے" آنحضرتؐ سے پوچھا گیا کہ کیا قرطاس و قلم لایا جائے؟

---

[1] صحیح بخاری باب مرض النبیؐ۔ کتاب المغازی جلد ۶ صفحہ ۱۱-۱۲ اور باب کتابۃ العلم کتاب العلم جلد ۱ صفحہ ۳۹ اور باب قول المریض قوموا عنی۔ کتاب الطب جلد ۷ صفحہ ۱۵۶ اور باب کراھیۃ الخلاف کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ جلد ۹ صفحہ ۱۳۷ مطبوعہ بولاق مصر۔ صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۱۲۵۹ حدیث ۱۶۳۹ تحقیق عبد الباقی۔

آپ نے فرمایا: "ان الفاظ کے بعد اب کیا لاؤ گے؟" آنحضرتؐ نے جو کچھ فرمایا اس کے کیا معنی ہیں؟ ایک شخص ایک طویل مدت تک رسولِ اکرمؐ کی پیروی کا مدعی رہنے کے باوجود آپ کے روبرو اور آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے کہ یہ شخص ہذیان بول رہا ہے تو ہوسکتا ہے کہ یہی شخص ــــ بالخصوص اگر وہ اپنے حامیوں کا ایک حلقہ پیدا کرلے جو وہ کرلے گا، تو دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے یہ وصیت نامہ اس وقت لکھوایا تھا جب ان کی ذہنی کیفیت درست نہیں تھی اور جو کچھ انہوں نے لکھوایا ہے وہ سب کا سب ہذیان گوئی پر مبنی ہے اور بس ــــ کسی اور چیز کا اضافہ بھی کرے کہ العیاذ باللہ۔ ان حالات میں آنحضرتؐ وصیّت نہیں لکھوا سکتے تھے کیونکہ اگر آپ ایسا کرتے تو کہا جاتا کہ ہم نے تو اسی وقت کہہ دیا تھا کہ آپ پر ہذیان کا غلبہ ہے اور یہ وصیت بھی ہذیان پر مبنی ہے۔ اس وقت ابو عبیدہ بن جراح، مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن عاص جیسے اس کے پرانے دوست بھی شہادت دیتے کہ ہاں ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ رسولِ اکرمؐ کی حالت اس وقت ٹھیک نہیں تھی اور آپ کا ذہن ٹھیک کام نہیں کر رہا تھا اور یہ وصیت نامہ ایسے حالات میں ہی لکھا گیا ہے۔ اگر آنحضرتؐ کے لیے ہذیان گوئی ثابت ہوجاتی تو پھر آپ کی کسی بات کا اعتبار نہ رہتا اور آپ کی نبوت پر بھی زد پڑتی اور کچھ لوگوں کے دلوں میں شک پیدا ہوجاتا۔ بعد میں یہ چیز اسلام کے پاک دامن پر ایک مستقل بدنما دھبہ بن کر رہ جاتی کیونکہ یہ لوگ ضرور اپنے قول پر اصرار کرتے اور اپنی بات سچی ثابت کرنے کے لیے کسی کوشش سے دریغ نہ کرتے۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ کیا خلیفہ عمر اور ان کے دوستوں کا وصیت نامہ لکھنے میں مانع ہونا اس وجہ سے تھا کہ انہیں یہ ڈر تھا کہ آنحضرتؐ کا وصیت نامہ قرآن مجید سے خلط ملط نہ ہوجائے یا اس کی وجہ وہ تھی جس کی بنا پر عبداللہ بن عمرو عاص کو احادیث لکھنے سے منع کیا گیا یا کوئی اور بات تھی؟ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں یہ بات واضح طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ یہ لوگ ڈرتے تھے کہ آنحضرتؐ کوئی ایسی چیز نہ چھوڑ جائیں جو اُن کے مفادات اور خواہشات کے لیے سدِّ راہ ثابت ہو اور ان کی سالہا سال کی امیدوں پر پانی پھیر دے۔

یہ طاقتور گروہ رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں آپ کی وصیت لکھے جانے کی راہ میں حائل

ہوا اور آپ کے بعد بھی انھوں نے کوشش کی کہ آپ کی جو باتیں دلوں میں رہ گئی ہیں وہ مستقل صورت اختیار نہ کریں اور ان کی نشر و اشاعت نہ ہو۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جو لوگ رسول اکرمؐ کے بعد حاکم بنے وہ قریش میں سے تھے اور ان سب کا شمار مہاجرین میں ہوتا تھا اور آنحضرتؐ کے ان کے اور ان کے وابستگان کے بارے میں کہے ہوئے نفرت اور لعنت کے الفاظ موجود تھے۔

اب تک گفتگو تحریف کے پہلے وسیلے کے بارے میں تھی جو اس چیز سے عبارت ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی حدیث کی نشر و اشاعت کی ممانعت کی جائے اور آپ کے ارشادات مدینے سے باہر رہنے والے لوگوں اور ان نومسلموں تک نہ پہنچنے پائیں جنہوں نے آنحضرتؐ کو قریب سے نہیں دیکھا تاکہ اربابِ خلافت ان کی ذہنی پرورش اپنی مرضی کے مطابق کر سکیں اور انہیں جس طرح چاہیں پروان چڑھا سکیں۔

تاریخ ہماری تائید کرتی ہے

جو واقعات ہم نے نقل کیے ہیں ان کی مزید وضاحت کے لیے ہم ایک دفعہ پھر تاریخ کی جانب رجوع کرتے ہیں۔

جس وقت آنحضرتؐ کی رحلت کا وقت آیا تو خلیفہ ابوبکر اپنے گھر پر تھے جو مدینہ سے باہر "سنح"[1] کے مقام پر واقع تھا۔ مورخین، محدثین اور جغرافیہ نویس اس بات پر

---

[1] وَهِيَ إِحْدَى مَحَالِّ مَدِينَةَ كَانَ بِهَا مَنْزِلُ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ حِينَ تَزَوَّجَ مُلَيْكَةَ .... وَهِيَ فِي طَرَفٍ مِّنْ أَطْرَافِ الْمَدِينَةِ وَهِيَ مَنَازِلُ بَنِي الْحَارِثِ بْنِ الْخَزْرَجِ بِعَوَالِي الْمَدِينَةِ، وَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ مَنْزِلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِيلٌ ۔ معجم البلدان۔ مادہ سخ جلد ۳ صفحہ ۲۶۵ مطبوعہ بیروت۔

اَلسُّنْحُ مَنَازِلُ بَنِي الْحَارِثِ بْنِ الْخَزْرَجِ بِالْمَدِينَةِ النَّبَوِيَّةِ وَهُوَ أُطُمٌ مِّنْ آطَامِ الْمَدِينَةِ وَ بِهِ سُمِّيَتْ تِلْكَ النَّاحِيَةُ. وَفِي الْخَبَرِ: أَنَّ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ كَانَ سَاعَةَ مَوْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَهْلِهِ بِالسُّنْحِ. الروض المعطار فی خبر الاقطار مطبوعہ مصر دوسرا ایڈیشن ۱۳۷۵ھ۔

فَمَا بَرِحْنَا حَتَّى طَلَعَ ابْنُ أَبِي قُحَافَةَ وَكَانَ بِالسُّنْحِ فَصَلَّى بِالنَّاسِ ۔ انساب الاشراف جلد ۱ صفحہ

متفق ہیں کہ خلیفہ ابوبکر کی رہائش شہر مدینہ سے باہر واقع نواحی آبادی سنخ میں تھی حتیٰ کہ حکومت حاصل ہونے کے بعد کافی مدت تک وہیں مقیم رہے اور نماز جماعت کی امامت کے لیے سوار ہو کر آیا کرتے تھے اور کبھی نہیں بھی آتے تھے اور ان کے بجائے خلیفہ عمر نماز پڑھایا کرتے تھے۔[1]

اس بنا پر رسولِ اکرمؐ کی وفات کے دن خلیفہ ابوبکر مدینہ میں موجود نہیں تھے۔ ان کے گھر چلے جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ انھوں نے آنحضرتؐ کی اجازت کے بغیر صبح کی نماز کی امامت کرائی لیکن جونہی آنحضرتؐ نے ان کی آواز سنی آپ نے آنکھ کھولی اور امام علیؑ کی گود سے سر اٹھایا اور فرمایا "مجھے اٹھاؤ"۔ آپ کی ایک بغل کو امام علیؑ نے اور دوسری بغل کو فضل بن عباسؓ نے سہارا دیا اور آپ کو اٹھایا اور مسجد میں لے گئے۔ آنحضرتؐ کو اتنی شدید تکلیف تھی کہ آپ زمین پر پاؤں نہیں رکھ سکتے تھے۔ صحیح بخاری کے مطابق آپ کے پاؤں دو لکڑیوں کی مانند زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے اور ان سے ایک لکیر پڑتی جا رہی تھی۔[2] آپ اس حالت میں محراب کی جانب گئے اور ابوبکر کو ایک طرف ہٹایا اور نماز جماعت کو توڑ دیا اور پھر خود نماز کا آغاز کیا۔[3]

اس موقع پر خلیفہ ابوبکر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس لیے کہ بالکل بے حیثیت ہو کر میدان سے خارج ہی نہ ہو جائیں انہوں نے نماز کے بعد آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: "مجھے گھر جانے کی اجازت دیجیے۔" رسول اکرمؐ چونکہ کمال شرم و حیا

---

۵۵۴ نسخہ محمد حمید اللہ۔

وَكَانَ مَنْزِلُهُ بِالسَّنَحِ خَارِجَ الْمَدِيْنَةِ وَكَانَتِ امْرَأَتُهُ حَبِيْبَةُ بِنْتُ خَارِجَةَ فِيْهِ. تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ نجف۔

تفصیلات کے لیے محولہ بالا سے رجوع کیجیے۔

[1] ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۱ مطبوعہ دار الکتاب العربی۔

[2] صحیح بخاری۔ کتاب الطب باب ۲۲ جلد ۷ صفحہ ۱۲۷، کتاب المغازی باب ۸۳ جلد ۶ صفحہ ۱۱ مطبوعہ بولاق مصر۔

[3] سید مرتضیٰ عسکری کے تحقیقی رسالے "صلاۃ ابوبکر" سے رجوع کیجیے۔

کے مالک تھے اس لیے آپ نے ان کے منہ پر کچھ کہے بغیر اجازت دیدی اور خلیفہ ابو بکر گھر چلے گئے۔ اس بنا پر آنحضرتؐ کی وفات اور اس سے پہلے کے واقعات رونما ہونے کے وقت تک خلیفہ ابو بکر مدینہ میں موجود نہ تھے۔

سیاست کے کارپردازوں نے جو اس موقع پر موجود تھے خطرہ محسوس کیا اور پریشان ہو گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیعت انجام پذیر ہو جائے اور خلیفہ ابو بکر موجود نہ ہوں مجبوراً حکومت اور امت کی پیشوائی کا موقع ہاتھ سے نکل جائے لہٰذا ایک نئے منصوبے پر عمل کیا گیا۔ خلیفہ عمر نے چلا کر کہا کہ نبی اکرمؐ فوت نہیں ہوئے بلکہ حضرت موسیٰؑ کی طرح اپنے پروردگار کے پاس گئے ہیں ـــــ حضرت موسیٰؑ چالیس دن تک اپنی قوم کے درمیان سے غائب رہے تھے اور چالیس دن کے بعد واپس آ گئے تھے لیکن لوگوں نے کہا تھا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں"ـــــ انہوں نے کہا: "خدا کی قسم! رسول اکرمؐ اسی طرح واپس آجائیں گے جس طرح حضرت موسیٰؑ واپس آ گئے تھے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ فوت ہو گئے ہیں میں ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گا۔[1]" ایک اور روایت کے مطابق خلیفہ عمر نے کہا: "جو شخص کہے گا کہ آنحضرتؐ فوت ہو گئے ہیں میں تلوار سے اس کا سر اڑا دوں گا۔[2]"

یہ کام بڑی شد و مد سے انجام دیا جا رہا تھا اور انھوں نے لوگوں کو مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ کچھ لوگ خلیفہ عمر سے پوچھتے تھے کہ "کیا رسول اللہؐ نے تم سے کوئی خاص بات کہی ہے یا اپنی وفات کے بارے میں تم سے کوئی خاص وصیت کی ہے؟" اس کا جواب وہ نفی میں دیتے تھے۔[3]

---

[1] ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۶۵۵۔ تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۰۰ مطبوعہ دار المعارف ۱۹۶۹ء۔ انساب الاشراف جلد ۱ صفحہ ۵۶۳۔ طبقات الکبریٰ جلد ۳ صفحہ ۲۶۶-۲۶۷۔ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۹۵۔ ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۱۹۔ دار الکتاب العربی۔

[2] تاریخ ابو الفداء جلد ۱ صفحہ ۱۶۴۔ سیرت زینی دحلان جلد ۳ صفحہ ۳۸۷-۳۸۸-۳۹۰ برحاشیہ الحلبیہ۔

[3] طبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۲۷۱-۲۷۲۔ ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۲۴۳۔ حلبی جلد ۳ صفحہ ۳۹۰-۳۹۱۔ نسائی کتاب الامامہ باب ۲۴ جلد ۲ صفحہ ۱۰۰ مطبوعہ بیروت۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۵۷۱، حدیث ۱۶۱۸۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۳۵۶-۳۵۷۔

خلیفہ عمر نے اس قدر شور مچایا اور دھمکیاں دیں کہ ان کے منہ سے جھاگ بہنے لگا۔[1]
لیکن اس دوران میں ابو حذیفہ کا آزاد کردہ غلام سالم جو اس گروہ کا ایک وفادار فرد تھا خلیفہ ابوبکر کو لانے کے لیے سنح روانہ ہو گیا۔[2] یہ چیخ پکار اور دھمکیاں اسی طرح جاری رہیں حتیٰ کہ ابوبکر آپہنچے۔ محض ابوبکر کو دیکھتے ہی عمر کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ زمین پر بیٹھ گئے۔[3]
اس دوران میں ایک صحابی نے انکے لیے وہ آیات پڑھیں جو پیغمبرؐ کی موت پر دلالت کرتی ہیں لیکن عمر نے کان نہ دھرا اور کوئی توجہ نہ دی۔ عمرو بن قیس بن زائدہ نے اس آیت کی تلاوت کی: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ[4] نیز دوسرے لوگوں نے اور استدلالات کیے لیکن ان کا کوئی اثر نہ ہوا تاہم وہاں ابوبکر کو دیکھ کر اور ان کی تقریر سن کر عمر کو سکون ہو گیا حالانکہ انہوں نے بھی انہی آیات کی تلاوت کی۔

یہاں مؤرخین نے مختلف توجیحات پیش کی ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ خلیفہ عمر کو آنحضرتؐ سے اتنی شدید محبت تھی کہ وہ ان کی موت کا یقین نہیں کر پائے۔ کئی دوسرے کہتے ہیں کہ وہ مصیبت کی شدت کی بنا پر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے لہٰذا اس دن انہوں نے جو کچھ کیا وہ کامل شعور کی بنا پر نہیں کیا تھا۔[5] تاہم ہمارا خیال ہے کہ اس بارے میں علامہ ابن ابی الحدید معتزلی کا نظریہ درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "جب عمر کو رسول اکرمؐ کی وفات کی اطلاع ملی تو وہ امامت کے مسئلے پر لوگوں کی شورش اور ہلچل سے پریشان ہو گئے۔ انہیں ڈر تھا کہ

---

[1] انساب الاشراف جلد ۱ صفحہ ۵۶۷۔ طبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۲۶۷۔ تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۱۸۵۔ سیرت حلبی جلد ۳ صفحہ ۳۹۲۔

[2] ابن کثیر جلد ۵ صفحہ ۲۴۴۔ سیرت زینی دحلان جلد ۳ صفحہ ۳۹۰-۳۹۱۔

[3] کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۵۳ حدیث ۱۰۹۲ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۱۳ھ جَلَسَ عُمَرُ حِيْنَ رَاٰى اَبَا بَكْرٍ مُقْبِلًا۔

[4] سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۴۴، بحوالہ طبقات ابن سعد جلد ۲ طبقہ ۲ صفحہ ۵۷، مطبوعہ لیڈن (Leiden)

[5] سیرت حلبی جلد ۳ صفحہ ۳۹۲ مطبوعہ مصر ۱۳۸۲ھ ق۔ سیرت زینی دحلان جلد ۳ صفحہ ۳۹۱ بر حاشیہ حلبی

انصار یا دوسرے لوگ زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں۔ لازمی طور پر انھوں نے مصلحت اس میں دیکھی کہ جس طرح بھی بن پڑے لوگوں کو پرسکون رکھیں اور جو کچھ بھی انہوں نے کہا اس کی یہی وجہ تھی چنانچہ انہوں نے لوگوں کو تردد میں مبتلا رکھا تاکہ دین اور حکومت محفوظ رہیں۔ یہ سب کچھ اس وقت تک تھا جب تک ابوبکر نہیں آ گئے۔"

پس ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ گروہ بڑی سنجیدگی سے مصروفِ کار تھا اور اس کوشش میں تھا کہ حالات کو اپنے کنٹرول میں لے لے۔ ان لوگوں نے رسول اکرمؐ کی زندگی کے آخری لمحوں میں آپ کے ارشادات تحریر کیے جانے میں جو رکاوٹ ڈالی اس کی واحد وجہ یہ خوف تھا کہ کہیں آئندہ حاکم کا قطعی اور تحریری طور پر تعین نہ ہو جائے اور آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بھی انھوں نے کمال ہوشیاری سے حالات کو اپنے قابو میں کر لیا تاکہ یہ کام بیعت کے طریقے سے انجام نہ پائے۔

بحث کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے یہاں ایک تاریخی نکتے کا تذکرہ کرنا بہت ضروری ہے اگرچہ وہ ہمارے موضوعِ سخن سے خارج ہے۔ تاریخ طبری اور دوسرے معتبر مدارک میں لکھا ہے[1] کہ جب اپنی زندگی کے آخری لمحات میں خلیفہ ابوبکر نے خلیفہ عثمان کو طلب کیا تو اس وقت کوئی دوسرا وہاں موجود نہیں تھا۔ خلیفہ ابوبکر نے کہا لکھو: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ ہے جس کی خلیفہ ابوبکر مسلمانوں کو وصیت کرتے ہیں ..." یہ کہہ کر وہ بیہوش ہو گئے۔ تاہم خلیفہ عثمان نے لکھنا جاری رکھا۔ "امابعد میں اپنے بعد عمر بن الخطاب کو اپنا جانشین قرار دیتا ہوں اور اس معاملے میں میں نے تمہاری بہتری مدنظر رکھی ہے۔" اس موقع پر ابوبکر ہوش میں آ گئے اور عثمان سے کہا: "جو کچھ لکھا ہے مجھے پڑھ کر سناؤ۔" خلیفہ عثمان نے وصیت نامہ پڑھا۔ ابوبکر نے تکبیر کہی اور ان الفاظ کا اضافہ کیا: "میرا خیال ہے کہ تمہیں خوف تھا کہ اگر میں اسی بیہوشی کے عالم میں مر گیا تو لوگ اختلاف میں پڑ جائیں گے۔" خلیفہ عثمان نے جواب دیا: "ہاں" اس پر

---

[1] طبری جلد ۱ صفحہ ۲۱۳۸ مطبوعہ لیڈن اور جلد ۳ صفحہ ۴۲۹ - ۴۳۱ مطبوعہ دار المعارف۔ ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۲، دار الکتاب عربی۔ تاریخ الخمیس جلد ۲ صفحہ ۲۴۰ - ۲۴۱۔ قلقشندی: مآثر الانافۃ فی معالم الخلافۃ جلد ۱ صفحہ ۴۸ - ۴۹ مطبوعہ کویت۔

خلیفہ ابوبکر نے کہا: "جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا عَنِ الْإِسْلَامِ وَأَهْلِهِ" پھر خلیفہ عثمان نے جو کچھ لکھا تھا خلیفہ ابوبکر نے اس پر دستخط کردیے۔

اس کے بعد وصیت نامہ مسجد میں لایا گیا۔ خلیفہ عمر لوگوں کے درمیان بیٹھے تھے اور ایک لاٹھی ہاتھ میں پکڑے ہوئے کہہ رہے تھے: "اے لوگو! کان دھرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ کے فرمودات کی فرمانبرداری کرو۔ میں نے تمہاری خیر خواہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔" غور فرمائیے یہاں عمر، ابوبکر کو ہذیان گو نہیں کہتے اور یہ خیال نہیں کرتے کہ بیماری نے ان پر غلبہ پالیا ہے اور کسی طور بھی حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ کا سہارا نہیں لیتے۔ یہ ساری کی ساری باتیں رسولِ اکرمؐ کے وصیت کرنے سے مخصوص ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا یہ مسئلہ اتنا ہی سیدھا سادہ ہے جتنا نظر آتا ہے یا وہ چاہتے تھے کہ جس طرح بھی ممکن ہوسکے رسول اکرمؐ کو وصیت لکھوانے سے باز رکھا جائے۔ کیا واقعی حدیث کی نشر و اشاعت پر پابندی کی وجہ یہی تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ حدیث، قرآن مجید سے خلط ملط نہ ہو جائے یا وہ ڈرتے کہ پاکباز صحابہ (جو بلاشبہ ان کی فہرست اور گروہ میں شامل نہیں تھے) میں سے کوئی متعارف نہ ہو جائے یا شر پسند اور منافق لوگ پہچان نہ لیے جائیں۔ کیا ہم قرآن مجید میں نہیں پڑھتے تھے کہ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ (سورہ توبہ۔ آیت ۱۰۱) یعنی مدینہ کے کچھ لوگ ہیں جو نفاق میں اتنے مشاق ہیں کہ آپ انہیں پہچانتے نہیں لیکن ہم انہیں جانتے ہیں۔ آپ اپنے انسانی پہلو کی بنا پر اپنی تمام غیر معمولی صلاحیتوں اور فہم و فراست کے باوجود انہیں ان اشخاص سے ممیز نہیں کرسکتے جو مومن ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہم آپ کو وحی کے ذریعے ان کے وجود سے آگاہ کریں۔

قرآن کریم کے صریح ارشاد کے مطابق اس قسم کے لوگ مدینہ میں مسلمانوں کے درمیان موجود ہیں اور اتنے پر اسرار اور ہوشیار ہیں کہ انہیں پہچاننے کا واحد ذریعہ آسمانی وحی اور ارشاداتِ رسولؐ ہیں لہٰذا آنحضرتؐ کے اقوال نقل نہیں ہونے چاہئیں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جن پردوں نے انہیں ڈھانپ رکھا ہے وہ اٹھ جائیں اور ایک گروہ رسوا ہو جائے۔ یوں ہم نے عبداللہ بن عمرو عاص کی حدیث سے اور آنحضرتؐ کی وفات سے مربوط واقعات سے حدیث نبویؐ کی کتابت و اشاعت پر پابندی کے محرکات کو سمجھا ہے اور اس اہم واقعہ کے

اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کی ہے۔

اب تک ہم نے حقائق اسلام کی تحریف، تبدیلی اور اخفا کے پہلے ذریعے یعنی رسولِ اکرمؐ کی حدیث کے بیان اور تحریر کی ممانعت کا مطالعہ کیا ہے اور اس پر ان مختصر بحثوں کے دائرے میں رائے زنی کی ہے۔ حدیث سو سال تک نہیں لکھی گئی اور حکومتِ وقت نے مسلمانوں کی جس طرح چاہا پرورش کی اور جہاں جی چاہا انہیں لے گئے یعنی اربابِ اقتدار نے لوگوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ان تمام میدانوں میں جو خیالات ان کے اپنے تھے وہی لوگوں کو ذہن نشین کرائے اور انہیں اسی ڈھب پر چلایا۔ یہ قوت انہیں اس وجہ سے ہاتھ آئی کہ اسلام کا دوسرا رکن یعنی حدیثِ رسولؐ مسلم معاشرہ سے حذف ہو گیا اور بجز ان احادیث کے جن سے حکومتِ وقت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا اور انکی سیاست پر کوئی زد نہیں پڑتی تھی فرموداتِ رسولؐ کا کوئی حصہ نشر نہ ہو سکا۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ

●●●●●

ساتواں درس

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَآ أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى

صَدَقَ اللهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ۔

گزشتہ مباحث میں ہماری بحث کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اسلام دراصل کیا تھا اور بعد میں اس نے کیا شکل اختیار کرلی۔ اس بحث سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم موجودہ دور میں اپنی ذمے داریوں کو سمجھیں اور یہ سوچیں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

ہم نے اپنے مطالعے کے ضمن میں پیغمبرِ اسلامؐ کی یہ حدیث پیش کی کہ "جو کچھ پچھلی امتوں میں ہو چکا ہے وہی ہو بہو اس امت میں بھی واقع ہوگا۔" اسی سلسلے میں ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا تھا کہ پچھلی شریعتوں میں تحریف ان مقتدر اور شیطان صفت انسانوں کے ہاتھوں ہوئی جو صاحبِ شریعت نبی کے بعد آئے، اور پھر تحریف کا یہ عمل اتنی مدت تک جاری رہا کہ اس امت کا نبی جو مجموعۂ شریعت لایا تھا اسے یکسر بدل دیا گیا یہاں تک کہ انسان اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔

یہی واقعات جن کی بنیاد خدا کی سنت اور انسان کی ساخت پر ہے اس امت کے ہاں بھی پیش آئے۔ البتہ چونکہ شریعتِ محمدیؐ آخری آسمانی شریعت تھی اس لیے لطفِ الٰہی کا تقاضا تھا کہ انسانیت کبھی بھی ہدایت سے محروم نہ رہے، اور یہ کہ وہ ہر دور میں محنت اور کوشش کر کے اسے حاصل کر سکے لہٰذا خاتم الانبیاءؐ کی اُمّت میں تحریف شدہ دین ائمۂ اہلبیتؑ کی کوششوں اور قربانیوں سے ایک مرتبہ پھر سے اپنی اصلی حالت میں لوگوں کے

پاس پہنچ گیا اور حقیقت کے متلاشیوں کو اُن تک رسائی حاصل ہو گئی۔ یہ تھا ہماری بحث کا خاکہ جسے ہم نے ایک دفعہ پھر دہرایا ہے۔

جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں شریعت اور دین کی تحریف کے اہم عوامل میں سے ایک عامل ایسا تھا جسے درحقیقت تحریف کا بنیادی پتھر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ عامل احادیثِ نبوی کو پوشیدہ رکھنے اور ان کی نشر و اشاعت میں رکاوٹ ڈالنے سے عبارت تھا۔ اگر پچھلی امتوں کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے کہ "یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا" یعنی جو لوگ ہماری ہدایتوں کو چھپاتے ہیں (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۹) تو اس امت کے ارباب اقتدار نے نہ صرف یہ کہ خود دینی حقائق پر پردہ ڈالا بلکہ اسلام اور قرآن کے مخلص حامیوں کو بھی حقائق بیان کرنے کی اجازت نہیں دی نیز یہ کہ انھوں نے جو حدیثیں لکھی تھیں انھیں بھی جلا دیا۔ اس صورت میں دین ہم تک کیسے پہنچتا؟ تحریف کا پہلا اور سب سے اہم ذریعہ یہیں عملی شکل اختیار کرتا ہے۔

اب ہم اپنی بحث اور مطالعے میں اس دوسرے وسیلے کی جانب اشارہ کریں گے جو حاکموں اور مقتدر لوگوں نے اسلام میں تحریف کرنے کے لیے اختیار کیا۔ اس وسیلے نے جو پہلے عامل سے وابستہ ہے یہ شکل اختیار کی کہ مقتدر لوگوں نے پہلے مرحلے میں جہاں تک ان سے ہو سکا اسلام کے دوسرے رکن یعنی سنّتِ نبوی کی نشر و اشاعت میں رکاوٹ ڈالی لیکن چونکہ وہ جانتے تھے کہ جیسا کہ کنٹرول کے باوجود بھی غیر قانونی خرید و فروخت کا جاری رہنا ممکن ہے اسی طرح اس بات کا بھی امکان ہے کہ لوگوں کے درمیان اِکّا دُکّا ایسی حدیثیں پھیل جائیں جو حکومت کی سیاست کے خلاف ہوں لہٰذا انھوں نے سوچا کہ اس پہلو کی جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے اور اس کے لیے خاص منصوبہ تیار کرنا چاہیے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ میثم تمّار نے پھانسی پر لٹکے ہوئے بھی لوگوں کے لیے حدیثیں نقل کیں جو انھوں نے سنیں اور لکھ لیں، رشید ہجری کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے تاکہ وہ اسی حالت میں مر جائیں لیکن انھوں نے مرتے مرتے بھی اپنے ہمسایوں سے کہا: آؤ اور رونے دھونے کی بجائے مجھ سے حدیثیں سنو اور لکھ لو۔ ابوذرؓ کو شہر بہ شہر جلا وطن کیا گیا اور ان پر کڑی نظر رکھی گئی تاکہ وہ کچھ کہہ نہ پائیں،

لیکن اس کے باوجود انھوں نے حدیثیں روایت کیں۔ سوال یہ تھا کہ ان حدیثوں کا کیا کیا جائے جو خلفاء کی مرضی کے خلاف نشر ہوئیں۔ ان سب باتوں کا علاج انھوں نے ایک بنیادی منصوبے کے مطابق کیا اور ان کا یہ منصوبہ وہ دوسرا عامل تھا جسے اسلام میں تحریف کے لیے استعمال کیا گیا۔

بخدا یہ چیز بڑی عجیب، دردناک اور رنجدہ ہے۔ ہمیں سید الشہداء پر نہیں بلکہ خلفاء کے اس فعل پر رونا چاہیے کیونکہ یہ فعل ایک سہ پہلو تیر ہے جو اسلام کے قلب میں پیوست کر دیا گیا۔ اگرچہ اس سے کوئی جسم مجروح نہیں ہوا اور کسی کا خون نہیں بہا لیکن اس سے اسلام کی اس روح، فکر اور نصب العین کو قتل کر دیا گیا جس کی حفاظت کی خاطر سیکڑوں پاک بدن خاک و خون میں لتھڑ گئے تھے۔ چنانچہ یہ لازم تھا کہ دنیا کے پاک نہاد لوگوں کی دسیوں نسلیں ایک بار پھر اس قیمتی خون کی تاثیر کو واپس لانے کے لیے اپنے آپ کو قربان کر دیں۔

آخر انھوں نے ایسا کیا کام کیا؟ انھوں نے رسولِ اکرمؐ کے ارشادات کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانے کے لیے ایک منصوبہ بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر آنحضرتؐ کی کوئی حدیث لوگوں تک پہنچے تو وہ کسی طور بھی معتبر تصور نہ ہو، کہ اس سے کسی حقیقت کو ثابت کیا جا سکے یا اسکی مدد سے کوئی صحیح کام انجام دیا جا سکے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ اس بات کو ناممکن بنا دیا جائے کہ اس حدیث پر اعتماد کرتے ہوئے اسلام کو سمجھا جا سکے اور اس پر عمل کیا جا سکے۔

کیا یہ چیز واقعی ممکن ہے؟ کیا اس بات کا امکان ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی اُمت یہ اعلان کر دے کہ ان کے نبی کی باتیں قطعاً ناقابلِ اعتبار ہیں اور ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں؟

پھر جب یہ بات مان لی جائے تو ان کی شریعت میں سے کیا باقی رہ جائے گا؟

انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ اُمتِ اسلامی میں یہ عمل بھی انجام پایا۔ اس دینی تقدس پر مختلف اطراف سے حملہ کیا گیا اور اسے مجروح کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس حملے اور اس بھرپور کوشش کے بعد مسلمانوں کے دلوں میں رسول اکرمؐ کے ارشادات کی کیا قیمت باقی رہ گئی؟ کیا یہ بات قرینِ عقل اور فطری نہ تھی کہ آنحضرتؐ کی احادیث پر سے ـــ جو اسلام کا دوسرا رکن ہے ـــ ان کا اعتقاد اُٹھ جائے۔

"تاہم خلفاء کے اس فعل کے اثرات اس سے کہیں زیادہ تھے جو ہم نے ان کے ایسے

اقوال کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جیسے کہ "حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ" اور "بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ كِتَابُ الله" وہاں انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے اور ہمیں اس کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں لیکن یہاں تو انھوں غضب کر دیا اور گویا ایک دلیل گھڑی کہ احادیثِ رسولؐ اصولاً بے وقعت اور غیر معتبر ہیں۔

تحریف کا دوسرا عامل

صحیح مسلم، مسند احمد بن حنبل اور دوسری معتبر کتابوں میں ایک حدیث موجود ہے جو ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کی گئی ہے۔ اگرچہ اس حدیث کے اور راوی بھی ہیں لیکن ہم پہلے اسے بی بی عائشہ سے نقل کرتے ہیں کیونکہ اہل سنت کے نزدیک وہ دوسرے سب راویوں سے زیادہ معتبر ہیں۔

احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں جو روایت نقل کی ہے وہ یوں ہے: عائشہ کہتی ہیں: عرب کے مختلف قبیلوں کے بہت سے لوگ رسولِ اکرمؐ کے پاس آئے ہوئے تھے۔ وہ آنحضرتؐ کے اردگرد جمع تھے اور آپ سے مختلف باتیں پوچھ رہے تھے۔ لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ آنحضرت انکے درمیان دب کر رہ گئے تھے اور پریشان ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر مہاجرین رسولِ اکرمؐ کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے لوگوں کو آپکے پاس سے دور ہٹا دیا اور آپکے لیے راستا بنا دیا حتیٰ کہ آپ اپنی عبا ان لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ کر میرے گھر کے دروازے تک پہنچے۔ پھر جلدی سے اندر داخل ہوئے اور فرمایا: "خدایا! ان لوگوں پر لعنت کر"۔ بی بی عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! یہ لوگ تو ہلاک ہو جائیں گے۔ آپؐ نے ان پر لعنت کی ہے اور آپ کی لعنت انہیں ہلاک کر دیگی"۔ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا: اے ابوبکر کی بیٹی! واللہ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ لوگ جن پر میں نے لعنت کی ہے ہلاک نہیں ہوں گے ـــــ یہاں سے جھوٹ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ غلط بیانی کہاں تک جا پہنچی ہے اور رسولِ اکرمؐ کے ارشادات کا اعتبار ختم کرنے کے لیے کیا کہا جا رہا ہے ـــــ پھر رسول اکرمؐ نے فرمایا: میں نے خدا سے ایک معاہدہ کیا ہے اور یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی خلاف ورزی کا کوئی سوال نہیں، میں نے اپنے پروردگار سے کہا ہے: خداوندا! میں ایک انسان ہوں اور تمام عام انسانوں کی طرح

مجھے بھی طیش آجاتا ہے۔ پس اگر اس حالت میں مَیں کسی مومن پر نفرین کروں تو تُو اسے اسکے گناہوں کا کفارہ قرار دینا لہٰذا میری یہ لعنت ان لوگوں کے لیے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔ [۱]

ایک دوسری روایت میں جو صحیح مسلم میں بی بی عائشہ سے نقل کی گئی ہے، وہ کہتی ہیں:
دو آدمی رسولِ اکرمؐ کے پاس آئے اور انھوں نے آپؐ سے باتیں کیں۔ میں نہیں سمجھ سکی کہ انہوں نے کیا کہا لیکن آنحضرتؐ اُن کی باتوں پر سخت خفا ہوئے اور آپؐ نے ان پر لعنت بھیجی اور انھیں سخت سُست کہا۔ جب وہ آپ کے پاس سے چلے گئے تو میں نے کہا: اگر کسی کا بھلا ہونا ہے تو ان دو آدمیوں کا بھلا ہرگز نہ ہو گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: کیوں؟ کیا ہوا ہے؟ میں نے کہا: آپ نے ان دو آدمیوں پر لعنت کی ہے اور انھیں سخت سُست کہا ہے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتیں کہ میں نے اپنے خدا کے ساتھ کیا معاہدہ کر رکھا ہے؟ میں نے اپنے خدا سے یہ معاہدہ کیا ہے کہ جب میں کسی مسلمان کو لعنت ملامت کروں تو وہ میری اس لعنت ملامت کے بدلے میں اُسے پاک اور پاکیزہ کر دے۔ [۲]

اب جب کوئی صاحب بھی حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں سے یہ نقل کریں گے کہ رسولِ اکرمؐ نے معاویہ پر لعنت کی ہے تو یہ لعنت اس کی پاکیزگی کا موجب بن جائے گی۔ اگر آپ کہیں کہ آنحضرتؐ نے ابُوسفیان یا کسی دوسرے پر لعنت کی ہے تو اس کا اثر بھی اُلٹا ہو گا اور یہ لعنت اسکی مذمت کی بجائے اس کی فضیلت کا باعث بن جائے گی۔

احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں بی بی عائشہ سے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں وہ کہتی ہیں:

ایک دفعہ رسول اکرمؐ ایک قیدی کو میرے پاس لائے۔ آنحضرتؐ کے تشریف لے جانے کے بعد میری لاپروائی کے نتیجے میں وہ قیدی بھاگ گیا۔ جب آنحضرتؐ واپس آئے تو مجھ سے دریافت فرمایا کہ قیدی کہاں ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میں عورتوں سے باتیں کرنے میں

---

[۱] صحیح مسلم، جلد ۸ کتاب ۴۵، باب ۲۵، حدیث ۸۸، صفحہ ۲۴ - ۲۷ مطبوعہ محمد علی صبیح،
مسند احمد بن حنبل، جلد ۶ صفحہ ۱۰۷۔

[۲] صحیح مسلم جلد ۸ صفحہ ۲۴۔

مشغول تھی کہ وہ بھاگ گیا۔ آپ نے فرمایا: ایسا کیوں ہوا؟ خدا تیرا ہاتھ کاٹ دے! پھر آپ باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کو قیدی کے بھاگ جانے کے متعلق بتایا چنانچہ وہ اسے پکڑ کر لے آئے تاہم مجھے یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ رسولِ اکرمؐ کی اس بددعا کے نتیجے میں میرا ہاتھ لازماً کاٹا جائے گا۔ میں مسلسل اپنے ہاتھوں کو دیکھتی اور سوچتی رہی کہ دیکھیں ان میں سے کونسا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ اسی اثنا میں آنحضرتؐ گھر تشریف لائے اور انہوں نے دیکھا کہ میں اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھے جا رہی ہوں۔ آپ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ تم دیوانی تو نہیں ہوگئیں کہ اپنے ہاتھوں کو حرکت دیے جا رہی ہو؟ میں نے جواب دیا: آپ نے مجھے بددعا دی ہے۔ اب میں اپنے ہاتھوں کو الٹا سیدھا کر کے دیکھ رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ دیکھیے ان میں سے کونسا کاٹا جاتا ہے۔ اس وقت آنحضرتؐ نے آسمان کی طرف دیکھا، خدا کی حمد و ثنا کی اور پھر بولے: اے پروردگار! میں انسان ہوں اور دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی غصہ آجاتا ہے۔ اگر میں ایسی حالت میں کسی مومن یا مومنہ کو بددعا دوں تو تُو اس کو اُس کے لیے پاکیزگی کا باعث قرار دے۔[۱]

چوتھی روایت بھی بی بی عائشہ سے نقل کی گئی ہے جس میں وہ کہتی ہیں: رسولِ اکرمؐ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھے اور اس قدر دعا کرتے تھے کہ میں تھک جاتی تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے: خداوندا! میں ایک انسان ہوں، اس لیے اگر میں کسی مسلمان کو بُرا بھلا کہوں یا تکلیف دوں تو اس پر مجھے سزا اور بدلہ نہ دے۔[۲]

پانچویں روایت میں بی بی عائشہ کہتی ہیں: ایک دن رسول اکرمؐ میرے گھر تشریف لائے۔ اس وقت آنحضرتؐ کے کندھے پر فرغل تھا اور اس کے اوپر عبا تھی۔ آپ قبلہ رو ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر آپ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور کہا: اے پروردگار! میں بھی ایک انسان ہوں۔ اگر میں تیرے کسی بندے کو ماروں پیٹوں یا تکلیف دوں تو تُو مجھ سے باز پرس نہ کرنا اور مجھے برا بدلہ نہ دینا۔[۳]

ایک اور روایت میں بی بی عائشہ کہتی ہیں:

---

[۱] و [۲] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۵۲ [۳] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۵۸ - ۲۵۹

میں نے رسولِ اکرمؐ کو دیکھا کہ انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور کہہ رہے تھے : بار الٰہا ! میں بھی انسان ہوں۔ تُو مجھے سزا اور عذاب نہ دے۔ اگر میں کسی مومن مرد کو تکلیف دوں یا بُرا بھلا کہوں تو اس فعل کی بنا پر مجھے بُرا بدلہ نہ دے۔[۱]

ایسی روایتیں جو زیادہ تر ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کی گئی ہیں ایک یا دو نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کی مشہور کتابوں میں ان کے بہت سے نمونے مل جائیں۔

مکتبِ خلفاء کے ایک صحابی اور معتبر راوی ابوہریرہ کی روایات بھی اس مکتب کی اہم ترین کتب حدیث میں موجود ہیں۔ ہم یہاں اُن سے مروی دو روایتیں نقل کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا : بار الٰہا ! میں تجھ سے ایک ہمیشہ برقرار رہنے والا معاہدہ کرتا ہوں جسے تو ہرگز نہیں توڑے گا۔ تُو جانتا ہے کہ میں ایک انسان ہوں لہٰذا اگر میں کسی مومن کو تکلیف پہنچاؤں، اُسے بُرا بھلا کہوں، اسے تازیانہ ماروں یا اس پر لعنت کروں تو میرے اس فعل کو اس کے لیے رحمت، پاکیزگی اور اپنے قرب کا ذریعہ قرار دے تاکہ قیامت کے دن اُسے اس کے وسیلے سے تیرا قرب حاصل ہو۔[۲]

وہ ایک دوسری روایت کہتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا : بار الٰہا ! محمدؐ ایک انسان ہے جس طرح دوسرے انسانوں کو غصہ آتا ہے (صحیح یا غلط وجہ سے) اسی طرح اسے بھی غصہ آتا ہے۔ چنانچہ میں نے تیرے ساتھ ایک معاہدہ کر رکھا ہے جسے تو ہرگز نہیں توڑے گا کہ میں جس مومن کو تکلیف دوں یا سخت سُست کہوں یا تازیانہ لگاؤں تو میرے اس عمل کو اس کے گناہوں کا کفارہ اور اپنی بارگاہ میں اس کے تقرب کا ذریعہ قرار دے جس سے وہ قیامت کے دن تیری نزدیکی حاصل کرے۔[۳]

۱؎ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۵۸۔ ۲؎ صحیح مسلم جلد ۸ صفحہ ۲۴ کِتَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ۔ بَابُ مَنْ لَعَنَهُ النَّبِيُّ اَوْ سَبَّهُ ۳؎ صحیح مسلم جلد ۸ صفحہ ۲۶ کِتَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ۔ بَابُ مَنْ لَعَنَهُ النَّبِيُّ اَوْ سَبَّهُ۔ (یہ دونوں حدیثیں محمد فواد عبد الباقی کی مطبوعہ صحیح مسلم کے ۲۵ ویں باب میں ۹۰ اور ۹۱ نمبر پر درج ہیں)۔

مکتبِ خلفاء کی ایسی معتبر روایات سے پتا چلتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی معاویہ، ابوسفیان اور قریش کے دوسرے اکابرین پر لعنت ہی خُدا سے ان کی نزدیکی ان کی پاکیزگی اور ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی لہٰذا یہ امر واضح ہے کہ پہلے مرحلے میں ایسی روایتوں کا فائدہ کن لوگوں کو پہنچے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ فائدہ ان لوگوں کو پہنچے گا جو بعد میں ایک طویل مدت تک مسلمانوں کے حاکم رہے اور جنہیں لوگوں کی جان و مال اور دین و دستور پر اختیار حاصل تھا۔

بی بی عائشہ سے مروی ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: میں نے اپنے پروردگار کے ساتھ ایک مُعاہدہ کر رکھا ہے جس کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور وہ معاہدہ یہ ہے کہ میں نے اس سے عرض کیا: بارِ الٰہا! میں فقط ایک انسان ہوں۔ مجھے بھی دُوسرے انسانوں کی طرح غصہ آتا ہے اور میں بھی انہیں کی طرح پریشان اور رنجیدہ ہوتا ہوں۔ پس اگر میں کسی مسلمان کو (ان وجوہ کی بنا پر) ماروں یا بُرا بھلا کہوں یا اس پر لعنت کروں یا اُسے تکلیف دوں تو میرے اس تکلیف دینے، لعنت کرنے، بُرا بھلا کہنے اور مارنے کو اس کے لیے بخشش، رحمت اور قرب کا ذریعہ قرار دے تاکہ وہ ان کے ذریعے قیامت کے دن تیری نزدیکی حاصل کرے[1]

ایک اور مقام پر ام المومنینؓ نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے رسولِ اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا: کیا تم نہیں جانتیں کہ میں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کیا معاہدہ کیا ہے؟ میں نے اس سے عرض کیا ہے کہ اے پروردگار! میں ایک انسان ہوں اور مجھے بھی اسی طرح غصہ آتا ہے جیسے کسی دوسرے کو آتا ہے۔ پس میں جس مسلمان پر نفرین کروں تو میری اِس نفرین کو اس کے لیے اپنی رحمت کا باعث بنا دے۔[2]

وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے مجھ سے کہا: اے عائشہ! کیا تم نہیں جانتیں کہ میں نے اپنے پروردگار سے راز و نیاز کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں فقط ایک انسان ہوں

---

[1] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۲۴۔ حدیث ۳۰۳۵ [2] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۲۴، بحوالہ کتاب مکارم الاخلاق از خرائطی۔

اور لازمی طور پر مجھے بھی غصّہ آتا ہے لہٰذا اگر میں غصّے کی بنا پر اپنی ملّت کے یا اپنے خاندان کے کسی فرد یا اپنی کسی بیوی پر نفرین کروں تو اسے اس کے لیے برکت، بھلائی، بخشش، رحمت اور پاکیزگی کا موجب قرار دے۔[1]

اس موضوع پر رسولِ اکرمؐ سے محض ایک دو ہی نہیں، بلکہ بہت سی روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ اب اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو آنحضرتؐ کے لیے کہنے کو کیا باقی رہ جاتا ہے؟ ان روایتوں کے ہوتے ہوئے آنحضرتؐ کی احادیث حقیقت کی نشاندہی کیسے کر سکتی ہیں اور ایک پیغمبر بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کی شخصیت کیا شکل اختیار کر لیتی ہے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ جن اشخاص پر رسولِ اکرمؐ نے بقول بی بی عائشہ کے بیجا طور پر لعنت بھیجی اور انھیں سخت سُست کہا وہ محض دو یا تین افراد نہیں ہیں۔ ایک گروہ تو ان بدوی عربوں کا ہے جو اس لیے مدینے آئے تھے کہ انھیں رسولِ اکرمؐ سے کچھ عرض کرنا تھا، مگر آپ نے ان پر لعنت کی۔ دوسرے موقع پر دو مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے ان پر لعنت کی۔ ایک موقع پر آپ نے خود بی بی عائشہ کو بددعا دی وغیرہ وغیرہ۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ ہر مرتبہ یہ بھی فرماتے تھے: میں نے خدا سے درخواست کی ہے اور اس کے ساتھ معاہدہ کیا ہے کہ میں جس شخص پر لعنت کروں، خدا اس لعنت کو اس کے لیے برکت، رحمت، بخشش اور تقرب کا موجب قرار دے گا۔

اب ہم ان روایات کی تحقیق کرتے ہیں

جو روایات نقل کی گئی ہیں اب ہم ان کی تحقیق کرتے ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، مسند احمد بن حنبل اور مسند ابو عوانہ میں عبداللہ بن مسعود سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

---

[1] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۲۴، بحوالہ کتاب الالقاب از شیرازی۔

"سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَّ قِتَالُهُ كُفْرٌ"۔[1] یعنی مسلمان کو گالی دینا فسق، اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔

ایک اور حدیث ثابت بن ضحاک سے نقل کی گئی ہے جو بیعت رضوان میں شریک اصحاب میں سے ہیں۔ یہاں رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

یعنی اگر کوئی شخص کسی مومن پر لعنت بھیجے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ اس نے اسے قتل کر دیا۔ آپ نے مزید فرمایا: وَمَنْ قَذَفَ مُؤْمِنًا بِكُفْرٍ فَهُوَ كَقَتْلِهٖ[2] یعنی اگر کوئی شخص کسی مومن کو کفر سے منسوب کرے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے اسے قتل کر دیا۔

ابوداؤد نے نقل کیا ہے کہ: رسولِ اکرمؐ کے ایک صحابی آندھی میں گھر گئے تو تیز ہوا کی وجہ سے ان کی چادر ان کے کندھے پر سے گر گئی۔ اس وقت انھوں نے ہوا پر لعنت کی۔ تب رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: ہوا پر لعنت نہ کرو۔ وہ خدا کی مامور کی ہوئی چیزوں میں سے ایک ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز پر لعنت کرے جو لعنت کی مستحق نہ ہو تو وہ لعنت، لعنت کرنے والے پر لوٹ آتی ہے۔[3]

انھوں نے ہی ابودرداء سے بھی نقل کیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: جب ایک ایسے شخص پر لعنت بھیجی جائے جو لعنت کا مستحق نہ ہو تو وہ لعنت کرنے والے پر لوٹ آتی ہے۔[4]

ابن مسعود نے رسولِ اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: مومن نہ طعنے دیتا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان باب ۳۶، کتاب الادب باب ۴۴ اور کتاب الفتن باب ۸۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان۔ حدیث ۱۱۶۔ صحیح ترمذی، کتاب البر۔ باب ۵۱، کتاب الایمان باب ۱۵۔ سنن نسائی، کتاب التحریم، باب ۲۷۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن باب ۴، مقدمہ ابن ماجہ باب ۷ اور ۹، مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۷۶، ۱۷۸، ۲۸۵، ۴۱۱، ۴۲۲، ۴۴۶، ۴۵۴ اور ۴۶۰، مسند ابی عوانہ جلد ۱ صفحہ ۲۴، ۲۶۔ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۲۱۔ پہلا ایڈیشن۔ [2] صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۵ مطبوعہ عبدالحمید۔ مسند ابی عوانہ، جلد ۱ صفحہ ۴۴، ۴۵۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔ [3] سنن ابوداؤد، جلد ۴ صفحہ ۲۷۸ حدیث ۴۹۰۸۔ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۲۲۔ طبع قدیم [4] سنن ابوداؤد جلد ۴ صفحہ ۲۷۷ حدیث ۴۹۰۵ (یہ حدیث کا خلاصہ ہے) تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید۔

ہے، نہ زیادہ لعنت کرتا ہے، نہ سخت سُست کہتا ہے اور نہ ہی بد کلامی کرتا ہے۔[1]

ابو درداء سے روایت کی گئی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: جو لوگ کسی پر بے جا لعنت کرتے ہیں وہ نہ تو شفاعت کریں گے اور نہ ہی لوگوں کی شہادت دیں گے۔[2]

رسولِ اکرمؐ سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی ایک بیوی سے فرمایا:

- میں تمہیں زیادہ لعنت کرنے سے منع کرتا ہوں۔
- مومن پر لعنت کرنا اسے قتل کر دینے کی مانند ہے۔
- ایک مومن کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ زیادہ لعنت کرے۔
- یہ نہیں ہو سکتا کہ تم زیادہ لعنت بھی کرو اور تمہارا شمار صدیقین میں بھی ہو۔
- اے ابوبکر! کوئی بہت لعنت کرنے والا بھی ہو اور صدیق بھی ہو۔ نہیں! خدا کی قسم! یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ دو صفتیں ایک شخص میں جمع ہو جائیں۔[3]

ام المومنین بی بی عائشہ سے یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: میں رسولِ اکرمؐ کے ساتھ تھی۔ قافلے میں جو اونٹ میرے پاس تھا، جب میں نے اس پر لعنت کی تو آنحضرتؐ نے فرمایا: جس چیز پر لعنت کی جائے وہ ہمارے ہمراہ نہیں ہونی چاہیے لہٰذا اس اونٹ کو چھوڑ دو اور قافلے سے الگ کر دو۔[4]

وہ مزید کہتی ہیں کہ میں ایک اونٹ پر سوار تھی اور میں نے اس پر لعنت کی تو رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اب جبکہ تم نے اس اونٹ پر لعنت کی ہے، اس پر سواری مت کرو۔[5]

صحیح مسلم میں یہ روایت آئی ہے کہ ایک دن جب ایک انصاری عورت نے اپنے اونٹ پر لعنت کی تو رسول اکرمؐ نے فرمایا: اونٹ کا پالان اتار لو اور اسے چھوڑ دو۔ جس

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۴۰۵۔ صحیح ترمذی جلد ۳ صفحہ ۱۳۸

[2] سنن ابوداؤد جلد ۴ صفحہ ۲۷۸ حدیث ۴۹۰۷ [3] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۲۵ پہلا ایڈیشن

یہ پانچ حدیثیں ہیں جن میں سے پہلی بی بی عائشہ سے مروی ہے اور باقی دوسروں سے مروی ہیں جن میں خلیفہ ابوبکر بھی شامل ہیں۔ [4] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۷۲، ۲۵۷، ۲۵۸۔

[5] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۳۸۔ سنن دارمی جلد ۲ صفحہ ۲۸۸

اونٹ پر لعنت کی گئی ہو اسے ہمارے ہمراہ نہیں ہونا چاہیے۔[1]

ان سب احادیث کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے ان مسلمانوں اور مومنوں پر بیجا لعنت کی ہو؟

تاریخ اور حدیث کی معتبر کتابوں میں ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کیا گیا ہے کہ: رسول اکرمؐ نے کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی جس کا ذکر کیا جائے اور جو لوگوں کو یاد ہو۔[2]

کیا یہ قول حافظے کی کمزوری کی نشانی نہیں ہے؟ وہی ام المومنین جو مسلمانوں کے حق میں رسولِ اکرمؐ کی تمام بیجا لعنتیں نقل کرتی ہیں یہ بھی کہتی ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے کسی مسلمان پر لعنت کی ہی نہیں۔

انہیں معتبر کتابوں میں بی بی عائشہ سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ کو جو تکالیف دی گئیں ان کا انھوں نے کسی سے انتقام نہیں لیا ماسوا اس کے کہ خدا کے قوانین میں تجاوز کیا گیا ہو۔ انھوں نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے ضرب نہیں لگائی مگر جب معاملہ خدا کا ہوتا تھا تو اس وقت آپ سزا دیتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے آپ سے کوئی چیز مانگی ہو اور آپ نے دینے سے انکار کیا ہو سوائے اس کے کہ جو چیز مانگی گئی ہو وہ حرام ہو کیونکہ ایسی حالت میں آپ بلاشبہ سب لوگوں کے مقابلے میں حرام سے زیادہ دُور رہتے تھے۔ جب کبھی آپ کو دو کاموں میں اختیار رہا تو آپ نے آسان امر کو اختیار فرمایا۔

ایک اور موقع پر بی بی عائشہ کہتی ہیں[3]: میں نے نہیں دیکھا کہ رسولِ اکرمؐ نے کبھی کسی کنیز یا خادمہ یا غلام یا خادم کو چھڑی سے پیٹا ہو اور انھوں نے کبھی اپنی کسی بیوی

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۳ - کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۲۵

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۲ - ۲۶ - ۱۱۴ - ۱۱۶ - ۱۸۲ - ۲۲۳ - ۲۲۹ - ۲۳۲ اور ۲۸۱ - ابن سعد طبقات الکبریٰ جلد ۱ طبقہ ۱ صفحہ ۹۱ مطبوعہ لیڈن - صحیح بخاری جلد ۴ صفحہ ۱۸۹ مطبوعہ عبد الحمید - صحیح مسلم باب مباعدہ للاثام جلد ۷ صفحہ ۸۰۔

[3] سنن ابو داؤد جلد ۴ صفحہ ۲۵۰ - تحقیق محمد محی الدین - موطا مالک جلد ۲ صفحہ ۹۰۲، حدیث ۲ کتاب حسن الخلق۔

کو نہیں مارا۔ ہاں جنگ، جہاد اور خدا کی راہ میں لوگوں کو مضروب کرنے کے علاوہ وہ اصولاً کسی کو ضرب نہیں لگاتے تھے اور کبھی کسی نے ان کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ انھوں نے کسی سے انتقام لیا بجز اس کے کہ معاملے کا تعلق دین اور خدا سے رہا ہو۔ ہاں جب کبھی ایسی صورت ہوئی تو آپ نے ضرور بدلہ لیا۔ جب کبھی آپ کو دو کاموں کا اختیار ہوا کہ (اس کو کریں یا اس کو) تو آپ نے آسان امر کو اختیار فرمایا بشرطیکہ اس میں گناہ نہ ہو۔ اگر گناہ ہوتا تو سب سے زیادہ آپ اس سے پرہیز کرتے تھے۔

پھر ہم بی بی عائشہ کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ: رسولِ اکرمؐ کبھی بھی گالی نہیں دیتے تھے اور کوچہ و بازار میں شور و غل نہیں مچاتے تھے۔ آپ کسی کی بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معاف کر دیتے تھے اور چشم پوشی فرماتے تھے۔[1]

چند یہودی آپ کے پاس سے گزرے تو انھوں نے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہنے کی بجائے کہا اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ (تمھیں موت آئے)۔ بی بی عائشہ نے جو وہاں موجود تھیں ــــ ان کے اپنے قول کے مطابق ــــ کہا: خود تمھیں موت آئے، خُدا تم پر لعنت کرے اور تم پر اپنا غضب نازل کرے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اے عائشہ خاموش رہو۔ تمھیں چاہیے کہ ملائمت اور نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدگوئی سے پرہیز کرو۔[2]

یہ وہ روایتیں ہیں جو خود ام المومنین عائشہ نے نقل کی ہیں اور جو رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی سے باقی رہی ہیں۔ ہم نے بحث کے شروع میں قرآن مجید کی آیتیں بھی ملاحظہ کی ہیں۔ جیسے خدا فرماتا ہے:

اے لوگو! تمھیں میں سے ہمارا ایک رسولؐ تمہارے پاس آچکا ہے جس پر تمہارا تکلیف اٹھانا سخت شاق ہے اور وہ مومنین پر حد درجہ شفیق اور مہربان ہے۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۲۸)۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۷۴ - ۲۳۶ - ۲۴۶ -

[2] صحیح بخاری، کتابُ الادب۔ باب لم یکن النبیؐ فاحِشًا جلد ۴ صفحہ ۳۸ - ۳۹ - کتابُ الاستئذان۔ باب کیف یرد علی اھل الذمّۃ جلد ۴ صفحہ ۶۱ - ۶۲

وہ یہ بھی فرماتا ہے:

قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو لکھی جاتی ہے کہ اے پیغمبرؐ (مشرکوں کے قول کے برعکس) آپ اپنے پروردگار کے لطف و کرم سے دیوانے نہیں ہیں اور (ان کثیر تکالیف کے بدلے میں جو آپ نے اٹھائی ہیں) آپ کے لیے یقیناً وہ اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ بے شک آپ بڑا اعلیٰ اخلاق رکھتے ہیں۔ (سورۂ قلم۔ آیات ۱-۵)

ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تو اپنے پیغمبرؐ کے بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے اور اس طرح ان کے اوصاف بیان کرتا ہے لیکن مکتبِ خلفاء کی معتبر کتابوں میں موجود روایات یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ رسولِ اکرمؐ کے اقوال اور افعال کا اصل محرک انکی نفسانی خواہشات تھیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ آنحضرتؐ بہت سی باتیں لوگوں سے خوش یا ناخوش ہونے کی بنا پر کرتے تھے اور ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔

اب ہم دوبارہ قرآن مجید کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے کہ:

قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہوتے وقت نیچے آتا ہے کہ تمہارے پیغمبر گمراہ نہیں ہوئے اور نہ اپنے ہدف سے دور ہوئے ہیں کیونکہ وہ اپنی نفسانی خواہش سے کچھ نہیں کہتے۔ یہ تو بس وحی ہے جو انھیں بھیجی جاتی ہے۔ (سورۂ نجم۔ آیات ۱-۵)۔

ہاں تو ہم جانتے ہیں کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو قرآن ہے اور وہ ایسی وحی ہے جس میں الفاظ و معانی دونوں خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور دوسری پیغمبرؐ کی وہ حدیث ہے جس کے معنی و مفہوم وحی کے ذریعے آنحضرتؐ پر القا ہوئے لیکن الفاظ اور عبارات کا انتخاب خود آپ نے کیا۔ چنانچہ ان دونوں صورتوں میں پیغمبرؐ اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کرتے۔ یہ تھی پیغمبرؐ کے بارے میں قرآن مجید کی وضاحت اور یہ تھی آنحضرتؐ کی جانب سے صحیح اسلام کی شناخت۔

یہ روایتیں کیوں بیان کی گئیں؟

اب جبکہ ہمیں پتا چل گیا ہے کہ پہلے زمرے کی احادیث جھوٹی ہیں تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ایسی احادیث کیوں وجود میں آئیں اور ایسی باتیں رسولِ اکرمؐ سے کیوں منسوب کی گئیں۔

ان حدیثوں کی غرض وغایت یہ تھی کہ آنحضرتؐ نے کسی کی جو تعریف یا مذمت کی ہو اسکی قدر وقیمت زائل کردیں اور آپ کے ارشادات کو اتنا غیر معتبر بنا دیں کہ اگر خلفاء کی سیاست کے خلاف کوئی حدیث یا حدیثیں سخت سنسر کے باوجود بیان ہو جائیں تو پھر وہ اس رکاوٹ کو نہ پھلانگ سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگر رسولِ اکرمؐ کی زبانی کسی مسلمان کی تعریف نقل کیجاتی یا عمارؓ کے بارے میں آپ کا یہ قول دہرایا جاتا کہ "عمارؓ حق کے ساتھ ہے اور حق سے جُدا نہیں ہوتا" یا یہ کہ ابوذرؓ کے بارے میں آپ کی زبان مبارک سے سُنا گیا تھا کہ "ابوذرؓ سے زیادہ سچا شخص نہ زمین نے اپنے پہلو میں لیا ہے اور نہ آسمان نے اس کے سر پہ سایہ ڈالا ہے" تو ان اقوال کی کوئی قدر وقیمت نہ تھی۔

جیسا کہ ہم نے گزشتہ بحثوں میں پڑھا ہے، قریش نے رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں عبداللہ بن عمرو بن العاص سے کہا: تم رسولِ اکرمؐ سے جو بات سنتے ہو لکھ لیتے ہو حالانکہ وہ بھی ہماری طرح ایک انسان ہیں اور خوشی یا غصے کی حالت میں بات کرتے ہیں۔ جب کسی سے خوش ہوتے ہیں تو اس کی تعریف کرتے ہیں اور جب کسی سے خفا ہوتے ہیں تو اس کی مذمت کرتے ہیں۔ پھر ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ عبداللہ نے یہ باتیں سنکر آنحضرتؐ کے ارشادات قلمبند کرنا چھوڑ دیا اور جو کچھ قریشیوں نے کہا تھا وہ آنحضرتؐ کے سامنے عرض کر دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: "تم حسبِ سابق میری حدیثیں لکھتے رہو۔ مجھے اس ذات کی قسم! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ ان دو ہونٹوں میں سے سچی بات کے علاوہ کوئی چیز باہر نہیں آتی۔ میری باتیں اور میری حدیثیں بہرحال ایک جیسی ہیں اور سبھی سچی ہیں"۔

اس حدیث کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم زیرِ بحث روایات کے نشر کرنے کی وجہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں ان قریشیوں نے جو بعد میں حکومت کے اعلیٰ مناصب پر پہنچے رسولِ اکرمؐ کی بھیجی ہوئی لعنتوں کی قدر وقیمت ختم کر دی۔

اب اپنے اس دعوے کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے ہم صحیح مسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

صحیح مسلم میں ایک خاص باب ہے جس کا نام ہے: "باب مَنْ لعنَهُ النبیؐ او سَبَّهٗ جَعَلَهُ اللّٰهُ زَکَاةً وَّطَهُوْرًا" (اس شخص کے بارے میں جس پر رسولِ اکرمؐ

لعنت کریں یا اسے بُرا بھلا کہیں۔ خدا اس لعنت کرنے یا بُرا بھلا کہنے کو اس شخص کے لیے پاکیزگی اور طہارت قرار دیتا ہے)۔

مسلم نے اپنی کتاب کے اس باب میں بی بی عائشہ، ابوہریرہ اور بعض دوسرے اشخاص کی کچھ روایات نقل کی ہیں جن کے نمونے آپ بھی دیکھ چکے ہیں۔ وہ اس باب کے آخر میں رسولِ اکرمؐ کے معاویہ پر لعنت کرنے کی داستان نقل کرتے ہیں جو یوں ہے:

رسولِ اکرمؐ نے عبداللہ بن عباسؓ کو کئی بار معاویہ کے پاس بھیجا تاکہ وہ انہیں بلا لائیں۔ ہر مرتبہ ابنِ عباسؓ نے واپس آکر کہا کہ معاویہ کھانا کھا رہے ہیں۔ بالآخر آنحضرتؐ نے فرمایا: "خدا اس کے پیٹ کو سیر نہ کرے۔" چنانچہ کہا جاتا ہے کہ معاویہ اپنی زندگی کے آخر تک ہر دفعہ اتنا کھانا کھاتے کہ کہا کرتے تھے کہ میں کھاتے کھاتے تھک گیا ہوں لیکن سیر نہیں ہوتا ہوں۔"

ہم یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے ایک دن دیکھا کہ ابوسفیان ایک اونٹ پر سوار ہے اور اس کے دو بیٹے یزید[1] اور معاویہ اس کے ساتھ ہیں۔ ان میں سے ایک نے اونٹ کی مہار تھام رکھی ہے اور دوسرا اسے ہانک رہا ہے۔ انھیں دیکھ کر آنحضرتؐ نے فرمایا: "لَعَنَ اللّٰهُ الْقَائِدَ وَالسَّائِقَ وَالرَّاكِبَ۔" "خدا کی لعنت ہو سوار پر اور اس پر جو اونٹ کی مہار تھامے ہوئے ہے اور اس پر جو اسے ہانک رہا ہے۔"[2]

آپ ملاحظہ کریں گے کہ زیرِ بحث احادیث کی بنا پر ابوسفیان اور معاویہ جیسے اشخاص پر بھیجی گئی لعنت کا نتیجہ ان کے لیے رحمت، بخشش اور پاکیزگی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگا لہٰذا آپ رسولِ اکرمؐ کی خواہ کتنی ہی احادیث پیش کریں جن میں اموی مجرموں پر لعنت کی گئی ہو، وہ احادیث نہ صرف یہ کہ معتبر نہیں ہوں گی بلکہ ان کا مطلب ان لوگوں کی مدح اور تعریف ہوگا۔ علاوہ ازیں ہم نے بیشتر یہ بھی ملاحظہ کیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے حکم بن ابی العاص اور اس کی تمام نسل پر لعنت کی ہے (سوائے ان کے جو مومن تھے اور جن کی تعداد آنحضرتؐ کے ارشاد کے مطابق بہت کم ہے) اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بیشتر اموی خلفاء اسی حکم کی اولاد میں سے

---

[1] معاویہ کا بھائی جو خلیفہ ابوبکر کے عہد میں شام کا حاکم مقرر ہوا اور خلیفہ عمر کے عہد میں طاعون سے مر گیا۔ [2] نصر بن مزاحم، کتاب صفین، صفحہ ۲۲۰۔

تھے مثلاً عبدالملک، سلیمان، ہشام، ولید، یزید وغیرہ اور رسولِ اکرمؐ نے جو لعنت کی اس میں یہ سبھی شامل ہیں۔ ذرا غور فرمائیے کہ کیا برسرِ اقتدار اشخاص اور مذکورہ بالا خلفاء نے اس قسم کی روایات کا کوئی علاج نہیں سوچا ہوگا؟ بلا شبہ انھوں نے اس کا علاج سوچا اور اس بارے میں کافی کوشش کی۔

مقتدر لوگوں کے اس گروہ کو چاہیے کہ اس قاطع روایت کا کچھ علاج کریں جو عمرو بن مرّہ جہمی[۱] سے نقل کی گئی ہے۔ عمرو بن مرّہ کہتے ہیں: تیسرے خلیفہ عثمان کا چچا مروان[۲] کا باپ اور خلفائے بنو امیہ کا مورثِ اعلیٰ حکم بن ابی العاص، رسولِ اکرمؐ کے گھر کے دروازے پر آیا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ آنحضرتؐ نے اس کی آواز پہچان لی اور فرمایا: یہ آنے والا ایک سانپ ہے، اِسے آنے دو۔ لعنت ہو اس پر اور ہر اس فرزند پر جو اس کے صلب سے پیدا ہو سوائے ان کے جو مومن ہوں اور بلاشبہ وہ بہت کم ہوں گے۔ یہ دنیا میں تو بڑے بن جائیں گے لیکن آخرت میں ان کے نصیب میں کچھ نہیں ہے۔

اس موضوع پر بہت سی روایتیں اور معتبر تاریخی داستانیں موجود ہیں لیکن ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں اسی پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ زیرِ بحث روایات کے گھڑنے کی وجہ جاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اس سے ہم ان اسباب کو سمجھ سکتے ہیں جن کی وجہ سے رسولِ اکرمؐ کے ارشادات پایۂ اعتبار سے گر گئے۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر رسولِ اکرمؐ نے کچھ لوگوں کی تعریف کی یا کسی خاص گروہ پر لعنت بھیجی تو کس طرح اس تعریف یا لعنت کی اہمیت جاتی رہی اور یہ بے وقعت ہو کر رہ گئیں۔

رسولِ اکرمؐ دنیاوی امور سے ناواقف ہیں

اب تک ہم نے جو چیز ملاحظہ کی وہ ایسی روایات کا ایک مجموعہ تھا جس کے ذریعے یہ کوشش کی گئی تھی کہ رسولِ اکرمؐ کی احادیث غیر معتبر قرار پائیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور روایات بھی

۱۔ مستدرک علی الصحیحین جلد ۴ صفحہ ۴۸۱۔ ۲۔ مروان بن حکم جو تھا اموی خلیفہ تھا جس نے نو مہینے حکومت کی (تجارب السلف، صفحہ ۲۷-۷۴)۔

ہیں جن کا یہی انداز ہے اور جن سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اب ہم ان روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

ام المومنین بی بی عائشہ اور انسؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ: ایک دن رسول اکرمؐ نخلستان کے پاس سے گزر رہے تھے۔ کچھ لوگ درختوں پر چڑھ کر زیرہ چھڑکنے اور کھجور کے مادہ درختوں کو بارآور بنانے میں مشغول تھے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کھجور کے درختوں سمیت سبھی درختوں میں نر اور مادہ ہوتے ہیں اور مادہ کھجور کا درخت ہی پھل دیتا ہے۔ کھجور کے نر درخت پر خوشے آتے ہیں جنہیں عربی زبان میں طلع کہتے ہیں۔ نخلستانوں کے مالک نر خوشوں کو توڑ لیتے ہیں اور انہیں ان مادہ درختوں پر چھڑکتے ہیں جن کے نئے نئے خوشے نکلے ہوں تاکہ نر خوشوں میں موجود زیرہ مادہ خوشوں پر بیٹھ جائے۔ اسی طرح کھجوریں اگتی ہیں اور ان میں مٹھاس پیدا ہوتی ہے ورنہ وہ ضائع ہو جاتی ہیں اور اس کا میوہ وجود میں نہیں آتا۔ جو لوگ ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں کھجور کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کی لوگوں کو خبر نہ ہو۔

ان ابتدائی کلمات کے بعد اب ہم اصلی واقعہ کی جانب لوٹتے ہیں۔ رسولِ اکرمؐ کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرتے ہیں جو کھجور کے درختوں پر چڑھ کر زیرہ چھڑکنے میں مصروف ہیں۔ آپ انھیں یہ کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان سے فرماتے ہیں: تم یہ کام نہ کرو تو بہتر ہے۔ اگر تم یہ کام انجام نہ دوگے تو کھجوریں بہتر ہو جائیں گی۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے رسولِ اکرمؐ کے فرمان کے مطابق عمل کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال شہر مدینہ کی کھجوروں کی فصل ضائع ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد جب آنحضرتؐ دوبارہ اس نخلستان کے پاس سے گزرے اور آپ نے خراب کھجوروں کو دیکھا تو لوگوں سے پوچھا تمھاری کھجوریں کیوں خراب ہو گئی ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ آپ ہی نے ارشاد فرمایا تھا کہ تم زیرہ نہ چھڑکو' اگر تم زیرہ نہ چھڑکو گے تو تمھاری کھجور کی فصل اچھی ہو گی۔ چنانچہ ہم نے زیرہ نہیں چھڑکا اور ہماری کھجوریں خراب ہو گئیں۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا: "تم اپنے دنیاوی کاموں کے بارے میں مجھ سے بہتر جانتے ہو۔"[1]

---

[1] صحیح مسلم' باب وجوب امتثال ما قالہٗ شرعاً دُوْنَ مَا ذکرہٗ من معایش الدنیا علی سبیل الرأی جلد ۷ صفحہ ۹۵ حدیث ۱۳۹-۱۴۲۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۶۲۔ جلد ۳ صفحہ ۱۲۳۔ سنن ابن ماجہ ' کتاب الرھون۔ باب تلقیح النخل ' جلد ۲ صفحہ ۸۲۵۔

ایسی روایات کا جو مکتبِ خلفاء کی حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں موجود ہیں نتیجہ کیا ہے ؟ کیا ان کے یہ معنی نہیں نکلتے کہ رسولِ اکرمؐ نے دنیاوی مسائل کے متعلق جو کچھ فرمایا ہو مثلاً اپنے بعد کسی کو لوگوں کا حاکم اور ولی الامر مقرر کیا ہو تو آپ کے اس ارشاد کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ لوگ اس سے بہتر حاکم کا انتخاب کر سکتے ہیں جیسے آنحضرتؐ نے خود فرمایا ہے اور اپنے عمل سے ثابت کیا ہے کہ لوگ دنیا کے معاملات کو آپ سے بہتر جانتے ہیں۔

ایسی روایتوں کے نتیجے میں لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دین صرف اس لیے آیا ہے کہ آپ کو یہ بتائے کہ نماز کیسے پڑھی جائے ، روزہ کیسے رکھا جائے ، دعا کیسے مانگی جائے اور عبادت کیسے کی جائے لیکن دنیا کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور دنیاوی معاملات خود لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے ہیں کیونکہ وہ انہیں بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ ان احادیث کا مقصد یہ ہے کہ اگر رسولِ اکرمؐ نماز ، روزے اور عبادت کی تعلیم دیں تو کوئی حرج نہیں لیکن دنیاوی امور میں وہ غلطی کھا جاتے ہیں کیونکہ ان معاملات میں وہ اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے بارے میں ان پر آسمان سے کوئی وحی نازل نہیں ہوتی۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ دین سیاست سے جدا ہے ؟ یعنی دین اجتماعی امور اور انسانوں کے دنیاوی مسائل سے الگ ہے اور اس کے پاس ان معاملات کے بارے میں کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ کیا یہ وہی بات نہیں ہوئی جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ "قیصر کا کام قیصر پر اور خدا کا کام خدا پر چھوڑ دو"

میں نے آج تک یہ نہیں دیکھا کہ کسی نے ایسی احادیث پر کوئی اعتراض کیا ہو یا ان کی صحت کے بارے میں خدشہ ظاہر کیا ہو۔ حدیث شناسی اور ضعیف احادیث کی تحقیق کے موضوع پر لکھی گئی کسی کتاب میں ان احادیث پر تنقید بھی نہیں کی گئی۔ آخر کیوں ؟ اس لیے کہ یہ احادیث صحیح مسلم میں نقل کی گئی ہیں اور مکتبِ خلفاء میں اس کتاب اور اس جیسی دوسری کتابوں کے مندرجات کے بارے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور یہ انتہائی معتبر ہیں۔

آپ غور فرمائیں کہ جو شخص اس قسم کی احادیث کو صحیح سمجھتا ہو، رسول اکرمؐ کے بارے میں اس کی شناخت کا کیا عالم ہو گا اور وہ آنحضرتؐ کو انسانیت اور عقل و شعور کے کس درجے پر رکھے گا ؟ کیا وہ اصولاً انہیں عقل و فکر رکھنے والا ایک عام انسان سمجھے گا ؟ ان پیغمبرؐ کو جن کے بارے میں قرآن مجید واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ : "مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ."

کفار قریش نے تو رسولِ اکرمؐ کو فقط دیوانگی سے نسبت دی لیکن اس طرح کی احادیث نے انکے قول کو عملاً درست ثابت کر دیا۔ اگر آپ خود اپنے ملک کے کسی گرم علاقے میں جائیں اور وہاں کسی نوجوان سے پوچھیں کہ کھجور کے درخت کو بار آور کرنے کے لیے کونسا عمل کیا جاتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ نوجوان زیرہ چھڑکنے کی ترکیب سے بخوبی واقف ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس کے بغیر درخت پھل نہیں دے گا لیکن ان احادیث کے مطابق رسول اکرمؐ جن کا سن مبارک اس وقت پچاس سال سے تجاوز کر چکا تھا وہ یہ عام سی بات بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ جاننا مزید دلچسپی کا موجب ہو گا کہ مستشرقین نے اس حدیث پر خاص توجہ دی ہے اور اس پر حاشیہ آرائی کی ہے[۱] درحقیقت ایسے ہی کمزور پہلوؤں کی موجودگی کے باعث مستشرقین نے اپنے مطالعات کو مکتبِ خلفاء کی کتابوں پر مرکوز کر دیا ہے اور اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کا تعارف اسی نقطۂ نگاہ سے کرایا ہے کیونکہ اس طرح وہ اسلام کو بہتر طور پر اپنے حملوں اور معاندانہ تنقیدوں کا نشانہ بنا سکتے ہیں لیکن جن لوگوں نے یہ روایات گھڑی ہیں انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کو ایک عام انسان کی سطح سے بھی نیچے لے آئیں تاکہ اول تو ان کی باتیں جو اسلام کو بیان کرنے سے عبارت ہیں پایۂ اعتبار سے گر جائیں اور دوم یہ کہ جو لوگ بعد میں خلیفہ بنیں وہ ان کے برابر بلکہ ان سے برتر ہوں اور یوں خلافت کے منصب کو وہ اہمیت اور اعتبار حاصل ہو جائے جس کی انھیں ضرورت تھی۔

رسولِ اکرمؐ قرآن بھول جاتے تھے

وہ روایات جو رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کو اپنے حملے کا ہدف قرار دیتی ہیں، ان کا تیسرا دستہ وہ روایات ہیں جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آنحضرتؐ ایک بھلکڑ انسان تھے حتیٰ کہ وہ قرآن مجید کی آیات کو ـــــ جو خود ان پر نازل ہوئیں، جو انھوں نے خود لوگوں کو سکھائیں اور جن کی تفسیر پر وہ خدا کی طرف سے مامور تھے ـــــ بھول جاتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان آیات کو قطعاً جانتے ہی نہیں۔ یہ بات ہم مندرجہ ذیل روایات

---

[۱] دیکھیے: محمدؐ پیغمبری کہ از نو باید شناخت مؤلفہ کونستان ورژیل گیورگیو مترجمہ ذبیح اللہ منصوری

ہیں ملاحظہ کرتے ہیں:

۱۔ بخاری مسلم اور دوسرے معتبر محدثین کے مطابق ام المومنین بی بی عائشہ اور ابوہریرہ نقل کرتے ہیں کہ:

ایک دن جب رسولِ اکرمؐ مسجد میں تشریف فرما تھے، آپ نے ایک مسلمان کے قرآن مجید پڑھنے کی آواز سنی اور فرمایا: خدا اس پر رحمت کرے۔ اس شخص نے مجھے وہ آیات یاد دلا دیں جنہیں میں بالکل بھول چکا تھا اور قرآن کے فلاں سورے سے ساقط کر دینا تھا۔[۱]

اس روایت میں ام المومنین سے یوں نقل کیا گیا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ خدا قرآن مجید میں کیا فرماتا ہے:

"سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ."[۲] یعنی ہم تمہیں قرآن پڑھا دیں گے اور تم اسے نہیں بھولو گے۔" مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت کے نزول سے پہلے رسولِ اکرمؐ آیاتِ قرآن کو نزول کے وقت اس خیال سے کہ کہیں بھول نہ جائیں انھیں یوں دہرایا کرتے تھے کہ ابھی آیات ختم نہیں ہوتی تھیں کہ آپ ان کی قرائت شروع کر دیتے تھے لیکن اس آیہ کریمہ کے نازل ہونے پر آپ کے دل سے بھول جانے کا خوف دور ہو گیا اور خدا کی مدد سے آپ کو تسلی ہو گئی۔[۳] چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری آیات میں آنحضرتؐ کو یہ حکم دیا جاتا ہے: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ.[۴]

یعنی (اے رسولؐ)، قرآن کو یاد کرنے میں جلدی نہ کرو۔ اس کا جمع کرنا اور پڑھا دینا تو ہمارے ذمے ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھا چکیں تو اس کے بعد تم بھی اسی طرح پڑھا کرو۔ پھر اس کا سمجھا دینا بھی ہمارا کام ہے۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن۔ باب ۳۳ جلد ۶ صفحہ ۱۹۳۔۱۹۴ مطبوعہ بولاق مصر۔ صحیح مسلم کتاب صلاۃ المسافرین۔ باب الامر بتعہد القرآن۔ جلد ۲ صفحہ ۱۹۰ مطبوعہ محمد علی صبیح داولادہٗ قاہرہ مصر۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۶۲۔

[۲] سورۂ اعلیٰ۔ آیت ۶ [۳] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ صفحہ ۴۷۵۔ تفسیر کشاف جلد ۴ صفحہ ۵۸۹۔۵۹۰۔ تفسیر المیزان جلد ۲۰ صفحہ ۳۹۰ [۴] سورۂ قیامت۔ آیات ۱۶ تا ۱۹

ایک اور مقام پر ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۔[1]

یعنی اے رسولؐ! اس سے پہلے کہ تم پر وحی پوری کر دی جائے، قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کرو۔

معتبر روایات میں بھی ہمیں ایسے مطالب ملتے ہیں جو زیرِ بحث احادیث کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد بن حنبل میں لکھا ہے کہ رسولِ اکرمؐ ہر سال ایک مرتبہ جبرئیلؑ کو قرآن مجید سناتے تھے لیکن آپ کے سالِ وفات میں یہ عمل دو مرتبہ انجام دیا گیا[2] یعنی آنحضرتؐ نے پورا قرآن شروع سے آخر تک پڑھا اور جبرئیلؑ سنتے رہے۔

ہم نے ایک اور مقام پر اس ضمن میں بحث کی ہے اور اس امر کو تاریخی نقطۂ نگاہ سے ثابت کیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے مسلمانوں کو قرآن مجید پڑھانے کے لیے ایک خاص روش اختیار کی ہوئی تھی۔ چنانچہ آپ ہر دس آیتیں جو نازل ہوتیں اور موضوع کے لحاظ سے یکساں ہوتیں سب مسلمانوں کو پڑھ کر سناتے تھے تاکہ وہ انھیں یاد کر لیں اور جو لکھنا جانتے ہوں وہ لکھ لیں۔ وہ لوگ ان آیتوں کو پتھر، ہڈی، لکڑی یا چمڑے پر لکھ لیتے تھے۔ یوں سب مسلمان قرآن مجید پڑھتے تھے، لکھتے تھے اور یاد کر لیتے تھے۔ پھر رسولِ اکرمؐ انہیں ان آیات کی علمی اور عملی تفسیر بتاتے تھے اور جب تک سبھی اس کو سمجھ نہیں لیتے تھے آپ ان آیات سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔[3]

انصاف سے کہیے کہ تعلیم و تربیت کے اس منظم طریقے کے ہوتے ہوئے اور رسولِ اکرمؐ کی طرف سے اس خاص اہتمام کے باوجود ــــ جو وہ مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے فرماتے تھے نیز اس بات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کہ اس زمانے کی تمام معلومات قرآن کے علم میں منحصر تھیں ــــ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ خود آنحضرتؐ اپنے دین کی اس بنیادی کتاب

---

[1] سورہ طٰہٰ۔ آیت ۱۱۴ [2] صحیح بخاری جلد ۳۔ کتاب فضائل القرآن۔ باب ہفتم صفحہ ۱۵۱-۱۵۳۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱، کتاب الصیام صفحہ ۶۵۲ [3] تفسیر قرطبی جلد ۱۔ صفحہ ۳۹۔ بحار الانوار جلد ۹۲۔ صفحہ ۱۰۶، البیان فی تفسیر القرآن از آیت اللہ خوئی مطبوعہ دار التوحید کویت۔

کو حفظ کرنے سے پہلو تہی کرتے تھے یا اس بارے میں ایسا تساہل برتتے تھے کہ قرآن مجید کی چند آیتیں بھول جاتے تھے اور انھیں ساقط کر دیتے تھے۔

۲۔ دوسری روایت بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہ سے لی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

ایک نماز میں (جس کے بارے میں راوی بھول گیا ہے کہ آیا وہ مغرب کی نماز تھی یا عشاء کی) رسولِ اکرمؐ نے ہمارے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں اور نماز کے مکمل ہونے سے پہلے ہی نماز کا سلام کہا۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور مسجد میں موجود ایک تختے کی جانب چلنے لگے جس پر آپ خطبہ دیتے وقت ٹیک لگایا کرتے تھے۔ وہاں پہنچ کر آپ کھڑے ہو گئے اور اپنے ہاتھ ایک دوسرے پر اس طرح مارنے لگے جیسے کوئی انسان غصے کی حالت میں مارتا ہے۔ آپ اپنا بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ پر مار رہے تھے (آپ توجہ فرمائیں کہ روایت گھڑنے والا اس کی جزئیات اس طرح نقل کر رہا ہے کہ آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہ جھوٹ ہے) تاہم جو لوگ جلدی میں تھے وہ فوراً مسجد سے باہر چلے گئے۔ ابو ہریرہ مزید کہتے ہیں: ابو بکر اور عمر بھی وہاں موجود تھے لیکن رسول اکرمؐ کا رعب سب پر چھا گیا اور کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ ہم نے خیال کیا شاید کوئی نئی وحی نازل ہوئی ہے جس کی بنا پر نماز کو مختصر کر کے دو رکعتی کر دیا گیا ہے۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ تب ذوالیدینؓ اٹھے[1] (وہ ایک صحابی تھے جن کے ہاتھ بڑے لمبے تھے اور اسی بنا پر اس نام سے پکارے جاتے تھے) اور کہنے لگے: "یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَنَسِیْتَ اَمْ قُصِرَتِ الصَّلَاۃُ" (یعنی یا رسول اللہؐ! آپ بھول گئے ہیں یا اصولاً نماز مختصر ہو کر دو رکعتی ہو گئی ہے)۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: نہیں بھولا ہوں اور نہ ہی نماز مختصر ہوئی ہے۔ پھر آپؐ نے دوسروں سے سوال کیا: کیا ذوالیدینؓ کا کہنا درست ہے اور میں نے نماز کم پڑھائی ہے۔

---

[1] انھیں صحیح بخاری کی پانچ روایات میں اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ذوالیدین اور دوسرے مقامات پر ذوالشمالین کہا گیا ہے۔ ان کا نام عبد عمرو بن نضلہؓ تھا اور ان کا تعلق بنو خزاعہ سے تھا۔ یہ بزرگوار جنگ بدر میں یعنی ابو ہریرہ کے اسلام قبول کرنے اور مدینہ آنے سے پانچ سال پہلے شہید ہو گئے تھے۔

صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں یا رسول اللہؐ! آپ نے نماز کم پڑھی ہے۔ تب رسولِ اکرمؐ اپنی جگہ واپس آئے اور جتنی نماز کم پڑھی تھی، اتنی ادا کی، پھر سلام اور تکبیر کہی اور سجدہ سہو بجالائے پھر آپ اس جگہ پر آگئے جہاں سے خطبہ دیا کرتے تھے۔

ابوہریرہ کا کہنا ہے کہ: رسولِ اکرمؐ صحابہ کی بات سن کر محراب میں واپس آئے اور جتنی نماز کم پڑھی تھی اتنی باجماعت بجالائے یعنی اگر تین رکعتی نماز تھی تو ایک رکعت اور اگر چار رکعتی نماز تھی تو دو رکعتیں بجالائے جنہیں پڑھنا بھول گئے تھے یعنی نماز کا بھولا ہوا حصہ پڑھا اور اس کے بعد دو سجدۂ سہو بھی ادا کیے[1]

ہم اس روایت کا تجزیہ کرنے کے لیے تاریخ کو موردِ تحقیق قرار دیتے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ ذوالیدینؓ ہجرت کے دوسرے سال میں جنگِ بدر میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے جبکہ خود ابوہریرہ ہجرت کے ساتویں سال میں یعنی ذوالیدین کی وفات کے تقریباً پانچ سال بعد یمن سے مدینہ آئے اور اسلام قبول کیا لیکن جب ذوالیدینؓ زندہ تھے اور مدینہ میں رہ رہے تھے اس وقت اصولاً ابوہریرہ نے مدینہ دیکھا تک نہیں تھا لیکن ابوہریرہ نے یہ داستان بطور روایت اس وقت بیان کی جب نہ ذوالیدینؓ تھے اور نہ ہی اکثر صحابہ اور نہ ہی کوئی یہ جرأت کرسکتا تھا کہ ان (ابوہریرہ) پر تنقید کرے یا اس داستان کے بارے میں شک کرے۔ شاید یہ داستان اس وقت گھڑی گئی جب وہ مروان بن الحکم کی جگہ مدینہ کے حاکم مقرر ہوئے۔ یہ معاویہ کا دورِ حکومت تھا اور رسولِ اکرمؐ پر بہتان باندھنے کے خریدار موجود تھے۔ چنانچہ اس طرح کی احادیث گھڑنے والوں کو مسلمانوں کے بیت المال سے خطیر رقوم دی جاتی تھیں۔

بعد میں مکتبِ خلفاء کے فقہاء نے اس روایت سے مختلف شرعی احکام کا استنباط کیا، مثلاً نماز کے دوران میں قبلہ کی طرف پشت کرنے میں کوئی حرج نہیں اور ایسی صورت میں نماز

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۳۴ - صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ باب ۸۸ جلد ۱ - صفحہ ۶۶ - کتاب السہو، باب ۳ - ۵ جلد ۱ صفحہ ۱۴۷ - ۱۴۸ - کتاب الادب، باب ما یجوز من ذکر الناس، جلد ۴ - صفحہ ۴۰ - صحیح مسلم، کتاب المساجد، حدیث ۹۷ - صفحہ ۴۰۲ - سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، صفحہ ۱۸۹ - سنن نسائی، کتاب السہو، باب ۲۲ -

دوبارہ پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں نیز یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ علاوہ ازیں صحیح بخاری اور مسند احمد بن حنبل میں ابوہریرہ سے روایت کی گئی ہے کہ:

نماز جماعت پڑھی جانے والی تھی۔ لوگوں نے صفیں درست کرلی تھیں اور سبھی رسولِ اکرمؐ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے تیار تھے۔ آنحضرتؐ محراب میں کھڑے تھے تاکہ نماز کی امامت کریں سبھی امام کی تکبیر سننے کے لیے آمادہ تھے۔ اچانک رسولِ اکرمؐ کو یاد آیا کہ وہ جنابت کی حالت میں ہیں۔ اس کے بعد ابوہریرہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ہم سے فرمایا: "تم لوگ اپنی اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑے رہو" پھر آپ گھر تشریف لے گئے، آپ نے غسل کیا اور اس حالت میں مسجد میں آئے کہ پانی کے قطرے آپ کے سر پر سے گر رہے تھے۔ آپ محراب میں پہنچے تاکبیر کہی اور نماز کی امامت فرمائی اور ہم لوگوں نے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھی۔[1]

اگر ایسے واقعات رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں وجود رکھتے ہوں یا انھیں سچ یا جھوٹ ایسے اشخاص نقل کریں جو بظاہر آپ کے ساتھی سمجھے جاتے ہوں تو آنحضرتؐ کا کیا اعتبار باقی رہ جائے گا؟ ان روایات کے مطابق آپ اتنے بھلکڑ اور لاپروا تھے کہ تین یا چار رکعتی کی جگہ دو رکعتیں پڑھائیں یا ایک روز جنب ہوتے ہوئے محراب میں کھڑے ہوگئے اور بھول گئے کہ حالتِ جنابت میں ہیں۔ ایک موقع پر قرآن مجید کی آیات بھول گئے اور جب ایک مسلمان کو وہ آیات پڑھتے سنا تو کہا: یہ آیتیں جو میرے ذہن سے نکل گئی تھیں، اس شخص نے یاد دلادیں۔ اس پر خدا کی رحمت ہو۔ آپ غور فرمائیں کہ یہ احادیث نقل کرنے کے بعد رسولِ اکرمؐ کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ پھر جو مسلمان ان احادیث کو درست سمجھتے ہیں ان کی نظر میں آنحضرتؐ کی کیا قدر و قیمت ہوگی۔

ہم اس بحث کو ابوہریرہ کی ایک اور روایت کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ یہ روایت اس قسم کی روایات کے بڑے راوی، ابوہریرہ کی حقیقی شخصیت کو نمایاں کرتی ہے جو

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الغسل باب ۱۷، جلد ۱ صفحہ ۴۲ اور ۸۳۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۳۹ اور ۵۱۸۔

بدقسمتی سے مکتب خلفاء کی معتبر کتب حدیث میں نقل کی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک دن ابوہریرہ نے مسلمانوں کے ایک گروہ کے سامنے کہا: "قال النبی ص .... افضل الصدقة ماترك غنی ..... " (یعنی بہترین صدقہ وہ مال ہے جو ایک دولتمند شخص اپنی اولاد کے لیے چھوڑجاتا ہے) وہ شخص جس نے بعد میں یہ روایت بھی نقل کی کہتا ہے: میں نے ان سے کہا: "کیا تم نے خود یہ روایت رسولِ اکرم ص سے سنی ہے؟" یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہ کے کچھ ہم عصر لوگ بھی انھیں پہچان گئے تھے یا کم از کم ان کی باتوں یا ان کی نقل کی ہوئی حدیثوں پہ شک کرنے لگے تھے۔ اسی بنا پر مذکورہ بالا سوال کی نوبت آئی۔ جب ابوہریرہ نے دیکھا کہ سننے والوں کو ان کی بات پر شک گزرا ہے اور انھیں اس حدیث کے درست ہونے کا یقین نہیں آرہا تو انھوں نے ایک بہت بڑی حقیقت کا اعتراف کیا اور کہا: لَا ! هٰذَا مِنْ كِيْسِ اَبِيْ هُرَيْرَةَ ." (نہیں۔ میں نے یہ روایت رسول اکرم ص سے نہیں سنی بلکہ درحقیقت یہ خود ابوہریرہ کی جیب سے نکلی ہے)[1]

صحیح بخاری کی یہ روایت مسند احمد بن حنبل میں دوسرے الفاظ میں نقل ہوئی ہے جو زیادہ دلچسپ ہے۔ مسند احمد بن حنبل میں یہ روایت ان الفاظ میں آئی ہے: قَالُوْا يَآاَبَاهُرَيْرَةَ سَمِعْتَ هٰذَا ؟ (یا یہ کہ: هٰذَا شَيْءٌ قَالَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمْ هٰذَا مِنْ كِيْسِكَ ؟" (یعنی لوگوں نے کہا: "اے ابوہریرہ! کیا تم نے یہ جملہ رسول اکرم ص سے سنا؟ یا یہ کہ کیا یہ بات آنحضرت ص نے فرمائی تھی یا تم نے اپنی جیب سے نکالی ہے)۔ ابوہریرہ نے کہا: یہ روایت میری جیب سے نکلی ہے؟[2]

کیا یہ جاننا ممکن ہے کہ ابوہریرہ نے ایسی کتنی جعلی حدیثیں اپنی جیب سے نکالیں؟ کیا اس چیز کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس قسم کی احادیث نے اسلام کا چہرہ کس حد تک مسخ کردیا؟ احتمال اس بات کا ہے کہ ابوہریرہ کی روایت کردہ پانچ ہزار سے زائد احادیث میں سے بیشتر خود اس کی اپنی گھڑی ہوئی ہیں یا اس کے ہم عصروں کے بقول خود اسکی جیب سے نکلی ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب النفقات، باب وجوب النفقة علی الاھل والعیال۔ جلد ۷، صفحہ ۶۳ مطبوعہ بولاق مصر [2] مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۵۲ اور ۲۹۲۔

ان روایات نے رسول اکرمؐ کے ارشادات کو نا قابلِ اعتبار بنانے اور آنحضرتؐ کی شخصیت کو گھٹانے کے لیے جو میدان ہموار کیا ہے اس نے صحیح اسلام کے ایک بہت بڑے حصّے کو پایۂ اعتبار سے گرا دیا لہٰذا اگر رسول اکرمؐ نے کسی کو سرزنش کی ہے اور اس پر لعنت کی ہے یا کسی کی تعریف و توصیف کی ہے تو اس کی کوئی صحیح بنیاد یا اہمیت نہیں ہے کیونکہ وہ انسان ہیں اور ہر انسان کی طرح خفا بھی ہوتے ہیں اور خوش بھی ہوتے ہیں۔ نیز اگر وہ دنیاوی مسائل کے بارے میں رہنمائی کرتے اور کچھ کہتے ہیں تو اس کی بھی کوئی بنیاد یا اعتبار نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ البتہ بعد میں اس قسم کی روایات کا دقیق مطالعہ کیا گیا اور کوشش کی گئی کہ انہیں دینی بنیاد فراہم کی جائے چنانچہ کہا گیا کہ: رسولِ اکرمؐ نے جو کچھ فرمایا اس کی بنیاد ان کی ذاتی رائے پر تھی۔ انھوں نے اجتہاد کیا اور اپنی رائے کا اظہار کیا اور پھر خلفاء سمیت جن دوسرے اشخاص نے ان معاملات میں آپ کی مخالفت کی، انھوں نے بھی اجتہاد کیا اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ایسی مخالفتیں دو مجتہدوں کے درمیان مخالفت سمجھی جاتی ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں لہٰذا اگر آنحضرتؐ نے کوئی بات کہی یا کسی چیز کے بارے میں کوئی حکم دیا تو یہ آپ کا اجتہاد تھا۔[1] پس اگر خلفاء نے آپ کے اجتہاد کے مقابلے میں کوئی بات کہی تو انھوں نے بھی اجتہاد کیا لہٰذا یہ ایک اجتہاد کے مقابلے پر دوسرا اجتہاد ہے۔

ہم نے جو یہ کہا ہے کہ یہ روایتیں ایک گروہ کے دینی عقائد کی بنیاد تشکیل دیتی ہیں تو یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ روایات اسلام میں تحریف کا ذریعہ بھی ہیں کیونکہ ان کے مطابق ذاتی رائے اور نظریے کا اظہار "اجتہاد" ہے جبکہ ذاتی رائے اور نظریے کا اظہار بجائے خود اسلام کے احکام کو تہ و بالا کرنے کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

یہ روایات جن کے ذریعے ارشاداتِ رسولؐ کو پایۂ اعتبار سے گرا دیا گیا، ایک ایسا تیر تھا جس کے دو ہدف اور دو نشانے تھے۔ بلاشبہ ایسے تیر بھی ہیں جن کے تین ہدف اور تین نشانے ہیں۔ ہم انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ان پر بحث کریں گے۔ ہمارا یہ کہنا کہ جو روایات ہم نے نقل کی ہیں وہ ایسے تیر تھے جن کے دو ہدف اور دو نشانے تھے۔ یہ تو اس لیے کہا گیا

---

[1] مرتضیٰ عسکری، مقدمہ مرآۃ العقول۔ جلد اول۔ باب اجتہاد پیغمبرؐ۔

کہ ایسی احادیث نے پہلے تو رسولِ اکرمؐ کی ذات اور شخصیت کو پایۂ اعتبار سے گرایا اور پھر جیسا کہ ہم جانتے ہیں جب عملی طور پر آنحضرتؐ کی قدر و منزلت اور اعتبار گر گیا تو چونکہ ان کا مقام متنِ اسلام میں ہے اور ان کا عمل اور ان کی شخصیت اسلام کا ایک حصہ ہے اس لیے مسلمانوں کے دین اور اعتقادات پر بھی ضرب لگی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام کی تحریف کے دوسرے عامل کی تشکیل ہوتی ہے کیونکہ قرآن مجید تو واضح اور قطعی الفاظ میں فرماتا ہے کہ: "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ."[1] یعنی "پیغمبرؐ اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کہتے وہ تو بس وہی کہتے ہیں جو وحی ہوتی ہے" لیکن اس کے برخلاف اس بات پر اصرار کیا گیا اور ظاہری طور پر ثابت بھی کر دیا گیا کہ آنحضرتؐ اپنی مرضی اور اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق باتیں کرتے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ارشاداتِ رسولؐ کی قدر و قیمت جاتی رہی اور ان کی حدیثیں دوسروں کی باتوں کے برابر سمجھی جانے لگیں۔ چنانچہ اگر آنحضرتؐ کی کوئی حدیث کسی طرح سے اسلامی ممالک کے کسی خطے میں لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی تو اسے اعتبار اور قدر و قیمت حاصل نہ ہوتی لہٰذا اصحاب یا خلفاء اس کی خلاف ورزی کر سکتے تھے اور اس کے مقابلے پر کھڑے ہو سکتے تھے۔

مثلاً رسولِ اکرمؐ تو "متعۂ حج" اور "متعۂ نساء" کے بارے میں قوانینِ الٰہی کی تبلیغ فرماتے ہیں لیکن خلیفہ عمر پوری جرأت کے ساتھ کہتے ہیں اور لوگ بھی اسے تسلیم کر لیتے ہیں کہ: "مُتْعَتَانِ كَانَتَا عَلَىٰ عَهْدِ رَسُولِ اللهِ وَأَنَا أَنْهَىٰ عَنْهُمَا وَأُعَاقِبُ عَلَيْهِمَا."[2]

چونکہ رسولِ اکرمؐ نے دنیاوی مسائل میں سے ایک مسئلے کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے اور خلیفہ نے ان کے خلاف کہا ہے اس لیے مکتبِ خلفاء کے نزدیک نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ خلیفہ کا قول مکمل طور پر معتبر بھی ہے لہٰذا مسلمانوں نے خلیفہ کے حکم کے مطابق عمل کیا اور آنحضرتؐ کے فرمان کو ترک کر دیا۔ یہ ہے مکتبِ خلفاء کا امتیاز!

امام علی بن ابی طالبؑ اور امام مہدیؑ تک ان کے فرزندوںؑ نے ارشاداتِ رسولؐ میں ایک لفظ اور ایک حرف بھی کم یا زیادہ نہیں کیا اور اپنی طرف سے ایک حرف بھی نہیں

---

[1] سورہ نجم۔ آیت ۳-۴   [2] اس کلام کی سند صفحہ ۲۴ پر بتائی جا چکی ہے۔

کہا۔ امام محمد باقرؑ یا امام جعفر صادقؑ یہ نہیں فرماتے تھے کہ "اَنَا اَقُوْلُ" (یعنی میں کہتا ہوں) یا "اَنَا اُحَرِّمُ" (یعنی میں حرام کرتا ہوں)۔ زُرارہ، محمد بن مسلم اور ہشام جیسے ان کے شاگردوں نے بھی کبھی اپنی ذاتی رائے یا نظریے کا اظہار نہیں کیا بلکہ یہی کہتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ نے یوں فرمایا ہے یا خدا نے یوں فرمایا ہے[1] یہ مکتبِ اہلبیتؑ کا امتیاز ہے۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ

●●●●●

---

[1] اس مکتب کے اصولِ تفکر کے نمونے کے طور پر ہم آپ کے لیے ایک عالم، راوی اور بزرگ صحابی عثمان بن سعید عمریؒ کا قول نقل کرتے ہیں جو حضرت ولی عصرؑ ارواحنا فداہ کے نائب خاص تھے۔ جب انھوں نے ایک شیعہ کے سوال کے جواب میں ایک عمل کی حرمت کا فیصلہ دیا تو ان الفاظ کا اضافہ کیا: "لَا اَقُوْلُ ھٰذَا مِنْ عِنْدِیْ، فَلَیْسَ لِیْ اَنْ اُحَلِّلَ وَلَا اُحَرِّمَ۔"
یعنی میں یہ فیصلہ اپنی طرف سے نہیں دے رہا۔ میرے لیے کسی صورت میں روا نہیں کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دوں بلکہ میں فقط امام علیہ السلام کا قول نقل کر رہا ہوں۔ (اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۳۳۰۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۸ صفحہ ۱۰۰)۔

آٹھواں درس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَۃِ
رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ وَّاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ
وَّاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۔ (سورۂ قلم۔آیات ۱ تا ۵)
صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

گزشتہ بحث کی یاددہانی

پیشتر ہم نے اس مسئلے پر بحث کی ہے کہ کونسے ذرائع کو کام میں لاتے ہوئے رسولِ اکرمؐ کے بعد اسلامی العادؔ احکام اور قوانین میں تبدیلیاں لائی گئیں۔ جیسا کہ ہم نے تفصیل سے ملاحظہ کیا ہے، پہلا عامل یہ تھا کہ رسولِ اکرمؐ کے ارشادات اور احادیث کو لکھنے‘ نقل کرنے اور نشر ہونے سے روک دیا جائے حالانکہ آپ قرآن کے معلّم، شارح اور مفسرّ اور تمام اسلامی احکام اور قوانین کے مبلغ تھے اور آپ نے اپنا یہ قطعی فریضہ انجام بھی دیدیا تھا۔ احادیث کا نقل کرنا سالہا سال تک ممنوع رہا اور پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی تقریباً سو سال تک‘ ان کے لکھے جانے پر پابندی عائد رہی۔ جس کسی نے احادیث لکھی تھیں وہ اس سے لیکر نذرِ آتش کر دی گئیں۔ رسولِ اکرمؐ کے کئی جلیل القدر صحابیوں مثلاً ابوذرؓ اور ابن مسعودؓ کو جو مدینہ سے باہر اور خلافت کی انتظامیہ کی نظروں سے دور رہ کر احادیث نقل کرتے تھے مدینہ بلا لیا اور ان پر کڑی نظر رکھی گئی۔

اسلامی احکام اور جہاں بینی میں تحریف اور تغیرّ کا عامل یہی تھا یعنی وہ طاقت جو اس امر کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ رسولِ اکرمؐ کی احادیث نشر ہوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں

پہنچیں۔ ہم نے نشرِ اسلام کو روکنے کے اس عامل کو تحریف اسلام کے عوامل میں شمار کیا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جو لوگ نئے نئے مسلمان ہوتے تھے، وہ اسلامی تعلیمات کے متمنی تھے اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ ان کے پیغمبرؐ نے مختلف حالات کے بارے میں کیا فرمایا ہے اور کیا عمل کیا ہے۔ وہ قرآن مجید کی تفسیر کے طالب تھے۔ وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے ان کے دینی فرائض کیا ہیں لہٰذا اگر حکومتِ وقت نے رسولِ اکرمؐ کی احادیث نقل کرنے اور لکھنے پر پابندی عائد کی تھی تو اس صورت میں لوگوں کا کچھ دوسرے سرچشموں کی جانب رجوع کرنا لازمی تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نادانستہ طور پر غیر صالح لوگوں کی جانب اپنے ہاتھ بڑھاتے۔ اربابِ اقتدار نے اس لازمی اور فطری تقاضے کا پہلے ہی سے احساس کر لیا تھا چنانچہ انھوں نے کعب الاحبار[1]، تمیم داری اور وہب بن منبّہ کو قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنے اور مبدأ و معاد سے متعلق مسئلوں کا جواب دینے پر مامور کر دیا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جن سے عوام تفسیر قرآن اور مبدأ و معاد کے بارے میں اسلامی معارف سیکھتے تھے۔ کعب مسجد میں بیٹھتے اور لوگ ان سے تفسیر قرآن کے بارے میں سوال پوچھتے تھے۔ وہ خلیفہ عثمان کے حضور میں بھی باریاب ہوتے تھے اور اسلام کے عملی احکام سے تعلق رکھنے والے مسائل کی توضیح کیا کرتے تھے۔

ان حقائق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بخوبی پتا چل جاتا ہے کہ کس طرح تحریف شدہ یہودیت اور مسیحیت نے جن کے گوشہ و کنار میں ایک طویل مدت سے خرافات کے انبار لگے ہوئے تھے، اسلام کے متن پر اپنا اثر ڈالا اور خدا کے دین کے اندر گھس آئیں لہٰذا حدیث کو نشر کرنے کی ممانعت اسلام کے مختلف پہلوؤں میں تحریف کا ایک بڑا عامل ہے۔ ہم انشاء اللہ آئندہ صفحات میں اس مسئلے کے بارے میں مزید بحث کریں گے۔

احادیث کی خفیہ طور پر اشاعت

ہم نے پیشتر بھی اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ انسان ہمیشہ حکومتوں کی سخت گیری

---

[1] کعب الاحبار ایک نام نہیں بلکہ ایک لقب ہے جو اس شخص کے مرتبے اور منصب کی نشاندہی کرتا ہے۔ "حبر" کے معنی ہیں عالم اور کعب الاحبار کے معنی ہیں یہودی عالموں کا سردار۔

اور جابر حکومتوں کی جانب سے لگائی گئی پابندیوں کے مقابلے میں کوئی نہ کوئی تدبیر سوچ لیتا ہے اور خفیہ طور پر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زیرِ بحث مسئلے، یعنی احادیث نشر کرنے کی ممانعت کے سلسلے میں بھی حکومتِ وقت یعنی خلافت کی انتظامیہ اور لوگوں کے درمیان ایسے ہی خفیہ حتیٰ کہ بعض اوقات کھلّم کھلا معرکے ہوئے لہٰذا حکومت کے کارندوں کی نظر سے بچکر کسی نہ کسی حد تک رسولِ اکرمؐ کی احادیث کی خفیہ طور پر اشاعت ہوئی۔ جیساکہ ہم نے دیکھا بعض حضرات نے اس عالم میں احادیث نقل کیں کہ وہ سولی پر لٹکے ہوئے تھے یا جلاّد کی تلوار اُن کے سروں پر لٹک رہی تھی لہٰذا اربابِ اقتدار کے نہ چاہتے ہوئے بھی رسولِ اکرمؐ کی احادیث نشر ہوئیں اور یہ ایک ایسا حادثہ تھا جو خلفاء کی حکومت کے اصلی کارندوں کے دلوں میں اضطراب اور دہشت پیدا کرسکتا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب خلفاء کی حکومت کی اصل سیاست پر عمل کرنے کے لیے ایک خاص پروگرام وضع کرنا ضروری ہوگیا۔

نئی سیاست

اس مرحلے پر اربابِ اقتدار نے سوچا کہ جو احادیث نشر ہوچکی ہیں انہیں پایۂ اعتبار سے گرانے کے لیے کوئی بنیادی تدبیر کرنا ضروری ہے چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تر کوششیں اس نقطے پر مرکوز کردیں کہ اصولاً آنحضرتؐ کی احادیث کا اعتبار اور تقدس ختم کردیا جائے۔ ہم انکے اس منصوبے اور عمل کو اسلام میں تحریف کرنے کا دوسرا بڑا عامل قرار دیتے ہیں۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں بھی اس کے کچھ پہلوؤں کے بارے میں بحث و تحقیق کی ہے۔

قبل ازیں ہم نے یہ دیکھا ہے کہ اسلام کے حقیقی جاں نثاروں اور بزرگوں کی جو تعریف کی گئی تھی اور اس کے کھلے اور چھپے دشمنوں کے لیے جو لعنت اور مذمت رسولِ اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے صادر ہوئی تھی اسے کچھ جھوٹی احادیث نقل کرکے پایۂ اعتبار سے گرادیا گیا۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے: "میں بھی انسان ہوں اور دوسرے انسانوں کی طرح مجھے بھی غصّہ آتا ہے اور خوشی ہوتی ہے اور میں ان احساسات کے تحت باتیں کرتا ہوں"۔ ہم نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ ایک موقع پر آنحضرتؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "تم اپنے دنیاوی معاملات کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہو"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے لیے یہ ضروری نہیں

ہے کہ تم ان معاملات میں میری باتوں کو کوئی اہمیت دو یا میری پیروی کرو۔ ظاہر ہے کہ ان روایات نے آنحضرتؐ کے بہت سے ارشادات کو غیر معتبر بنا دیا اور ان کی اہمیت زائل کر دی۔

تاہم ان سب باتوں سے بڑی اور اہم بات یہ ہوئی کہ مکتب خلفاء کے معتبر ترین راویوں کے ذریعے سے بہت سی احادیث گھڑی گئیں اور یہ کوشش کی گئی کہ اس طرح رسولِ اکرمؐ کا مقام اور مرتبہ ایک عام انسان سے بھی گھٹا دیا جائے۔ میں یہ بات اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں[1] لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ اس عمل کے اصلی عامل، سبب اور محرک سے بحث کروں۔ ان جعلی احادیث کے ذریعے سے یہ کوشش کی گئی کہ رسول اکرمؐ کو ایسے روپ میں پیش کیا جائے کہ وہ ایک عاقل اور با اصول انسان اور ایک عام مسلمان کے درجے سے بھی گر جائیں۔ کیا انھوں نے واقعی ایسا ہی کیا؟ کیا وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکے؟ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے۔ یہی انتہائی رنج اور سخت مصیبت کا مقام ہے۔ خاندان رسالت کے افراد کے لیے شہادت کوئی دکھ کی بات نہیں بلکہ یہ تو ان کا افتخار ہے۔ بے شک اس میں تکلیف تو ہے لیکن وہ جسم کی تکلیف ہے یعنی تھوڑی سی تکلیف کہ جسے وہ خدا کی راہ میں اپنی جان دے کر خریدتے ہیں کیونکہ ان کے لیے حقیقی تکلیف اسلام کی تخریب اور اس کے پیغمبرؐ کی حقیقی شخصیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی تکلیف ہے۔ احادیث کے اس مجموعے میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کی شخصیت کی وقعت کو کم کر دیا جائے یعنی حقیقی اسلام کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ رسولِ اکرمؐ متنِ اسلام میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ کیا یہ بھی ایک حقیقت نہیں ہے کہ ان کے ارشادات قرآن مجید کی تشریح کرتے ہیں اور اسلام کے عقائد اور احکام کا تعین کرتے ہیں لہٰذا ان کے مقام، شخصیت، تقدس اور ارشادات کو بے حیثیت بنانے کا مطلب ہے اسلام کے تمام ستونوں کو گرا دینا یعنی خدا کے دین کی بنیاد ڈھا دینا اور بالآخر اس کے معنی ہیں انسان کی نیک بختی کے نظام کو زیر و زبر کر دینا۔

اگرچہ میں اس تاریخی حادثے کو پہلے بیان کر چکا ہوں[2] لیکن ضروری سمجھتا ہوں کہ اسے ایک مرتبہ پھر دہراؤں تاکہ ہم اس قسم کے حوادث اور جعلی احادیث کی تیاری کی وجہ معلوم کر سکیں،

---

[1] سید مرتضیٰ عسکری کی کتاب "نقش عائشہ در تاریخ اسلام" صفحہ ۲۸۶ - ۲۸۸ دیکھیے۔

اور ہمیں پتا چل جائے کہ ان کے وجود میں آنے کا اصلی محرک کیا ہے ؟

معاویہ کا غلط مقصد

اس تاریخی حادثے کا ایک ماخذ علامہ ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ ہے۔ اس سے زیادہ قدیم علی بن حسین مسعودی کی "مروج الذہب" ہے جو تاریخ اسلام کی بہت معتبر کتاب ہے۔ ان دونوں سے زیادہ قدیم اور اہم زبیر بن بکار کی کتاب "الموفقیات" ہے۔ چونکہ زبیر خاندانِ رسالت سے شدید تعصب رکھتا تھا لہٰذا اس حادثہ کو نقل کرتے ہیں زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ یہ کتاب تاریخ اسلام کے قدیم ترین منابع میں سے ہے اور گمان غالب ہے کہ یہ آج سے تقریباً گیارہ سو سال پہلے لکھی گئی۔

زبیر بن بکار، مغیرہ بن شعبہ کے بیٹے مطرف سے نقل کرتا ہے: میں اپنے والد مغیرہ کے ساتھ شام کے سفر پر گیا اور وہاں ہم معاویہ سے ملے (مغیرہ ان دنوں معاویہ کی طرف سے کوفہ کا حاکم تھا اور اس بات کا احتمال ہے کہ وہ زمانۂ جاہلیت سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔ میرے والد ہر رات معاویہ کی شبانہ محفل میں جاتے اور رات گئے گھر واپس آتے تھے۔ اگرچہ وہ خود بھی عرب کے ذہین اور فہیم آدمیوں میں شمار ہوتے تھے لیکن جب بھی گھر آتے تو معاویہ کی ذہانت اور فہم وفراست کا ذکر بڑی حیرت سے کرتے تھے۔ ایک رات جب وہ معاویہ کے پاس سے گھر لوٹے تو انھوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ سخت پریشان ہیں۔ میں کچھ دیر چپکا ہو رہا کیونکہ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے میرے والد کی پریشانی کی وجہ کوئی ایسا فعل ہو جو ہم سے سرزد ہوا ہو یا شام میں ہماری آمد کے مقصد میں کوئی رخنہ پڑ گیا ہو یا میرے والد کے عہدے میں کچھ کمی ہو گئی ہو لیکن میں زیادہ دیر تک صبر نہ کر سکا اور آخر کار اپنے والد کو مخاطب کر کے کہا: آپ آج رات اس قدر مضطرب اور پریشان کیوں ہیں؟ میرے والد نے جواب دیا: بیٹے! میں اس وقت ایک خبیث ترین اور پلید ترین شخص کے پاس سے آرہا ہوں۔

میں نے پوچھا: کیوں کیا بات ہے ؟

وہ جو ہر رات معاویہ کی شبانہ محفلوں میں شریک ہوا کرتے اور گھر آکر معاویہ کی

عقلمندی اور فہم و فراست کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ آج رات وہ کہہ رہے تھے: میں خبیث ترین اور پلید ترین شخص کے پاس سے آرہا ہوں لہٰذا میں نے پوچھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟

میرے والد نے کہا: جب معاویہ کی مجلس میں کوئی اور نہیں تھا اور ہم دونوں بڑی خاص اور دوستانہ گفتگو کر رہے تھے، میں نے ان سے کہا: اے امیرالمومنین! آپ کی آرزوئیں پوری ہو گئی ہیں۔ اب اس پختہ عمر میں آپ عدل و انصاف سے کام لیں اور دوسروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ اگر آپ اپنے قرابتداروں ـــــ بنی ہاشم ـــــ پر مہربانی کی نگاہ ڈالیں اور ان کے ساتھ صلۂ رحم کریں تو اس میں کیا حرج ہے؟ خدا کی قسم! اب ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں رہی جس سے آپ کے دل میں خوف یا وہم پیدا ہو۔ وہ آپ کے چچا زاد ہیں[1]۔ ان کے ساتھ نیکی اور صلۂ رحم کریں تاکہ آنے والے وقتوں میں آپ کا نام نیکی سے لیا جائے۔

معاویہ نے جواب دیا: وائے ہو تم پر، تمہاری یہ آرزو پوری ہونے والی نہیں۔ ابوبکر کو حکومت ملی اور انھوں نے عدل کیا اور تمام تکلیفیں برداشت کیں لیکن خدا کی قسم جب وہ مر گئے تو ان کے ساتھ ہی ان کا نام بھی مر گیا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی ابوبکر کا نام لے لیتا ہو۔ پھر حکومت عمر کو ملی۔ انھوں نے کوششیں کیں اور دس سال تک تکلیفیں جھیلیں لیکن انھیں مرے ہوئے بمشکل چند دن گزرے تھے کہ ان کی کوئی یاد باقی نہ رہی بجز اس کے کہ کبھی کبھار کوئی کہنے والا کہہ دے: عمر!

پھر خلافت ہمارے بھائی عثمان کو ملی کہ نسب کے لحاظ سے کوئی شخص ان جیسا نہ تھا۔ انھوں نے جو کیا، سو کیا۔ پھر ان کے ساتھ جو سلوک ہوا سو ہوا لیکن جب وہ قتل ہو گئے تو خدا کی قسم! ان کا نام بھی مر گیا اور ان کے طور طریقے بھلا دیے گئے لیکن ابن ابی کبشہ (اس سے

---

[1] بنی ہاشم، ہاشم بن عبد مناف اور بنی امیہ، عبد شمس بن عبد مناف کی اولاد ہیں۔ اس لحاظ سے عبد مناف ان کے مشترک دادا ہیں اور یہ دونوں خاندان ایک دوسرے کے چچا زاد ہیں۔ نسب قریش، صفحہ ۱۴

رسول اکرمؐ مراد ہیں اور یہ وہ لقب ہے جو کفار قریش نے طعنے کے طور پر آنحضرتؐ کو دیا تھا)[1] کا نام ہر روز پانچ مرتبہ ساری دنیائے اسلام میں بلند آواز سے لیا جاتا ہے اور بڑی عزت کے ساتھ کہا جاتا ہے: " اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔" (میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں)۔ اے بے مادر! اب تم خود سوچو کہ ان حالات میں کیا عمل باقی رہے گا اور کونسا نیک نام پائیدار ہوگا۔ نہیں! خدا کی قسم! جب تک میں اس نام کو دفن نہ کردوں اور اس ذکر اور یاد کو خاک میں نہ ملادوں آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔[2]

اس مقصد کے حصول کے لیے معاویہ کی کوشش

معاویہ اپنی اس قسم پر قائم رہا اور اس نے آنحضرتؐ کا نام مٹانے کی انتہائی کوشش کی لہٰذا ـــــ ہمارے خیال کے مطابق ـــــ یہ احادیث معاویہ ہی کے عہد میں گھڑی گئیں۔ انھوں نے حدیث سازی کے مراکز قائم کیے اور انھیں پروان چڑھایا۔ اس منحوس حکمتِ عملی کو آگے بڑھانے کے لیے ابوہریرہ، عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، مالک بن انس اور سمرۃ بن جندب جیسے لوگ اس کے کارندے تھے۔ جن احادیث کے ذریعے رسول اکرمؐ کی شخصیت ان کا تقدس اور ان کی اہمیت اتنی کم ہوجاتی ہے کہ وہ ایک عام انسان کے درجے پر بلکہ اس سے بھی نیچے آجاتے ہیں اور مقابلتاً ابوبکر، عمر اور عثمان سے بلکہ معاویہ اور یزید سے بھی فروتر نظر آتے ہیں، ان میں سے کچھ حصہ انھیں لوگوں کا گھڑا ہوا ہے۔ قبل ازیں ہم نے جو یہ کہا تھا کہ ایک سہ شاخہ تیر بھی ہے جس کے تین ہدف ہیں، وہ یہی تیر ہے۔ اس منصوبے پر عمل کرکے انھوں نے تین کام کیے۔ اولاً یہ کہ اسلام کے احکام میں تحریف کی۔ ثانیاً رسول اکرمؐ

---

[1] جنگ احد میں مسلمانوں کی شکست کے بعد ابوسفیان نے رسولِ اکرمؐ کا مذاق اڑانے کے لیے آنحضرتؐ کو ابن ابی کبشہ کا نام دیا۔ دیکھیے: بلاذری، انساب الاشراف جلد ۱ صفحہ ۹۱ اور ۳۲۷، مقریزی امتاع الاسماع، صفحہ ۷۷ اور ۱۵۸۔

[2] شرح نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۴۶۳ پرانا ایڈیشن۔ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۴۵۴۔ مطبوعہ دارالاندلس بیروت۔ الاخبار الموفقیات صفحہ ۵۷۶ مطبوعہ عراق۔

کی شخصیت اور حیثیت پر ضرب لگائی اور تا لشا آنحضرت ص کے بعد آنے والے حاکموں کو آپ سے اونچا لے گئے اور انھیں آپ سے زیادہ بڑی شخصیت بخشی۔ اب آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ واقعی یہ ایک سہ شاخہ تیر ہے۔

●●●●●

وہ احادیث اور روایات جن سے یہ منحوس اور اسلام کو تباہ کرنے والا کام لیا گیا ہے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دسیوں دوسری کتابوں میں موجود ہیں لیکن ہم نے صرف صحیح بخاری سے استناد کیا ہے کیونکہ مکتبِ خلفاء کے عقیدے کے مطابق قرآن مجید کے بعد یہ سب سے زیادہ صحیح مذہبی کتاب ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں معتبر ترین کتابوں کی ترتیب یوں ہے: قرآن مجید، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد وغیرہ وغیرہ۔ حتیٰ کہ اس مکتب کے پیرو صحیح بخاری کے ایک لفظ تک میں شک روا نہیں رکھتے۔

اسی صحیح بخاری میں ام المومنین بی بی عائشہ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ وہ کہتی ہیں: رسولِ اکرم ص میرے گھر میں تشریف لائے۔ اس وقت دو کنیزیں یا دو گانے والی لڑکیاں زمانہ جاہلیت کے قصوں اور اس دور کی لڑائیوں کے اشعار بلند آواز سے گا رہی تھیں۔ آنحضرت ص میرے کمرے میں داخل ہوئے اور کسی ردِ عمل کا اظہار کیے بغیر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ اس دوران میں ابوبکر آگئے اور گانے والیوں کو دیکھتے ہی مجھ سے بڑی سختی سے کہا: رسولِ اکرم ص کی موجودگی میں یہ شیطانی ساز و آواز؟

اسی کتاب کی ایک اور روایت کے مطابق ابوبکر نے کہا: اے خدا کی بندیو! کیا تم شیطانی ساز و آواز کے ساتھ گانے بجانے لگی ہو؟

اے خدا کی بندیو! کیا تم شیطانی ساز و آواز کے ساتھ گانے بجانے لگی ہو؟

اے خدا کی بندیو! کیا تم شیطانی ساز و آواز کے ساتھ گانے بجانے لگی ہو؟

اس پر رسولِ اکرم ص نے ابوبکر کو مخاطب کر کے فرمایا: انھیں چھوڑ دو اور ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔ ہر قوم اور ہر گروہ کی ایک عید ہوتی ہے۔ آج کا دن ہماری عید ہے[۲]

---

[۱] صحیح بخاری کتاب العیدین بَابُ الحراب وَالدرق یَوْمَ الْعِیْدِ۔

[۲] صحیح بخاری کتاب العیدین بَابُ سُنَّۃِ الْعِیْدَیْنِ لِاَھْلِ الْاِسْلَامِ۔ (بقیہ اگلے صفحے پر)

اسی روایت میں ام المومنین سے یوں نقل کیا گیا ہے: عید کا دن تھا۔ حبشہ کے کچھ لوگ خوشی منانے اور ناچنے میں مشغول تھے۔ وہ مسجد میں تھے اور اپنے مخصوص انداز میں تلوار کا ناچ دکھا رہے تھے۔ میں نے عرض کی یا یہ کہ آنحضرتؐ نے خود ہی پوچھا: کیا تم ان لوگوں کو ناچتے اور خوشی مناتے دیکھنا چاہتی ہو؟

میں نے کہا: جی ہاں! تب رسولِ اکرمؐ نے مجھے اپنے کندھے کا سہارا دیا اور اس حالت میں کہ میرا چہرہ ان کے چہرے پر تھا۔ میں حبشیوں کو مسجد میں تلوار کا رقص کرتے دیکھنے لگی۔ وہ ناچ رہے تھے اور میں دیکھ رہی تھی۔ تب رسولِ اکرمؐ بار بار فرما رہے تھے: اے حبشی زادو! ناچتے رہو۔ یہ ناچ کافی دیر تک جاری رہا اور میں بدستور آنحضرتؐ کے کندھے کے سہارے کھڑی رہی حتیٰ کہ میں تھک گئی۔ آنحضرت کو میری تھکن کا احساس ہوا تو آپ نے فرمایا: کیا اتنا دیکھنا کافی ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں! اس پر آپ نے فرمایا: اچھا تو جاؤ۔[1]

ذرا غور فرمائیں کہ یہ قصہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں درج ہے جو مکتبِ خلفاء میں حدیثؑ کی بلند ترین اور معتبر ترین کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

ایک اور روایت کے مطابق ام المومنین بی بی عائشہ کہتی ہیں: عید کا دن تھا اور حبشیوں کا ایک گروہ مسجدِ نبوی میں آیا ہوا تھا۔ وہ لوگ بڑے زور و شور سے ناچ رہے تھے۔ رسول اکرمؐ نے مجھے حبشیوں کا ناچ دیکھنے کو کہا۔ میں آنحضرتؐ کے پاس گئی اور آپ کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ وہاں سے میں ان لوگوں کے خاص کرتب اور ناچ دیکھنے لگی اور یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا حتیٰ کہ میں تھک گئی اور ناچ اور کرتب دیکھنا بند کر دیا۔[2]

صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ العیدین۔ باب الرخصۃ فی اللعب الذی لامعصیۃ فیہ۔ حدیث ۱۹۔ تحقیق محمد فواد عبدالباقی۔

[1] صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۲۲ مطبوعہ محمد علی صبیح و اولادہ، قاہرہ کتاب صلوٰۃ العیدین، باب الرخصۃ فی اللعب الذی لامعصیۃ فیہ۔

[2] صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۲۲-۲۳۔ حدیث ۲۰۔ تحقیق محمد فواد۔ عبدالباقی

ایک اور مقام پر کہتی ہیں: کچھ بازیگر آئے ہوئے تھے۔ میں نے رسولِ اکرمؐ سے عرض کیا کہ مجھے ان لوگوں کا کھیل دیکھنے کا شوق ہے۔ آنحضرتؐ مسجد کی طرف منہ کرکے دروازے میں کھڑے ہوگئے۔ تب میں بھی ان کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ میں نے اپنا سر ان کے کندھے پر رکھ دیا اور ران کے کندھے اور کان کے بیچ سے کھیل دیکھنے لگی جبکہ وہ لوگ مسجد میں تماشا دکھا رہے تھے۔[1]

ایک اور روایت میں کہتی ہیں: میں نے اپنا سر رسولِ اکرمؐ کے کندھے پر رکھ دیا۔ آنحضرتؐ نے اپنے آپ کو اور اپنے کندھے کو جھکا لیا اور میں ان کے کندھے کے اوپر سے کھیل دیکھنے لگی حتیٰ کہ میں سیر ہوگئی اور تھک کر کھیل دیکھنا بند کر دیا۔[2]

مندرجہ بالا روایات میں دراصل یہ کہا گیا ہے کہ: آپ نوجوان عورتوں کے جذبات کو پہچانیں اور اس بات کو سمجھیں کہ وہ اپنی عمر کے فطری تقاضوں کی بنا پر کھیل کود اور ناچ دیکھنے کی خواہشمند ہوتی ہیں۔ اگر آپ کی کوئی نوجوان عورت گانا بجانا سننا چاہتی ہے یا اجنبی مردوں کے کرتب یا ناچ دیکھنا چاہتی ہے تو جس طرح رسولِ اکرمؐ میرے ساتھ برتاؤ کرتے تھے اور ایسے کاموں میں کوئی روک ٹوک نہیں کرتے تھے، اسی طرح آپ بھی اپنی عورت کو ان چیزوں سے منع نہ کریں۔[3]

ایک اور روایت میں کہتی ہیں: میں آنحضرتؐ کے پیچھے کھڑی ہو کر مسجد کی جانب دیکھ رہی تھی جبکہ حبشی ناچنے میں مشغول تھے۔ رسولِ اکرمؐ انہیں فرما رہے تھے: اے حبشی زادو! خوب ناچو گاؤ اور ساز بجاؤ تاکہ یہودیوں اور عیسائیوں کو پتا چل جائے کہ ہمارے دین میں ایسے کام جائز ہیں اور ان کی پوری آزادی ہے۔ حبشی جو آنحضرتؐ کی روش دیکھ کر خوش ہوگئے تھے کہنے لگے: اے ابوالقاسمؐ! آپ نے خوب کہا![4]

اسی دوران میں عمر بن خطاب مسجد کے دروازے سے وارد ہوئے۔ حبشی انکی ہیبت

---

[1] و [2] صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۲۳ طبع قدیم، نیز طبع جدید میں اسی باب کی حدیث ۲۱ و ۲۳۔

[3] یہ نتیجہ ان نکات سے اخذ کیا گیا ہے جو حدیث میں موجود ہیں اور خود ام المومنین کا کلام ہیں۔

[4] منتخب کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۱۷۳

سے خوف زدہ ہو گئے اور اِدھر اُدھر بھاگ گئے[1]۔ جہاں تک رسولِ اکرمؐ کا تعلق ہے نہ صرف یہ کہ حبشی ان سے نہیں ڈرے بلکہ انھوں نے دیکھا کہ وہ ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اور انھیں ناچنے گانے کی ترغیب دے رہے ہیں لیکن عمر کے مقابلے میں وہ لحظہ بھر نہ ٹھہر سکے۔

ایک اور روایت[2] میں کہا گیا ہے کہ: رسولِ اکرمؐ اپنے کمرے میں تشریف فرما تھے کہ آپ نے باہر سے لوگوں کا شور و غل سُنا تو اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک حبشی عورت ناچ رہی ہے اور لوگ اس کے اردگرد کھڑے اس کا ناچ دیکھ رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے عائشہ! آؤ تم بھی دیکھو۔ میں آنحضرتؐ کے پاس گئی اور اپنا چہرہ آپ کے کندھے پر ٹکا دیا اور اس کے اوپر سے وہ منظر دیکھنے لگی۔ اسی طرح کافی وقت گزر گیا۔ تب رسولِ اکرمؐ نے پوچھا: اے عائشہ! کیا ابھی تمہارا جی نہیں بھرا۔ میں نے عرض کیا نہیں۔ یہی سوال آپ نے کئی مرتبہ پوچھا اور میں نے ہر بار نفی میں جواب دیا حالانکہ آنحضرتؐ تھک گئے تھے اور اپنے پاؤں بدل بدل کر زمین پر ٹکا رہے تھے۔ میں نے یہ اس لیے کہا کہ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ان کے دل میں میری کیا قدر و منزلت ہے۔ اچانک عمر بن خطاب مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے آنے پر لوگ منتشر ہو گئے اور بچے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: میں نے دیکھا ہے کہ شیاطین جن و انس عمر کو دیکھ کر بھاگ نکلتے ہیں[3]۔

جی ہاں! یہ شیطان رسولِ اکرمؐ کی موجودگی سے نہ تو ہراساں ہوتے ہیں نہ راہِ فرار اختیار کرتے ہیں کیونکہ آپ بذاتِ خود بڑے شوق سے رقص و سرود میں دلچسپی لیتے ہیں لیکن عمر بن خطاب ایسی روحانی ہیبت کے مالک ہیں کہ انھیں دیکھ کر تمام شیطان ڈر کے مارے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ اصولاً وہ خود رقص و سرود سے پرہیز کرتے ہیں۔ آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ روایات کیا کام کرتی ہیں اور ان کی تخریب کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

---

[1] منتخب کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۳۹۲ صحیح ترمذی جلد ۱۳ صفحہ ۱۴۸ ، باب مناقب عمر۔

[2] بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب روایات ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کی گئی ہیں۔

[3] منتخب کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۳۹۳۔

جیساکہ ہم نے دیکھا اس قسم کی تمام روایات ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کی گئی ہیں لیکن ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ یہ سب باتیں انھوں نے خود کہی ہیں یا ان کے قابل اعتبار ہونے کی بنا پر دوسروں نے ان کے نام سے گھڑلی ہیں۔ ایسی ہی کچھ روایات ابوہریرہ سے بھی نقل ہوئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: جس وقت حبشی، رسولِ اکرمؐ کے سامنے اپنی تلواروں کے کرتب دکھارہے تھے عمر بن خطاب مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وہ جھکے اور انھوں نے مسجد کے فرش پر پڑے ہوئے سنگریزوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ وہ ان حبشیوں کو ماریں اور اس کام سے باز رکھیں۔ تب رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اے عمر! انھیں کچھ نہ کہو اور تماشا کرنے دو[1]

اگر ایسی تمام روایات کا مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان میں کس تدبیر پر عمل کیا گیا ہے۔ ان میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کے مقام اور مرتبے کو معمولی اشخاص سے اور بالخصوص آنحضرتؐ کے بعد آنے والے حکام سے گرادیا جائے مثلاً اگر آپ یہ کہیں کہ رسولِ اکرمؐ کا یہ قول مختلف مصادر سے ہم تک پہنچا ہے کہ آپ نے بارہا فرمایا: عَلِیٌّ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْ عَلِیٍّ (یعنی علیؑ مجھ سے اور میں علیؑ سے ہوں) تو بعض لوگ کہیں گے کہ خود پیغمبرؐ کیا تھے کہ جو علیؑ ان کے برابر ہوں گے۔ وہ تو مثلاً خلیفہ عمر ہیں جو اتنی بلند شخصیت رکھتے ہیں یا وہ خلیفہ ابوبکر ہیں جن کا رتبہ اتنا بڑا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حبشی عورت کا ناچ، کچھ لوگوں کا گانا بجانا اور پھر حبشی نژاد مردوں کا تلوار کے کرتب دکھانا یہ سب کچھ مسجد نبوی میں ہوتا رہا۔ اس صورت میں اسلام کی اس دوسری عظیم مسجد کی کیا وقعت رہ جاتی ہے جس کی بنیاد خود رسولِ اکرمؐ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی تھی؟

اسی طرح کی کچھ روایات مسلمانوں کی شادیوں کے بارے میں بھی ہیں۔ ان شادیوں میں جو اعمال رسولِ اکرمؐ سے سرزد ہوتے ان سے صاف پتا چلتا ہے کہ آپ رقص و سرود کے شوقین تھے۔ مندرجہ ذیل روایت صحیح بخاری، جلد ۷، کتاب النکاح، باب ضرب دف صفحہ ۱۹-۲۰،

---

[1] صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۲۳ آخری حدیث۔ مطبوعہ محمد علی صبیح واولادہ، قاہرہ

کِتَابُ الْفَضَائِل، بَابُ شُهُوْدِ الْمَلَائِکَةِ بَدْرًا (مطبوعہ بولاق مصر)اور طبقات ابن سعد میں نقل کی گئی ہے۔ ہم اسے صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں جو قرآن مجید کے بعد مکتب خلافت کی معتبر ترین کتاب شمار کی جاتی ہے۔ یہ داستان ربیع بنت معوذ بن عفراء سے نقل کی گئی ہے۔ وہ کہتی ہے: میری شادی کے دن رسول اکرمؐ ہمارے گھر تشریف لائے اور جو جگہ میرے لیے مخصوص تھی وہاں میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جو لڑکیاں اس وقت وہاں موجود تھیں انھوں نے ڈھولک پر گانا شروع کر دیا۔ سبھی لڑکیاں وہ گیت گا رہی تھیں جو عام طور پر شادی بیاہ پر گائے جاتے ہیں سوائے ایک کے جس نے یہ شعر گایا: "فِیْنَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ" (یعنی ہمارے درمیان ایک ایسا نبی ہے، جو آئندہ رونما ہونیوالے واقعات کا علم رکھتا ہے)۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اس کو رہنے دو۔ وہی گاؤ جو گا رہی تھیں۔

خدا جانتا ہے کہ اس سے زیادہ مضر کلام اور اس سے زیادہ کارگر تیر ہم نے نہیں دیکھا جو آنحضرتؐ سے ایسی باتیں منسوب کر کے آپ کے اور آپ کے اہلبیتؑ میں ہونیوالے اماموں کے قلب میں پیوست کیا گیا ہو۔ تاہم وہ لوگ اس سے بھی ایک قدم آگے گئے ہیں جس کا ذکر ہم انشاء اللہ آئندہ بحث میں کریں گے۔ مذکورہ بالا حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ: رسول اکرمؐ ایک مسلمان کے گھر جاتے ہیں اور اس کی نو بیاہتا دلہن کے پہلو میں بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر وہاں موجود لڑکیاں گانے بجانے لگتی ہیں اور آنحضرتؐ ان کا گانا بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ ان حالات میں ہم عام مسلمانوں سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟

إِذَا كَانَ رَبُّ الْبَيْتِ بِالدُّفِّ مُوْلِعًا ۔۔۔ فَشِيْمَةُ أَهْلِ الْبَيْتِ كُلِّهِمِ الرَّقْصُ

یعنی اگر کسی خاندان کا بزرگ ڈھولک کا شوقین ہو تو بلاشبہ اس گھر کے تمام افراد ناچنے لگیں گے۔ اگر پیغمبر اسلامؐ کا یہ عالم ہو تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ یقیناً یہ باتیں اس لیے کہی گئی ہیں کہ آپ لوگ ان معاملات میں یزید یا اس کے باپ معاویہ پر کوئی اعتراض نہ کریں۔

صحیح بخاری[1] اور صحیح مسلم میں سہل ساعدی سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ

---

[1] صحیح بخاری جلد ۷، صفحہ ۲۶

نے ابو اسید ساعدی کی شادی کی تقریب میں شرکت فرمائی۔ دلہن آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کے لیے شربت لائی جو کھجور کی قند سے تیار کیا گیا تھا۔ یہ شربت اس نے آنحضرتؐ کو اپنے ہاتھ سے پلایا اور یہ کام آپ کے احترام کے طور پر انجام دیا گیا۔

ایک اور روایت میں ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کیا گیا ہے، جب ہم انصار کی ایک عورت کی شادی کی تقریب سے واپس آئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس گانے بجانے کا کوئی سامان نہ تھا جسے اس میں استعمال کیا جاتا؟ انصار گانے بجانے سے خوش ہوتے ہیں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک مُغنّی کو اپنے ساتھ رکھ لو[1]

ایک اور روایت میں بی بی عائشہ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے بی بی عائشہ سے فرمایا: (یہ تم نے اچھا نہیں کیا کیونکہ) انصار ایک ایسی قوم ہیں جو شعر، غزل اور گانے کو پسند کرتے ہیں۔ کاش تم نے یہ کام کیا ہوتا۔ پھر آپ نے ایک شعر پڑھا جو مُغنّی کو اس موقع پر گانا چاہیے اور وہ یہ ہے:

اَتَیْنَاکُمْ اَتَیْنَاکُمْ فَحَیَّانَا وَحَیَّاکُمْ[2]

صحیح بخاری اور سنن ابن ماجہ میں انس بن مالک سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک دن رسولِ اکرمؐ مدینے کے ایک کوچے سے گزر رہے تھے کہ آپ کا سامنا کچھ عورتوں اور بچّوں سے ہوا جو ایک شادی کی تقریب سے واپس آ رہے تھے۔ وہ تالیاں بجاتے ہوئے گیت گا رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: خدا جانتا ہے کہ تم میرے نزدیک محبوب ترین لوگ ہو۔[3]

ایک اور روایت ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کی گئی ہے جس میں وہ کہتی ہیں: میں نے کچھ گڑیاں بنائی تھیں اور ان کے ساتھ کھیلتی تھی۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب النسوۃ التی یھدین المرأۃ الی زوجھا جلد ۷ صفحہ ۲۲ مطبوعہ بولاق مصر۔
[2] سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الغنا والدف، جلد ۱ صفحہ ۶۱۲-۶۱۳ حدیث ۱۹۰۰۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۷۸۔ جلد ۳ صفحہ ۳۹۱
[3] صحیح بخاری کتاب النکاح، باب ذھاب النساء والصبیان الی العرس جلد ۷ صفحہ ۲۵۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۶۱۲ حدیث ۱۸۹۹۔

لڑکیاں بھی ہمارے گھر آجاتی تھیں اور ہم سب مل کر گڑیوں سے کھیلتے تھے لیکن جب رسولِ اکرمؐ گھر تشریف لاتے تو یہ لڑکیاں بھاگ جاتی تھیں۔ آنحضرتؐ ان کے پیچھے جاتے، انھیں گھر میں لے آتے اور فرماتے تھے: بیٹھو اور گڑیوں کے ساتھ کھیلو![1]

اب لازم ہے کہ ہم مذکورہ بالا احادیث کا تجزیہ و تحقیق کریں اور مذہبی معیارات کی بنیاد پر ان کی تشخیص کریں۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ ان احادیث میں سے ہر ایک کے مطالعے کے لیے الگ تحقیق کی ضرورت ہے لیکن فی الحال ہم ان کا مطالعہ ایک ہی بحث میں کرتے ہیں۔

اسلام میں غنا اور موسیقی

مکتبِ خلافت کی معتبر کتب حدیث میں کچھ اور روایات بھی موجود ہیں مثلاً انس کا کہنا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: "بَعَثَنِی اللّٰهُ رَحْمَةً وَّهُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ وَ بَعَثَنِیْ بِمَحْقِ الْمَعَازِفِ وَالْمَزَامِیْرِ" خدا نے مجھے اہل عالم کی ہدایت کی خاطر اور ان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اس نے مجھے اس لیے مبعوث فرمایا ہے تاکہ میں ڈھولک وغیرہ جیسے لہو و لعب اور موسیقی کے آلات کو نابود کر دوں[2]

ایک اور روایت میں مجاہد نے کہا ہے: میں عبداللہ بن عمر کے ہمراہ تھا۔ راستے میں ہم نے ڈھول کی آواز سنی۔ عبداللہ نے اپنی دو انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں، کچھ دیر چلتے رہے اور اس جگہ سے دُور ہوگئے۔ پھر انھوں نے انگلیاں کانوں سے نکال لیں۔ جب دوبارہ ڈھول کی آواز سنی تو دوبارہ انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔ یہ عمل انھوں نے تین مرتبہ دہرایا اور پھر کہا: رسول اکرمؐ کا یہی طریقہ تھا۔[3]

---

[1] صحیح بخاری کِتَابُ الْاَدَب، بَابُ الْاِنْبِسَاطِ اِلَی النَّاسِ جلد ۴ صفحہ ۳۱ مطبوعہ بولاق مصر

[2] تفسیر در المنثور، جلد ۲ صفحہ ۳۲۴۔

[3] سنن ابن ماجہ کِتَابُ النِّکَاح، بَابُ الْغِنَا وَالدُّفِّ جلد ۱ صفحہ ۶۱۲ حدیث ۱۹۰۱۔ سنن ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۰۴۔

آیۂ کریمہ " مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ " (سورۂ لقمان۔ آیت ۶) کے ذیل میں بی بی عائشہ سے نقل کیا گیا ہے کہ: رسول اکرمؐ نے گانے بجانے والی کنیز کی خرید و فروخت اور اسے موسیقی کی تعلیم دینے کو حرام قرار دیا ہے۔ جب عبداللہ بن مسعود سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو انھوں نے کہا: خدا کی قسم! لہوالحدیث سے مراد گانا ہے۔ ابن عباس اور اسلام کے زمانۂ قدیم کے دوسرے عظیم مفسرین نے بھی مذکورہ آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے[1]

آیۂ شریفہ " وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ " کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ خدا شیطان کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: "تم جس کسی کو چاہو اپنی آواز کے ساتھ (زنا، شراب نوشی، جوئے وغیرہ پر) اکساؤ" عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں: اس آیت میں شیطان سے مراد گانا بجانا ہے[2]

یہ وہ چند آیات اور روایات ہیں جن سے ساز و آواز کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی عکاسی ہوتی ہے۔

مجسمے کے بارے میں اسلامی نقطۂ نگاہ

اب ہم مجسموں اور ان گڑیوں کے بارے میں صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو بی بی عائشہ کے پاس تھیں۔ خود بی بی عائشہ سے روایت ہے کہ وہ کہتی ہیں: میں نے ایک ایسا تکیہ خریدا اور گھر لے آئی جس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جب رسولِ اکرمؐ گھر تشریف لائے تو دہلیز پہ رُک گئے اور کمرے میں داخل نہ ہوتے۔ میں نے عرض کیا: میں نے جو گناہ کیا ہے اس سے توبہ کرتی ہوں۔ آپ نے فرمایا: یہ کیسا تکیہ ہے؟ تب میں نے وہ تکیہ اٹھایا اور اس کے مالک کو واپس کر دیا[3]

---

[1] تفسیر طبری جلد ۲۱ صفحہ ۳۹-۴۰۔ تفسیر قرطبی جلد ۱۴ صفحہ ۵۱-۵۳۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۴۴۱-۴۴۲۔ تفسیر سیوطی جلد ۵ صفحہ ۱۵۹-۱۶۰ [2] تفسیر طبری جلد ۱۵ صفحہ ۸۱۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۴۹ [3] صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب کرہ القعود علی الصورۃ جلد ۷ صفحہ ۱۶۸ اور باب مَنْ لَمْ يَدْخُلْ بَيْتًا فِيْهِ صُوْرَةٌ جلد ۷ صفحہ ۱۶۹

بہت سی روایات میں جن کی تعداد شاید دس سے زیادہ ہے کہا گیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: قیامت کے دن شدید ترین عذاب ان لوگوں کو دیا جائے گا جو تصویریں بناتے ہیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اب اس میں جان ڈالو۔[1]

اسی طرح کی ایک اور روایت آئی ہے کہ: خدا تصویریں بنانے والوں کو انہی کے ذریعے سے عذاب دے گا' نیز آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تصویریں بنانے والے قیامت کے دن عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ ایک اور روایت کے مطابق اس شخص کو قیامت میں سب سے زیادہ عذاب ہوگا جو ایسی چیزیں بنائے جو خدا کی مخلوقات سے مشابہ ہوں۔[2]

غیر عورتوں کے ساتھ مل بیٹھنا

وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ شادی کی ایک تقریب میں شریک ہوئے اور دلہن کی جگہ پر اس کے پہلو میں بیٹھے یا انھوں نے دلہن کے ہاتھ سے شربت پیا مندرجہ ذیل روایت اس کی پوری پوری وضاحت کردے گی۔ بی بی ام سلمہ کہتی ہیں: میں اور زوجۂ رسولؐ بی بی میمونہ آنحضرتؐ کے پاس بیٹھی تھیں۔ دریں اثنا آپ کے ایک نابینا صحابی ابن ام مکتوم دروازے سے داخل ہوئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: تم اپنے آپ کو اس سے پوشیدہ کرلو اور پردے کے پیچھے چلی جاؤ۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! وہ تو نابینا ہیں اور ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم دونوں بھی نابینا ہو اور انھیں نہیں دیکھ سکتیں؟[3]

یہ روایت شیعہ کتب سے نہیں لی گئی بلکہ مکتب خلفاء کی معتبر کتابوں اور صحاح سے لی گئی ہے۔ کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ پیغمبرؐ جو اس تمام احتیاط اور پاکدامنی کے حامل ہوں وہ دلہن کے پہلو میں بیٹھیں یا ناچ اور گانے پر کان دھریں؟

---

[1] و [2] صحیح بخاری، کِتَابُ اللِّبَاسِ، بَابُ عَذَابِ الْمُصَوِّرِیْنَ جلد۷ صفحہ ۱۶۷ (دو حدیثیں) اور بَابُ مَنْ لَّمْ یَدْخُلْ بَیْتًا فِیْهِ صُوْرَۃٌ جلد۷ صفحہ ۱۶۹

[3] سنن ابوداؤد جلد۴ صفحہ ۶۳ حدیث ۴۱۱۲۔ صحیح ترمذی جلد۵ صفحہ ۱۰۲ حدیث ۲۷۷۸۔ مسند احمد بن حنبل جلد۶ صفحہ ۲۹۶۔ دُرِّ منثور جلد۵ صفحہ ۴۲۔

ایک اور روایت کے مطابق جو صحیح بخاری میں نقل کی گئی ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: (نامحرم) عورت کے گھر اور اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پرہیز کرو۔ ایک انصاری نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! کسی انسان کی رشتہ دار عورتوں مثلاً بھاوج وغیرہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ موت اور ہلاکت ہے (یہی وہ مقام ہے جہاں شیطان بہکاتا ہے)[1]۔
ایک اور روایت میں رسول اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: مرد کو چاہیے کہ کسی وقت بھی نامحرم عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے[2]۔

اس قسم کی احادیث اس امر کو پوری طرح واضح کرتی ہیں کہ مذکورہ بالا روایات جھوٹ کے دفتر کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ ایک طرف تو ان کی مخالف روایات ابن عباس جیسے معتبر راویوں سے نقل کی گئی ہیں جنہیں دونوں مکاتب قبول کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ قرآن اور اسلام کے مسلمات سے بھی موافقت رکھتی ہیں۔

ایسی احادیث گھڑنے کا مقصد

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسی حدیثیں کیوں گھڑی گئیں اور یہ کام کرنے والوں کے ارادے کیا تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان دروغ بافیوں اور جعلسازیوں کے کئی ایک ہدف تھے۔

۱۔ اس کام کے جو اہم مقاصد تھے ان میں سے ایک معاویہ کا وہی خطرناک مقصد تھا جس کے تحت وہ "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کو دفن کر دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان احادیث نے کس عمدگی سے اپنا یہ منحوس مقصد حاصل کیا اور کس طرح پیغمبر اسلامؐ کے مبارک نام کو جھوٹ اور بیجا تہمتوں کے ڈھیر کے تلے دفن کرنا چاہا۔ بلاشبہ اگر امام حسینؑ قیام نہ فرماتے اور ائمۂ اہلبیتؑ کی جانب سے کوششیں نہ کی جاتیں تو ان خطرناک منصوبوں پر کامیابی سے عملدرآمد ہو جاتا اور مخالفین اپنا مقصد حاصل

---

[1] و [2] صحیح بخاری، کِتَابُ اللِّبَاسِ، بَابُ عَذَابِ الْمُصَوِّرِیْنَ، جلد۷، صفحہ ۱۶۷۔ جلد۷، صفحہ ۳۷ مطبوعہ بولاق مصر۔

کر لیتے لیکن کربلا کے شہیدوں نے اپنا پاک خون بہا کر اور اہلبیتِ رسولؐ نے بیحد تکالیف اٹھا کر آنحضرتؐ کی پیغمبری کو جو اصولاً نابود ہو چکی تھی ایک دفعہ پھر زندہ کر دیا۔ انشاء اللہ ہم آئندہ مباحث میں اس موضوع پر مزید تحقیق کریں گے۔

معاویہ کی آرزو تھی کہ رسولِ اکرمؐ کا نام دفن کر دے اور اس نے ان احادیث کے ذریعے اپنے منصوبے پر عملدرآمد شروع کیا۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ رسولِ اکرمؐ کو غیر معتبر ثابت کر دیں اور بلاشبہ ان روایات کے مجموعے میں یہ کام انجام پا گیا۔ چنانچہ وہابیت جس نے پچھلی صدی میں قوت پکڑی اور اقتدار حاصل کیا وہ یہیں سے وجود میں آئی۔ رسولِ اکرمؐ اور ان کی شریعت کے بارے میں ان کے خیالات کا سرچشمہ یہی احادیث ہیں۔ اب شیعہ اور سنی علماء خواہ کتنی ہی زحمت اٹھائیں اور وہابیوں کے نظریات کو رد کر دیں ان کی کوششوں کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک اس قسم کی احادیث کا علاج نہ کیا جائے اور انکی جڑیں خشک نہ کر دی جائیں۔ آپ ایک کھلی کھڑکی یا دروازے کے سامنے کاغذوں کا ایک دستہ رکھیں۔ جب ہوا چلے گی تو لازماً ان کاغذوں کو اڑائے گی اور الٹ پلٹ کر رکھ دے گی اور آپ انھیں کتنی ترتیب سے کیوں نہ رکھیں اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا اور اس کا اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں کہ کھڑکی یا دروازہ بند کر دیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ وہابیت کے تجزیے اور اس پر تنقید کی ابتدا یہاں سے کریں اور یہ نہیں کہ محمد بن عبدالوہاب یا ابن تیمیہ کے نظریات پر براہِ راست تنقید کرنے لگیں۔ جب تک اس قسم کی جعلی روایات موجود ہیں اور وہ معتبر سمجھی جاتی ہیں وہابیت کے مسئلے کو قطعی طور پر حل کرنا ممکن نہیں ہے۔

ایک عینی مشاہدہ

مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی دفعہ مکہ گیا تو حج سے واپسی پر ہم لوگ موٹر کار سے سفر کر رہے تھے۔ ہمارا قافلہ شہر رماح میں چوبیس گھنٹے ٹھہرا۔ وہاں ایک کنواں تھا۔ حاجی اس کنویں کی جانب گئے تاکہ اپنے پینے کے لیے اور موٹر کار کے لیے پانی حاصل کر سکیں۔ تقریباً عصر کے وقت قافلے نے روانہ ہونے کی ٹھانی۔ اس وقت میں نے اپنے قافلے کے حاجیوں کے درمیان ایک اجنبی جوان کو دیکھا جو چیخ چلا رہا تھا اور بڑے زور شور سے تقریر کر رہا

تھا حتیٰ کہ اس کی تقریر نے شیعہ حاجیوں میں اضطراب پیدا کر دیا۔ میں اس جوان کی جانب بڑھا لیکن جب اس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگا: "ھٰذَا مُطَوَّعُھُمْ" یہ ہے ان کا عالم! اگر میرا بس چلے تو میں اس کا سر کاٹ ڈالوں اور اس کا خون پی جاؤں۔ میں نے دیکھا کہ یہ بحث مباحثے کا موقع نہیں ہے چنانچہ میں اپنی جگہ پر رُک گیا اور اسے دیکھتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا: یہ مشرک ہیں۔ یہ کافر ہیں۔ پھر اس نے تمسخر اڑانے کے انداز میں ہمارے رونے کی نقل اتاری۔ وہ اپنا ہاتھ پیشانی پر لے جاتا اور رونی صورت بنا لیتا۔ ایک شیعہ حاجی نے آگے بڑھ کر اس سے کہا: ہم مشرک نہیں، ہم مسلمان ہیں۔ اصولاً ہم مشرک ہو بھی کیسے سکتے ہیں؟ ہم نے خانۂ خدا کا حج کیا ہے۔ ہم نے روضۂ رسولؐ کی زیارت کی ہے۔ ہم نے امام علیؑ کے روضہ کی زیارت کی ہے۔ جب وہ شیعہ حاجی یہ باتیں کہہ چکا تو اس جوان نے کہا: تو مشرک ہو گیا ہے۔ تجھے قتل کر دینا واجب ہے۔ اگر ملِو سعود (عرب کے بادشاہ) کا باپ بھی آئے تو وہ بھی تیری حمایت نہیں کرے گا۔ شیعہ حاجی نے جو غصے کے مارے کانپ رہا تھا اسے مخاطب کر کے کہا: خدا کے علاوہ نفع نقصان پہنچانے والا کوئی نہیں۔ تب اس جوان نے یہ جملہ کہا جو ہماری گفتگو کا اصل مقصد ہے: "وَیش مُحَمَّد؟ مُحَمَّد رِجَالُ مِثْلِیْ" (یعنی محمدؐ کیا ہیں۔ وہ میری طرح ایک انسان ہیں) اس سے پتا چلتا ہے کہ اس قسم کی احادیث نے رسولِ اکرمؐ کے مقام و مرتبہ کو یہاں تک گھٹا دیا ہے کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے کہتا ہے کہ محمدؐ میری طرح ایک انسان ہیں۔

اس گفتگو کے بعد ہمارے ڈرائیور نے جو قفقاز کا ایک شیعہ تھا، آگے بڑھ کر اس جوان سے پوچھا: کیا محمدؐ تمہاری ہی طرح کے ایک انسان ہیں؟ وہابی جوان نے جواب دیا: ہاں! محمدؐ میری ہی طرح کے ایک انسان ہیں اور وہ مر چکے ہیں۔ یہ سوال و جواب تین مرتبہ دہرائے گئے۔ پھر شیعہ ڈرائیور نے کہا: محمدؐ پر تو قرآن نازل ہوتا تھا۔ کیا تم پر بھی قرآن نازل ہوتا ہے؟ "فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ" یعنی اس پر وہ منکرِ حق ہکا بکا رہ گیا۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۸)۔

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اَلْعِیَاذُ بِاللہ رسولِ اکرمؐ عیش و نشاط اور ساز و آواز کے دلدادہ تھے اور سہو و نسیان کے عادی تھے تاہم ان کے پیروان سے کہیں

بڑھ کر اخلاق، پاکدامنی اور تقویٰ کے پابند تھے وغیرہ وغیرہ لیکن ان باتوں کے مقابلے میں قرآن یہ فرماتا ہے: "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (یعنی اے رسولؐ! آپ عظیم اخلاق سے بہرہ مند ہیں۔ (سورۂ قلم۔ آیت ۴)۔ "طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى" (یعنی اے طٰہٰ! ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ تم عبادت میں اپنے آپ کو اس قدر مشقّت میں ڈالو)۔ (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۲) لیکن جو لوگ اس قسم کی احادیث پر اعتقاد رکھتے ہیں اور انہیں صحیح سمجھتے ہیں، رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کے بارے میں ان کے خیالات لازمی طور پر اس قرآنی معیار سے مختلف ہوں گے لہٰذا ہم یہ دیکھیں گے کہ ان کے دینی اعتقاد کے مطابق رسول اکرمؐ برتر ہیں یا ابوبکر، جبکہ خلیفہ ابوبکر آلاتِ موسیقی کو شیطانی چیز سمجھتے ہوئے ان سے نفرت کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں چاہتے کہ رسولِ اکرمؐ کے سامنے ساز بجائے جائیں حالانکہ خود رسول اکرمؐ اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ اسی طرح ان دینی خیالات کے مطابق خلیفہ برتر ہوں گے یا رسولِ خداؐ! جبکہ خلیفہ عمر کو دیکھ کر شیاطین جن و انس بھاگ کھڑے ہوتے ہیں لیکن آنحضرتؐ کے سامنے نہ صرف یہ کہ وہ بھاگتے نہیں بلکہ ناچ گانے میں بھی لگے رہتے ہیں۔

انہی احادیث کو ہم نے تین شاخوں والے یا تین نشانوں والے تیر کہا ہے یعنی:

۱۔ رسولِ اکرمؐ کی شخصیت اور ان کے اعتبار کو ختم کرنا۔

۲۔ آنحضرتؐ کے بعد آنے والے حکام اور اربابِ اقتدار کا رتبہ بلند کرنا اور

۳۔ اعتقاد اور عمل کے بارے میں اسلام میں تخریب کرنا۔

منصب خلافت کے تقدس کی بلندی

ایسے ہی اعتقادات کی بنا پر ایک روز حجّاج بن یوسف ثقفی نے منصب خلافت کی عظمت کے بارے میں لوگوں کے سامنے ان الفاظ میں خطبہ دیا:

"کیا تمہاری غیر حاضری میں ــــ تمہارے خاندان کے درمیان ــــ تمہاری ذمّہ داریاں سنبھالنے والا تمہارا خلیفہ اور جانشین برتر ہے یا وہ شخص جسے تم اس کے پاس بھیجتے ہو؟"[1]

---

[1] ابن عبدربہ اندلسی: العقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۲۸۵-۲۸۶ مطبوعہ محمد سعید العریان، مصر ۱۳۷۲ھ

پھر انھیں خیالات کی بنا پر اس نے ایک اور موقع پر خلیفہ عبدالملک کے نام اپنے خط میں لکھا کہ آسمانوں اور زمین کے کام خلافت کے واسطے اور برکت کے بغیر انجام نہیں پاتے اور خلیفہ (جو ان دنوں جابر حاکم عبدالملک تھا) خدا کے نزدیک ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین سے بھی افضل ہے[۱]۔ مزید برآں انہی نظریات کی بنا پر آجکل کے وہابی کہتے ہیں کہ رسول ؐ ایک قاصد اور پیغام لانے والے ہیں۔ وہ بس خدا کا پیغام بندوں کے پاس لائے اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان تمام خیالات کا سرچشمہ وہی احادیث ہیں جن پر ہم نے غور کیا اور آئندہ بھی کریں گے۔

خلیفہ عثمان ان روایات کے ترازو میں

اگر آپ یہ دریافت کریں کہ انھوں نے خلیفہ عثمان کے بارے میں کیا کہا ہے اور یا ان کے متعلق بھی ایسی احادیث وجود رکھتی ہیں تو آپ کو مندرجہ ذیل حدیث پر غور کرنا چاہیے جو ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کی گئی ہے۔ وہ کہتی ہیں: میں اور رسولِ اکرم ؐ ایک لحاف میں تھے۔ اس اثناء میں میرے والد ابوبکر نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ آنحضرت ؐ نے اپنی جگہ سے اٹھے بغیر انھیں اجازت دیدی۔ وہ اندر آئے، انھوں نے آنحضرت ؐ سے اپنا مقصد حاصل کیا اور چلے گئے۔ ہم ابھی اسی لحاف میں تھے کہ عمر نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ آنحضرت ؐ نے اپنی وضع میں کوئی تبدیلی کیے بغیر انھیں آنے کی اجازت دیدی اور بستر میں لیٹے لیٹے ہی ان کا مطلب پورا کر دیا اور وہ باہر چلے گئے۔ اسی دوران میں عثمان آئے اور شرفیابی کی اجازت مانگی۔ آنحضرت ؐ اُٹھے، آپ نے لباس زیب تن فرمایا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد آپ نے انھیں اندر آنے کی اجازت دی۔ تب عثمان آئے اور اپنا مطلب حاصل کر کے باہر چلے گئے۔ اب بی بی عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ؐ! جب ابوبکر آئے تو آپ نے اپنی وضع میں کوئی تبدیلی نہ کی اور اسی حال میں انھیں اندر آنے کی اجازت دیدی اور اسی بستر میں لیٹے لیٹے ان کا کام کر دیا۔ ان کے بعد عمر آئے تب بھی آپ نے اپنی وضع تبدیل نہ کی اور اس بستر میں

---

[۱] ابن عبد ربہ اندلسی: العقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۲۸۵-۲۸۶ مطبوعہ محمد سعید العریان، مصر ۱۳۷۲ھ

میرے ساتھ لیٹے لیٹے ہی ان کا کام کر دیا حتیٰ کہ ان کے باہر جانے تک آپ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں لیکن جب عثمان آئے تو یکایک صورت بدل گئی۔ آپ اپنی جگہ سے اُٹھے، لباس پہنا اور اپنی جگہ پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: عثمان بڑے شرم و حیا والے ہیں۔ مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ اس حال میں شاید بے حد حیا کی وجہ سے وہ اپنی حاجت بیان نہ کریں اور اپنا مقصد حاصل کیے بغیر ہی واپس نہ چلے جائیں[1]

ایک اور روایت میں جو صحیح مسلم میں نقل کی گئی ہے، یہ واقعہ اور بھی شرمناک شکل میں بیان ہوا ہے۔ اس کے مطابق رسولِ اکرمؐ ایک بستر پر بی بی عائشہ کی چادر میں ان کے ساتھ لیٹے تھے۔ تب فقط عثمان بن عفان کے آنے پر آنحضرتؐ نے بی بی عائشہ سے فرمایا: اپنا لباس پہن لو اور اپنا بدن ڈھانپ لو! وہ بولیں: کیا بات ہے۔ ابوبکر اور عمر کے آنے سے تو آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی لیکن اب عثمان کی آمد پر آپ پریشان ہو گئے ہیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا! کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے خدا کے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں[2]

آپ غور فرمائیں کہ اس قسم کی روایات پر اعتقاد رکھنے والے مسلمانوں کے دل میں رسول اکرمؐ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ کیا ان روایات کے مطابق عثمان زیادہ قدر و منزلت کے مالک ہیں یا پیغمبر اسلامؐ؟

اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کی صفتِ حیاء کے بارے میں قرآن مجید یوں ارشاد فرماتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ (الآیۃ)

اے ایمان لانے والو! پیغمبرؐ کے گھروں میں بغیر اجازت کے نہ جایا کرو تا کہ وہاں کھانا کھاؤ لیکن اگر تمھیں کھانے کی دعوت دی جائے تو پھر جانے میں کوئی حرج نہیں لیکن جب کھانا کھا چکو تو پھر باتیں کرنے کے لیے نہ بیٹھے رہو کیونکہ اس سے پیغمبرؐ کو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ تمھیں اپنے گھر سے جانے کو کہنے سے شرم کرتے ہیں لیکن خدا اس حقیقت کو بیان کرنے سے نہیں شرماتا۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۵۳)۔

قرآن مجید کی تصدیق کے مطابق رسولِ اکرمؐ اس قدر شرم و حیا رکھتے تھے کہ لوگوں

---

[1] و [2] صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۱۱۶ مطبوعہ محمد علی صبیح و اولادہٗ قاہرہ مصر

کو اپنے گھر سے جانے کو نہیں کہہ پاتے تھے۔ آپ کے ہاں لوگ کھانا کھاتے اور پھر وہاں بیٹھ کر باہم باتیں کرنے لگتے تھے۔ اس طرح وہ نہ صرف یہ کہ آنحضرتؐ کا وقت ضائع کرتے تھے بلکہ آپ کو روحانی اذیت بھی پہنچاتے تھے مگر آپ ادب اور اخلاق کی اس قدر پابندی کرتے تھے کہ ان کی طرف سے اس تمام تکلیف کو برداشت کر لیتے تھے لیکن ان سے یہ نہیں کہتے تھے کہ وہ آپ کے گھر سے چلے جائیں لہٰذا جو دوسرا سورہ آپ پر نازل ہوا اس میں خدا نے بجا طور پر آپ کے عظیم اخلاق کی تعریف کی اور فرمایا: " وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ " (سورۂ قلم۔ آیت ۴)۔

یہ قرآن مجید کے قطعی ارشادات ہیں جو سراسر حق اور حقیقت ہیں اور وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایات ہیں۔ اب میں آپ کی توجہ جس چیز کی جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں ابوبکر، عمر اور عثمان ٹھیک ایک دوسرے کے بعد رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایسی اور بھی بہت سی روایات ہیں جن میں یہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس طرح کی روایات گھڑنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس ذریعے سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دیں کہ ان حضرات کی ایک دوسرے کے بعد خلافت اور حکومت صحیح اور مقدس تھی۔ چونکہ وہ اس قسم کی روایات میں بہت سے مواقع پر یکے بعد دیگرے اسی ترتیب سے آتے ہیں جس طرح وہ یکے بعد دیگرے خلیفہ اور حاکم بن گئے تھے۔ یہ منصوبہ بڑا گہرا تھا اور بڑی احتیاط سے تیار کیا گیا تھا۔ جن لوگوں نے ایسی روایات گھڑی تھیں انہوں نے انتہائی کوشش کی کہ خلافت کی اس ترتیب کو درست سمجھنے کے لیے لوگوں میں ذہنی آمادگی پیدا کر دیں۔

رسولِ اکرمؐ جادو کے چنگل میں

ہم یہ داستان نقل کر کے اس کا تجزیہ کریں گے اور پھر اس بحث کو ختم کر دیں گے۔ خدا گواہ ہے کہ میرے لیے ان عبارات اور اقوال کا نقل کرنا ناگوار ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بی بی عائشہ سے نقل کیا گیا ہے (بخاری نے تین اور مسلم نے ایک مقام پر لکھا ہے)۔ ان روایات میں سے ایک میں کہا گیا ہے کہ کسی نے رسولِ اکرمؐ پر جادو کر دیا جس کے نتیجے میں آپ کی

عام سوجھ بوجھ جاتی رہی یہاں تک کہ آپ نے جو کام نہیں کیے ہوتے تھے ان کے متعلق یہ خیال کرتے تھے کہ وہ کیے ہیں مثلاً وہ خیال کرتے تھے کہ انھوں نے کھانا کھا لیا ہے حالانکہ نہیں کھایا ہوتا تھا۔ کبھی یہ خیال کرتے تھے کہ نماز پڑھ لی ہے حالانکہ نہیں پڑھی ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ۔ یہ صورت برابر قائم رہی حتیٰ کہ ایک دن جب آنحضرت[ص] میرے پاس بیٹھے تھے' آپ نے فرمایا: اے عائشہ! دو فرشتے آئے۔ ان میں سے ایک میرے سرہانے اور دوسرا پائنتی کی جانب بیٹھ گیا۔ ان فرشتوں نے مجھے حقیقت حال کی خبر کر دی۔ جو فرشتہ میرے سرہانے بیٹھا تھا اس نے پائنتی والے فرشتے سے پوچھا: انہیں کیا ہوگیا ہے؟ دوسرے فرشتے نے جواب دیا: ان پر لبید بن اعصم یہودی نے جادو کر دیا ہے۔ پہلے فرشتے نے پوچھا: کس چیز سے جادو کیا گیا ہے؟ دوسرے فرشتے نے جواب دیا: کھجور کے درختوں کی شاخوں اور .... (اس نے چند دوسری چیزوں کے نام لیے اور کہا:) ان سب چیزوں کو اکٹھے کرکے جادو کیا گیا ہے۔ پہلے فرشتے نے پوچھا: یہ چیزیں کہاں ہیں؟ دوسرے نے جواب دیا: وہ ذی اروان کے کنویں میں ہیں۔

اس پر رسولِ اکرم[ص] اپنے اصحاب کے ساتھ کنویں پر گئے اور واپس آکر فرمایا: اے عائشہ! جادو کے اثر سے اس کنویں کا پانی اتنا بدل گیا تھا کہ اس کا رنگ مہندی جیسا ہو گیا تھا اور کھجور کے درخت کی جو شاخیں وہاں پڑی تھیں ان کی شکل شیطان کے سر کی سی ہو گئی تھی۔[۱]

ایک اور روایت میں یہ بات اس سے بھی بدتر شکل میں بیان کی گئی ہے جس سے اس کی قباحت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ اس روایت کے مطابق جادو نے آنحضرت[ص] پر اتنا اثر کیا کہ بعض اوقات وہ یہ خیال کرتے تھے کہ انھوں نے اپنی ایک بیوی کے ساتھ ہم بستری کی ہے حالانکہ واقعاً ایسا نہیں ہوا ہوتا تھا۔ دیکھیے یہ کتنی شرمناک بات ہے! کیا اصولاً کسی کے

---

[۱] صحیح بخاری کِتَابُ بَدْأُ الْخَلْقِ، بَابُ صِفَةِ إِبْلِيْسَ وَجُنُوْدِہٖ، جلد ۴ صفحہ ۱۲۲۔ طبع بولاق مصر، کِتَابُ الطِّبِّ، بَابُ السِّحْرِ، بَابُ هَلْ يُسْتَخْرَجُ السِّحْرُ جلد ۷ صفحہ ۱۳۷-۱۳۸۔ مسند احمد بن حنبل صفحہ جلد ۶ صفحہ ۵۰-۹۶۔ طبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۴۔ صحیح مسلم کِتَابُ السَّلَامِ جلد ۴ ۴۔ سنن ابن ماجہ کِتَابُ الطِّبِّ، بَابُ السِّحْر، جلد ۲ صفحہ ۱۱۷۳، حدیث ۳۵۴۵۔

حق میں اس سے زیادہ پستی کا اظہار کیا جا سکتا ہے ؟ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب روایات صحاح میں موجود ہیں۔

اس کے مقابلے میں ہم امیر المومنین امام علی علیہ السلام کے کلام سے استناد کرتے ہیں خطبہ ۱۹۵ میں امام علیہ السلام سے یوں نقل ہوا ہے: "خدا نے آپ کی دودھ بڑھائی کے وقت ہی سے فرشتوں میں سے ایک عظیم المرتبت فرشتے کو آپ کے ساتھ لگا دیا تھا جو آپ کو رات دن بزرگ خصلتوں اور پاکیزہ سیرتوں کی راہ پر لے چلتا تھا۔[1]

یہ مکتبِ امامت کے پہلے امام کا ارشاد ہے اور وہ مکتبِ خلافت کے معتبر راویوں کے اقوال ہیں۔

مکتبِ خلافت کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام میں تغیر و تبدل کا دوسرا ذریعہ وہ احادیث ہیں جن میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اپنی حیثیت قدر و منزلت اور تقدس کھو بیٹھیں اور نہ صرف یہ کہ انھیں ایک پیغمبرؐ کا بلند مقام حاصل نہ ہو بلکہ وہ عام لوگوں کے رتبے سے بھی نیچے گر جائیں تاکہ ان کی حدیثوں اور دنیاوی معاملات کے بارے میں ان کے اوامر و نواہی کی کوئی وقعت باقی نہ رہے اور سب کو پتا چل جائے کہ وہ دنیاوی امور سے چنداں واقف نہیں ہیں حتیٰ کہ ان معاملات میں ان کی سوجھ بوجھ عام افراد سے بھی کمتر ہے کیونکہ انھوں نے خود کہا ہے کہ مجھے تمہارے دنیاوی کاموں کی کوئی خبر نہیں تم ان امور کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ دوسری جانب بعض افراد اور اشخاص کو متعارف کرانے کے بارے میں ان کے ارشادات کی کوئی قیمت نہ رہے۔ اصولاً ان کا حافظہ کمزور ہو اور ان کے کام ناقص رہ جائیں اور ان کی عقل بھی قوی نہ ہو۔ چنانچہ ایک دن وہ جنابت کی حالت میں گھر سے نکلیں اور محراب میں کھڑے ہو جائیں لیکن جب مسلمان نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو

---

[1] نہج البلاغہ۔ خطبہ قاصعہ صفحہ ۵۳۳ ترجمہ علامہ مفتی جعفر حسین۔ "وَلَقَدْ قَرَنَ اللّٰہُ بِہٖ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَاٰلِہٖ مِنْ لَّدُنْ اَنْ كَانَ فَطِيْمًا اَعْظَمَ مَلَكٍ مِّنْ مَّلٰٓئِكَتِہٖ يَسْلُكُ بِہٖ طَرِيْقَ الْمَكَارِمِ وَمَحَاسِنَ اَخْلَاقِ الْعَالَمِ لَيْلَہٗ وَنَهَارَهٗ"۔

اس وقت پیغمبرؐ کو اپنی حالت کا احساس ہو اور وہ لوگوں سے کہیں: صبر کرو، صبر کرو۔ پھر گھر جا کر غسل کریں اور واپس آئیں۔ اسی طرح سبھی لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ قرآن کی بعض آیات بھول گئے تھے اور مسجد میں ایک شخص کو قرآن پڑھتے ہوئے سن کر آپ کو یاد آیا کہ آپ قرآن کا کونسا حصّہ بھول گئے ہیں۔ ایسے پیغمبرؐ ہی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ: انھوں نے فلاں اسلامی مسئلہ میں اجتہاد کرتے ہوئے اپنا نظریہ ظاہر کیا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب ہر مقتدر شخص پیغمبرؐ کے مقابلے میں اپنی رائے اور نظریے کا اظہار کر سکتا ہے اور یہ اظہارِ نظر اسلام کا جزو بھی بن جاتا ہے کیونکہ اگر پیغمبرؐ مجتہد ہیں اور اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں تو جو لوگ ان کے بعد حاکم بنے وہ بھی مجتہد ہیں اور وہ بھی جہاں مصلحت سمجھیں وہاں پیغمبرؐ کے نظریات کو اُلٹ پلٹ سکتے ہیں اور ان میں تغیر و تبدل کر سکتے ہیں۔

اگر ہمارے ذہن ان باتوں کو تسلیم کر لیں اور ان کے تمام پہلوؤں کو سمجھ لیں تو پھر ہم یہ جان سکتے ہیں کہ ملوکیت نے اسلام کی کیا شکل بنا دی ہے اور کن کن ذرائع سے اسکے حقائق میں تحریف کی گئی ہے۔ اس وقت ہم ائمۂ اہلبیتؑ کی مساعی کو صحیح طور پر پہچان سکتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ امیرالمومنینؑ نے کیا کیا اور امام باقرؑ یا امام رضاؑ یا امام جوادؑ کو کیا کرنا چاہیے تھا اور انھوں نے کیا کیا۔ عہدِ امامت میں کیا کام کیا گیا اور غیبتِ صغریٰ کے زمانے میں کس کس کی کیا ذمہ داری تھی۔ جب تک ہم ان حکام کے اقدامات اور ان کے اثرات کو نہ سمجھ لیں ہم مکتبِ امامت کی کارگزاریوں کا ادراک نہیں کر سکتے کیونکہ ائمۂ اہلبیتؑ نے حکام کی پیدا کردہ انہیں خرابیوں کی اصلاح کی اور انھیں حقائق کو دوبارہ زندہ کیا جو نابود ہو چکے تھے۔

اہلِ مغرب کی اسلام شناسی پر ایک نظر

سابقہ صفحات میں جو مطالب زیرِ بحث تھے ان کے واضح ہو جانے کے بعد اب ہم سب مل کر ایک اہم نکتے پر توجہ دے سکتے ہیں۔ ایران آنے سے پہلے میں اس نکتے سے واقف نہ تھا اور اس کا پتا مجھے اس وقت چلا جب میں ایران میں اپنی کتاب "عبداللہ بن سبا" کی دوسری جلد لکھ رہا تھا۔ یہ انکشاف میرے لیے بہت اہم تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے

کہ مغرب کے اسلام شناس، اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے فقط خلفاء کے مکتب کی کتابوں سے رجوع کرتے ہیں اور مکتب امامت کی کتابوں سے استفادہ نہیں کرتے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب ابتداء میں مکتب خلفاء ہی کے اسلام سے واقف ہوا تھا اس لیے اس کی وابستگی انھیں سے چلی آرہی ہے۔ اس کے برعکس چونکہ وہ ہم سے کچھ دور دور ہی رہا ہے اس لیے وہ ہماری کتابوں سے بھی بے خبر رہا ہے۔ ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ نپولین بوناپارٹ ۱۷۹۸ء کے موسم بہار میں ۳۰۰ بحری جہازوں اور تقریباً چالیس ہزار سپاہیوں کو لیکر مصر روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ مصر فتح کرنے کے بعد ہندوستان پر قبضہ کرلے اور انگریزوں کو وہاں سے نکال باہر کرنے کا تھا۔ چنانچہ موسم گرما کے شروع میں ایک مختصر جنگ کے بعد وہ فاتحانہ طور پر قاہرہ میں داخل ہوا۔

نپولین ۱۸۰۱ء تک مصر میں رہا اور اسی سال ستمبر میں انگریز اور عثمانی فوجوں کے دباؤ کے تحت اس نے وہ ملک خالی کر دیا۔ نپولین اپنے ہمراہ علماء کی ایک جماعت بھی مصر لایا تھا۔ یہ علماء فرانسیسی فوج کے مصر میں قیام کے دوران تحقیق کے کام میں مصروف رہے۔ ان کی علمی کاوشوں کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے یورپ کے علماء کو سرزمین مشرق، اس کے مذاہب، علوم اور تہذیب سے روشناس کرایا۔ مستشرقیت، آثار قدیمہ اور زبان شناسی کے علوم نیز مشرق کے مذاہب اور تاریخ کے مطالعے کی بنیاد بڑی حد تک اسی تاریخی موڑ پر قائم ہوئی اور پھر یہ علوم ترقی کرتے گئے۔[1]

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ لبنانی عیسائی جو فکری تجدد اور مغرب کے ساتھ تہذیبی ارتباط کے نقیب شمار ہوتے ہیں عربی بولنے والوں اور یورپینوں کے درمیان علمی رابطے کا کام دیتے رہے ہیں بالخصوص اس لیے کہ ۱۸۶۰ء میں بڑی طاقتوں کی رضامندی سے لبنان میں فرانسیسی فوج اتاری گئی اور وہ کافی عرصے تک اس ملک میں مقیم رہی۔[2]

اس سے پہلے میں مصر کے ساتھ فرانسیسیوں اور انگریزوں کے روابط اور لبنانی عیسائیوں کے یورپ سے ارتباط کو یورپینوں کی اسلام شناسی کی ماہیت کا سب سے اہم

---

[1] ڈاکٹر حافظ فرمانفرمائیاں: تاریخ قرون معاصر: اروپا در عصر انقلاب صفحہ ۱۵۹-۱۶۰۔
[2] ڈاکٹر فلپ ہٹی۔ تاریخ عرب، جلد ۲ صفحہ ۹۳۹ (فارسی ترجمہ: از ابوالقاسم پاینده)۔

عامل سمجھتا تھا۔ چونکہ اس نوعیت کے ارتباط اور اتصال میں یورپیوں کو مکتبِ خلفاء کے اسلام، ان کے علماء اور ان کی کتابوں سے سابقہ پڑا تھا لہٰذا میں اس بات کو فطری سمجھتا تھا کہ وہ اس مکتب کے اسلام کے علاوہ کسی اور اسلام کو نہ پہچانتے ہوں اور اسے رسمی نہ سمجھتے ہوں۔

لیکن ایران آنے کے بعد مکتبِ اہلبیتؑ کے اسلام سے اہل یورپ کی اس دوری کا راز مجھ پر کھل گیا اور اچانک بجلی کی چمک کی مانند میری یہ مشکل حل ہوگئی یعنی حقیقت یہ تھی کہ ان لوگوں کی اسلام شناسی کی کوششیں تلاشِ حق کے لیے نہیں ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ آسمانی اور خداوندی دین کا سراغ لگائیں اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھیں۔ اس کے برعکس وہ اسلام اور اس کے اکابرین کی تاریخ کے کمزور پہلوؤں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ مکتب اہلبیتؑ کی احادیث کے مطابق رسولِ اکرمؐ معصوم ہیں، رحمۃ للعالمین ہیں، اشرف المخلوقات ہیں اور بہترین صفات اور اخلاق کے مالک ہیں۔ بلاشبہ یہ بات واضح ہے کہ ان نظریات سے ان لوگوں کا مذموم مقصد پورا نہیں ہوتا لیکن بدقسمتی سے وہ جو باتیں اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ سے منسوب کرنا چاہتے ہیں وہ انھیں خلفاء کے مکتب کی احادیث میں مل جاتی ہیں۔ یہ وہ احادیث ہیں جو اس مکتب سے تعلق رکھنے والے حضرات کے مطابق نہایت معتبر بھی ہیں لہٰذا اہل مغرب کی تقریباً تمام تر اسلام شناسی مکتبِ خلفاء کی کتابوں ہی سے پروان چڑھتی ہے۔

جن مستشرقین نے اسلام شناسی میں خصوصی مہارت حاصل کی ہے خواہ وہ فرانس میں ہوں یا ہالینڈ، بلجیم، روس اور انگلستان میں یا آجکل کے زمانے میں امریکہ میں ہوں ان کے کام کا مجموعی طور پر یہی انداز ہے۔ انھوں نے بڑی زحمت اٹھا کر قرآن، حدیث، تاریخ، فقہ اور کلام وغیرہ غرضیکہ پورے اسلام کو پڑھا ہے تاکہ وہ یہ ثابت کرسکیں کہ اسلام میں کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہے۔ چونکہ انھیں اپنے مقاصد کے لیے مکتبِ امامت کی کتابوں میں سے کوئی مواد نہیں ملا اس لیے انھوں نے اپنا مقصد مکتبِ خلفاء سے حاصل کیا ہے۔ یہودی اسلام شناس اگناس گلڈزیہر یا متعصب عیسائی اسلام شناس لوئی ماسینن خوب جانتے ہیں کہ وہ کہاں جائیں، کس سے مواد حاصل کریں اور کیا کہیں۔ ان لوگوں کی وہ تحریریں جن کا فارسی میں ترجمہ ہوچکا ہے مثلاً ویرژیل گیورگیو کی تحریر "محمدؐ پیغمبری کہ از نو باید شناخت"، پروفیسر منٹگمری واٹ کی کتاب "محمدؐ پیغمبر و سیاستدان"، پروفیسر برتولد اشپولر کی تالیف "جہانِ اسلام"

پروفیسر پطروشفسکی کی تحریر "اسلام در ایران" اور سب سے بڑھ کر "دائرۃ المعارف اسلامی" جو سبھی اطراف سے اسلام کی تخریب کے درپے ہیں وہ اپنے اقوال کے لیے مکتب خلفاءؓ ہی کی احادیث، تاریخ اور تفسیر سے مواد حاصل کرتے ہیں اور بس۔ جو لوگ اسلام کی پہچان کے لیے یورپ جانیوالوں یا خود یورپ والوں سے رجوع کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ابوجہل یا ابوسفیان سے کہا جائے کہ وہ رسولِ اکرمؐ کی بلند مرتبت شخصیت کی تعریف و توصیف کریں۔ جن کتابوں کا یورپی زبانوں سے ترجمہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ان میں اسلام شناسی پر مبنی تحقیق کی گئی ہے وہ درحقیقت شہد میں پٹا ہوا زہر ہیں... آخر تم امام باقرؑ اور امام صادقؑ کو چھوڑ کر ابوہریرہؓ اور انس بن مالک وغیرہ کے اسلام کی جانب کیوں رجوع کرتے ہو۔ کیا رسولِ اکرمؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں: قرآن اور میری عترت۔ اس فرمان کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے بحث و تحقیق کی ہے۔ اب ایک ہی بات ہے کہ " فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ "۔

امام علیؑ اور بی بی فاطمہؑ کا کربناک دکھ یہی ہے۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا دکھ بھی یہی ہے۔ یورپی اسلام شناسی کی جانب رجوع کرنا کربلا کے شہیدوں کے مقدس خون کو رائیگاں کرتا ہے نیز امام باقرؑ اور امام صادقؑ نے جو تکالیف اٹھائیں وہ بھی اکارت ہو جاتی ہیں۔ اس مقام پر ہماری سوچ، ہمارا احساس اور ہمارا عمل کیا ہونا چاہیے؟

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ

●●●●●

نواں درس

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ
بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ مَا أَنْتَ
بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ .... فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ.
هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ.

ہماری بحث اس موضوع پر تھی کہ اسلام کی اصلی شکل کیا تھی اور بعد میں اس نے کیا صورت اختیار کی نیز یہ کہ اس سلسلے میں اب ہماری کیا ذمہ داری ہے؟

ہم نے بحث کے دوران یہ دیکھا کہ رسول اکرمؐ نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی کہ جو کچھ گزشتہ امتوں میں ہوا ہے، وہ اس امت میں بھی وقوع پذیر ہوگا۔

اس امت نے بعینہٖ اسی طرح جس طرح کہ پیشین گوئی کی گئی تھی اسلام کے کچھ پہلوؤں میں تحریف کی۔

گزشتہ امتوں میں خدا کے دین میں تحریف کے بعد ایک نیا پیغمبر مبعوث ہوجاتا تھا اور آسمانی شریعت کی ایک مرتبہ پھر تجدید ہو جاتی تھی لیکن حضرت ختمی مرتبتؐ کا دین تو آخری آسمانی دین ہے لہٰذا اس دین میں تحریف کر کے اسے جن مصائب سے دوچار کر دیا گیا ہے اس بارے میں ہمیں کیا کام انجام دینا چاہیے؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ اس امت میں دین کی تجدید ائمہ اہلبیتؑ کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔

★

اسلام میں عواملِ تحریف کی تحقیق کے سلسلے میں جو وجوہات ہمارے سامنے آئی ہیں ان میں پہلی اور شاید سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ صدرِ اوّل کے مقتدر لوگوں نے

احادیثِ رسولؐ ــــ جو اسلام کا دُوسرا رکن تھیں ــــ کی نشر و اشاعت پر پابندی عائد کردی۔ اس پابندی پر عملدر آمد کے دوران بہت سی تحریر شدہ حدیثیں جلادی گئیں، بعض صحابۂ کرام کو سزائیں دی گئیں، بعض کو قید خانے میں ڈال دیا گیا اور بعض کو جلاوطن کر دیا گیا۔ ان اقدامات کے ذریعے حکومت وقت نے لوگوں کی زبانوں پر مہر لگادی۔

لیکن طاقت کے اس وسیع استعمال اور تمام تر سخت گیری کے باوجود بھی کچھ احادیث خفیہ طور پر حتیٰ کہ علانیہ طور پر نشر ہو گئیں۔ یہ صورت دیکھ کر حکّام نے کوشش کی کہ رسول اکرمؐ کی ان احادیث کو جو ان کے ذاتی مفادات کے لیے خطرہ بن سکتی تھیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

اُن کی اِن کوششوں نے وضعی حدیثوں کے ایک سلسلے کی شکل اختیار کی جو رسولِ مقبولؐ کی شخصیت اور آپ کے ارشادات کے تقدس کو مجروح کرنے کے لیے وضع کی گئیں۔

اس قسم کی احادیث کے ایک دستے میں رسول اکرمؐ کے ان کلمات کا توڑ کیا گیا جو آنحضرتؐ نے اسلام کی حامی اور مخالف شخصیتوں کی تعریف یا مذمّت میں ارشاد فرمائے تھے۔ اس مقصد کے تحت رسولِ اکرمؐ کے نام سے یہ روایت نقل کی گئی کہ آپ نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا: بار الٰہا! میں کسی وقت غصّے اور کسی وقت خوشی کی بنا پر کسی شخص کی تعریف یا مذمّت میں کوئی بات کہہ دیتا ہوں۔ پس میں جن لوگوں پر لعنت کروں ان کے لیے اس مذمت اور لعنت کو پاکیزگی، بزرگی اور اپنے تقرب کا ذریعہ قرار دے۔

اس قسم کی روایات کے ایک اور دستے میں رسول اکرمؐ کے ان احکام کا اعتبار ختم کیا گیا ہے جو انہوں نے لوگوں کے دنیاوی امور کی اصلاح مثلاً گھر کی تنظیم، اقتصادی مسائل، نظام سیاست، نیز امت کی رہبری اور امامت وغیرہ کے بارے میں دیے۔ ان جعلی روایات میں سے ایک میں گویا آنحضرتؐ فرماتے ہیں: تم اپنے دنیاوی امور اور مسائل کو مجھ سے بہتر طور پر سمجھتے ہو کیونکہ تم اپنے ان کاموں سے بخوبی واقف ہو۔ (اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسے معاملات میں جو کچھ میں کہوں تم اس کی پروا نہ کیا کرو اور اپنی عقل، رائے اور تدبر کے مطابق عمل کیا کرو)۔

ان احادیث کے تیسرے مجموعے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ کی بلند و بالا شخصیّت کو ایک عام انسان کی سطح پر لایا جائے بلکہ اس سے بھی گھٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں رسول اکرمؐ کو ایک بھلکّڑ شخص کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ قرآن کی آیات بھول جاتے ہیں۔ جنابت کی حالت میں مسجد میں آتے ہیں اور نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بعض احادیث میں آنحضرتؐ پر جادو کا اثر ہو جانے کی داستان بیان کی گئی ہے اور جادو کو اتنا زبردست بتایا گیا ہے کہ اس کے نتیجے میں آنحضرتؐ معمولی عقل و ہوش سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی کچھ اور جعلی احادیث میں رسول اکرمؐ ایک ایسے شخص دکھائی دیتے ہیں جو راگ رنگ اور ناچ سے پرہیز نہیں کرتا اور نہ صرف یہ کہ خود بڑی دلچسپی سے ان چیزوں کو دیکھتا اور سنتا ہے بلکہ جن کو یہ کام برے لگتے ہیں انھیں بھی گانے بجانے اور ناچنے والوں کو روکنے سے منع کرتا ہے!

یہ تھا ہمارے گزشتہ مباحث کا خلاصہ، اور اسے دہرانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ اسلام کی تاریخی سرنوشت کے حساس ترین نقاط کا حامل ہے جو اسلام شناسی کا اہم ترین مواد تشکیل دیتا ہے نیز یہ کہ ائمۂ اہلبیتؑ نے احیائے دین میں جو شاندار کردار ادا کیا ہے اس کی مؤثر انداز میں نشاندہی کرتا ہے۔

خلفاء کے مکتب میں نزول وحی کی کیفیت

اب ضروری ہے کہ ہم ان روایات کا مطالعہ کریں جن میں وحی الٰہی کے حریم قدس کو حملے کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اسلام کی مصیبت انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور اسلام کے جانے پہچانے یا ڈھکے چھپے دشمن حرم اسلام کے سب سے زیادہ اندرونی نقاط تک تجاوز کرتے ہیں اور اسلام کی ہر چیز حقیقی خطرے میں گھر جاتی ہے۔

اس مسئلے سے تعلق رکھنے والی روایات چار یا پانچ صورتوں میں آئی ہیں۔ ان میں سے اہم دو ہیں، جن میں سے ایک ام المومنین بی بی عائشہ سے اور دوسری عبید بن عمیر لیثی سے نقل کی گئی ہیں۔ ان دو روایتوں میں سے جو نزول وحی کی ابتدا کے واقعات کو تفصیل

سے بیان کرتی ہیں معتبر ترین روایت بی بی عائشہ سے نقل کی گئی ہے۔ یہ روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں کئی مقامات پر اور مسند احمد بن حنبل میں چار مرتبہ آئی ہے۔ نیز ابن ہشام، تاریخ ابن اثیر، تاریخ اسلام ذہبی، امتاع الاسماع مقریزی، عیون الاثر ابن سید الناس، طبقات ابن سعد، تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر، تفسیر قرطبی حتیٰ کہ تفسیر فی ظلال القرآن سید قطب میں بھی موجود ہے۔

۱۔ ام المومنین سے منقول روایت میں وحی کے ابتدائی واقعات کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے:

شروع شروع میں آنحضرتؐ پر رویائے صادقہ کی شکل میں وحی آتی تھی۔ یہ رویا صبح کی سفیدی کی مانند روشن ہوتی تھیں۔ بعد میں آنحضرتؐ تنہائی اور خلوت گزینی کو پسند فرمانے لگے۔ اب ان کی متعدد راتیں غارِ حرا[۱] میں گزرتیں جہاں آپ ذکر الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ کبھی کبھی آپ ضرورت کی چیزیں لینے کے لیے گھر تشریف لاتے اور پھر واپس غارِ حرا میں چلے جاتے۔ آنحضرتؐ اپنی زندگی کے دن اسی طرح گزارتے رہے حتیٰ کہ ایک دن اچانک ان پر حق آشکار ہو گیا۔ جبرئیل ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: اے محمدؐ! آپ خدا کے رسول ہیں۔ رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت کھڑا تھا اور گھٹنوں کے بل ہو گیا۔

یہ ملاقات یہیں ختم ہو گئی اور بعد میں اس حالت میں کہ میرا بدن کانپ رہا تھا میں چل کر گھر میں خدیجہ کے پاس پہنچا اور ان سے کہا: مجھ پر کپڑا ڈال دو! مجھ پر کپڑا ڈال دو! مجھ پر کپڑا ڈال دو! کچھ وقت گزرنے کے بعد اس اچانک ملاقات کا خوف اور اضطراب ختم ہو گیا۔ اس دوران میں جبرئیل دوبارہ میرے سامنے ظاہر ہوئے اور بولے: اے محمدؐ! آپ خدا کے رسول ہیں۔

---

[۱] "حرا" مکہ سے تین میل دُور شمال کی جانب ایک پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹی پر ایک غار ہے جہاں رسول اکرمؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ اسی وجہ سے اسے "جبل النور" کہا جاتا ہے۔ (معجم البلدان)

اس وقت میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا دوں گا اور عین اس وقت جب میں نے یہ ارادہ کیا۔ جبرئیلؑ تیسری مرتبہ میرے سامنے ظاہر ہوئے اور بولے: اے محمدؐ! میں جبرئیل ہوں اور آپ خدا کے رسول ہیں۔

تب جبرئیل نے کہا: پڑھو۔ میں نے کہا: کیا پڑھوں؟ انھوں نے مجھے تین مرتبہ زور سے بھینچا۔ ان کا دباؤ اتنا سخت تھا کہ شاید میرا دم نکل جاتا۔ پھر جبرئیل نے کہا:

اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ۔

یعنی پڑھو اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے خلق فرمایا۔ تب میں نے یہ پڑھا۔ یہ ملاقات ختم ہونے کے بعد میں خدیجہؓ کے پاس آیا اور کہا: میں اپنی جان کو خطرے میں پاتا ہوں۔ پھر میں نے جو واقعات گزرے تھے وہ سب انھیں بتاتے۔

خدیجہؓ نے کہا: آپ کو مبارک ہو۔ خدا کی قسم پروردگار آپ کو پست نہیں کریگا کیونکہ آپ صلۂ رحم کرتے ہیں اور صادق و امین ہیں۔ آپ لوگوں کی خاطر تکالیف اٹھاتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں۔ پھر مجھے ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں اور اس سے کہا: اپنے بھتیجے کی باتیں سنو۔ ورقہ نے مجھ سے پوچھا: کیا ماجرا ہے؟ میں نے جو کچھ ہوا تھا اسے کہہ سنایا۔ ورقہ نے کہا: یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ بن عمران پر نازل ہوا تھا۔ کاش میں بھی اس تحریک میں حصہ لے سکتا جس کی بنیاد آپ کے ہاتھوں رکھی جائیگی۔[۱]

۲۔ دوسری تاریخی روایت عبداللہ بن شداد نامی ایک شخص سے نقل کی گئی ہے۔ اس سے رسولِ اکرمؐ کے اس خوف کی وجہ واضح ہو جاتی ہے جس کی جانب گزشتہ روایات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس روایت کے مطابق آنحضرتؐ پہلی وحی کے بعد جو ان پر غارِ حرا میں نازل ہوئی بی بی خدیجہؓ کے پاس پہنچے اور ان سے فرمایا:

یَا خَدِیْجَةُ! مَا اَرَانِیْ اِلَّا قَدْ عُرِضَ لِیْ۔[۲]

---

[۱] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۹۔ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۷ باب بدء الوحی۔ طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۱۹۴۔۱۹۵

[۲] ابن اثیر: البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۸۳

اے خدیجہؓ! میرا خیال ہے کہ میں جنوں کے اثر سے دیوانہ ہو گیا ہوں۔
بی بی خدیجہؓ جواب دیتی ہیں: ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم! آپ کا پروردگار کبھی بھی آپ کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرے گا۔[1]

۳۔ اس موضوع پر مفصل ترین روایت عبید بن عمیر لیثی سے منقول ہے جس میں پہلی وحی کے وقت رسولِ اکرمؐ پر گزرے ہوئے حالات کچھ یوں بیان کیے گئے ہیں:
وحی کی داستان کا آغاز جبرئیل کے رسولِ اکرمؐ پر نازل ہونے سے ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ ہر سال ایک مہینے کے لیے عبادت کی خاطر غارِ حرا میں خلوت نشینی اختیار فرماتے تھے اور قریش کا یہ طریقہ تھا کہ ہر سال اسی طرح عبادت کیا کرتے تھے۔ رسولِ اکرمؐ بھی ہر سال اس خاص مہینے میں عبادت کرتے تھے۔ ان ایام میں اگر کوئی فقیر آپ کے پاس آتا تو آپ اسے سیر کرتے تھے۔

جب ایک مہینہ گزر جاتا اور اس میں کی جانے والی عبادت کا وقت ختم ہو جاتا تو آنحضرتؐ واپس مکہ آجاتے تھے۔ پہلے وہ مسجد الحرام میں جاتے اور سات بار یا اس سے زیادہ مرتبہ اس کا طواف کرتے، پھر اپنے گھر روانہ ہو جاتے۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا حتیٰ کہ وہ سال آگیا جس میں خدائے تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ انھیں بزرگی عطا کر کے رسالت کا لباس پہنائے اور اس وسیلے سے اپنے بندوں پر رحمت فرمائے۔
یہ واقعہ ماہ رمضان میں پیش آیا جبکہ رسولِ اکرمؐ حسبِ معمول خلوت نشینی اور عبادت کے لیے غارِ حرا میں تشریف رکھتے تھے اور آپ کے اہلِ خانہ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ ایک رات جب خدا نے ارادہ کیا کہ انھیں اپنی عنایات سے نوازے اور رسالت پر مبعوث کرے تو جبرئیل آپ کے پاس آئے۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں: جبرئیل میرے پاس آئے، وہ دیبا کا ایک غلاف اپنے ساتھ لائے جس پر کوئی تحریر موجود تھی۔ میں اس وقت نیند میں تھا۔ جبرئیل نے مجھ سے کہا: پڑھو! میں نے کہا: میں پڑھ نہیں سکتا! تب انھوں نے مجھے پکڑا اور

---

[1] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۹ - ۳۰۰

زور سے بھینچا حتیٰ کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا دم نکلنے والا ہے۔ پھر انھوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو۔ میں نے پوچھا: کیا پڑھوں ؟ یہ الفاظ میں نے اس لیے کہے کہ کہیں دوبارہ شدید دباؤ میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ جبرئیل نے کہا:

اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ.

..... عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ.

میں نے یہ پڑھا اور وہ چلے گئے۔ میں نیند سے جاگ اٹھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ جو الفاظ میں نے پڑھے ہیں وہ میرے قلب پر نقش ہو گئے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ مزید فرماتے ہیں: خدا کی مخلوقات میں سے جتنا شاعروں اور دیوانوں کا مخالف تھا، اتنا کسی اور کا مخالف نہیں تھا یہاں تک کہ میں انھیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ (نعوذ باللہ) یہ بدبخت (یعنی محمدؐ) یا تو شاعر بن گیا ہے یا دیوانہ ہو گیا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ یہ باتیں قریش تک پہنچیں اور پھر وہ ان باتوں کو دہرائیں، اس لیے میں ابھی پہاڑ کی چوٹی پر جاتا ہوں اور اپنے آپ کو وہاں سے نیچے گرا کر خودکشی کر لیتا ہوں تاکہ اس پریشانی سے چھٹکارا پا جاؤں۔

یہ سوچ کر میں غارِ حرا سے باہر آیا اور خودکشی کے ارادے سے آدھا پہاڑی راستا طے کر کے نیچے چلا گیا۔ اسی اثنا میں آسمان سے آنے والی ایک آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا جس کے الفاظ یہ تھے: اے محمدؐ! آپ خدا کے رسول ہیں اور میں جبرئیل ہوں۔

رسولِ اکرمؐ مزید فرماتے ہیں: میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا تو جبرئیلؑ کو ایک آدمی کی صورت میں افق پر کھڑے دیکھا۔ تب میں خودکشی کا ارادہ چھوڑ کر وہاں کھڑا ہو گیا تاکہ اسے دیکھوں۔ پھر میں نے نہ ایک قدم آگے بڑھایا اور نہ پیچھے ہٹایا۔ میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اور جبرئیل کو اسی طرح دیکھ رہا تھا جیسے شروع میں دیکھا تھا، یہاں تک کہ وہ چلے گئے اور میں اپنے گھر والوں کے پاس واپس آ گیا۔ میں خدیجہؓ کے پاس گیا، ان کی ران پر بیٹھ گیا اور انھیں بھینچ لیا۔

بی بی خدیجہؓ نے کہا: اے ابوالقاسمؐ! آپ کہاں تھے۔ میں نے جن لوگوں کو

آپ کی تلاش میں بھیجا تھا، انھوں نے سارے مکہ شہر کو نور میں ڈوبا ہوا دیکھا۔ رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ میں نے خدیجہ سے کہا: یہ بیچارہ (محمدؐ) یا تو شاعر بن گیا ہے یا دیوانہ ہوگیا ہے یا پھر اس پر آسیب کا اثر ہوگیا ہے۔

بی بی خدیجہؓ نے کہا: اے ابوالقاسمؐ! میں آپ کو ان چیزوں سے خدا کی پناہ میں دیتی ہوں۔ خدا آپ کے لیے یہ چیزیں پسند نہیں کرے گا کیونکہ میں آپ میں راستگوئی، امانتداری، حُسنِ خلق اور صلۂ رحمی دیکھتی ہوں۔ اے میرے چچا کے بیٹے! آخر آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ شاید آپ نے کوئی چیز دیکھی ہے۔

میں نے جواب دیا: ہاں! پھر میں نے تمام واقعات انہیں سنائے۔

بی بی خدیجہؓ نے جواب دیا: اے میرے چچا کے بیٹے، آپ کو مبارک ہو آپ اس راستے پر مضبوطی سے جمے رہیں۔ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ آپ اس قوم کے پیغمبر ہوں گے۔

پھر وہ اٹھیں، لباس تبدیل کیا اور ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو اُن کا چچازاد بھائی تھا۔ ورقہ ایک عیسائی تھا اور ایک عالم شخص تھا جو تورات اور انجیل سے واقفیت رکھتا تھا۔ خدیجہؓ نے جو کچھ مجھ سے سنا تھا، اسے بتایا۔

سارا ماجرا سننے کے بعد ورقہ بن نوفل نے کہا:

"قدّوس ہے۔ قدّوس ہے! اے خدیجہؓ مجھے اس کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم ٹھیک کہہ رہی ہو تو ان کے پاس ناموسِ اکبر (جبرئیل) آئے ہیں، جو موسیٰؑ کے پاس آیا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس قوم کے پیغمبر ہیں۔ انھیں میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ وہ اپنے راستے پر قائم رہیں!

بی بی خدیجہؓ گھر آئیں اور جو کچھ ورقہ بن نوفل نے کہا تھا رسولِ اکرمؐ کو کہہ سنایا۔ یوں آنحضرتؐ کا ذہنی تناؤ دُور ہوگیا اور ان کے دل سے شاعر یا دیوانہ ہو جانے کا خوف جاتا رہا۔

پھر چند دن بعد رسولِ اکرمؐ اور ورقہ کے درمیان مسجد الحرام میں ملاقات ہوئی۔ ورقہ نے آنحضرتؐ سے حال احوال پوچھا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ جو واقعات

آپ کو پیش آئے تھے آپ ان کی خاص خاص باتیں اسے بتائیں۔ آنحضرتؐ نے اسے تمام باتیں بتائیں جنہیں سن کر ورقہ نے کہا: مجھے اس کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ آپ اس قوم کے پیغمبر ہیں۔ آپ کے پاس وہی ناموس اکبر آئے ہیں جو موسیٰؑ کے پاس آیا کرتے تھے۔ لوگ یقیناً آپ کو جھٹلائیں گے، تکلیفیں دیں گے، آپ کو آپ کے آبائی شہر سے نکال دیں گے اور آپ سے جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اگر میں اس وقت موجود ہوا تو آپ کی یوں مدد کروں گا کہ خدا راضی ہو جائے۔ پھر اس نے جھک کر آنحضرتؐ کی پیشانی چومی۔ اس ملاقات کے بعد آنحضرتؐ بڑی دلجمعی اور اطمینان کی حالت میں گھر لوٹے کیونکہ آپ کی پریشانی دُور ہو گئی تھی۔[1]

۴۔ ایک اور روایت میں جو "عکرمہ" نے عبداللہ بن عباس سے نقل کی ہے، یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے:

ایک دن جب رسولِ اکرمؐ صفا کے نزدیک اجیاد کی سرزمین میں تشریف فرما تھے، آپ نے دیکھا کہ ایک فرشتہ دُور آسمان کے افق پر اچانک ظاہر ہوا۔ وہ اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھے ہوئے بہ آواز بلند کہہ رہا تھا: اے محمدؐ! میں جبرئیل ہوں۔ اے محمدؐ! میں جبرئیل ہوں!

فرشتے کو یوں اچانک دیکھ کر رسول اکرمؐ پریشان ہو گئے۔ آپ بار بار اپنا سر زمین کی جانب جھکا لیتے تھے لیکن جب دوبارہ سر اٹھاتے تھے تو فرشتے کو افق پر موجود پاتے تھے۔ یہی بات تھی کہ آپ وہاں ٹھہرے نہیں بلکہ جلدی سے گھر آ گئے اور اپنی بیوی خدیجہ کو اس سارے واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا: اے خدیجہ! میں ان بتوں سے زیادہ کسی اور چیز کو اور ان کاہنوں سے زیادہ کسی دُوسرے شخص کو دشمن نہیں رکھتا لیکن اب میں ڈر رہا ہوں کہ شاید میں خود بھی کاہن بن گیا ہوں۔

---

[1] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۰۶ - ۲۰۸ پہلا ایڈیشن مصر، جلد ۲ صفحہ ۳۰۰-۳۰۲ مطبوعہ دار المعارف، سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۳۶ - ۲۳۹ مطبوعہ مصر ۱۳۷۵ھ - الاکتفاء جلد ۱ صفحہ ۲۶۳-۲۶۶ مطبوعہ مصر۔

خدیجہؓ نے جواب دیا: نہیں، ایسا نہیں ہے۔ آپ یہ باتیں منہ سے نہ نکالیں۔ خدا ہرگز آپ سے ایسا سلوک نہیں کرے گا کیونکہ آپ صلۂ رحم کرتے ہیں اور ..... [1]

۵۔ عروہ بن زبیر کی روایت میں رسولِ اکرمؐ کے الفاظ یوں نقل ہوئے ہیں:
اے خدیجہؓ! میں ایک نور دیکھتا ہوں اور ایک آواز سنتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ مبادا میں کاہن نہ بن جاؤں ..... [2]

۶۔ ایک اور روایت کے مطابق جو عکرمہ نے ابن عباس سے نقل کی ہے رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: اے خدیجہؓ! میں ایک آواز سنتا ہوں اور ایک روشنی دیکھتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں دیوانہ تو نہیں ہو گیا۔ [3]

روایات کی تحقیق

جو روایات اوپر نقل کی گئی ہیں وہ کئی لحاظ سے تجزیے کے قابل ہیں اور ان کا بغور مطالعہ کرنے سے ان کی اسناد کا ضعف اور ان کے متن کا کذب وجعل واضح ہو جاتا ہے۔ ہم انہیں سے ہر ایک روایت پر مختلف پہلوؤں سے غور کریں گے اور ان میں موجود جعلسازی اور دروغ بافی کی نشانیوں کا پتا چلائیں گے۔

اسناد تجزیہ

ان روایات میں پانچ ایسے راوی ہیں جن پر ان روایات کی سند منتہی ہوتی ہے یا کم از کم یہ روایات ان سے منسوب ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ راویوں کا ایک سلسلہ ہے جو ان لوگوں پر مشتمل ہے:

ام المومنین بی بی عائشہ، عبداللہ بن شدّاد، عبید بن عمیر لیثی، عبداللہ بن عباس اور پھر عروہ بن زبیر۔

---

[1]، [2] اور [3] طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۹۵ مطبوعہ بیروت ۱۳۷۶ھ۔ چوتھی اور چھٹی روایت میں آنحضرتؐ کی ورقہ سے ملاقات اور اس کے آپ کو تسلی اور اطمینان دلانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جس وقت آنحضرتؐ پر پہلی وحی کے نزول کا واقعہ پیش آیا اس وقت ان افراد میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل تفصیل سے واضح ہوتا ہے:

۱۔ بی بی عائشہ، آنحضرتؐ کی بعثت کے چوتھے، پانچویں یا چھٹے سال میں پیدا ہوئیں۔[۱]

۲۔ عبداللہ بن شدّاد لیثی رسولِ اکرمؐ کے صحابہ میں شمار نہیں کیے جاتے۔ وہ تابعین یعنی صحابہ کے بعد کی نسل میں سمجھے جاتے ہیں۔ وہ رسول اکرمؐ کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے لیکن نوعمری کی وجہ سے آنحضرتؐ کی زیارت نہ کر پائے۔ وہ ۸۱ھ میں کوفہ میں قتل کر دیے گئے۔[۲]

۳۔ عبید بن عمیر لیثی بھی رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے آخری زمانے میں پیدا ہوئے۔ عبداللہ بن شدّاد کی طرح ان کو بھی آنحضرتؐ کے صحابہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔[۳]

۴۔ عبداللہ بن عباس بعثت کے بعد دسویں سال میں یا ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے۔[۴] علاوہ ازیں ابن عباس سے ان روایات کو نقل کرنے والا عکرمہ ہے جو علمائے رجال کی گواہی کے مطابق ایک جھوٹا شخص تھا جس نے اپنی گھڑی ہوئی بہت سی جھوٹی روایات ابن عباس سے منسوب کر دیں۔[۵]

۵۔ عروہ بن زبیر کو جو خلیفہ عمر کے دورِ حکومت میں پیدا ہوئے تابعین کے دوسرے طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔[۶]

لہٰذا جن لوگوں نے نزولِ وحی کے آغاز کا یہ واقعہ سب سے پہلے نقل کیا ہے ان میں سے کوئی بھی اس کے وقوع پذیر ہونے کے زمانے میں موجود نہ تھا۔ پھر جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کسی واقعہ کو خود موجود ہوئے یا عینی شاہدوں کی گواہی کے بغیر نقل نہیں کیا جا سکتا جبکہ مذکورہ بالا تمام راویوں نے یہ واقعہ کسی واسطے کے بغیر نقل کیا ہے۔

---

[۱] اسد الغابہ جلد ۷ صفحہ ۱۸۹ نیا ایڈیشن مطبوعہ کتاب الشعب مصر۔ [۲] تقریب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۴۲۲ مطبوعہ المکتبۃ العلمیہ مدینہ [۳] تقریب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۵۴۴ [۴] اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۲۹۱۔
[۵] میزان الاعتدال جلد ۳ صفحہ ۹۴ [۶] تقریب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۱۹۔

ان میں صرف عبید بن عمیر لیثی ہیں جو خود رسولِ اکرمؐ سے روایت کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے بھی ہرگز آنحضرتؐ کی زیارت نہیں کی کیونکہ وہ آنحضرتؐ کے زندگی کے آخری زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے رجال انہیں صحابہ میں نہیں بلکہ تابعین میں شمار کرتے ہیں لہٰذا ایسی روایت' تاریخ یا حدیث میں کسی بھی طرح معتبر نہیں ہو سکتی۔ یاد رہے کہ ہم نے یہاں ان راویوں کی شخصیت اور ان کی صداقت کے معیار کا مطالعہ نہیں کیا ہے کیونکہ اس کام کے لیے ایک الگ باب کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید کا قطعی فیصلہ

زیرِ بحث روایات کے متن اور مفہوم کے بارے میں قرآن مجید کا فیصلہ بالکل قطعی ہے چنانچہ ہم ان روایات کی سند کی کمزوری سے صرفِ نظر کرتے ہوئے' قرآن مجید کو معیار قرار دے کر ان پر بھرپور تنقید کر سکتے ہیں۔

اسلام کی آسمانی کتاب میں غور و فکر کرنے سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی نبوّت کوئی اچانک رونما ہونے والا اور انوکھا واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کا ذکر مختلف شکلوں میں ہو چکا تھا مثلاً:

تمام پیغمبروں سے آپ کی نبوّت کا عہد لیا گیا تھا اور انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آپ کی حمایت اور مدد کریں گے۔

اولوالعزم پیغمبروں نے آپ کے وجود' ظہور اور بعثت کی بشارت دی تھی۔

توراۃ اور انجیل میں آپ کا اور آپ کے بعض پیروؤں کے ناموں اور صفتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

اہلِ کتاب آنحضرتؐ کو بخوبی پہچانتے تھے۔ وہ آپ کے نام و نشان' خصوصیات اور صفات کے پورے علم اور آگاہی کے ساتھ آپ کو قبول کرتے تھے یا بعض اوقات انکار کر دیتے تھے۔

ذیل میں ہم اس موضوع سے متعلق قرآنی آیات کا مطالعہ کریں گے اور ہر ایک کے بارے میں مختصر بحث بھی کریں گے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّ حِکْمَةٍ ..... مِنَ الشّٰهِدِیْنَ [۱]

(وہ وقت یاد کرو) جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ ہم جو کتاب اور حکمت تمھیں عطا کریں۔ اس کے بعد اگر تمہارے پاس کوئی رسول آئے اور تمہارے پاس جو آسمانی کتاب ہے، وہ اس کی تصدیق کرے تو تم اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا۔ (اس کے بعد) خدا نے ان سے فرمایا کہ تم نے اقرار کر لیا اور جن باتوں کا ہم نے تم سے اقرار لیا ان کا بوجھ اٹھا لیا؟ سب نے عرض کیا کہ ہم نے اقرار کیا۔ تب خدا نے فرمایا: اچھا تم اس اقرار کے گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ ایک گواہ ہوں۔

ہمارے اعتقاد کے مطابق، انبیاءؑ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ ان میں سے تین سو سے کچھ اوپر وہ انبیاءؑ ہیں جنہیں رسالت اور پیغام رسانی کے منصب پر فائز کیا گیا[۲] یعنی ان سب بزرگواروں کا تعلق عالم بالا اور عالم غیب سے ہے لیکن فقط پیام لانے والے اور صاحبانِ رسالت اس کام پر مامور ہیں کہ عالم غیب سے جو معلومات انھیں حاصل ہوں وہ لوگوں تک پہنچائیں۔

اس آیت میں اقرار کے بارے میں گفتگو ہے جو تمام انبیاءؑ سے (یعنی ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ سے) لیا گیا تاکہ وہ اُن رسولوں کے بارے میں جو بعد میں آئیں اور ان کے پاس موجود حقائق کی تصدیق کریں دو فریضے انجام دیں:

۱- ان پر ایمان لائیں لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ۔

۲- ان کی مدد کریں لَتَنْصُرُنَّهٗ۔

اس آیت کی تفسیر میں دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نظریے کی بنیاد ان معتبر روایات پر ہے جو دونوں مکاتب یعنی مکتبِ امامت (تشیع) اور مکتبِ خلافت (تسنن) میں موجود ہیں۔ یہ روایات واضح طور پر بتاتی ہیں کہ یہ عہد تمام انبیاء علیہم السلام سے (یعنی حضرت آدمؑ سے لیکر ان میں سے آخری بزرگوار تک سے)

---

[۱] سورۂ آل عمران۔ آیت ۸۱ [۲] صدوق: الخصال صفحہ ۶۰۴ مطبوعہ نجف۔ مفید: الاختصاص صفحہ ۲۶۴۔ بحار الانوار جلد ۱۱ صفحہ ۳۰۔ ۳۲۔ ۳۳۔

دیا گیا کہ وہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں اور اگر آنحضرتؐ کا زمانہ پائیں تو ان کی مدد کریں۔ پھر انبیاءؑ کو حکم دیا گیا کہ اپنی قوم سے بھی اس بارے میں عہد لیں۔

حضرت علی بن ابی طالبؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا نے کسی پیغمبر کو مبعوث نہیں فرمایا بجز اس کے کہ اس سے محمدؐ کے بارے میں عہد لیا کہ اگر وہ زندہ ہو اور آنحضرت مبعوث ہو جائیں تو وہ پیغمبر ضرور ان پر ایمان لائے گا اور ان کی مدد کرے گا۔ پھر ان انبیاءؑ کو حکم ہوا کہ وہ اپنی اپنی قوموں اور امتوں سے بھی ایسا ہی عہد لیں[1]

ایک اور روایت میں جو زیادہ مفصّل ہے امام علیؑ سے یوں نقل کیا گیا ہے: خدا نے انبیاءؑ سے عہد لیا کہ وہ اپنی اپنی امتوں کو حضرت خاتم النبیینؐ کے بلند مقام کی خبر اور ان کی بعثت کی بشارت دیں گے۔ نیز انہیں حکم دیں گے کہ (اگر وہ آنحضرتؐ کے زمانے میں ہوں تو) آپ کی تصدیق کریں[2]

۲- وَاِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا.....[3]

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں اور توراۃ کی تصدیق کرتا ہوں جو مجھ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور تمہیں ایک پیغمبر کی خوشخبری سناتا ہوں جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمدؐ ہوگا۔ پھر جب وہ پیغمبر (احمدؐ) ان کے پاس واضح اور روشن معجزے لے کر آئے تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

اس آیت میں جو پیغام ہے وہ کمال کی حد تک صریح ہے۔ یہ آیت بڑے واضح طور پر

---

[1] تفسیر طبری جلد ۳ صفحہ ۲۳۶۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۱ صفحہ ۳۷۸۔ تفسیر درمنثور۔ تفسیر قرطبی جلد ۴ صفحہ ۱۲۵ مطبوعہ دار الکتب العربی قاہرہ۔ تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۱۵ [2] تفسیر تبیان جلد ۲ صفحہ ۵۱۳۔ تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۶۸۔ تفسیر صافی جلد ۱ صفحہ ۲۷۴ [3] سورۂ صف۔ آیت ۶

بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کے دور میں رسولِ اکرمؐ کا ذکر آپ کے خاص نام کے ساتھ کیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیغام کے ایک حصے میں آنحضرت کے وجود اور رسالت کی بشارت دی۔

یہ جو خیال کیا جاتا ہے کہ ایسی باتیں ایک دعوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں کسی وجہ سے بھی درست نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآن مجید کینہ اور دشمنی کے ماحول میں نازل ہوا اور اگر یہ دعویٰ جھوٹا ہوتا تو اسلام کے دشمن جو اس کے خلاف سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے ایک لحظہ کے لیے بھی خاموش نہ بیٹھتے۔ وہ لوگ جو ہزاروں سپاہی اور جنگجو قرآن کے پیروؤں کے مقابلے پر لے آتے تھے فقط ایک غلطی اور بے بنیاد دعوے سے فائدہ اٹھا کر کسی زحمت کے بغیر اسلام کی ابتداء میں اس کا گلا گھونٹ سکتے تھے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ یہ فرض کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جن بشارتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہمارے زمانے کی اناجیل میں موجود نہیں ہیں لیکن خوش قسمتی سے انجیل کے نسبتاً قدیم ترجموں اور اشاعتوں میں ان بشارتوں کے نمونے مل جاتے ہیں مثلاً فرانسیسی پادری ف۔ لامنہ کے یوحنا کی انجیل کے فارسی ترجمے میں اور اسی کتاب کے انگریز پادری رابنسن کے عربی ترجمے میں چودھویں فصل (آیات ۱۶، ۱۷، ۲۵، ۲۶) اور پندرھویں فصل (آیت ۲۶) اور سولھویں فصل (آیات ۷، ۱۲، ۱۳، ۱۴) میں "فارقلیط" کا نام لیا گیا ہے اور ان کی صفات اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ یہ لفظ (فارقلیط) یونانی لفظ "بریکلیتوس" اور عربی کے لفظ "احمد" کا ہم معنی ہے [1]

۳۔ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ ..... [2]

(پرہیزگار) وہ لوگ ہیں جو اس رسول اور امی نبی کی پیروی کرتے ہیں جس

---

[1] لامنہ کا انجیل کا ترجمہ فرانس کے شہر پیرس میں شائع ہوا اور مجلس شوریٰ ملی (ایران) کی لائبریری میں نمبر شمار ۱۷۶۳ کے تحت موجود ہے۔ رابنسن کا انجیل کا ترجمہ ۱۸۳۱ء میں لندن میں طبع ہوا اور مؤلف کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ [2] سورۂ اعراف۔ آیت ۱۵۷

کا نام اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔ وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا اور برے کاموں سے روکتا ہے۔ وہ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔

جو کچھ گزشتہ آیت میں کہا گیا تھا مندرجہ بالا آیت اس میں اضافہ کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ انجیل میں پیغمبر اسلامؐ کا نام و نشان بتایا گیا ہے بلکہ تورات بھی اس خصوصیت سے بہرہ مند ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں اس دشمنی کے ماحول میں اور عرب معاشرے میں یہودی علماء کے موجود ہوتے ہوئے ایسا جھوٹا دعویٰ کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا لیکن اس دلیل سے بڑھ کر ہم خوش قسمتی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ قدیم نسخوں میں ہمیں ایک آیت ملتی ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کی صریح نشانیاں مذکور ہیں۔

کتابِ استثنا کے تینتیسویں باب کی پہلی، دوسری اور تیسری آیات میں لکھا ہے کہ:

یہ ہے وہ دعائے خیر جو مردِ خدا موسیٰؑ نے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کے حق میں کی اور خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے نمودار ہوا اور کوہِ فاران پر جلوہ گر ہوا اور دس ہزار مقربین کے ساتھ وارد ہوا۔ اس کے دہنے ہاتھ سے انہیں ایک آتشیں شریعت ملی بلکہ وہ قبائل کو دوست رکھتا تھا اور اس کے تمام مقدس لوگ تیرے قبضے میں ہیں [1]

ان آیات میں تین مقامات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے یعنی سینا، سعیر اور فاران۔

سینا: یہودیوں اور عیسائیوں کی مروجہ کتابوں کے مطابق سینا وہ مقام ہے جہاں خدائے تعالیٰ نے اپنی شریعت کے قوانین اور فرامین حضرت موسیٰؑ پر

---

[1] **تورات:** پادری رابنسن نے اصل عبرانی سے اس کا ترجمہ کیا جو ۱۸۳۹ء میں رچرڈ واٹس پریس لندن سے طبع ہوا۔

نازل فرمائے۔ تورات کی کتاب احبار کے ساتویں باب کی ۳۷ ویں اور ۳۸ ویں آیات میں لکھا ہے:

"سوختنی قربانی........ کے بارے میں شرع یہ ہے جس کا حکم خداوند نے موسیٰؑ کو کوہِ سینا پر دیا تھا۔ اس کتاب کے ۲۵ ویں باب کی پہلی آیت میں لکھا ہے: اور خداوند نے کوہِ سینا پر موسیٰؑ سے خطاب کرتے ہوئے کہا........"

کتاب خروج میں حضرت موسیٰؑ کے کوہ سینا پر جانے اور خداوند سے ان کی ملاقات کا ذکر یوں کیا گیا ہے: اور جب موسیٰؑ پہاڑ کی بلندی پر پہنچے تو پہاڑ پر گھٹا چھا گئی اور خداوند کا جلال کوہِ سینا پر آکر ٹھہرا اور چھ دن تک گھٹا اس پر چھائی رہی اور ساتویں دن اس نے گھٹا کے درمیان میں سے موسیٰؑ کو آواز دی ..... اور موسیٰؑ چالیس دن اور چالیس راتیں پہاڑ پر رہے۔[۱]

عیسائی مذہبی محققین نے سینا کی تعریف یوں کی ہے: "یہ ایک پہاڑ ہے جو جزیرہ نمائے طور سینا میں واقع ہے اور خدائے تعالیٰ نے اس کی بلندی پر سے اپنی شریعت بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھی۔"[۲]

سعیر یا ساعیر فلسطین کے جنوب میں ایک پہاڑی سرزمین ہے جسے ادوم یا ادومیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ماہرین جغرافیہ کے نظریے کے مطابق ان پہاڑوں میں پہلی مرتبہ انجیل حضرت مسیح ابن مریمؑ پر نازل ہوئی۔[۳]

---

[۱] کتاب خروج۔ باب ۲۴۔ آیات ۱۵ سے ۱۸ تک۔

[۲] ڈاکٹر جیمز ہاکس، قاموس کتاب مقدس، مادہ سینا صفحہ ۴۹۸ طبع اول۔

[۳] معجم البلدان مادہ ساعیر جلد ۳ صفحہ ۱۷۱، مادہ فاران جلد ۴ صفحہ ۲۲۵۔ نیز قاموس کتاب مقدس مادہ ادومیہ صفحہ ۲۷۔۳۰، مادہ جلیل صفحہ ۲۸۹۔۲۹۰، مادہ ناصرہ صفحہ ۸۶۵۔۸۶۷، مادہ یہودیہ صفحہ ۹۸۲، مادہ فلسطین صفحہ ۶۶۰ اور اس کے بعد کے صفحات۔

فاران : اس لفظ کے بارے میں عیسائیوں کی مروجہ کتابوں میں کوئی قطعی وضاحت نہیں ملتی مثلاً کہا گیا ہے کہ "کوہِ فاران وہی پہاڑ ہے جہاں سے خداوند نے آنے کے وقت اپنا جلوہ دکھایا" اس پر اس عبارت کا اضافہ کیا گیا ہے: "اور معتبر یہ ہے کہ بنی اسرائیل جس دشت میں سرگرداں رہے فاران اس کے شمال مشرق میں واقع پہاڑوں کا جنوبی حصہ ہے۔"[۱]

تاہم کچھ ایسی نشانیاں موجود ہیں اور بعض ایسے قرائن دستیاب ہیں جو فاران کے محل وقوع کی بخوبی نشاندہی کرتے ہیں مثلاً کتاب پیدائش میں لکھا ہے: "تب ابراہیمؑ نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کا مشکیزہ لیا اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی .... اور جب مشکیزے کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور خود ایک تیر کے ٹپے پر جا کر دور بیٹھ گئی، کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ پھر وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی اور خدا نے اس کے لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو آواز دی اور اس سے کہا: اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا۔ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشکیزہ کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا......."[۲]

یہاں گفتگو حضرت اسماعیلؑ اور بی بی ہاجرہ کے بارے میں ہے اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں انھوں نے سرزمین مکہ میں سکونت اختیار کی اور چاہِ زمزم پہلی بار حضرت اسماعیلؑ

---

[۱] قاموس کتاب مقدس صفحہ ۶۴۲ [۲] تورات کتاب پیدائش باب ۲۱ - آیات ۱۴ تا ۲۱ - مطبوعہ ایڈنبرگ ۱۸۴۵ء۔

کے لیے اسی زمین سے ابلا تھا چنانچہ حضرت اسماعیلؑ اور بی بی ہاجرہ کی قبریں مسجد الحرام (مکہ) میں "حجر اسماعیلؑ" کے مقام پر اب بھی موجود اور معروف ہیں[1]

جو عظیم قوم حضرت اسماعیل سے وجود میں آنا تھی اور جس کا خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے وعدہ کیا تھا وہ قبیلہ قریش اور عرب قوم ہی ہے جو طلوعِ اسلام کے وقت اور اس کے بعد دنیا کی ایک تاریخ ساز قوم بن کر ابھری۔

یوں فاران یا پاران کے محل وقوع کا بخوبی پتا چل جاتا ہے۔ نیز قدیم جغرافیہ دانوں نے بھی اس کی تصریح کی ہے[2]

گزشتہ بحث پر توجہ دینے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں تین بڑے مذاہب کے ظہور کی جانب اشارہ کرتی ہے کیونکہ ان میں سے پہلے سینا میں، دوسرے ساعیر و فلسطین میں اور تیسرے حجاز اور کوہ فاران کے شہر مکہ میں ظاہر ہوئے۔ اس آیت میں کچھ اور نشانیاں بھی ہیں جو پیغمبر اسلامؐ پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ "اس نے کوہِ فاران سے نور پھیلایا اور وہ دس ہزار مقربین کے ساتھ وارد ہوا۔"

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے اس آیت میں تین بار ظہور خداوندی کا ذکر آیا ہے یعنی تین بڑی بعثتوں یا تین اولوالعزم اور صاحب شریعت پیغمبروں کے منصب نبوت پر مامور ہونے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ نیز اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ تیسری بعثت کوہِ فاران سے انجام پائے گی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں حضرت خاتم النبیینؐ پر پہلی وحی مکہ کے قریب واقع ایک پہاڑ کوہِ حرا (فاران) کے ایک غار میں نازل ہوئی اور ہم

---

[1] تاریخ یعقوبی جلد ۱ صفحہ ۱۸۲ - سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۵ - تاریخ طبری جلد ۱ صفحہ ۳۱۴ طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۵۲ - الاکتفاء جلد ۱ صفحہ ۶۳ - معجم البلدان جلد ۲ صفحہ ۲۱۱

[2] معجم البلدان جلد ۴ صفحہ ۲۲۵ - مطبوعہ بیروت

یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ آنحضرتؐ ہی تھے جنہوں نے بعثت کے چند سال بعد دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ مکہ شہر میں داخل ہو کر اسے فتح کر لیا۔ دس ہزار مقربین کے ہمراہ ہونے کا واقعہ فقط رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں پیش آیا ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ابتدا میں فقط ان کے بھائی ہارونؑ تھے اور مصر سے خروج کے وقت تمام بنی اسرائیل ان کے ہمراہ تھے جن کی تعداد کچھ معتبر مؤرخین نے چھ لاکھ سے زیادہ بتائی ہے[1] اور حضرت عیسیٰؑ کو ان کے دور کے خاتمے تک بہت ہی کم پیرو ملے جو تقریباً ۱۲۰ اشخاص تھے[2] جن میں سے بارہ افراد کا انتخاب کر کے انھیں حواری کا لقب دیا گیا اور وہ آپ کے مخصوص شاگرد اور مستقل ساتھی تھے[3]

تاہم عیسائیوں نے یہ کوشش کی ہے کہ تورات کی اس آیت میں تحریف کر کے اسے حضرت عیسیٰؑ کے ظہور سے وابستہ کر دیں لہٰذا کچھ جدید نسخوں میں مذکورہ بالا جملے کی بجائے یہ عبارت دیکھنے میں آتی ہے:

وَتَلَألَأَ مِنْ جَبَلِ فَارَانَ وَاَتٰی مِنْ رَبَوَاتِ الْقُدْسِ.

یعنی اس نے کوہِ فاران پر اپنا پرتو ڈالا اور قدس (بیت المقدس اور فلسطین) کی بلندیوں پر سے آیا ہے[4] اس تحریف کے علاوہ اس نسخے میں ساتھیوں کی تعداد کے بارے میں سرے سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ ایک فارسی ترجمے میں دس ہزار کی بجائے لکھا ہے: "ہزاروں ہزار مقدسوں کے ساتھ وارد ہوا۔"[5]

۲۔ "اور اس کے دہنے ہاتھ سے انھیں ایک آتشیں شریعت ملی"۔ یہ اسلام کی

---

[1] جیمز ہاکس: قاموس کتاب مقدس، مادہ خروج صفحہ ۳۴۹ پہلا ایڈیشن۔ بیروت ۱۹۲۸ء

[2] نیا عہدنامہ۔ رسولوں کے اعمال۔ باب اول۔ آیت ۱۶

[3] ورم میلر: قدیم کلیسا کی تاریخ صفحہ ۳۱-۳۲ (فارسی ترجمہ از علی نخستین، مطبوعہ جرمنی)

[4] تورات، ترجمہ عربی مطبوعہ امریکن پریس بیروت ۱۹۰۷ء

[5] تورات، ترجمہ فارسی از فاضل خاں ہمدانی۔ مطبوعہ ایڈنبرگ ۱۸۴۵ء

ایک اہم علامت کی تشریح ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں جہاد عبادت اور دین کا ایک رکن ہے جبکہ کسی دوسرے دین میں جہاد کا مسئلہ اس انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔

۴۔ "بلکہ وہ قبائل کو دوست رکھتا تھا۔"

یہ اسلام اور اس کے پیغمبرؐ کی ایک اور بڑی نشانی ہے۔ قرآن مجید اس بات کو یوں بیان کرتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

یعنی اے رسولؐ! ہم نے آپ کو نہیں بھیجا سوائے اس کے کہ آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔[1]

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ۔

یعنی اے رسولؐ! یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ تم سا نرم دل سرداران کو ملا ہے۔[2]

قدیم تورات میں یہ کہا گیا ہے کہ "کوہِ فاران سے ظہور کرنے والا پیغمبر تمام قبائل اور تمام لوگوں اور مختصراً تمام اہل عالم کے لیے مہر و محبت کے جذبات رکھتا ہے"۔ قرآنی آیات بھی پیغمبر اسلامؐ کی ان خصوصیات کو بیان کرتی ہیں اور ان کی تصدیق کرتی ہیں۔ تاہم بعد میں تورات کے جدید تر نسخوں میں یہ معنی بھی تحریف کا شکار ہو گئے اور ان کی یہ صورت ہو گئی کہ "وہ واقعی اپنے قبائل کو دوست رکھتا تھا"[3] یا "وہ واقعی اپنی قوم کو دوست رکھتا تھا"[4]

یہ تبدیلیاں اس لیے کی گئیں تاکہ پیغمبر اسلامؐ کی محبت اور رحمت کے آفاقی ہونے کی نفی ہو جائے اور یہ چیز بنی اسرائیل کی قوم سے مخصوص ہو جائے یا حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ پر منطبق ہو جائے۔

---

[1] سورۂ انبیاء۔ آیت ۱۰۷ [2] سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۵۹ [3] تورات مترجمہ فاضل ہمدانی [4] تورات فارسی، انجمن پخش کتب مقدسہ درمیان ملل۔

۴ - مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ....[1]

یعنی محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحمدل ہیں۔ تم انھیں اکثر رکوع اور سجود کی حالت میں دیکھو گے۔ وہ خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے خواستگار ہوتے ہیں۔ سجدوں کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر گھٹے پڑے ہوتے ہیں ان کے یہی اوصاف تورات اور انجیل میں بتائے گئے ہیں اور انہیں ایک ایسے درخت سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جب اس کا بیج بویا گیا تو اس نے پہلے زمین سے اپنی کمزور سوئی نکالی مگر بعد میں بڑھتے بڑھتے اپنی جڑ کے سہارے مضبوطی کے ساتھ سیدھا کھڑا ہوگیا اور اپنی تر و تازگی سے کسانوں کا دل خوش کرنے اور کافروں کا جی جلانے لگا۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ فقط رسولِ اکرمؐ کی ہی نہیں بلکہ ان کے صحابہ کی مخصوص صفات بھی اسلام کے ظہور سے صدیوں پہلے تورات اور انجیل میں بتائی گئی ہیں۔

۵ - وَلَمَّا جَآءَھُمْ کِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ ....[2]

یعنی اور جب ان یہودیوں کے پاس خدا کی طرف سے کتاب (قرآن) آئی جو اس کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے (تورات) تو اگرچہ وہ پہلے نبی کا واسطہ دیکر کافروں پر فتح یاب ہونے کی دعائیں مانگتے تھے لیکن جب وہ نبی ان کے پاس آگیا جسے وہ پہچانتے تھے تو انکار کرنے لگے۔ پس کافروں پر خدا کی لعنت ہے۔

یہودیت جزیرہ نمائے عرب میں یمن سے آئی۔ وہ یہودی جو مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں آباد تھے خدا کے آخری پیغمبرؐ کے انتظار میں اور ان کی زیارت کی

۱۔ سورۂ فتح - آیت ۲۹ ۲۔ سورۂ بقرہ - آیت ۸۹

امید باندھے اس سرزمین میں پہنچے تھے۔ چنانچہ یہودی فدک، خیبر یا مدینہ میں آکر آباد ہوئے۔ وہ اسی مقصد کی خاطر ترک وطن کر کے وہاں آئے تھے۔ جو یہودی مدینہ میں سکونت پذیر تھے انھیں بعد میں یمن کے دوسرے عرب قبائل کی وہاں آمد کا سامنا کرنا پڑا۔ یمن کے عرب جو نقل مکانی کر کے مدینہ پہنچے رفتہ رفتہ پھیلتے گئے اور انھوں نے دو بڑے قبیلوں یعنی اوس اور خزرج کی شکل اختیار کر لی۔ کبھی کبھی ان دو گروہوں میں جھڑپیں بھی ہو جاتی تھیں جن میں ایک طرف یہودی اور دوسری طرف اوس و خزرج کے قحطانی قبیلے ہوتے تھے۔ انھیں جھڑپوں کے دوران یہودی بھی دوسرے خدا پرستوں کی طرح دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے اور آنے والے پیغمبرؐ کے نام اور بزرگی کا واسطہ دے کر خدا سے فتح طلب کرتے تھے۔ قرآن مجید اس بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے:

يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوا۔[1]

بعض اوقات جب انھیں شکست ہو جاتی تو وہ اوس و خزرج کے لوگوں سے کہتے تھے: جلد ہی ایک پیغمبر اس سرزمین میں ظہور کرے گا، ہم اس سے وابستہ ہو جائیں گے اور تم سے انتقام لیں گے۔ انھیں لڑائی جھگڑوں اور دھمکیوں کے نتیجے میں اوس و خزرج یعنی مدینہ کے غیر یہودی عرب بھی رسولِ اکرمؐ کے نام اور آپ کی خصوصیات سے واقف ہو گئے حالانکہ تب وہ مکہ اس غرض سے آتے تھے کہ قریش سے جنگی کمک حاصل کریں۔[2]

گزشتہ مباحث کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہمیں پتا چلتا ہے کہ قرآن نے اپنی دو آیات میں جو تشریح فرمائی ہے وہ کتنی صحیح اور عمدہ ہے۔ خداوند عالم پہلی آیت میں فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ[3]

۱۔ تفسیر کشاف جلد ۱ صفحہ ۱۲۳ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۷۳ھ۔ تفسیر طبری جلد ۱ صفحہ ۳۲۵-۳۲۷۔ تفسیر جلالین صفحہ ۱۹۔ تفسیر در منثور صفحہ

۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۶ مطبوعہ حجازی، قاہرہ۔

۳۔ سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۴۶۔

یعنی جن لوگوں کو ہم نے (آسمانی) کتاب دی ہے وہ انہیں (پیغمبر اسلامؐ کو) اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دیدہ دانستہ حق بات کو چھپاتے ہیں اور سورۂ انعام کی آیت ۲۰ میں فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ.

یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ انہیں (پیغمبر اسلامؐ کو) اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے فرزندوں کو پہچانتے ہیں لیکن جن لوگوں نے آپ اپنا نقصان کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

ہم نے مذکورہ بالا آیات میں جو بات ملاحظہ کی وہ یہ تھی کہ قرآن مجید کی بنیاد پر اور تورات، انجیل اور تاریخ کی تائید کے ساتھ رسولِ اکرمؐ کی پیغمبری کا مسئلہ آپ کی تمام صفات اور نشانیوں کے ساتھ آپ کے ظہور سے پہلے ہی پیش کیا جا چکا تھا اور بہت سے اہل کتاب اور مشرک عرب اس سے واقف تھے۔ آپ کے شہر کے اپنے بیگانے سب لوگ نیز یہودی اور عیسائی علماء، آپ کے ظہور کے وقت آپ کی صفات آپ کی کتاب اور آپ کے دین کی خصوصیتوں کو جانتے تھے۔ ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کیا یہ چیز بعید اور محال نظر نہیں آتی کہ خود رسولِ اکرمؐ اپنی شخصیت، اپنے مقدر اور ان حقائق کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں؟

لہٰذا پہلی وحی کے بارے میں وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ اپنی نبوت کے متعلق شک و شبہ میں مبتلا تھے سند کی بنیادی خامیوں کے علاوہ متن کے لحاظ سے بھی قطعاً کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں کیونکہ وہ قرآن، تورات، انجیل اور تاریخ کی تصریحات کے حتیٰ کہ عقل کے بھی منافی ہیں۔

اب ہم ان روایات اور تاریخی واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں جن کا تعلق رسولِ اکرمؐ کی قبل بعثت کی زندگی سے ہے اور جو ہمیں ان لوگوں کے بارے میں بتاتی ہیں جنھیں آپ کی بعثت سے پہلے ہی آپ کے ظہور اور منصبِ رسالت پر فائز ہونے کا پورا علم تھا۔ یہ سب روایات زیرِ بحث حقیقت کے بارے میں کافی اشارات اور دلائل فراہم کرتی ہیں، نیز پہلی وحی کے متعلق مذکورہ روایات کے جعلی ہونے کے بارے میں ہماری دوسری سچی دلیل ہیں۔

حضرت خاتم النبیینؐ کا انتظار

بحیرا راہب کی خانقاہ

قریش کے سوداگروں کا معمول تھا کہ ہر سال ایک دفعہ شام اور ایک دفعہ یمن جاتے تھے۔ بعض اوقات قریش کے سردار حضرت ابو طالب بھی ان تجارتی سفروں میں شرکت فرماتے تھے۔ رسولِ اکرمؐ جو اپنے دادا حضرت عبد المطلب کی وفات کے بعد اپنے چچا حضرت ابو طالب کے زیرِ کفالت تھے ایک سفر میں ان کے ہمراہ تھے۔ جب آنحضرتؐ نے شام کا سفر کیا اس وقت آپ کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔

قریش کا قافلہ روانہ ہونے کو تیار تھا۔ بھتیجا اپنے چچا کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہا تھا اور سخت اصرار کر رہا تھا کہ مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔ اگرچہ قریش کا بزرگ اور مہربان سردار راستے کی تکالیف اور خطرات سے بخوبی آگاہ تھا لیکن وہ اپنے پیارے بھتیجے کو مایوس نہ کر سکا۔ پھر قافلہ روانہ ہو گیا لیکن ابھی اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچا تھا کہ بصریٰ[1] شہر کے قریب ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے حضرتِ ابو طالب کے سفر کا پروگرام درہم برہم کر دیا۔

بحیرا نامی ایک راہب جو عیسائی اور توحید پرست تھا[2] سالہا سال سے بصریٰ کے قریب ایک خانقاہ میں مقیم تھا اور وہاں عبادت میں مشغول رہتا تھا۔ وہ قدیم مذہبی کتابوں کا بڑا وسیع علم رکھتا تھا۔ اس خانقاہ میں عیسائی راہبوں کی کئی نسلوں نے زندگی بسر کی تھی۔ ہر راہب مرنے پر اپنی جگہ دوسرے کے سپرد کر جاتا تھا۔ ان کے

---

[1] دمشق کے نواح میں ایک شہر ہے۔ (معجم البلدان جلد ا صفحہ ۴۴۱)

[2] سیرت ابن ہشام جلد ا صفحہ ۱۹۲ مطبوعہ حجازی، قاہرہ۔

پاس ایک کتاب بھی تھی جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچتی رہی تھی۔ چنانچہ اس کتاب کی ایک گرانبہا میراث کے طور پر نگہداشت کی جاتی تھی کیونکہ ان راہبوں کے حصولِ علم کا سلسلہ اسی کتاب پر آکر ختم ہوتا تھا۔

قریش کا قافلہ ہر سال سستانے کے لیے اس خانقاہ کے پاس ٹھہرا کرتا تھا لیکن اہل قافلہ نے بحیرا کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ اس کے ساتھ رابطہ قائم کر سکتے تھے لیکن اس سال جونہی یہ لوگ وہاں اترے ان کی ملاقات بحیرا سے ہو گئی جو اپنی خانقاہ سے نیچے اتر کر انھیں کھانے کی دعوت دے رہا تھا۔ قریشیوں میں سے ایک شخص نے اس سے کہا: اے بحیرا! خدا کی قسم تمہارا آج کا عمل بڑا حیرت انگیز ہے۔ ہم سالہا سال سے تمہاری خانقاہ کے پاس سے گزرا کرتے ہیں لیکن تم نے ہمیں کبھی کھانے کی دعوت نہیں دی۔ بحیرا نے جواب دیا: ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو لیکن آج تم میرے مہمان ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تمہاری عزت افزائی کروں اور تمہارے لیے کھانے کا اہتمام کروں۔

سبھی قافلے والے اس کے دستر خوان پر جمع ہو گئے، صرف رسولِ اکرمؐ اپنی کم سنی کی بنا پر سامان کے پاس تشریف فرما رہے۔ جب اس عالم اور زاہد عیسائی نے مہمانوں پر نگاہ ڈالی تو ان میں اپنے مطلوب کو نہ پا کر ان سے کہا: اے قریشیو! تم میں سے کسی کو بھی میرے دستر خوان سے دور نہیں رہنا چاہیے۔

انہوں نے جواب دیا: سوائے ایک نوجوان کے جو سامان کی حفاظت کے لیے وہیں رہ گیا ہے باقی سب دستر خوان پر موجود ہیں۔

بحیرا نے کہا: نہیں۔ سب کو آنا چاہیے۔

قریشیوں میں سے ایک نے کہا: بے شک ہم سرزنش کے لائق ہیں کیونکہ ہم عبداللہ بن عبدالمطلب کے بیٹے کو اس دعوت میں اپنے ساتھ نہیں لائے۔ پھر رسولِ اکرمؐ کو بحیرا کے دستر خوان پر لایا گیا۔ بحیرا فقط اس کم سن مہمان کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بڑے غور سے اس قریشی نوجوان کی حرکات و سکنات، قد و قامت اور خد و خال پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ جب سب لوگ کھانا کھا چکے اور اٹھ کر چلے گئے تو اس نے

آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے کہا: اے نوجوان میں تمہیں لات اور عزیٰ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ تم میرے تمام سوالوں کے جواب دو گے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: تم لات اور عزیٰ کا نام لیکر مجھ سے کوئی بات مت پوچھو۔ خدا کی قسم! میں ایسی چیزوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

بحیرا نے کہا: پھر میں تمہیں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ میں تم سے جو کچھ پوچھوں تم مجھے بتاؤ گے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: تم جس چیز کے بارے میں چاہو سوال کرو۔

بحیرا نے آپ سے جاگنے، سونے اور دوسرے حالات زندگی کے متعلق سوالات کیے اور ان کے ایسے جوابات سنے جو اس کی توقع کے عین مطابق تھے۔ تب اس نے آنحضرت سے کہا: "کیا میں آپ کے دونوں کندھوں کی درمیانی جگہ دیکھ سکتا ہوں۔

آنحضرتؐ نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر فرمایا: "آئیے اور دیکھ لیجیے۔"

بحیرا اپنی جگہ سے اٹھ کر آپ کے نزدیک آیا اور آپ کے کندھوں پر سے کپڑا ہٹایا تو اس کی نظر اس سیاہ تل پر پڑی جس نے بعد میں مہر نبوت کا نام پایا۔ تل کو دیکھ کر اس نے زیر لب کہا: "وہی ہے۔"

حضرت ابوطالب نے پوچھا: "کون ہے؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

بحیرا نے الٹا ان سے سوال کیا: "مجھے بتائیے کہ اس نوجوان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

حضرت ابوطالب چونکہ آنحضرتؐ کو اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اس لیے انھوں نے جواب دیا: "یہ میرا بیٹا ہے۔"

بحیرا نے کہا: "یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے۔ اسے یتیم ہونا چاہیے۔"

ابوطالب نے جواب دیا: "ہاں! یہ میرا بھتیجا ہے۔"

بحیرا نے پوچھا: "اس کے باپ کو کیا ہوا؟"

ابوطالب نے جواب دیا: "جب یہ ماں کے پیٹ میں تھا اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔"

بحیرا نے کہا: تم نے درست کہا۔ پھر بحیرا نے حضرت ابوطالب سے کہا: "میری بات غور سے سنیے۔ اس نوجوان کا مستقبل بے حد تابناک اور حیرت انگیز ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اگر یہودیوں نے بھی دیکھ لیا اور اسے پہچان گئے تو وہ اسے قتل کر دیں گے لہٰذا اس کی حفاظت کیجیے اور اسے شام نہ لے جائیے۔"

حضرت ابوطالب نے کہا: "مجھے یہ تو بتائیے کہ بات کیا ہے؟"

بحیرا نے کہا: "اس کی آنکھوں میں ایک بہت بڑے پیغمبر کی علامت ہے اور اس کی پشت پر اس چیز کی واضح نشانی ہے۔" [۱]

نسطورا راہب کی خانقاہ

رسولِ اکرمؐ کی عمر اب پچیس سال ہو گئی تھی۔ علاوہ اس کے کہ آپ قبیلے کے سردار اور بزرگ کے عزیز شمار ہوتے تھے، آپ نے اپنی اعلیٰ صفات اور عظیم اخلاق کی بدولت خاص اعتبار حاصل کر لیا تھا اور "امین" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔

اسی سال ایک دن حضرت ابوطالب نے آپ سے کہا: میرے بھتیجے! میں ایک ایسا شخص ہوں جس کے پاس دنیاوی مال کی کمی ہے۔ آج ہم پر سخت وقت آن پڑا ہے۔ ہمارے پاس سرمایہ اور سامان تجارت نہیں ہے جسے کام میں لائیں اور تنگدستی سے نجات پائیں۔ تاہم اب قریش کا تجارتی قافلہ شام کے سفر پہ جانے والا ہے۔ خدیجہ بنت خویلد عموماً قریش کے مردوں کو ایسے قافلوں کے ساتھ تجارت کی غرض سے بھیجا کرتی ہیں۔ اگر تم بھی اپنے آپ کو ان سے متعارف کرا دو تو ہمارے لیے کشایش کی صورت نکل سکتی ہے۔

---

[۱] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۸۰-۱۸۳ مطبوعہ مصطفیٰ السقا وغیرہ مصر ۱۳۷۵ھ۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۷-۲۷۸۔ تاریخ کامل جلد ۲ صفحہ ۲۳-۲۴ مطبوعہ دارالکتاب۔ تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۲ صفحہ ۲۸-۳۰ مطبوعہ دمشق۔ الاکتفا جلد ۱ صفحہ ۱۹۰-۱۹۳۔ سیرت حلبی جلد ۱ صفحہ ۱۳۰-۱۳۲ مطبوعہ مصر ۱۳۸۲ھ۔

جب اس گفتگو کی خبر بی بی خدیجہؓ تک پہنچی تو انھوں نے اپنا ایک نمائندہ بھیج کر آنحضرتؐ کو یہ کام کرنے کی دعوت دی اور ہر سال کے مقابلے میں زیادہ مال تجارت آپ کے سپرد کیا۔ بی بی خدیجہؓ نے اپنے غلام خاص میسرہ کو بھی آپ کے ہمراہ کر دیا اور اسے تاکید کی آپ کی پوری پوری اطاعت کرے۔ چنانچہ آپ میسرہ کے ساتھ قریش کے تجارتی قافلے میں شامل ہو گئے۔ یہ آپ کا شام کی جانب دوسرا سفر تھا۔

قافلہ نے بصریٰ پہنچ کر حسب دستور پڑاؤ ڈالا تو آنحضرتؐ اور میسرہ اپنا مال لیکر شہر کے بازار میں اتر پڑے۔ جس مقام پر وہ اترے اس کے قریب ہی ایک خانقاہ تھی جس میں نسطورا نامی ایک راہب رہتا تھا۔ اس خانقاہ کے پاس بیری کا ایک بہت پرانا درخت بھی تھا۔ جب سامان اتارا جا چکا تو آنحضرت بیری کے درخت کے سائے میں فروکش ہوئے۔

عیسائی راہب نسطورا نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا اور میسرہ سے جسے وہ پہلے سے جانتا تھا کہنے لگا: "اے میسرہ! یہ شخص جو اس درخت کے نیچے بیٹھا ہے کون ہے؟"

میسرہ نے جواب دیا: "یہ قبیلۂ قریش کا ایک فرد ہے اور مکہ کا رہنے والا ہے۔"

تب نسطورا نے کہا: "اس درخت کے نیچے کسی پیغمبر کے علاوہ کبھی کوئی نہیں بیٹھا۔" پھر اس نے پوچھا: "کیا اس کی آنکھوں میں سرخی جھلکتی ہے؟"

میسرہ نے جواب دیا: "ہاں! اس کی آنکھوں کی ہمیشہ یہی کیفیت رہتی ہے۔"

تب نسطورا نے کہا: "یہ وہی ہے۔ یہ خدا کا آخری پیغمبر ہے۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب انھیں اپنی رسالت کے اعلان کا حکم دیا جائے گا۔"

کچھ دن بعد رسولِ اکرمؐ بصریٰ کے بازار میں گئے اور وہاں اپنا مال فروخت کر کے دوسرا مال خریدنے میں لگ گئے۔ اس خرید و فروخت میں آپ کا ایک شخص سے مناقشہ ہو گیا جس پر اس نے آنحضرتؐ سے لات و عزیٰ کی قسم کھانے کو کہا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "میں نے کبھی ان دونوں کی قسم نہیں کھائی اور جب بھی ان کے پاس سے گزرتا ہوں تو اپنا منہ پھیر لیتا ہوں۔"

اس شخص نے کہا: "اس قضیے کے بارے میں میں آپ کی رائے کو قبول کرتا ہوں۔"

پھر اس شخص نے میسرہ سے خلوت میں گفتگو کی اور کہا : اے میسرہ ! خدا کی قسم یہ شخص پیغمبر ہے۔ مجھے اس کی قسم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے یہ وہی ہے جس کی مکمل اور واضح صفات اور نشانیاں ہمارے احبار اور علماء اپنی کتابوں میں پاتے ہیں۔
اس طرح کی باتیں میسرہ کے دل و دماغ پر نقش ہو رہی تھیں اور اس کے خیالات پر اثر کر رہی تھیں۔ وہ پہلے ہی اس سفر کے دوران آنحضرت ؐ سے بے حد متاثر ہو چکا تھا۔ اب یہ باتیں اسے آپ کا اور بھی گرویدہ بنا رہی تھیں [1]

دانائے ایران

عبداللہ ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ سلمان فارسی ؓ نے اپنے مسلمان ہونے کا قصّہ یوں بیان کیا : میں ایرانی النسل اور اصفہان کے علاقے کا رہنے والا ہوں۔ میری جائے پیدائش "جیّ" نامی ایک گاؤں تھا۔ میرا باپ وہاں کا دہقان (رئیس) شمار ہوتا تھا۔ وہ مجھے بے حد چاہتا تھا یہاں تک کہ مجھے لڑکیوں کی طرح گھر میں بٹھائے رکھتا تھا اور باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں اپنے زردتشتی مذہب میں اس قدر مستعد تھا کہ مجھے آگ کی خدمت پر مامور کر دیا گیا تھا۔ ایک دن جب میں اپنے باپ کے حکم سے گھر سے نکل کر اپنے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا تو مجھے عیسائیوں کا ایک گرجا نظر آیا جہاں وہ عبادت میں مشغول تھے۔ میں نے ان کی آواز سنی تو گرجے میں داخل ہو گیا۔ وہاں میں نے عیسائیوں کو نماز پڑھتے ہوئے پہلی مرتبہ دیکھا تھا جس سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ میں وہاں بہت دیر تک رکا رہا حتیٰ کہ رات ہو گئی اور جس کام کے لیے میں نکلا تھا اس کا وقت بھی جاتا رہا۔ جب میرے باپ کو اس دن کے واقعات اور میری عیسائیت میں دلچسپی کا پتا چلا تو وہ بے حد خفا ہوا اور اس نے مجھے گھر میں

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۵۶ - ۱۵۷ مطبوعہ بیروت۔ سیرت ابن ہشام جلد ا صفحہ ۱۸۷ - ۱۸۹ مطبوعہ مصر ۱۳۷۵ھ۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۰ - ۲۸۱۔ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم۔ تاریخ الکامل جلد ۲ صفحہ ۲۴ - ۲۵۔ سیرت حلبی جلد ا صفحہ ۱۴۷ - ۱۵۲۔

نظر بند کر دیا۔ تاہم میں نے اس کی آنکھ بچا کر عیسائیوں سے رابطہ قائم کر لیا اور ان سے درخواست کی کہ اگر عیسائیوں کے علاقے میں جانے والا کوئی قافلہ ہمارے گاؤں کے پاس سے گزرے تو وہ مجھے اطلاع دیں۔ چنانچہ جب ایک قافلہ وہاں آیا تو میں گھر سے نکل بھاگا اور اس قافلے کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہاں میں ایک عیسائی عالم کی رفاقت میں رہنے لگا اور اسے اپنے مربی اور استاد کے طور پر منتخب کر لیا لیکن وہ ایک ریاکار شخص تھا اور کئی ایک گناہوں کا مرتکب ہوتا تھا۔ تاہم اس کے مرنے کے بعد جو پادری گرجے میں اس کا جانشین بنا وہ زہد اور عبادت کا پیکر تھا۔ میں نے اس سے دلی تعلق قائم کر لیا اور کئی سال تک ایک شاگرد کے طور پر اس کے ساتھ رہا۔ مرتے وقت اس نے مجھے موصل[1] کے ایک عالم کا نام و نشان بتایا۔ چنانچہ میں نے اس عالم کی شاگردی میں بھی چند سال گزارے۔ وہ بھی اپنے دوست کی طرح بے حد پرہیزگار تھا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے کسی اور عالم کا پتا بتا دے۔ تب اس نے مجھے نصیبین[2] میں ایک عالم اور پرہیزگار شخص کے پاس جانے کو کہا۔

اس کی وفات کے بعد میں نصیبین پہنچا جہاں میں نے اس عالم سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ پھر اس کی وفات تک میں اس سے مستفید ہوتا رہا۔ پھر اس نے اپنی وفات کے وقت مجھے جو ہدایت کی تھی اس کے مطابق میں عموریہ[3] گیا جہاں میں نے پرہیزگار علماء کا ایک اور اعلیٰ نمونہ دیکھا۔

میں ایک مدت تک اس استاد کی خدمت میں رہا۔ جب وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہونے لگا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے اپنے کسی جانشین کا نام بتا دے۔

---

[1] موصل عراق کے شمال میں ایک قدیم شہر ہے (معجم البلدان جلد ۵ صفحہ ۲۲۳ - ۲۲۵ مطبوعہ بیروت)

[2] نصیبین بین النہرین کے درمیان آباد ایک شہر ہے جو موصل سے تین دن کی مسافت کے فاصلے پر واقع ہے۔ (معجم البلدان جلد ۵ صفحہ ۲۲۸)

[3] دو شہروں کا نام عموریہ ہے جن میں سے ایک شام کے نزدیک واقع ہے۔

اس نے جواب دیا: خدا کی قسم! اس وقت میری نظر میں کوئی ایسا آدمی نہیں جو ہمارے جیسے عقائد پر ایمان رکھتا ہو اور ہمارے طریقے پر چلنے والا ہو تاکہ میں تمہاری رہنمائی اس کی جانب کرسکوں۔ تاہم اب ایک پیغمبر کے ظہور کا وقت اور زمانہ نزدیک آگیا ہے۔ وہ ابراہیمؑ کے دین پر سرزمین عرب میں مبعوث ہو گا۔ اس کی ہجرت کا مقام وہ جگہ ہے جہاں کھجور کے درخت اگتے ہیں اور جو دو جانب سے ایسی زمین میں گھری ہوئی ہے جو آتش فشاں پتھروں سے پٹی پڑی ہے[1] وہ ہدیہ قبول کرے گا لیکن صدقے سے پرہیز کرے گا اور اس کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوّت (ایک بڑا سیاہ تل جس پر بال اگے ہوئے ہوں گے) موجود ہو گی۔ اگر جا سکتے ہو تو اس سرزمین میں چلے جاؤ۔[2]

شام کا یہودی عالم

اسلام کے ظہور میں چند سال سے زیادہ مدت باقی نہیں تھی جب "ابن ہیّبان" نامی ایک شامی یہودی نے مدینہ کا سفر کیا۔ جن لوگوں نے اسے دیکھ رکھا تھا وہ اس کی بزرگی کی تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے: "ہم جب کبھی خشک سالی سے دوچار ہوئے اور ہمیں بارش کی ضرورت ہوئی ہم نے اس کا دامن پکڑا اور اس سے درخواست کی کہ وہ مینہ برسنے کے لیے دعا کرے۔" ایسے موقع پر ابن ہیّبان عموماً یہ کہتا تھا: "نہیں میں یہ کام نہیں کروں گا مگر یہ کہ دعا سے پہلے تم کچھ صدقہ دو۔"

ہم پوچھتے تھے: "کیا دیں؟"

---

[1] مدینہ منورہ دو بیابانوں کے درمیان واقع ہے جن میں پہلے آتش فشانی ہوتی رہی ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کو "حرّہ" کہا جاتا ہے۔

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۱۴ - ۲۱۸ - تاریخ اسلام ذہبی جلد ۲ صفحہ ۵۱ - ۶۳ - الاکتفاء جلد ۱ صفحہ ۲۳۶ - ۲۴۴ - عیون الاثر جلد ۱ صفحہ ۶۰ - ۶۵ - اسد الغابہ جلد ۲ صفحہ ۴۱۷ - ۴۱۹ - مطبوعہ دار الشعب - مصر

وہ جواب دیتا تھا: "ہر شخص گندم یا جَو کی ایک مقدار دے"۔

ہم اس کے کہنے کے مطابق عمل کرتے تھے۔ پھر وہ ہمارے ساتھ صحرا میں آتا اور ہم دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے۔ ابھی ہم اپنے گھروں میں واپس بھی نہیں پہنچتے تھے کہ بادل آسمان پر نمودار ہو جاتے اور ہمارے سروں پر مینہ برسنے لگتا تھا۔ چونکہ ایسا واقعہ کئی مرتبہ ہو چکا تھا اس لیے ابن ہیبان کو مدینہ کے یہودیوں میں بڑا اعتبار اور اثر و رسوخ حاصل تھا۔

ایک دن ہمیں پتا چلا کہ ابن ہیبان لب گور ہے۔ یہودی اس کے پاس جمع ہو گئے تو اس نے اس مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اے یہودیو! کیا تم جانتے ہو کہ کونسی چیز مجھے شام کی سرسبز و شاداب سرزمین سے اس مفلس و نادار ملک میں کھینچ لائی تھی؟"

سب نے کہا: "تم خود ہی بہتر جانتے ہو"۔

پھر اس نے کہا: "میں شام سے یہاں آیا اور اس پیغمبر کے انتظار میں رہا جس کی بعثت بہت قریب ہے۔ چونکہ وہ پیغمبر ہجرت کر کے اس شہر میں آئے گا اس لیے مجھے امید تھی کہ مجھے اس کی زیارت نصیب ہو گی اور میں اس کی پیروی کروں گا لیکن بدقسمتی سے میری موت کے ساتھ یہ امید ختم ہو رہی ہے تاہم اگر تم اس کا نام اور اس کی کوئی خبر سنو تو کسی کو اس بات کا موقع نہ دو کہ وہ تم سے پہلے اس پر ایمان لے آئے۔

ابن ہیبان نے اپنی وصیت ختم کی اور جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ پھر ایک مدت کے بعد جس دن بنی قریظہ مغلوب ہوئے تین یہودی جوانوں کو جن کے نام ثعلبہ، اُسید اور اسد تھے اور جن میں بری عادتیں پختہ نہیں ہوئی تھیں ابن ہیبان کی وصیت یاد آئی اور انھوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا: "بخدا! یہ وہی پیغمبر ہیں جن کے بارے میں ابن ہیبان نے ہمیں بتایا تھا لہٰذا تم خدا سے ڈرو اور ان کی پیروی کرو۔ یہودیوں نے جواب دیا: "نہیں یہ وہ نہیں ہے لیکن ان تینوں جوانوں نے مزید اصرار کیا کہ یہ شخص واقعی وہی ہے (جس کے بارے میں ابن ہیبان نے وصیت کی تھی)۔ پھر وہ اپنے قلعے سے نکل کر اسلامی لشکر سے آملے اور مسلمان ہو گئے۔[1]

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۶۰۔ مطبوعہ بیروت

جاں نثار علماء

مُخیریق یہودیوں کے ایک دینی عالم تھے۔ وہ مدینہ میں رہتے تھے اور کافی جائیداد کے مالک تھے جس میں باغ اور نخلستان بھی شامل تھے۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کو پہچانتے تھے اور آپ کی صفات اور خصوصیات اپنے بزرگوں کی علمی میراث میں لکھی ہوئی پاتے تھے۔

چنانچہ جب رسولِ اکرمؐ نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور مدینہ پہنچنے سے پہلے شہر قبا میں قیام فرمایا تو عبداللہ بن سلام اور مخیریق جو دونوں یہودیوں کے بڑے عالم تھے آنحضرت کی زیارت کے لیے آئے اور اسلام قبول کیا۔[۱]

پھر جنگ احد ہوئی۔ یہ جنگ ہفتہ کے دن لڑی گئی جو یہودیوں کی مذہبی چھٹی کا دن ہے۔ اس دن مخیریق نے اپنی قوم کو پکار کر کہا: "اے یہودیو! خدا کی قسم! تم قطعی طور پر جانتے ہو کہ محمدؐ کی مدد کرنا تم پہ لازم اور واجب ہے۔"

یہودیوں نے جواب دیا: "آج ہفتے کا دن ہے اور ہفتے کے دن کام کرنا اور سرگرمی دکھانا حرام ہے۔"

مخیریق نے کہا: "اب تمہارے لیے ہفتے کی حرمت کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اسلام کے آنے سے یہودیوں کی دوسری رسموں کی طرح یہ رسم بھی منسوخ ہو گئی ہے۔"

پھر وہ تلوار ہاتھ میں لیکر گھر سے نکلے اور احد پہنچ کر رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت انھوں نے یہ وصیت بھی کی کہ اگر میں جنگ میں مارا جاؤں تو میری تمام دولت اور جائیداد محمدؐ کی ملکیت ہو گی اور انہیں اختیار ہو گا کہ جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ اس کے بعد انھوں نے اسی دن جام شہادت نوش فرمایا۔[۲]

---

[۱] مقریزی: امتاع الاسماع صفحہ ۴۶ [۲] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۵۱۸۔ الاکتفاء جلد ۲ صفحہ ۱۰۳۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۵۱۳۔ تاریخ الکامل جلد ۲ صفحہ ۱۱۲۔ البدایہ والنہایہ جلد ۴ صفحہ ۳۶۔ طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۵۰۱-۵۰۳

تعصب کی موجودگی

زبیر بن باطا یہودیوں کا سب سے بڑا دینی عالم تھا۔ وہ رسولِ اکرمؐ کے ظہور سے پہلے آنحضرتؐ کا نام (احمد) اور صفات بیان کرتا تھا۔ وہ آپ کے ظہور اور خروج کی سرزمین کے بارے میں بھی بتایا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں اپنے باپ کے پاس ایک کتاب دیکھا کرتا تھا جسے وہ میری دسترس سے دُور رکھتا تھا۔ وہ اسے سربمہر کر دیتا تھا تاکہ میرے لیے اس سے استفادہ کرنا ممکن نہ رہے لیکن اس کے مرنے کے بعد وہ کتاب میری تحویل میں آ گئی۔ چنانچہ میری سب پیشین گوئیاں اسی قدیم کتاب کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔

پھر وقت گزرتا گیا اور بالآخر رسولِ اکرمؐ نے ظہور فرمایا۔ جب مکہ میں آنحضرتؐ کی بعثت کی خبر زبیر بن باطا کے کانوں تک پہنچی تو اس نے اولین فرصت میں اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہوئی کتاب نکالی اور اس کی تحریریں مٹا دیں۔ اس کے بعد اس نے وہ سب کچھ پوشیدہ رکھا جو وہ آنحضرتؐ کے بارے میں جانتا تھا اور جب لوگ اس سے پوچھتے تو وہ کہتا: "یہ شخص وہ پیغمبر نہیں ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔" [۱]

❁

ہم تاریخ کی معتبر اور قدیم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ مدینہ کے یہودی بالخصوص بنی قریظہ رسولِ اکرمؐ کے نام سے واقف تھے۔ انھوں نے یہ نام اپنی دینی کتابوں میں پڑھ رکھا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو ایک روشن مستقبل کی خوشخبری کے طور پر اس نام سے روشناس کراتے تھے اور انھیں بتاتے تھے کہ وہ پیغمبر ہجرت فرما کر ہمارے شہر مدینہ میں تشریف لائیں گے لیکن جب رسولِ اکرمؐ مبعوث ہوئے اور آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو یہ لوگ اپنے موروثی حسد اور تعصب میں گرفتار ہو گئے اور کہنے لگے: "یہ شخص وہ پیغمبر نہیں ہے جس کا ذکر ہم کرتے رہے ہیں۔" [۲]

---

[۱] طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۵۹ طبع دوم۔ بیروت۔

[۲] طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۶۰۔ مطبوعہ بیروت۔

حاصل گفتگو

ان سب شواہد کی بنا پر جو مکتبِ خلافت کی معتبر کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں ہم قرآن مجید کی اس آیت کی سچائی سے اور زیادہ واقف ہو جاتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ "یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ." [1]

یعنی اہلِ کتاب پیغمبرؐ کو اپنے فرزندوں کی طرح پہچانتے ہیں۔ جو چیز ہم اس نسبتاً طویل بحث سے ثابت کرنا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ پہلی وحی کے بارے میں جن روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ اپنی پیغمبری کے بارے میں لاعلم تھے اور شک و شبہ میں مبتلا تھے ان روایات کے برعکس خود آنحضرتؐ، آپ کے صحابہ اور جزیرۃ العرب کے بہت سے عیسائی اور یہودی آپ کی نبوت کے متعلق علم رکھتے تھے۔ وہ آنحضرتؐ کی صفات اور خصوصیات بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آپ کی ذات اور شخصیت سے بھی واقف تھے۔ اگر ہم عالمِ غیب اور اس کی امداد سے قطع نظر بھی کر لیں اور آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے آپ کو ایک عام انسان تصور کریں تب بھی جب ہم آپ کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ شام کے سفر میں آپ کے ولی اور قریش کے سربراہ حضرت ابوطالب آپ کی پیغمبری اور اس کی علامتوں اور نشانیوں سے پوری طرح آگاہ ہو گئے تھے یہاں تک کہ آپ کی جان کی حفاظت کے لیے خاص تدابیر اختیار کی گئی تھیں تاکہ دنیا کے مستقبل کا یہ سرمایہ کسی خطرے سے دوچار نہ ہو جائے۔ شام کے دوسرے سفر میں بھی یہی واقعات ایک اور طریقے سے دہرائے گئے۔ پھر یہ مسئلہ آنحضرتؐ کے کچھ دوسرے ساتھیوں کو بھی پیش آیا اور وہ اس سے واقف ہو گئے۔

اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جن روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ پہلی وحی کے وقت رسولِ اکرمؐ حیرت زدہ رہ گئے اور شک و شبہ میں مبتلا ہو گئے تھے وہ محض جھوٹ معلوم ہوتی ہیں خصوصاً اس لیے کہ سند کے لحاظ سے ان میں سے کوئی روایت بھی اس عمل کے وقوع پذیر ہونے کے وقت سے متصل نہیں ہے۔ چنانچہ اپنی سند اور متن کے ضعف کی

[1] سورۃ انعام۔ آیت ۲۰

وجہ سے یہ روایات معتبر نہیں ہیں۔ تاہم اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ یہ روایات رسولِ اکرمؐ کی شخصیت اور آپ کی نبوت کے اعتبار کو کس قدر گھٹا سکتی ہیں ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس طرح یہ معاویہ کے عام منصوبے کے مطابق، پیغمبرِ اسلامؐ کی شخصیت کو مسخ کرنے کے لیے وجود میں آئیں اور کس طرح یہ اپنے منحوس فریضے کے مطابق آج تک عمل کر رہی ہیں۔

پہلی وحی کے متعلق روایات اور مستشرقین

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مستشرقین اور مغربی اسلام شناس جو انتہائی مستعدی اور سنجیدگی کے ساتھ اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام اور اس کے پیغمبرؐ کو پایۂ اعتبار سے گرادیں انھوں نے روایات کے اس مجموعے سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ اہلِ مغرب کی تحریروں میں اس پر جو اضافہ کیا گیا ہے وہ اس واقعہ کی علمی اور نفسیاتی تحلیل ہے جو ان کی آراء کو ایک انجان شخص کی نگاہ میں مثبتاً زیادہ تقویت بخشتی ہے۔

ہم سب سے پہلے انگریز اسلام شناس منٹگمری واٹ Montgomery Watt کی کتاب "محمدؐ، پیغمبر و سیاستدان" سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

ایک ایسے شخص کے دل میں جو ساتویں صدی میں مکہ جیسے دور افتادہ شہر میں رہ رہا ہو یہ یقین پیدا ہو جانا کہ اسے خدا کی جانب سے پیغمبری پر مبعوث کیا گیا ہے ایک حیرت انگیز بات ہے (؟) پس اگر ہمیں یہ بتایا جائے کہ محمدؐ ڈر گئے اور شک و شبہ میں مبتلا ہو گئے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں .... مزید برآں انھیں جنون کا خوف تھا کیونکہ اس زمانے کے عربوں کا اعتقاد تھا کہ اس قسم کے لوگ روحوں اور جنوں کے اثر میں ہوتے ہیں۔ مکہ کے کچھ لوگ محمدؐ کے الہامات کی تفسیر اسی طرح کرتے تھے اور

وہ خود بھی بعض اوقات اس شک میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ آیا لوگ صحیح کہتے ہیں یا نہیں؟
کہا جاتا ہے کہ پہلی وحی کے نزول کے بعد آپ کی بیوی خدیجہ اور ان کے چچا زاد بھائی ورقہ نے انہیں ترغیب دلائی کہ وہ اس بات کو قبول کریں کہ انہیں پیغمبری کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ایک عیسائی کے اس بات کی شہادت دینے سے کہ محمدؐ پر بعینہٖ اسی طرح سے وحی نازل ہوئی ہے جس طرح موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی ان کے (یعنی رسولِ اکرمؐ کے) خیال کو تقویت پہنچی۔[1]

پروفیسر منٹگمری واٹ جو ایڈنبرگ یونیورسٹی میں اسلام شناسی کے استاد ہیں اپنی ایک اور کتاب میں پہلی وحی کے بارے میں مختلف روایات نقل کر کے اسی موضوع پر بحث کرتے ہیں اور ان روایات کی صحت میں کسی شک وشبہ کا اظہار کیے بغیر ان کا مفصل اور طویل مطالعہ کرنے کے بعد وہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں جس کا ذکر بطور خلاصہ اوپر کیا گیا ہے۔[2]

تاہم ایسی روایات سے فقط مسٹر واٹ نے ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ ماضی اور حال میں دوسروں نے بھی یہی طریقہ اپنایا ہے جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں یہ لوگ عموماً اسلام، رسولِ اکرمؐ اور دیگر اسلامی مقدسات کے کمزور پہلوؤں کی جستجو میں رہتے ہیں اور بدقسمتی سے خلفاء کے مکتب کی کچھ روایات کے ذریعے ان کی مراد بر آتی ہے چنانچہ وہ کسی شک وشبہ کے بغیر ان کتابوں سے استناد کرتے ہیں جن میں تاریخ طبری، سیرت ابن ہشام اور صحیح بخاری سرفہرست ہیں پہلی مغربی تحریر جس میں اس موضوع پر مذکورہ بالا جعلی روایات کی بنیاد پر گفتگو کی گئی ہے ایک تاریخ کی کتاب ہے جو مغرب کے ایک بہت قدیم مورخ تھیوفانس THEOPHANES نے لکھی ہے۔[3]

تھیوفانس کے نظریے کا خلاصہ اہل مغرب کی عظیم مشہور اور اسلام شناسی کے

---

[1] طبقات ابن سعد فارسی ترجمہ اسماعیل ولی زادہ صفحہ ۲۶-۲۷ مطبوعہ تہران ۱۳۴۳ھ

[2] M. Watt: Muhammad at Mecca pp. 39 — 54, Oxford

[3] جلد ۱ صفحہ ۵۱۳ مطبوعہ کلاسن

موضوع پر معتبر کتاب "دائرۃ المعارف اسلام" میں دیا گیا ہے۔[1] "بحیرا" نامی مقالے کا مصنف اے جے ونسنک A. J. WENSINCK اس کتاب میں رسولِ اکرم ؐ کی پیغمبری کے بارے میں اہلِ کتاب کی تاریخی معلومات کے نمونوں کو کسی دلیل کے بغیر افسانہ قرار دینے کے بعد تھیوفانس کی تحریر کا خلاصہ بیان کرتا ہے اور باوجودیکہ تھیوفانس کے اقوال جعلی روایات تک سے بھی مطابقت نہیں رکھتے وہ ان پر کوئی تنقید یا تحقیق نہیں کرتا۔ جن یورپی کتابوں میں پہلی وحی کے بارے میں جعلی روایات پر انحصار کرتے ہوئے اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے ان میں سے انگریز مستشرق پروفیسر روم لاندو کی کتاب "اسلام اور عرب" اور وروکلاڈ یونیورسٹی میں سامی زبانوں اور ہالے یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے استاد پروفیسر کارل بروکلمان کی تصنیف "اسلامی اقوام اور سلطنتوں کی تاریخ" کے نام لیے جا سکتے ہیں۔[2]

عینی شاہد کا بیان

مکتبِ خلفاء کی روایات کا مکتبِ اہلبیت ؑ کی روایات سے موازنہ

ایک تاریخی واقعہ کسی ایسے شخص کی گواہی کے بغیر نقل نہیں کیا جا سکتا جس نے اسے خود رونما ہوتے دیکھا ہو۔ یہ علمِ تاریخ کا ایک قطعی اصول ہے جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اسی قطعی اصول کی بنا پر ہم پہلی وحی کے سلسلے کی روایات کو ضعیف اور ناقابلِ اعتبار قرار دے چکے ہیں لہٰذا اب ہم اس واقعہ کا مطالعہ فقط اس شخص کے اقوال کی روشنی میں کرتے ہیں جو اس کا عینی گواہ تھا اور جس نے اس کے کچھ پہلوؤں کے بارے میں رسولِ اکرم ؐ

---

[1] عربی ترجمہ

[2] Halle University — Germany   Wroclaw University — Poland

کے ارشادات بھی سنے تھے۔

امیر المومنین امام علیؑ جو اسلام کے تمام حقائق کے وارث ہونے کے علاوہ ابتدائے اسلام سے ہی اس کے شاہد تھے، پہلی وحی کے بارے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ قَرَنَ اللّٰهُ بِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ مِنْ لَّدُنْ اِنْ كَانَ فَطِيْمًا .....[1]

"اور اللہ نے آپ کی دودھ بڑھائی کے وقت ہی سے ایک عظیم المرتبت فرشتے کو آپ کے ساتھ لگا دیا تھا جو آپ کو رات دن اعلیٰ خصلتوں اور پاکیزہ سیرتوں کی راہ پر لے چلتا تھا اور میں ان کے پیچھے پیچھے یوں لگا رہتا تھا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے۔ میں ہر روز آپ کے بلند اخلاق کا ایک نیا نمونہ دیکھتا تھا اور آپ مجھے اس کی پیروی کرنے کا حکم دیتے تھے۔ آپ ہر سال غارِ حرا میں کچھ عرصہ عبادت کرنے کی خاطر تنہائی اختیار فرماتے تھے۔ وہاں میرے علاوہ کوئی انہیں نہیں دیکھتا تھا۔ ان دنوں رسولِ اکرمؐ اور بی بی خدیجہ کے گھر کے سوا کسی گھر میں اسلام نہ تھا البتہ تیسرا ان میں میں تھا۔ میں وحی و رسالت کا نور دیکھتا تھا اور نبوّت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ جب آپ پر وحی نازل ہوئی تو میں نے شیطان کے رونے کی آواز سنی جس پر میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ یہ آواز کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ شیطان ہے جو اب پوجے جانے سے مایوس ہو گیا ہے۔ مزید برآں آپ نے فرمایا: اے علیؑ! جو کچھ میں سنتا ہوں وہ تم بھی سنتے ہو اور جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھتے ہو، فرق صرف اتنا ہے کہ تم نبی نہیں ہو بلکہ میرے وزیر اور مددگار ہو اور یقیناً بھلائی کے راستے پر ہو۔"

ہم وحی و رسالت کے بارے میں مکتبِ امامت کے نقطۂ نظر کے نمونوں کی نشاندہی کے لیے امام علی نقیؑ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں:

"جب رسولِ اکرمؐ نے شام کی تجارت ترک کر دی تو جو کچھ آپ نے اس تجارت سے کمایا تھا وہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیا۔ اس کے بعد آپ ہر روز صبح کے وقت کوہ حرا

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲۔ خطبۂ قاصعہ صفحہ ۳۰۰ - ۳۰۱ تحقیق صبحی صالح، شرح محمد عبدہٗ جلد ا صفحہ ۱۸۲ مطبوعہ مطبعۃ الاستقامہ۔

پر جاتے اور اس کی بلند چوٹی سے خدا کی رحمت کے آثار اور فطرت کے میدان میں اسکی عجیب و غریب اور حکمت آمیز قدرت کے مظاہر کا مشاہدہ کرتے تھے۔ آپ آسمان کے مختلف حصوں اور زمین کے گوشہ و کنار پہ نگاہ ڈالتے اور غور و فکر کرتے۔ اس کے بعد آپ عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے۔

حالات کا دھارا اسی طرح بہتا رہا حتیٰ کہ آنحضرتؐ کی عمر چالیس سال ہو گئی۔ خدائے تعالیٰ نے ان کے دل کو اپنے حضور میں سب دلوں سے زیادہ جھکنے والا، ڈرنے والا اور اطاعت کرنے والا پایا تو حکم دیا کہ آسمان، بہشت اور حقیقت کے دروازے آپ کے سامنے کھول دیے جائیں تاکہ آپ آسمانوں میں موجود حقائق کا مشاہدہ کریں۔ اس نے فرشتوں کو بھی حکم دیا کہ آپ پر نازل ہوں۔ اس نے اپنی رحمت کو بھی حکم دیا کہ وہ عرش کی بلندی سے آنحضرتؐ پر اترے۔ پھر جبرئیل کو آپ پہ نازل کیا جس نے آپ کا بازو پکڑ کر اسے ہلایا اور کہا: اے محمدؐ پڑھیے۔ آپ نے فرمایا: کیا پڑھوں؟ جبرئیل نے عرض کیا: پڑھیے اس پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

پھر جبرئیل نے خدا کی بھیجی ہوئی وحی آپ کے سامنے پڑھی اور آسمان کی جانب لوٹ گئے۔

اس کے بعد رسولِ اکرمؐ پہاڑ سے نیچے اترے۔ خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال کا جو ظہور آپ پر ہوا تھا اس کی وجہ سے آپ کی حالت ایک ایسے مریض کی سی ہو گئی تھی جو تپ لرزہ میں مبتلا ہو۔

جو چیز آپ کے لیے تکلیف دہ تھی اور جس کا آپ کو دھڑکا لگا ہوا تھا یہ تھی کہ قریش آپ کو جھٹلائیں گے۔ آپ کو یہ بھی خدشہ تھا کہ کہیں وہ یہ نہ کہنے لگیں کہ آپ مجنوں ہو گئے ہیں یا آپ کا شیطان سے رابطہ ہو گیا ہے حالانکہ آپ اپنی زندگی کے آغاز ہی سے خدا کی سب سے زیادہ محبوب مخلوق تھے اور آپ کے دل میں دوسرے تمام لوگوں سے بڑھ کر شیطان کے لیے نفرت موجود تھی لہٰذا جو دشمنیاں اور مخالفتیں آپ کو درپیش تھیں ان کے مقابلے میں آپ کی ہمت بندھانے کے لیے خدا نے آپ کے ارد گرد کی تمام

اشیاء مثلاً پتھروں، چٹانوں اور پہاڑوں کو آپ سے ہم کلام کر دیا۔ آنحضرتؐ جس چیز کے پاس سے گزرتے اس میں سے یہ آواز سنتے: السلام علیک یا محمدؐ۔ السلام علیک یا ولی اللہؐ السلام علیک یا رسول اللہؐ۔ [۱]

خلاصۂ کلام

مکتبِ خلفاء کی روایات میں پہلی وحی کے نزول کے بارے میں یہ کہا گیا تھا:
جب جبرئیل نے رسولِ اکرمؐ کو تین مرتبہ بھینچا تو آپ کو یوں محسوس ہوا گویا ابھی آپ کا دم نکل جائے گا۔ پھر اس نے کہا پڑھو....

پہلی وحی کے آنے سے آنحضرتؐ بے حد خوفزدہ اور پریشان ہو گئے کیونکہ انھیں یہ خیال ہوا کہ شاید یہ واقعہ جنات کی کارستانی ہے۔ انھیں یہ شک بھی ہوا کہ کہیں آپ دیوانے یا کاہن نہ بن گئے ہوں لہٰذا آپ نے فیصلہ کیا کہ اپنے آپ کو پہاڑ کی بلندی سے نیچے گرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیں تاکہ اس پریشانی سے نجات پائیں۔

تاہم جبرئیل نے آپ کو اپنی طرف متوجہ رکھا اور آپ کو اپنے ارادے پر عمل نہ کرنے دیا۔ آنحضرتؐ دگرگوں حالت میں گھر لوٹے اور اپنی بیوی خدیجہ کو اپنے اس خدشے سے آگاہ کیا کہ وہ دیوانے ہو گئے ہیں یا ان پر جنون کا اثر ہو گیا ہے۔ بی بی خدیجہ نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ اپنے کریم النفس شوہر کی باتیں سنیں جو اس وقت پریشان اور خوفزدہ تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہ خود نہیں گھبرائیں بلکہ اپنے شوہر کو بھی تسلی دی اور انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ خدائے تعالیٰ انہیں ہرگز تنہا نہیں چھوڑے گا۔

پھر بیشتر معلومات اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے وہ ایک عیسائی عالم ورقہ کے پاس گئیں۔ جو کچھ خدیجہ نے بتایا اسے سن کر ورقہ نے انھیں ان کے شوہر کے بارے میں اطمینان دلایا۔ پھر اس نے خود آنحضرتؐ سے ملاقات کے وقت بھی اپنے تسلی آمیز الفاظ کے ساتھ ان کا باقیماندہ خوف بھی دور کر دیا اور جو کچھ وہ نہیں جانتے تھے وہ انھیں سکھا دیا۔

---

[۱] تفسیر الامام العسکری صفحہ ۶۰-۶۱ بحار الانوار جلد ۱۸ صفحہ ۲۰۵-۲۰۶۔ حلیۃ الابرار جلد ۱ صفحہ ۳۷-۳۸۔

مذکورہ بالا روایات کی تحقیق کرتے ہوئے ہم نے دیکھا کہ وہ سب کی سب ایسے اشخاص سے نقل کی گئی ہیں جو نزول وحی کے وقت ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے کہ وہ اس واقعہ کو ایک عینی شاہد کی حیثیت سے بیان کرتے۔

پھر ہم نے ان روایات کا موازنہ اسلام کے اہم ترین ماخذ یعنی قرآن مجید سے کیا تو قرآن مجید کی آیات کریمہ نے ہمیں یہ بتایا کہ:

۱۔ تمام پیغمبروںؑ سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ اپنے بعد آنے والے رسولوں اور بالخصوص حضرت خاتم الانبیاءؐ پر ایمان لائیں گے۔ وہ ان کی بعثت کی خوشخبری اپنی امتوں کو بھی دیں گے اور انھیں وصیت کریں گے کہ اگر وہ آنحضرتؐ کے زمانے میں موجود ہوں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔

۲۔ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ نے اپنی امت کو خوشخبری دی کہ میرے بعد جو پیغمبر آئیں گے ان کا نام احمدؐ (فارقلیط) ہوگا۔

۳۔ جب قرآن مجید یہودیوں کے پاس آیا اور اس نے ان کی کتاب (تورات) کی تصدیق کی تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا حالانکہ اس سے پہلے وہ جنگوں میں اس پیغمبر کے نام کے ساتھ خدا سے توسل کرتے تھے تاکہ فتح اور کامیابی سے ہمکنار ہوں۔

۴۔ وہ جس اُمی پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں اس کا نام و نشان تورات اور انجیل میں پاتے ہیں۔

بالآخر قرآن مجید اس گفتگو کو یہاں تک پہنچاتا ہے کہ:

یَعۡرِفُوۡنَهٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ۔

یعنی اہل کتاب کے علماء اس پیغمبر کو اپنے فرزندوں کی طرح پہچانتے ہیں۔

یہ مسئلہ بدیہی طور پر واضح ہے کہ جب قرآن مجید دوسروں کو یوں للکارتا ہے تو اگر اس کے ان ارشادات کو صحت اور صداقت کا مضبوط سہارا حاصل نہ ہوتا تو اہل کتاب کے لیے بڑا آسان تھا کہ وہ تورات اور انجیل لوگوں کے سامنے لا رکھتے اور قرآن کی ان باتوں کا خلافِ واقعہ ہونا ثابت کرتے اور اس کے نتیجے میں ان کے

کوئی زحمت اٹھائے بغیر اسلام اسی زمانے میں نابود ہوجاتا اور اس کا نام ونشان مٹانے کے لیے چودہ سو سال تک جنگیں لڑنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

لیکن خوش قسمتی سے نہ صرف یہ کہ مذکورہ بالا بشارتیں اس زمانے میں نئے اور پرانے عہد ناموں میں موجود تھیں بلکہ آج بھی جبکہ ان کتابوں میں کافی تحریف ہوچکی ہے تورات کے نسخوں میں ہمیں یہ لکھا ہوا نظر آتا ہے: "خداوند سینا سے اترا اور ساعیر سے نمودار ہوا اور کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا اور دس ہزار مقربین کے ساتھ وارد ہوا اور انہیں اس کے دائیں ہاتھ سے آتشیں شریعت ملی۔ نیز یہ آیت جو تورات کے قدیم نسخوں میں صحیح سلامت رہ گئی ہے، اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی بعثت سینا سے، حضرت عیسیٰؑ کی ساعیر سے اور حضرت خاتم الانبیاءؐ کی کوہِ فاران میں واقع غارِ حرا سے ہوئی اور آپ ایسی شریعت لائے جس میں کافروں اور منافقوں کے خلاف جنگ لڑنے اور جہاد کرنے کے احکام موجود ہیں۔ دس ہزار افراد کے ہمراہ وارد ہونے کا واقعہ بھی فقط رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں وقوع پذیر ہوا جس کا تعلق فتح مکہ سے ہے جو ہجرت کے آٹھویں سال میں ہوئی۔

علاوہ ازیں یوحنا کی انجیل کے ایک نسخے میں لکھا ہے کہ: حضرت عیسیٰؑ نے اپنے آخری دور میں لوگوں کے ایک بڑے اجتماع میں اپنے حواریوں کو فارقلیط (احمدؐ) کے آنے کی بشارت دی۔

یہ ان تمام بشارتوں ہی کا نتیجہ تھا کہ اہلِ کتاب حضرت خاتم الانبیاءؐ کے ظہور اور بعثت کے منتظر رہے۔ ان میں سے بعض نے اس امید پر مدینہ اور اس کے نواح میں ہجرت کی کہ آنحضرتؐ کی زیارت سے مشرف ہونگے چنانچہ کئی ایسے افراد کے نام اور کوائف تاریخ میں موجود ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

بحیرا راہب جس کا صومعہ قریش کے شام کو جانے والے تجارتی راستے پر تھا۔ چنانچہ جب رسولِ اکرمؐ بارہ سال کی عمر میں اس طرف سے گزرے اور اس کی خانقاہ کے پاس رکے تو اس نے آپ کو نشانیوں اور علامتوں کی بنا پر پہچان لیا اور آپ کی زیارت سے شرف یاب ہوا۔

ایک اور راہب نے جسے تاریخ نسطورا کے نام سے یاد کرتی ہے شام کے دوسرے سفر کے دوران آنحضرتؐ سے ملاقات کی اور آپ کی نبوت کے بارے میں باتیں کیں جبکہ بی بی خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی آپ کے ہمراہ تھا۔

یہودیوں کے ایک بڑے عالم ابن ہیبّان آنحضرتؐ کی زیارت سے شرفیاب ہونے کی خاطر شام سے ہجرت کر کے مدینہ آئے لیکن آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے ہی فوت ہو گئے۔

یہودیوں کے ایک اور عالم مخیریق تھے جو آنحضرتؐ کی ہجرت کے ابتدائی ایام میں قباء کے مقام پر آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ پر ایمان لائے وہ جنگ احد میں گئے اور وہاں شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔

ایک اور شخصیت حضرت سلمان فارسیؓ کی ہے جو اپنے دل میں یہی آرزو لیے ہوئے مدینہ میں آئے اور آنحضرتؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے اور اسلام لے آئے۔

یہودی آنحضرتؐ کے ظہور کی روایات سے اس قدر واقف تھے کہ انھیں ایک سبق کی طرح اپنے بچوں کے سامنے دہراتے تھے اور انہیں خوشخبری دیتے تھے کہ آپ کا ظہور عنقریب ہونے والا ہے۔ وہ ہمارے ہی ملک میں مبعوث ہوں گے اور ہمارے شہر مدینہ میں ہجرت فرمائیں گے۔

اس زمانے کے اہل کتاب رسولِ اکرمؐ کا اسی طرح انتظار کرتے تھے اور اپنے بچوں کو آپ کے ظہور کی نشانیاں بتاتے تھے جس طرح اس زمانے کے شیعہ حضرات امام زمانہ حضرت مہدی موعود (عج) کے ظہور کے منتظر ہیں اور آپ کے ظہور کے بارے میں آپس میں بحث اور گفتگو کرتے ہیں۔

ان تمام تاریخی حقائق اور واقعات کے ہوتے ہوئے جن میں سے چند ایک کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور ان ملاقاتوں کے باوجود جو اس زمانے کے اہل کتاب کے علماء اور آنحضرتؐ، آپ کے چچا حضرت ابوطالبؑ، آپ کے ہمسفر جناب میسرہ اور آپ کی بیوی بی بی خدیجہؓ کے درمیان ہوئیں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ خود آنحضرتؐ کو ان واقعات کا کوئی علم نہ ہو؟ کیا ان واقعات کو جو زیادہ تر غیر معمولی تھے دوسرے سمجھ سکتے

تھے اور جس شخص کا ان میں ذکر تھا اسے خدا کے آخری پیغمبرؐ کے طور پہ پہچان سکتے تھے لیکن خود وہ شخص نہ واقعات کو دیکھتا تھا اور نہ سمجھتا تھا اور نہ ہی اسے اپنی غیر معمولی اور ممتاز شخصیت کا کوئی علم تھا۔

حیرت ہے کہ ان تمام واقعات کے باوجود جو بالخصوص مکتب خلفاء کی معتبر کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں اس مکتب کے علماء نے پہلی وحی یعنی اسلام کی عمارت کی پہلی اینٹ کے بارے میں مذکورہ جھوٹی اور توہین آمیز روایات پر کیسے یقین کر لیا؟ انھوں نے یہ کیسے لکھ دیا کہ جب جبرئیل نے آنحضرتؐ پر قرآن مجید کا پہلا سورہ نازل کیا تو آپ نے اسے جن یا شیطان اور اپنے آپ کو دیوانہ، آسیب زدہ یا کاہن تصور کیا؟

درحقیقت یہ کچھ خفیہ ہاتھ تھے جنہوں نے یہ جعلی روایات گھڑیں اور کسی خاص مقصد کے تحت مکتب خلفاء کی اول درجے کی اسلامی کتابوں میں شامل کر دیں۔

۞

جن یہودی اور عیسائی اسلام شناسوں نے اسلام کے بارے میں تحقیق (!) کی ہے دراصل وہ علم و دانش کے پردے میں اسلام پر اعتراض کرنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نزول وحی کے بارے میں انہیں جعلی روایات پر انحصار کر کے انکا نفسیاتی اور عمرانی تجزیہ کیا اور اپنی کتابوں میں پیش کر دیا اور اس طرح مشرق و مغرب کی علمی سطح پر صحیح اسلام کی شناخت پر ایک کاری ضرب لگائی۔

برطانوی اسلام شناس پروفیسر منٹگمری واٹ نے اپنی دونوں کتابوں "محمدؐ مکہ میں" اور "محمدؐ پیغمبر اور سیاستدان" میں اور ایک دوسرے برطانوی اسلام شناس پروفیسر روم لاندو نے اپنی کتاب "اسلام اور عرب" میں اور اسیطرح سامی زبانوں کے استاد اور مشہور جرمن مستشرق پروفیسر کارل بروکلمان نے اپنی کتاب "اسلامی اقوام اور سلطنتوں کی تاریخ" میں اور ان کے مشرقی شاگردوں نے روایات کے اسی مجموعے سے استناد کیا ہے اور انھیں اسلام کے مسلمات اور اس کی معرفت کے لیے ناقابل تردید روایات کے طور پر استعمال کیا ہے۔

لیکن اصل واقعہ وہی ہے جو ائمہ اہلبیتؑ نے اپنے مکتب کے شاگردوں کو

بتایا ہے لہٰذا مناسب ہو گا کہ ہم مکتب اہلبیتؑ کی روایات اور مکتب خلفاء کی زیر بحث روایات کے درمیان موازنہ کریں۔

پہلی وحی کے متعلق مکتب خلفاء کی روایات میں سے کوئی روایت بھی کسی عینی شاہد سے نقل نہیں کی گئی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ واقعہ رونما ہوا تھا اس وقت ان راویوں میں سے کسی کا وجود نہ تھا۔ اس واقعہ کے واحد عینی شاہد امیرالمومنین امام علیؑ ہی ہیں۔ انھوں نے یہ واقعہ اپنے ایک خطبے میں یوں نقل فرمایا ہے:

"خدائے تعالیٰ نے رسولِ اکرمؐ کی کم سنی کے وقت سے ہی اپنے سب سے بڑے فرشتے کو آنحضرتؐ کا ساتھی اور رفیق بنا دیا۔ یہ فرشتہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ آپ کی رہنمائی نیک اعمال اور پسندیدہ اخلاق کی جانب کرتا تھا۔ آنحضرتؐ ہر سال کچھ مدت غارِ حرا میں گزارتے تھے اور میں بھی آپ کے ہمراہ ہوتا تھا۔ جب آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی تو میں نے رونے کی آواز سنی۔ میں نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ یہ آواز کیسی ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ شیطان کے رونے کی آواز ہے جو اب اپنے پوجے جانے سے ناامید ہو گیا ہے۔

ایک اور روایت میں یہی واقعہ امام علی نقیؑ سے یوں نقل کیا گیا ہے:

"جب رسولِ اکرمؐ کا سن مبارک چالیس سال ہوا تو خدائے تعالیٰ نے آسمان اور عالم ملکوت کے دروازے آپ کے لیے کھول دیے تاکہ آپ آسمان کے حقائق کا مشاہدہ کریں اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آپ پر نازل ہوں اور جبرئیل کو آپ کے پاس بھیجا۔ جبرئیل نے آپ کا بازو ہلایا اور کہا: پڑھیے! آپ نے فرمایا: کیا پڑھوں؟ جبرئیل نے کہا: "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ ...." اور خدائے تعالیٰ کی وحی آپ کو سنائی اور پھر آسمان کی جانب لوٹ گئے۔"

تب رسول اکرمؐ پہاڑ سے اترے۔ اس وقت آپ کی حالت یہ تھی کہ خدا کے جلال اور عظمت کے ظہور کی وجہ سے آپ تپ لرزہ میں مبتلا شخص کی طرح لرز رہے تھے۔ انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ اب قریش ان کو مجنوں کہیں گے تاہم خدائے تعالیٰ

نے آپ کو تسلّی دی۔ آپ کے اردگرد کی تمام چیزیں آپ سے گفتگو کرتی تھیں۔ وہ آپ کی پیغمبری کو سلام کرتی تھیں۔ ہر چیز سے یہ آواز آتی تھی: السلام علیک یا رسول اللہؐ!

کیا وجہ ہوئی کہ یورپ کے یہودی اور عیسائی اسلام شناسوں اور ان کے مشرقی شاگردوں نے نزولِ وحی کی داستان رسولِ اکرمؐ کے خاندان سے نہیں لی اور فقط خلفاء کے مکتب کی تکلیف دہ اور توہین آمیز روایات پر اکتفا کیا حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ "اَھْلُ الْبَیْتِ اَدْرٰی بِمَا فِیْہِ" یعنی ایک گھر کے رہنے والے ہی اس کے اندرونی حالات سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے کہ شناخت اسلام کی بنیاد فقط مکتب خلفاء کی کتابوں پر رکھی گئی اور ائمہ اہلبیتؑ کے نظریات اور ان کی روایات کو بالکل بھلا دیا گیا ہے اور مغربی اسلام شناسی میں کہیں بھی ان کی جانب توجہ نہیں دی گئی؟ کیا یہ چیز اس امر کی نشاندہی نہیں کرتی کہ دراصل یورپی اسلام شناسی کی بنیاد دشمنی اور کینہ پروری کے علاوہ کسی چیز پر نہیں ہے۔ وَالصَّلَاۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ۔

●●●●●

دسواں درس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۔ (سورۂ نجم۔ آیات ۱ تا ۵) قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ قَالَ ھٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ۔ (سورۂ حجر۔ آیات ۳۹ تا ۴۲)

رسولِ اکرمؐ کی اعلیٰ وارفع شخصیت کو بے وقعت بنانے کے لیے اسلام کے داخلی دشمنوں کے ہاتھوں جو سوچی سمجھی تدابیر اختیار کی گئیں وہ گزشتہ بحث کے ساتھ ختم نہیں ہوئیں بلکہ بدطینت منصوبہ بازوں نے اس معاملہ کو اور بھی آگے بڑھا دیا تھا۔ انھوں نے صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کیا کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنی پہلی وحی کے بارے میں شک کیا اور ایک مدت تک یہ خیال کرتے رہے کہ ان پر جنات اور شیاطین نے قابو پا لیا ہے[1] چنانچہ انھوں نے اپنا قدم ایک خطرناک جگہ پر بھی رکھا۔ انھوں نے کئی ایک روایات میں — جو مکتبِ خلفاء کی کتبِ تفسیر میں موجود ہیں — اس بات کی تشہیر کی کہ فقط یہی نہیں کہ رسولِ اکرمؐ کو اپنی پیغمبری میں اور اپنے کارِ نبوت میں شیطانوں اور جنوں کی دخل اندازی کا شک تھا بلکہ شیطان نے اس معاملے میں واقعی دخل اندازی بھی کی تھی اور اپنے شیطانی علم کے مطابق شرک آمیز مطالب کی حامل جعلی آیات خدا کی جانب سے نازل کی گئی آیات

---

[1] اس بنا پر انھوں نے لوگوں کے لیے جو اسلام کے مبارک دین پر اعتقاد رکھتے ہیں رسولِ اکرمؐ کی نبوت کی بنیاد کے بارے میں شک و شبہ کا دروازہ کھول دیا۔

کے طور پہ آنحضرتؐ کو القاء کر دیں جنہیں آنحضرتؐ نے وحی الٰہی کے طور پر قبول کر لیا اور انھیں اس معاملے کی براہ راست مداخلت کی خبر تک نہ ہوئی۔

یہ اس سازش کا بلند ترین مرحلہ ہے جہاں بنی امیہ کے زمانے میں اسلام کے دشمنوں کے نابکار ہاتھوں نے اپنی سرگرمی دکھائی اور کوشش کی کہ رسول اکرمؐ کی شخصیت اور آپ کی نبوت کی بنیاد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں حتیٰ کہ نبوت کے آخری قلعے یعنی عصمت کو بھی مسمار کر دیں جو خدائے تعالیٰ کی وحی اور رسالت کو حاصل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کے لیے ضروری ہے۔

چنانچہ "غرانیق" کا خطرناک اور اسلام کے لیے تباہ کن افسانہ خلفاء کی مشہور و معتبر تفسیر، تاریخ اور سیرت کی کتابوں کے ذریعہ دنیا بھر میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ہم اس امر کی تحقیق کے لیے سب سے پہلے مکتب خلفاء کے مفسرین اور مؤرخین کے امام، محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ ہجری) کی تفسیر اور تاریخ سے رجوع کرتے ہیں کیونکہ اس کی روایات کی اسناد قدیم ترین ہیں اور دوسروں کے مقابلے میں اس کے الفاظ اور عبارات زیادہ مفصل اور شک و شبہ پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر ہیں۔

خلفاء کے مکتب میں افسانۂ غرانیق کی روایات

مفسرین نے سورۂ حج کی ۵۲ ویں آیت کی تفسیر کے سلسلے میں غرانیق کے قصے پہ بحث کی ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ۔

یعنی ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول یا نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ جب اس نے آرزو کی تو شیطان نے اس میں وسوسہ اور شبہ ڈال دیا مگر اللہ شیطان کی القا کردہ بات کو زائل کر دیتا ہے اور اپنی آیات کو مضبوط کرتا ہے اور خدا تو بڑا جاننے والا اور دانا ہے۔

---

[۱] اس قول کی دلیل ہم انشاء اللہ بحث کے آخر میں پیش کریں گے۔

طبری نے — جو مکتب خلفاء کے مفسرین کے امام ہیں — اس آیت کے دو الفاظ "تمنّٰی" اور "اُمنیّه" کی تفسیر میں مروی تمام احادیث اور اقوال کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے[1]۔

الف: "تمنّٰی" اور "اُمنیّه" کی تفسیر میں طبری کی روایات کا پہلا حصہ:

اس حصے میں طبری وہ روایات نقل کرتا ہے جن میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی بڑی خواہش تھی کہ آپ کی قوم خدائے واحد پر ایمان لے آئے لہٰذا آپ چاہتے تھے کہ بتوں اور دیوتاؤں کی جانب ان لوگوں کے میلان کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے گفت گو کریں حتیٰ کہ اسی بنا پر بعض اوقات آپ ان کے بتوں کی برائی بیان کرنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ پھر طبری اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل روایات سے استناد کرتا ہے:

۱۔ محمد بن کعب قُرظی اور محمد بن قیس دونوں سے مروی ہے کہ رسول اکرمؐ ایک دن قریش کی ایک مجلس میں بیٹھے تھے اور وہاں بہت سے آدمی تھے، آپ نے یہ تمنا کی اللہ آپ پر کوئی بات ایسی نازل نہ فرمائے جس سے وہ لوگ آپ سے متنفر ہو جائیں۔ اس وقت اللہ نے یہ سورت نازل فرمائی:

رسول اکرمؐ نے اسے قریش کے سامنے پڑھا اور جب اس مقام پر آئے اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی[2] تو شیطان نے یہ دو جملے تِلْكَ الْغَرَانِقَةُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰی آپ کے دل میں القا کیے۔ آپ نے ان کو بھی پڑھا۔ پوری سورت ختم کر کے آخر میں آپ نے سجدہ کیا۔ آپ کے ساتھ تمام حاضرین بھی سجدے میں گر پڑے۔ ولید بن مغیرہ چونکہ پیرانہ سالی کی وجہ سے سربسجود نہیں ہو سکتا تھا اس نے مٹی اٹھا کر اس پر پیشانی رکھ کر سجدہ کر لیا اور قریش رسول اللہؐ کے ان الفاظ سے بہت خوش ہو گئے

---

[1] طبری: جامع البیان فی تفسیر القرآن جلد ۱۷ صفحہ ۱۳۱ اور بعد کے صفحات مطبوعہ بولاق۔ مصر۔ [2] سورۂ نجم۔ آیات ۱۹-۲۱

اور کہنے لگے : ہاں ہم اس بات سے واقف ہیں کہ اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے، وہی پیدا کرتا ہے، وہی رزق دیتا ہے مگر یہ ہمارے معبود اللہ کی جناب میں ہماری شفاعت کرتے ہیں۔ جب تم نے بھی ان کو اپنے رب کے ساتھ شریک کر لیا تو اب ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

رات کو جبرئیل آئے تو آنحضرتؐ نے وہ سورت انھیں پڑھ کر سنائی۔ جب آپ ان شیطانی جملوں پر پہنچے تو جبرئیل نے عرض کیا: میں نے یہ تو آپ کو نہیں پہنچائے۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا: اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے غلط بات اللہ سے منسوب کی۔ تب خدا نے رسولِ اکرمؐ کو یہ وحی فرمائی: "وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ"[1] ...

رسول اکرمؐ اس حادثے سے بہت ملول اور رنجیدہ تھے۔ پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى ....."[2]

راوی مزید کہتے ہیں: اس سلسلے میں مہاجرین حبشہ کو جب معلوم ہوا کہ تمام اہل مکہ اسلام لے آئے ہیں تو وہ اپنے قبائل کو یہ کہہ کر کہ وہ ہمیں جلاوطنی سے زیادہ محبوب ہیں پلٹے مگر یہاں آکر انھوں نے دیکھا کہ ان شیطانی کلمات کی اللہ کی جانب سے تنسیخ ہو جانے کی وجہ سے اہل مکہ پھر کافر ہو چکے ہیں۔[3]

۲۔ یہ روایت طبری نے صرف محمد بن کعب قرظی سے نقل کی ہے اور وہ کہتا ہے: جب رسولِ اکرمؐ نے دیکھا کہ ان کی قوم نے ان سے اعراض کیا ہے اور صرف اس حکم کی وجہ سے جو اللہ نے آپ کو دیا تھا آپکی قوم آپ سے دور ہو گئی ہے۔ آپ کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم نازل فرماتا جس سے آپ کے اور ان کے تعلقات پھر قائم ہو جاتے۔ آپ اپنی قوم سے محبت اور ان کی فلاح کے خیال سے یہ چاہتے تھے کہ ان کے معاملے میں آپ نے جو شدت برتی ہے اس میں نرمی کر دیں۔ یہ خیال آپ کے دل میں آیا اور آپ نے اس کی آرزو اور تمنا کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی: وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى. مَا ضَلَّ

---

[1] سورہ بنی اسرائیل۔ آیات ۷۳-۷۵ [2] سورہ حج۔ آیت ۵۲ [3] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۳۸

صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ جب آپ اللہ کے قول اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى[1] پر پہنچے تو شیطان نے آپ کی اس خواہش کی وجہ سے جو آپ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کو خوش کر یں آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری کر دیے تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ تُرْتَضٰى۔

یہ الفاظ سن کر مشرکین بہت خوش ہوئے کہ محمدؐ نے ان تعریفی الفاظ میں ہمارے معبودوں کا ذکر کیا ہے، انھوں نے خوشی میں نعرہ لگایا۔ مسلمان تو اپنے نبی پر ایمان کامل ہی رکھتے تھے کہ جو کچھ آپ ہمارے رب کی طرف سے کہتے ہیں وہ بالکل سچ ہے اور وہ آپ کو خطا، وہم اور لغزش سے معصوم سمجھتے تھے۔ جب اس سورت میں سجدہ کا مقام آیا اور سورت ختم ہوئی تو رسول اللہؐ نے سجدہ کیا اور تمام مسلمانوں نے اپنے نبی کی اتباع حکم اور وحی کی تصدیق میں آپ کے ساتھ سجدہ کیا اور چونکہ مشرکین نے رسول اللہؐ کی زبان سے اپنے معبودوں کی تعریف سنی تھی اس لیے مشرکین، قریش اور دوسرے لوگوں نے بھی سجدہ کیا۔ اس طرح ساری مسجد میں جس قدر مومن یا کافر تھے سب سجدے میں گر پڑے البتہ ولید بن مغیرہ چونکہ نہایت بوڑھا تھا وہ سجدے میں تو نہ جا سکا مگر اس نے مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر ان پر سر رکھ دیا اور اس طرح اس نے بھی سجدہ کر لیا۔

اس کے بعد تمام لوگ مسجد سے چلے گئے۔ قریش بھی بڑے خوش وہاں سے گئے اور ایک دوسرے سے بیان کرنے لگے کہ محمدؐ نے ہمارے معبودوں کا بڑے اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے اور اپنے قرآن میں یہ بات کہی ہے کہ اِنَّهَا الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ تُرْتَضٰى۔ (یہ دراز گردن مورتیں ہیں ان کی شفاعت مقبول ہو گی۔ اس سجدے کی خبر ان مسلمانوں کو بھی ہوئی جو حبشہ میں ہجرت کر گئے تھے اور ان سے یہ بھی کہا گیا کہ قریش اسلام لے آئے ہیں۔ اس خبر کو سن کر ان میں سے بعض وطن آنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ وہیں رہ گئے۔

حضرت جبرئیلؑ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور کہا: اے محمدؐ! آپ نے یہ کیا کیا؟

---

[1] سورۂ نجم۔ آیت ۱۹ تا ۲۱

آپ نے وہ الفاظ بطور وحی لوگوں کے سامنے پڑھے جو میں اللہ کی طرف سے آپ کے پاس نہیں لایا تھا اور آپ نے وہ کہہ دیا جو آپ سے نہیں کہا گیا۔ یہ سن کر رسول اللہ ص بہت رنجیدہ اور ملول ہوئے اور آپ کو اللہ کا بڑا خوف ہوا کہ کیا ہوگا مگر اللہ تعالیٰ چونکہ آپ پر نہایت مہربان تھا اس نے آپ کی تسلّی و تشفی کے لیے وحی کے ذریعے آپ کو بتایا کہ آپ سے پہلے بھی جس نبی یا رسول نے آرزو اور تمنا کی ہمیشہ شیطان اس میں اسی طرح شریک ہوا جس طرح کہ آپ کے ساتھ معاملہ گزرا کہ اس نے اپنی بات آپ کی زبان سے کہلا دی مگر اللہ نے ہمیشہ شیطان کی بات منسوخ کر کے اپنی بات جمائی ہے۔ چونکہ تم بھی دوسرے انبیاء کی طرح ہو اس لیے اس کی فکر مت کرو۔ پھر خدائے تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَی ...

اس طرح خدا نے اپنے نبی ص کا رنج و غم دور کیا اور آپ کے ہراس کو اطمینان میں بدل دیا اور شیطانی القائات یعنی اِنَّهَا الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ تُرْتَضٰى کو منسوخ فرما دیا۔

جب رسول اکرم ص نے قرآنی آیات کے بیچ میں بتوں یعنی لات، عزیٰ اور منات کے نام لیے (اور وہ منسوخ ہو گئے) تو آپ پر ایک اور آسمانی وحی ان الفاظ میں نازل ہوئی: "وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا...." [1]

آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں جن کی سفارش بھی کچھ کام نہیں آتی مگر اس کے بعد کہ خدا اجازت دے (وہ بھی) جس کے لیے وہ چاہے۔

یعنی پھر تمہارے ان خداؤں کی شفاعت کا اس پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟

جب خدائے تعالیٰ کی جانب سے شیطانی القائات کی منسوخی کا حکم نازل ہو گیا تو کفار قریش نے کہا:

محمد ص تمہارے خداؤں کی منزلت بیان کرنے سے خدائے تعالیٰ کے ہاں نادم اور پشیمان ہو گئے ہیں اور اب دوسری باتیں کہنے لگے ہیں۔ جو الفاظ شیطان نے رسول اکرم ص

---

[1] سورۂ نجم۔ آیت ۲۶

کی زبان پر القاء کیے تھے وہ ہر مشرک کی زبان پر تھے اور انھیں شر کی راہ پر زیادہ ثابت قدم بنا رہے تھے۔[1]

۳۔ طبری ابو العالیہ سے نقل کرتا ہے: کفار قریش نے رسولِ اکرمؐ سے کہا: آپ کے ساتھیوں اور رفیقوں میں فقط غلام اور آزاد شدہ غلام ہیں لیکن خاندانی لوگوں اور سرداروں میں سے کوئی بھی ان میں شامل نہیں ہے۔ تاہم اگر آپ ہمارے خداؤں کا ذکر اچھے الفاظ میں کریں تو ہم آپ کے ساتھ مل بیٹھیں گے۔ اس طرح عالی نسب لوگ آپ کے قریب آجائیں گے اور یہ فقیر بھی جب دیکھیں گے کہ قوم کے سردار آپ کے ساتھ مل بیٹھے ہیں تو انھیں بھی آپ کی اور اسلام کی جانب زیادہ رغبت ہوگی۔ پس شیطان نے (یہی تمنائیں) آنحضرتؐ کی زبان پر القاء کردیں۔

قصہ یوں تھا کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں اَفَرَءَیتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰی، وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی تو شیطان نے آنحضرتؐ کی زبان پر یہ الفاظ جاری کردیے: "تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وَشَفَاعَتُهُنَّ تُرْتَجٰى مِثْلُهُنَّ لَا يُنْسٰى۔

ان آیات کی قرأت کرتے وقت رسولِ اکرمؐ سجدے میں گر گئے، تب تمام مسلمانوں اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا (جو الفاظ آنحضرتؐ پر القاء ہوئے تھے اور آپ نے اپنی زبان سے ادا کیے تھے ابھی آپ ان کے مفہوم سے واقف نہیں تھے) لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ آپ کی زبان پر کیا چیز جاری ہوئی ہے تو آپ کو اس پر سخت پریشانی ہوئی۔ پس خدائے تعالیٰ نے (آپ کی تسلی کے لیے) یہ آیت نازل فرمائی: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ...

۴۔ طبری اسی روایت کو ایک اور سند کے ساتھ ابو العالیہ ہی سے زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل کرتا ہے:

کفار نے کہا: اے محمدؐ! فقط نادار، بیکس اور مسکین لوگ ہی آپ کی صحبت میں بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے خداؤں کو اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کریں تو ہم آپ

---

[1] تفسیر طبری جلد ۱۷ صفحہ ۱۳۱-۱۳۲۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۳۸-۳۳۹۔ تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم

کے ہم نشیں اور ساتھی بن جائیں گے۔ اس وقت تمام علاقوں اور شہروں کے لوگ آپ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ پھر جبکہ آنحضرتؐ سورۂ نجم کی قرأت فرماتے ہوئے اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی کی آیت پر پہنچے تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ الفاظ القاء کر دیئے: وَھِیَ الْغَرَانِقَةُ الْعُلٰی وَشَفَاعَتُھُنَّ تُرْتَجٰی جب آنحضرتؐ نے ان الفاظ کی قرأت کر لی تو ابو حیحہ سعید بن العاص کے علاوہ سب مسلمانوں اور مشرکوں نے آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ تاہم اس نے بھی مٹھی بھر مٹی اٹھائی اس پر سجدہ کیا اور کہنے لگا: وہ وقت آگیا ہے کہ ابن ابی کبشہ (محمدؐ) بھی ہمارے خداؤں کو اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کرتا ہے۔

جب اس اجتماعی سجدے کی خبر حبشہ میں اصحابِ رسول کو پہنچی تو وہ سمجھے کہ قریش اسلام لے آئے ہیں۔ تاہم آنحضرتؐ اس بات پر سخت رنجیدہ اور پریشان ہوئے کہ شیطان آپ کی زبان پر ایسے جملے جاری کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ...

۵ اور ۶۔ طبری نے یہ دو روایتیں سعید بن جبیر سے نقل کی ہیں۔ وہ کہتا ہے:

جب آیت اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی .... نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے اس کی قرأت فرمائی اور اس کے بعد "تِلْكَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی" بھی کہا اور اسی وقت سجدہ بھی کیا۔ مشرکوں نے کہا: اس سے پہلے وہ ہمارے خداؤں کو اچھے الفاظ کے ساتھ یاد نہیں کرتے تھے۔ پھر انھوں نے بھی رسولِ اکرمؐ کے ساتھ سجدہ کیا۔ اس وقت خدائے تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ .... عَذَابُ یَوْمٍ عَقِیْمٍ۔

۷۔ طبری نے یہ روایت ابن عباس سے نقل کی ہے۔ اس روایت میں عبداللہ ابن عباس آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ .... وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ کی شانِ نزول یوں بیان کرتے ہیں:

ایک دن رسول اکرمؐ (مسجد الحرام میں) نماز پڑھنے میں مشغول تھے۔ اس وقت اہل عرب کے بتوں کے بارے میں کچھ آیات آپ پر نازل ہوئیں اور آپ ان کی تلاوت کرنے لگے۔ وہ مشرک جو آپ کی تلاوت سن رہے تھے ایک دوسرے سے کہنے لگے: ہم سن رہے ہیں کہ (محمدؐ) ہمارے خداؤں کا ذکر بھلائی سے کر رہے ہیں لہٰذا وہ آنحضرتؐ کے قریب آگئے۔ اس وقت آپ تلاوت فرما رہے تھے اور کہہ رہے تھے: "اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى یہاں شیطان نے آپ پر القاء کیا کہ تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى مِنْهَا الشَّفَاعَةُ تُرْتَجٰى چنانچہ آپ نے مذکورہ آیت کے ساتھ ہی ان کلمات کی قرأت بھی کی۔ پھر جبریل آئے، ان کلمات کو منسوخ کیا اور یہ آیت پڑھی: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى .... وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔

۸۔ طبری ضحاک سے نقل کرتا ہے کہ آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ... کا قصہ یوں تھا: اس زمانے میں رسول اکرمؐ مکہ میں رہ رہے تھے۔ خدائے عزوجل نے عربوں کے بتوں اور خداؤں کے بارے میں آپ پر کچھ آیات نازل کیں اور آپ ان کی تلاوت کرنے لگے۔ آپ نے اس دوران میں لات اور عزیٰ کے نام بار بار دہرائے۔ اہل مکہ جو آنحضرتؐ کو تلاوت کرتے ہوئے سن رہے تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے خداؤں کا ذکر ہو رہا ہے بہت خوش ہوئے اور آپ کے نزدیک آگئے تاکہ یہ تلاوت بخوبی سن سکیں۔ یہاں شیطان نے آنحضرتؐ کی تلاوت میں یہ کلمات القاء کر دیے: تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى مِنْهَا الشَّفَاعَةُ تُرْتَجٰى۔ رسول اکرمؐ نے بھی ان الفاظ کی اسی طرح قرأت کی لہٰذا خدائے تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ... وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔

۹۔ یہ روایت طبری نے ابوبکر بن عبد الرحمٰن بن الحرث سے نقل کی ہے۔ وہ کہتا ہے: اس زمانے میں جب رسول اکرمؐ مکہ میں رہ رہے تھے آپ نے ایک دن لوگوں کے سامنے سورہ "وَالنَّجْمِ" کی قرأت فرمائی: جب آپ نے اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى کی آیت پڑھی تو پھر کہا:

وَشَفَاعَتُهُنَّ تُرْتَجٰی ۔ رسول اللہ ؐ نے یہ الفاظ ادا کرنے میں غلطی کھائی تھی لیکن اس حادثے کے بعد مشرکین نے آپ کو سلام کیا۔ وہ آپ کے اس نظریے اور ان کلمات پر خوش ہوئے۔ تب آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: یہ کلمات شیطان کی جانب سے تھے۔ اس وقت خدائے تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ ... فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ۔

طبری نے یہ احادیث ان مفسرین کے پیش کردہ دلائل کے طور پر نقل کی ہیں جنہوں نے "تَمَنّٰی" اور "اُمْنِيَّه" کے یہ معنی لیے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ بتوں کے معاملے میں اپنی قوم کے ساتھ نزدیکی اور تعلق کی خواہش رکھتے تھے۔

(ب) "تَمَنّٰی" اور "اُمْنِيَّه" کے معنی اور تفسیر کے بارے میں طبری کی روایات کا دوسرا حصّہ

طبری اپنی تفسیر میں کہتا ہے: لیکن جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں دو الفاظ "تَمَنّٰی" اور "اُمْنِيَّه" کے معنی قرأت یا تلاوت یا باتیں کرنے کے ہیں ان کے قول کی دلیل یہ روایات ہیں:

۱۔ ابن عباس آیت "اِذَا تَمَنّٰی اَلْقَی الشَّيْطَانُ فِیْ اُمْنِيَّتِهٖ" کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ رسولِ اکرمؐ بات کرتے ہیں تو شیطان ان کی بات میں شک و شبہ القاء کر دیتا ہے۔

۲۔ مکتب خلفاء کے ممتاز مفسر مجاہد کہتے ہیں کہ اس آیت میں کلمہ "اِذَا تَمَنّٰی" "جب اس نے کہا" کے معنوں میں آیا ہے۔

۳۔ اسی مکتب کے ایک اور مفسر ضحاک کہتے ہیں کہ "اِذَا تَمَنّٰی" میں "تَمَنّٰی" سے مراد تلاوت اور قرأت کرنا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب وہ تلاوت اور قرأت کریں تو شیطان اس میں شک و شبہ القاء کرتا ہے۔

طبری ضحاک کا نظریہ نقل کرنے کے بعد کہتا ہے: یہ نظریہ حقیقی تفسیر سے قریب تر

ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت کے آخر میں ارشاد ہوا ہے: فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (پس خدا شیطان کے القائات کو مٹا دیتا ہے)۔ یہ بات ہم نے اس لیے کہی ہے کہ جن آیات کو پروردگار استحکام بخشتا ہے اور ہمیں اس کی خبر دیتا ہے وہ قرآن مجید ہی کی آیات ہیں کوئی اور چیز نہیں لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی ہی آیات تھیں جن میں شیطان نے شبہات القاء کیے۔ بہ الفاظ دیگر یہ قرآن کی آیات ہی ہیں جو شیطان کے حملے کا نشانہ بنتی ہیں اور اس کے پیدا کیے ہوئے شبہات میں گرفتار ہوتی ہیں۔ جیساکہ خدائے تعالیٰ نے خود خبر دی ہے کہ ان شبہات کو زائل اور منسوخ کر کے اپنی آیات کو استحکام عطا فرماتا ہے۔

پس طبری کے نظریے کے مطابق خدا کے کلام کی تفسیر یوں ہے: ہم نے آپ سے پہلے کوئی نبی اور رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ جب اس نے کتاب خدا کی تلاوت و قرأت کی یا خود کوئی بات کہی تو شیطان نے اس میں (شکوک و شبہات) القاء کیے۔ ہاں پھر خدا نے شیطان کے القائات کو منسوخ اور زائل کر دیا۔ یہاں خدائے تعالیٰ یہ خبر بھی دیتا ہے کہ وہ خاتم الانبیاءؐ کی زبان پر جاری ہونے والے شیطانی القائات کو بھی باطل اور نابود کر دے گا۔

اس گفتگو کے بعد طبری اپنے اس نظریے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے معنیٰ "نسخ" کے بارے میں سابقہ مفسرین کی یہ شہادتیں نقل کرتا ہے۔

۱- ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ "فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ" کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ شیطان نے القاء کیا ہے خدائے تعالیٰ اسے باطل قرار دیتا ہے۔

۲- اسی آیت کی تفسیر میں ضحاک سے نقل کیا گیا ہے کہ شیطان نے جو کچھ رسولِ اکرمؐ کی زبان پر جاری کیا تھا جبرئیل نے خدائے تعالیٰ کے حکم سے اسے منسوخ کر دیا اور خدائے تعالیٰ کی آیات کو مضبوط بنا دیا۔ نیز ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ کی تفسیر میں ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اپنی کتاب کی آیات کو باطل کلام سے پاک کر دیا جو شیطان نے پیغمبرؐ کی زبان پر

جاری کر دیا تھا۔

اس کے بعد طبری آیت "لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي....."[1] کی تفسیر بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے: پس جو کچھ شیطان نے القاء کیا وہ اسے زائل کر دیتا ہے اور اپنی آیات کو استحکام بخشتا ہے تاکہ جو باطل چیز شیطان نے پیغمبرؐ کی قرأت میں القاء کی ہے اسے ان لوگوں کے لیے امتحان اور آزمائش قرار دے جو دل میں مرض رکھتے ہیں...... اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى کہنا ایک آزمائش تھی جس کے ذریعے ان لوگوں کا امتحان لیا گیا جو دلوں میں نفاق کا مرض رکھتے تھے۔ یہ وہی شک تھا جو اس بنا پر رسولِ اکرمؐ اور ان کے پیغام کی صداقت اور اصلیت کے بارے میں پیدا ہوا اور اس قسم کے لوگ اس میں گرفتار ہو گئے۔

پھر طبری قتادہ سے یوں روایت کرتا ہے:

رسولِ اکرمؐ چاہتے تھے کہ خدائے تعالیٰ قریش کے خداؤں کی عیب جوئی نہ کرے اور انھیں برا بھلا نہ کہے لہٰذا شیطان نے آپ کی قرأت میں یوں القاء کیا:

اِنَّ الْاٰلِهَةَ الَّتِيْ تُدْعٰى اِنَّ شَفَاعَتَهَا لَتُرْتَجٰى وَاِنَّهَا لَلْغَرَانِيقُ الْعُلٰى۔

(تم جن خداؤں کو پکارتے ہو امید ہے کہ وہ تمہاری شفاعت کریں گے کیونکہ وہ بلند مرتبہ موجودات ہیں)۔ پس خدائے تعالیٰ نے ان شیطانی الفاظ کو منسوخ فرما دیا اور اپنی آیات کو استحکام بخشا۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ... تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ... مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ...[2]

قتادہ اس میں یہ اضافہ کرتا ہے: جب شیطان نے رسولِ اکرمؐ کی قرأت میں یہ القائات کیے تو مشرکین نے کہا: خدائے تعالیٰ نے ہمارے خداؤں (اور بتوں) کا نام

---

[1] سورۂ حج۔ آیت ۵۳۔ اس آیت کی تفسیر طبری کی جامع البیان فی تفسیر القرآن جلد ۱۷ صفحہ ۱۳۴ مطبوعہ بولاق مصر میں آئی ہے۔ [2] سورۂ نجم۔ آیت ۱۹ تا ۲۴

بھلائی سے لیا ہے۔ چنانچہ وہ اس پر بہت خوش ہوئے۔ اسی بنا پر قرآن مجید فرماتا ہے:
لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ .....[۱]
(تاکہ وہ شیطان کے القائات کو ان لوگوں کے لیے آزمائش قرار دے جن کے دلوں میں مرض ہے)۔

علاوہ ازیں طبری سورۂ حج کی ۵۴ ویں آیت کی تفسیر میں بھی "غرانیق" کے قصے کی جانب اشارہ کرتا ہے: وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَهَادِ الَّذِينَ آمَنُوا إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ[۲]

(اور اس لیے کہ جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ جان لیں کہ قرآن حق ہے اور تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے۔ پس وہ اس پر ایمان لائیں اور ان کے دل اس کے سامنے تواضع اور فروتنی اختیار کریں۔ ہاں تو جو لوگ ایمان لاتے ہیں پروردگار انکی رہنمائی سیدھے راستے کی جانب کرتا ہے)۔

پھر وہ قتادہ کا نظریہ یوں بیان کرتا ہے:

یہ اس لیے ہے تاکہ اہل علم اور خدا کی معرفت رکھنے والے جان لیں کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے یعنی اس کی آیات جنہیں اس نے رسولِ اکرمؐ کی خاطر استحکام بخشا ہے اور ان سے شیطان کے القائات کو منسوخ اور زائل کیا ہے حق ہیں اور تمہارے پروردگار کی طرف سے ہیں۔ پس اے محمدؐ! اہل معرفت ان آیات کی تصدیق کرتے ہیں، ان کے دل قرآن کے سامنے فروتنی اختیار کرتے ہیں، اسے تسلیم کرتے ہیں اور اس کے حقائق کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولؐ پہ ایمان لاتے ہیں پروردگار اپنے رسولؐ کی قرأت میں سے شیطانی القائات کو منسوخ کر کے ان کی رہنمائی سیدھے راستے اور کھلی سچائی کی جانب کرتا ہے لہٰذا آئندہ شیطان کے وہ القائات جو اس نے مکر اور جھوٹ سے پیغمبرؐ کی زبان پہ ڈالے ہیں وہ ان لوگوں کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

---

[۱] سورۂ حج - آیت ۵۳ [۲] سورۂ حج - آیت ۵۴ دیکھیے تفسیر طبری جلد ۱۷ صفحہ ۱۳۵/۱۳۴ مطبوعہ بولاق مصر۔

اب تک ہم نے جن چیزوں کا مطالعہ کیا ہے وہ مکتب خلفاء کے ممتاز مفسرین کی تفسیری روایات اور ان کے نظریات تھے جن کو اس مکتب کے امام المفسرین طبری نے اپنی تفسیر میں جمع کیا ہے۔

سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ ہجری) اس مکتب کا ایک اور بہت بڑا مفسر اور عالم ہے۔ اس نے سورۂ حج کی ۵۲ ویں آیت کی تفسیر میں ان روایات کے علاوہ جو طبری نے جمع کی ہیں کچھ اور روایات بھی نقل کی ہیں۔

وہ "سُدّی" سے نقل کرتا ہے: رسولِ اکرمؐ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں گئے۔ نماز کی قرأت میں آپ قرآن مجید کا ایک سورہ پڑھ رہے تھے۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے کہ: "اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی" تو شیطان نے ایک اور کلام آپ کی زبان پر جاری کر دیا۔ آپ نے بھی اسے ادا فرمایا۔ وہ کلام یہ تھا: "تِلْكَ الْغَرَانِقَةُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ تُرْتَجٰی۔

پھر آپ نے سورۂ نجم آخر تک پڑھی اور سجدہ کیا۔ تب آپ کے اصحاب نے بھی سجدہ کیا۔ چونکہ قرأت میں آپ نے مشرکین کے خداؤں کے نام لیے تھے اس لیے انھوں نے بھی سجدہ کرنے میں آپ کی پیروی کی۔ جب آنحضرتؐ نے سجدے سے سر اٹھایا تو مشرکین نے آپ کو اپنے کندھوں پر سوار کر لیا۔ وہ آپ کو اٹھائے اٹھائے مکہ میں ادھر ادھر پھر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: یہ بنی عبد مناف کے پیغمبر ہیں۔

اس واقعہ کے بعد جب جبرئیل آنحضرتؐ کے پاس آئے تو آپ نے انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا اور بالخصوص وہ دو جملے پڑھے۔ جبرئیل نے کہا: میں اس چیز سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی چیز آپ کو پڑھ کر سنائی ہو! اس پر آنحضرتؐ بے حد رنجیدہ ہو گئے۔ چنانچہ خدائے تعالیٰ نے انھیں تسلی دینے کے لیے یہ آیات نازل فرمائیں:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰی ...[1]

ایک اور مشہور مفسر نیشاپوری (متوفی ۷۲۸ھ ہجری) نے "تفسیر غرائب القرآن"

---

[1] تفسیر درمنثور جلد ۴ صفحہ ۳۶۸ - مطبوعہ بولاق مصر

میں ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے: ایک شیطان جس کا نام "ابیض" تھا جبرئیل کی شکل میں آنحضرتؐ کے سامنے ظاہر ہوا اور زیر بحث کلمات آپ پہ القاء کیے۔ جب مشرکین نے یہ کلمات سنے تو بہت خوش ہوئے۔ بعدازاں جبرئیل نازل ہوئے تو انھوں نے رسول اکرمؐ سے درخواست کی کہ آپ وہ آیات انہیں پڑھ کر سنائیں۔

آنحضرتؐ نے سورے کے آغاز سے قرائت شروع کی حتیٰ کہ ابیض کے القاء کیے ہوئے جملوں تک پہنچے۔ جب آپ نے وہ جملے پڑھے تو جبرئیل نے ان جملوں کے خدا کی جانب سے آنے کی نفی کردی۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: کوئی آپ کی شکل میں آیا اور اس نے یہ جملے مجھے القاء کیے۔[1]

یہ وہ روایات اور اقوال تھے جو مکتب خلفاء کی معتبر تفاسیر میں موجود ہیں لیکن بدقسمتی سے بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ مورخوں اور سیرت نگاروں نے بھی اس بارے میں بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ اس گروہ میں محمد بن اسحاق (متوفی تقریباً ۱۵۲ھ ہجری)، موسیٰ بن عقبہ (متوفی ۱۴۱ھ ہجری) اور محمد بن عمر واقدی (متوفی ۲۰۷ھ ہجری) سرفہرست ہیں۔

محمد بن اسحاق کی روایات طبری نے اپنی تاریخ میں نقل کی ہیں۔ یہ وہی پہلی اور دوسری روایات ہیں جو ہم پہلے تفسیر طبری سے نقل کر چکے ہیں۔ واقدی کی روایات اس کے شاگرد ابن سعد کی کتاب "طبقات الکبریٰ" میں نقل کی گئی ہیں اور موسیٰ بن عقبہ کی روایات ذہبی وغیرہ[2] جیسے بعد میں آنے والے سیرت نویسوں نے نقل کی ہیں۔

ان روایات کی تحقیق کے سلسلے میں ہم پہلے ان آیاتِ کریمہ کا مطالعہ کرتے ہیں جن کے متعلق ان روایات میں گفتگو کی گئی ہے۔

---

[1] سورۂ حج۔ آیت ۵۳۔ تفسیر غرائب القرآن نظام الدین الحسن بن محمد نیشاپوری جلد ۱۶ صفحہ ۱۱۰ مطبوعہ ۱۳۸۵ھ [2] مثلاً "سُبُلُ الْهُدٰى وَالرَّشَادِ فِي سِيْرَةِ خَيْرِ الْعِبَادِ" کے مصنف محمد بن یوسفی صالحی اور "اَلْاِكْتِفَاءُ فِي مَغَازِي رَسُوْلِ اللهِ وَالثَّلَاثَةِ الْخُلَفَاءِ" کے مصنف سلیمان بن موسیٰ کلاعی۔

ان آیات کو تین دستوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ سورۂ نجم کی وہ آیات جن کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ شیطان ان کی تلاوت کے دوران اپنے دو یا تین جملے رسولِ اکرمؐ کو القاء کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

۲۔ سورۂ حج کی چند آیات۔

۳۔ سورۂ بنی اسرائیل کی دو آیات۔

قرآن مجید کی آیات کا مطالعہ

۱۔ آیات کا پہلا دستہ ۔ سورۂ نجم

سورۂ نجم ان چھوٹی چھوٹی مکی سورتوں میں سے ہے جو بیک وقت نازل ہوئیں۔[1] یعنی یہ اس وقت نازل ہوئیں جب رسول اکرمؐ مکہ میں تھے۔ جن آیات میں شیطانی القائات کا مسئلہ کھڑا کیا گیا ہے وہ اس سورے کی اٹھارھویں آیت سے شروع ہو کر تیسویں آیت پر ختم ہوتی ہیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی تحقیق کی ابتدا ان آیات کے مطالعے اور ان کے مندرجات سمجھنے سے کریں تاکہ ان کے درمیان شیطانی کلمات کے موقع محل کا پتا چلا سکیں۔

اس سورے کی زیر بحث آیات میں عرب کے تین مشہور بتوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے جنہیں لات، منات اور عزّیٰ کے نام دیے گئے تھے۔ عرب یہ سمجھتے تھے کہ یہ بت خدا کے فرشتوں کی انسانی شکل ہیں۔ وہ اس بات پر بھی اعتقاد رکھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید نے بار بار اس عقیدے کا ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ

---

[1] بعض مفسرین نے اس سورے کی تمام آیات کو مکی قرار دیا ہے (تفسیر میزان جلد ۱۹ صفحہ ۲۵۔ تفسیر کبیر جلد ۲۸ صفحہ ۲۷۷) اور بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ فقط ۳۲ ویں آیت مدنی ہے (تفسیر مجمع البیان جلد ۹ صفحہ ۱۷۰، کتاب التسہیل لعلوم التنزیل جلد ۴ صفحہ ۷۵)۔

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شَاهِدُوْنَ [1]

یعنی اے رسول! ان مشرکین سے پوچھیے کہ کیا تمہارے پروردگار کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے یا یہ کہ جب ہم نے فرشتوں کو عورتوں کی صورت میں پیدا کیا تو کیا یہ لوگ اس وقت موجود تھے؟

ایک اور مقام پر کہا گیا ہے کہ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ... وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا [2]

یعنی جب ان لوگوں میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ غصّے سے سیاہ ہو جاتا ہے جبکہ وہ خود خدا کو بیٹیوں والا ہونے کی نسبت دیتے ہیں.... اور یہ فرشتوں کو جو خداوند رحمٰن کے بندے ہیں اس کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں!!

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ "وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ"... [3]

یعنی یہ مشرک خدا کے لیے تو بیٹیاں قرار دیتے ہیں اور اپنے لیے (بیٹے) جن کو وہ چاہتے ہیں۔ پھر اگر ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جائے تو غصّے کے مارے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے۔

قرآن ایک اور مقام پر یوں کہتا ہے کہ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ... [4]

یعنی کیا تمہارے پروردگار نے تمہیں بیٹوں والا ہونے کے لیے چن لیا ہے اور خود اپنے لیے بیٹیاں (فرشتے) لی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تم بڑی سخت بات کہتے ہو۔

قرآن مجید نے مشرکین عرب کے ساتھ (جو ایسا نامعقول عقیدہ رکھتے تھے) مختلف صورتوں میں گفتگو کی ہے اور ایک خاص صورت میں ایک خاص دلیل کے ساتھ ان کے اس عقیدہ کو غلط ٹھہرایا ہے۔ ان گفتگوؤں کا ایک نمونہ سورۂ نجم میں ہے جس کے بارے میں ہم بحث کر رہے ہیں۔ خداوند عالم اس سورے میں فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ صافات - آیت ۱۴۹ - ۱۵۰
[2] سورۂ زخرف - آیت ۱۷ - ۱۹
[3] سورۂ نحل - آیت ۵۷ - ۵۸
[4] سورۂ اسرائیل - آیت ۴۰

"کیا تم نے لات، عزیٰ اور تیسرے بت منات کو نہیں دیکھا؟" جیساکہ ہم جانتے ہیں مشرکین عرب کے عقیدے کے مطابق یہ عورتوں کی شکل میں خدائے تعالیٰ کے فرشتے تھے (!)، یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد فرمایا گیا: "کیا تمہاری اولاد لڑکے اور خدا کی اولاد لڑکیاں ہیں؟ یہ تو بہت بری تقسیم ہے۔" پھر قرآن مجید ان غلط خیالات کی بنیادی وجہ بیان کرتا ہے اور فرماتا ہے: "یہ باتیں اور یہ اعتقادات تو بس بے دلیل اور محض نام کے ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے گھڑ لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ اور وہ اس بات میں فقط اپنے مہمل خیالات اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے ہدایت آچکی ہے۔"

یہاں خدائے تعالیٰ بتوں کے بارے میں مشرکین کے ایک اور اعتقاد کا ذکر فرماتا ہے اور اسے رد کرتا ہے۔ وہ مسئلہ شفاعت کی قدرت رکھنے کا ہے۔ "کیا انسان جس چیز کی تمنا کرتا ہے اسے پا لیتا ہے؟" یقیناً نہیں کیونکہ "دنیا اور آخرت پروردگار کے اختیار میں ہیں" اور انسان کے اور اس کی نفسانی خواہشات کے اختیار میں نہیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شفاعت کے لیے بڑی سخت شرائط ہیں۔

"آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں جن کی شفاعت ان مشرکوں کے لیے سودمند نہیں ہو سکتی مگر یہ کہ پروردگار جس شخص کے لیے چاہے اجازت دے اور جسے وہ چاہے اور پسند کرے۔" اس موقع پر خدائے تعالیٰ فرشتوں کے بارے میں مشرکین کے اعتقاد کو ایک بار پھر غلط ٹھہراتا ہے اور فرماتا ہے: "وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، فرشتوں کو مؤنث مخلوق قرار دیتے ہیں وہ اس بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے بلکہ اپنے گمان کی پیروی کرتے ہیں اور گمان انسان کو کسی بھی طرح حقیقت سے بے نیاز نہیں کرتا۔ پس تم ان لوگوں کی طرف سے منہ پھیر لو جو ہماری یاد سے روگردانی کرتے ہیں اور محض اس دنیا کی زندگی اور بتوں کی جانب جھکتے ہیں۔ ان کا علم بس اتنا ہی ہے۔ پس جو لوگ تمہارے پروردگار

کے راستے سے بھٹک گئے ہیں وہ انہیں خوب جانتا ہے"۔ [1]

●

آپ دیکھ رہے ہیں کہ سورۂ نجم کی ان تمام آیات میں سے جو اوپر نقل کی گئی ہیں نہ صرف یہ کہ قریش کے خداؤں کی تعریف کی بو تک نہیں آتی بلکہ وہ سب کی سب ان کے مشرکانہ خیالات پر تنقید کرتی ہیں۔ زیرِ بحث امر یہ ہے کہ مشرک اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے بتوں کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں لیکن ان کے پاس اپنے اقوال کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ مزید برآں فرمایا گیا ہے کہ اصل میں ان مشرکوں کے علم اور عقل کی پہنچ اس سے آگے تک ہے ہی نہیں۔ وہ فقط اسی مادی دنیا کو اہمیت دیتے ہیں اور اس سے بڑھ کر وہ کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ پھر رسولِ اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان لوگوں سے دوری اختیار کریں، ان کی جانب سے منہ پھیر لیں اور اپنا راستہ ان سے الگ کر لیں۔

نہ جانے یہ اہم مسئلہ شیطانی القائات کا افسانہ گھڑنے والوں سے کیونکر مخفی رہا اور وہ یہ کیوں نہ سمجھ پائے کہ مشرکینِ مکہ عربی زبان سے اتنے بھی نابلد نہ تھے کہ اپنے اعتقادات کے خلاف سورۂ نجم کے اعلانِ جنگ کو نہ سمجھ سکتے اور اس تمام سرزنش اور تمسخر کا احساس نہ کر پاتے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مکہ کے رہنے والے عرب یعنی قریش خالص عرب تھے اور ان کے علم کا ذخیرہ تقریروں، شعروں، غزلوں، قصیدوں اور جوشیلی ہجو و مدح ہی پر مشتمل تھا۔ وہ مدح کے ایک شعر سے پھولے نہ سماتے تھے اور ہجو کا ایک شعر انہیں اتنا مشتعل کر دیتا تھا کہ ان سے خونیں جنگوں کا سلسلہ چل نکلتا تھا اور سالہا سال تک ان کے دلیر فرزندوں کا خون عرب کے صحراؤں کی تپتی ریت پر بہتا تھا۔ اس کے باوجود گزشتہ روایات کے مضامین سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نجم میں مشرکوں کے خیالات کی جو تردید اور تضحیک کی گئی تھی وہ اس کو قطعاً

---

[1] سورۂ نجم۔ آیت ۱۹ تا ۳۱۔ جو جملے واوین میں ہیں وہ آیات کا ترجمہ ہے اور جو جملے واوین سے باہر ہیں وہ مؤلف کی جانب سے ان کی تشریح ہے۔

نہیں سمجھ پاتے بلکہ ان دو تعریفی جملوں کو سن کر ان کے بعد آنے والے دسیوں تکذیبی جملوں کو نظر انداز کر کے مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر گئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیطانی القائات اور سخت تر قرآنی آیات کے واضح تضاد کو نہ سمجھ سکے اور فقط ان دو جملوں سے خوش ہو کر سجدہ ریز ہو گئے حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جو تمام تر کینے اور دشمنی کے باوجود تمام قرآنی آیات کو بڑی توجہ سے سنتے تھے[1] اور اس کے الفاظ کی خوبصورتی اور فصاحت و بلاغت پر حیران رہ جاتے تھے۔ پھر انھیں اس کے علاوہ کوئی اور راہ نہ ملتی تھی کہ وہ اسے جادو کہہ دیں[2] لہٰذا یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے سورے میں ایک دوسرے سے قریب تر جملوں کے انداز میں تبدیلی کو نہ سمجھ پائے؟ نہ صرف یہ کہ تنہا وہی سمجھ نہ پائے بلکہ مکتب خلفاء کے ممتاز علماء اور صفِ اول کے مفسرین بھی اسی نافہمی اور کوتاہ اندیشی کا شکار ہو گئے۔ کیا یہ باتیں عجیب اور حیران کن نہیں ہیں؟

۲۔ دوسرے مرحلے میں ہم سورۂ حج کی آیات کی تحقیق کرتے ہیں۔

ہماری بحث آیت "وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ ..."[3] کے بارے میں تھی چنانچہ ضروری ہے کہ ہم ان تین مفاہیم کا مطالعہ کریں جو اس آیت میں وارد ہوئے ہیں تاکہ اس کا سمجھنا اور اس کی تفسیر کرنا ہمارے لیے ممکن ہو جائے۔ یہ تین مفاہیم مندرجہ ذیل موضوعات سے عبارت ہیں:

ا۔ اُمۡنِیَّه

ب۔ شیطانی القائات

ج۔ خدا کا شیطانی القائات کو منسوخ کرنا اور اپنی آیات کو مستحکم کرنا۔

اُمۡنِیَّه: اس کلمے کی جمع "اَمَانِیّ" کی شکل میں بنائی جاتی ہے یا جیساکہ بعض حضرات نے کہا ہے اس کے معنی "تلاوت" اور "قرأت" کے ہیں۔ اس

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۳۱۵ - ۳۱۷ طبع دوم مصر ۱۳۷۵ھ ہجری۔ الاکتفاء جلد ۱ صفحہ ۳۱۳-۳۱۴

[2] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۷۰ - ۲۷۱ - تاریخ الاسلام جلد ۲ صفحہ ۹۰ - طبع دوم مصر۔

[3] سورہ حج - آیت ۵۲

رائے کے حامل حضرات کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جیسا کہ بہت سے دوسروں نے کہا ہے اس کے معنی "رغبت" اور "آرزو" کے ہیں اور ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے اور یہ کہ اس لفظ کے معنی ان دو مفروضوں سے باہر نہیں ہیں۔

جب ہم قرآن مجید میں اس مادہ کے مختلف مشتقات کی جانب رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جن آیات میں اس مادے کے مشتقات کسی نہ کسی شکل میں استعمال ہوئے ہیں ان سے فقط دوسرا مفروضہ ہی مناسبت رکھتا ہے۔

لفظ اَمَانِیّ جو اُمْنِیَّه کی جمع ہے قرآن مجید میں پانچ مرتبہ استعمال ہوا ہے مثلاً: وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔[1] یعنی اہل کتاب کہتے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ کے علاوہ کوئی شخص ہرگز جنت میں نہیں جائے گا۔ یہ ان کی آرزو ہے۔ اے رسول! ان سے کہیے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا[2] یعنی خوش بختی اور ثواب نہ تمہاری آرزوؤں کی بنیاد پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں کی بنیاد پر بلکہ جو برا کام کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس بنا پر "مجمع لغت عرب" کے لغت شناسوں کی تحقیقات صحیح ہے کہ انھوں نے زیر بحث لفظ کے معنی یوں کیے ہیں: "اَلْاُمْنِیَّه: مَا يَرْغَبُ فِيْهِ الْمَرْءُ وَيَتَشَهَّاهُ وَاَكْثَرُ مَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ فِي الْاٰمَالِ الْبَاطِلَةِ كَطُوْلِ الْبَقَاءِ وَعَدَمِ الْبَعْثِ (اُمْنِیَّه: وہ چیز ہے جس سے کوئی شخص رغبت رکھتا ہو اور اسے چاہتا ہو۔ اور بلاشبہ یہ لفظ اکثر باطل اور غیر صحیح اور پوری نہ ہو سکنے والی آرزوؤں مثلاً لمبی عمر اور قیامت کے برپا نہ ہونے کی آرزوؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے)[3]

کلمہ "تَمَنّٰی" جو اصل اور معنی کے لحاظ سے "اُمْنِیَّه" کے قریب ہے قرآن مجید میں مختلف صورتوں میں استعمال ہوا ہے اور کسی وجہ سے بھی آرزو کرنے

---

[1] سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۱۱ [2] سورۂ نساء۔ آیت ۱۲۳

[3] مُعْجَمُ لِاَلْفَاظِ الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ، مَجْمَعُ اللُّغَةِ الْعَرَبِيَّةِ جلد ۲ صفحہ ۶۶۰ دوسرا ایڈیشن۔ مصر

کے علاوہ اس کے کوئی اور معنی نہیں ہو سکتے۔ ان آیات کے نمونوں پر غور فرمائیے۔

"وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ ..."[1] یعنی جن لوگوں نے کل قارون کے جاہ و مرتبہ کی تمنا کی تھی انھوں نے اس حال میں صبح کی کہ کہہ رہے تھے .....

"قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ"[2] یعنی ان سے کہہ دو کہ اگر خدا کے نزدیک آخرت کا گھر خاص تمہارے لیے ہے اور دوسرے لوگوں کے لیے نہیں تو اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو (تاکہ اس طرح خاص نعمتیں حاصل کر لو)۔

"وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظَّالِمِيْنَ"[3] یعنی یہ لوگ ان اعمال کی وجہ سے جو انھوں نے کیے ہیں ہرگز موت کی آرزو نہیں کریں گے اور خدا ظالموں کو جانتا ہے۔

یوں "مجمع لغت عرب" کا اس کلمے کے بارے میں نظریہ صائب ہے کیونکہ اس میں اس کے معنی اس طرح کیے گئے ہیں: "تَمَنَّى الشَّيْءَ الْمَحْبُوْبَ: رَغِبَ فِيْ اَنْ يَّنَالَهٗ وَحَدَّثَتْهُ نَفْسُهٗ بِوُقُوْعِهٖ"[4] (فلاں محبوب چیز کی تمنا کی یعنی اس کی آرزو کی اور اس کے انجام میں دلچسپی لی)۔

پھر ان جملوں کا اضافہ کیا گیا ہے: نبی اور رسول کی تمنا اپنی دعوت نشر کرنے اور اپنی رسالت لوگوں تک پہنچانے کی رغبت ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں شیطان بھی ان لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے جنھیں یہ رسالت اور دعوت قبول کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ نبی اور رسول کی یہ عظیم آرزو اور خواہش پوری نہ ہو۔[4]

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس کی بنیاد پر "تَمَنّٰی" اور "اُمْنِيَّه" کے

---

[1] سورۂ قصص - آیت ۸۲ [2] سورۂ بقرہ - آیت ۹۴ [3] سورۂ جمعہ - آیت ۷

[4] مُعْجَم لِاَلْفَاظِ الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ، مجمع اللغة العربيّه جلد ۲ صفحہ ۶۵۹-۶۶۰

الفاظ قرآن مجید میں سورۂ حج کی آیت میں اور دوسرے مقامات پر خواہش اور آرزو کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں لہذا جب ہم مذکورہ بالا سورے میں اس آیت کے محلِ وقوع پر غور کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ آیت آیات کے ایک مجموعے میں واقع ہے جن کا موضوع مکمل طور پر ایک ہے۔ آیات کا یہ مجموعہ ۴۲ ویں آیت سے شروع ہو کر ۵۵ ویں آیت پر ختم ہوتا ہے۔

ان آیات میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: "اے رسولؐ! اگر یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ان سے پہلے نوحؑ کی قوم اور قوم عاد و ثمود اور ابراہیمؑ کی قوم اور لوطؑ کی قوم اور مدین کے رہنے والے بھی (اپنے پیغمبروں کو) جھٹلا چکے ہیں۔ موسیٰؑ کو بھی جھٹلایا گیا۔ پس ہم نے کافروں کو مہلت اور فرصت دی اور پھر آخر انھیں عذاب میں گرفتار کر لیا۔ پھر ہم نے کافروں کے کتنے ہی شہر نابود کر دیے اور اب ان شہروں کے مکانات کی دیواریں اور چھتیں گر چکی ہیں، وہاں کے کنوؤں کے پانی کا کوئی مصرف نہیں رہا اور وہاں کے بڑے بڑے اونچے محل ویران ہو گئے اور پھر فرماتا ہے: اور کتنی ہی بستیاں تھیں کہ میں نے انھیں چندے مہلت دی حالانکہ وہ سرکش تھیں۔ پھر آخر میں نے انھیں نابود کر دیا اور سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے۔" اس کے بعد خداوند عالم رسول اکرمؐ سے گفتگو کا آغاز کرتا ہے اور انھیں تسلی دیتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے کفر کی وجہ سے رنجیدہ نہ ہوں کیونکہ وہ فقط پیغام لانے والے اور خطرے سے خبردار کرنے والے ہیں اور لوگوں کے معتقد ہونے اور عمل کرنے کے بارے میں ان کی کوئی لازمی ذمہ داری نہیں کہ اگر وہ عمل نہ کریں تو وہ بھی جوابدہ ہوں۔ پھر فرماتا ہے: آپ کی تبلیغات کے مقابلے میں لوگوں کے دو دستے ہیں: ایک مومن اور دوسرا کافر۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ

یعنی جو لوگ قرآن پر ایمان لائے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں، ان کے لیے (آخرت میں) مغفرت اور (بہشت میں) بہت بڑا رزق ہے اور جو لوگ کوشش کرتے ہیں کہ ہماری آیات کو جھٹلائیں اور دین کی پیشرفت کو روک کر ہمیں عاجز کر دیں

وہ اہلِ دوزخ ہیں۔ اس تقسیم کے بعد خدائے تعالیٰ ایک مرتبہ پھر رسولِ اکرمؐ کو تسلی دیتا ہے اور فرماتا ہے : وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى۔ یعنی تم سے پہلے ہم نے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا، مگر یہ کہ وہ اپنی دعوت کی پیشرفت کی تمنا اور آرزو کرتا تھا۔" اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ۔

" تو شیطان اس کی آرزو پوری ہونے کی راہ میں مشکلات اور شکوک و شبہات پیدا کر دیتا تھا تاکہ خدا کی آیات کو جھٹلائے اور ان کی شکست اور ان کے عجز کو ثابت کر دے۔" فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ " پس خدا ان تمام شیطانی شبہات اور موانع کو جو اس پیغمبر کی دعوت کی راہ میں حائل کی جائیں نابود کر دیتا ہے اور ان کے اثرات مٹا دیتا ہے۔

قرآن مجید کی دوسری آیات میں اس دوطرفہ جنگ کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ایک طرف خدا اور اس کا پیغمبر اور اس کی آیات ہیں اور دوسری طرف شیطان اور شیطان صفت لوگ اور ان کے پیدا کردہ شکوک و شبہات اور مشکلات ہیں اور یہ واضح اعلان کیا گیا ہے کہ فتح بالآخر حق کی ہی ہوگی۔ ارشاد ہوا ہے کہ:" خدا حق کو باطل پر دے مارتا ہے اور اس طرح باطل کو توڑ پھوڑ دیتا ہے اور نابود کر دیتا ہے[1]

اور ایک اور موقع پر فرمایا گیا ہے کہ:" کافر تمہارے پاس آتے ہیں تاکہ تم سے جھگڑا کریں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن جو تمہارے پاس ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانوں اور من گھڑت کہانیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ دوسرے لوگوں کو (قرآن سننے اور قبول کرنے سے) روکتے ہیں اور خود بھی اس سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ یہ ان باتوں سے اپنے آپ کو ہی ہلاک کرتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔"[2]

نیز ارشاد ہوا ہے :" اے رسولؐ! جس طرح ہم نے تمہارے لیے دشمن قرار دیے ہیں اسی طرح ہر پیغمبر کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین کو ان کا دشمن بنایا ہے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو فریب دینے کے لیے ان کے بارے میں

---

[1] سورۂ انبیاء - آیت ۱۸ آزاد ترجمہ [2] سورۂ انعام - آیت ۲۴-۲۵

چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا کہ انہیں ان باتوں سے روک دیا جاتے تو یہ ایسی حرکتیں نہ کر پاتے۔ تم انھیں ان کی افترا پردازیوں کے ساتھ چھوڑ دو۔" [1]

سورۂ حج کی ۵۱ ویں آیت میں جس چیز کا نام "معاجزین" کے عنوان کے تحت لیا گیا تھا اور جس سے حق اور باطل کی قوتوں کے ایک دوسری کو شکست دینے کی کوشش کا پتا چلتا تھا اسے قرآن مجید کی بہت سی دوسری آیات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اور اس کے تین نمونے آپ نے اوپر ملاحظہ فرمائے ہیں۔ ہم اس کے مزید نمونے نقل کرنے سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اسی سورے کی ۵۱ ویں آیت (یعنی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ) کے بعد کی چند آیات اسی کلمے اور آیۂ شریفہ کی توضیح اور تفسیر میں ہیں جس میں یہ کلمہ آتا ہے اور حق و باطل کی جنگ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان میں ایک طرف شیطان کے ٹولے کی جانب سے شکوک و شبہات کے القاء اور دوسری طرف ان کے خدا کے وسیلے سے زائل کیے جانے کا ذکر آیا ہے اور اس کے بعد خدا کی جانب سے امتحان اور مومنوں اور کافروں کے مثبت اور منفی ردعمل کی وضاحت کی گئی ہے۔

★

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی بنا پر "تَمَنّٰى" اور "اُمْنِيَّه" لوگوں کی ہدایت اور خوش بختی کی خاطر رسول اکرمؐ کا شوق، رغبت اور کوشش ہے اور "شیطانی القائات" سے مراد وہ وسوسے اور شبہات ہیں جو شیطان لوگوں کی ہدایت کی راہ میں پیدا کرتا ہے۔

"نسخ" کے معنی ان شکوک و شبہات کو زائل کرنے، مٹا دینے اور بے اثر کر دینے کے ہیں اور "احکام" سے مراد قرآن مجید کی اعجاز آمیز آیات کے ذریعے شیطان کے پیدا کردہ شبہات کو واضح کرنے اور شیطانی وسوسوں کی نشاندہی کرنے کے ہیں۔

---

[1] سورۂ انعام۔ آیت ۱۱۲

سورۂ حج کی ۵۲ ویں آیت کا اسی سورے کی ان دوسری آیات میں مقام مدِّ نظر رکھتے ہوئے جن کے ساتھ اس کا موضوع واحد ہے اس کی تفسیر وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی۔ تاہم یہ اس وقت ہے جب "تَمَنّٰی" اور "اُمْنِیَّه" کے معنی رغبت، آرزو اور محبت کے لیے جائیں اور ہم نے دیکھا کہ صحیح قول بھی یہی ہے لیکن اگر ان دو الفاظ کے معنی تلاوت اور قرائت کے لیے جائیں تو تفسیر تو وہی ہوگی لیکن آیت کا ترجمہ اور معنی یوں ہو جائیں گے:

"اے رسولؐ! ہم نے آپ سے پہلے کوئی نبی اور رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ اگر اس نے خدا کی کتاب اور آیات کی لوگوں کے سامنے تلاوت کی تو شیطان نے اس کے بارے میں اس کی امت کے دلوں میں شکوک و شبہات اور نامعقول خیالات پیدا کر دیے اور انہیں کہا کہ یہ جادو یا کہانت ہے یا اگلے لوگوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں اور خدائے تعالیٰ پر افترا باندھا گیا ہے اور خدائے تعالیٰ ان شکوک و شبہات کو دوسری آیات کے ذریعے واضح کرتا ہے اور اس وسیلے سے انہیں نابود کر دیتا ہے...."

چنانچہ یہی مفہوم اور مضمون سورۂ سباء میں ایک اور انداز سے آیا ہے:

"وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَا"[1] یعنی جب ان کے سامنے ہماری واضح اور روشن آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر تو ہم جیسا آدمی ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ جن چیزوں کو تمہارے باپ دادا پوجتے تھے تمہیں ان کی پرستش سے روک دے اور کہنے لگے کہ یہ کتاب تو جھوٹ کی پوٹ ہے جو کہ خدائے تعالیٰ پر افترا باندھا گیا ہے۔ نیز جب قرآن جو سراپا حق اور حقیقت ہے ان پر نازل کیا گیا تو کہنے لگے کہ یہ کتاب تو بس کھلا ہوا جادو ہے۔

آیت کی تفسیر

قرآن مجید اور تاریخِ اسلام سے یہ بات مسلمہ طور پر ثابت ہے کہ رسول اکرمؐ

---

[1] سورۂ سباء۔ آیت ۴۳

کو اپنی قوم کی ہدایت کی شدید خواہش تھی اور اس سلسلے میں آپ لحظہ بھر بھی آرام سے نہیں بیٹھتے تھے اور تکلیف اٹھاتے تھے اور جاگ جاگ کر وقت گزارتے تھے تاکہ شاید ان کی رہنمائی خوش بختی کے راستے کی جانب کرسکیں۔ خداوند تعالیٰ آپ کے بارے میں فرماتا ہے: "اے رسولؐ! شاید تم اس افسوس کے مارے جان دیدو گے کہ یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے۔"[1]

اس کے مقابلے میں قریشیوں میں جو رسولِ اکرمؐ کی قوم اور قبیلہ تھے ابولہب اور نضر بن حارث جیسے اشخاص موجود تھے جو قبیلے کے دوسرے افراد کے دلوں میں ہی نہیں بلکہ مکہ میں آنے والوں اور خانۂ کعبہ کی زیارت کرنے والوں کے دلوں میں بھی شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے اور آنحضرتؐ کی دعوت کے بارے میں اور ان آیات کے بارے میں جو آپ خدا کی کتاب میں سے پڑھتے تھے معاشرے میں شبہات اور غلط فہمیاں پھیلاتے تھے[2] جس کے نتیجے میں بعض لوگ اسلام سے دوری اختیار کرتے تھے اور رسولِ اکرمؐ کی دعوت ان پر کوئی اثر نہ کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی اور مکرر آیات میں اس بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ بعض لوگ قرآن مجید کو جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً یا تو اسے جادو کہتے ہیں یا اگلے لوگوں کی من گھڑت کہانیوں کا نام دیتے ہیں اور یا یہ کہتے ہیں کہ یہ غیروں کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

شیطانی القائات کا تعلق ایسے ہی شیطان صفت لوگوں سے تھا جو یہ جملے اور کلمات کہتے تھے: "قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ"[3] یعنی ہم نے (قرآن کے کلمات اور اس کی آیات) سنی ہیں اور اگر ہم چاہیں تو انہیں جیسا کلام کہہ سکتے ہیں۔ یہ اگلے لوگوں کے افسانوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

"وَقَالُوْا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا"[4] یعنی کہنے لگے

---

[1] سورۂ کہف۔ آیت ۶ [2] بلاذری: انساب الاشراف جلد ۱ صفحات ۱۳۹-۱۴۱؛ ابن ہشام جلد ۱ صفحات ۳۰۰ اور ۴۲۳ [3] سورۂ انفال۔ آیت ۳۱ [4] سورۂ فرقان۔ آیت ۵۔ علاوہ ازیں سورۂ انعام۔ آیت ۲۵، سورۂ نحل۔ آیت ۲۴، سورۂ مومنون۔ آیت ۸۳، سورۂ احقاف۔ آیت ۱۷، سورۂ قلم۔ آیت ۱۵ اور سورۂ مطففین۔ آیت ۱۳ سے رجوع کریں۔

کہ یہ تو اگلے لوگوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں جو کوئی صبح شام اسے (رسولِ اکرمؐ کو) لکھواتا ہے اور وہ لکھ لیتا ہے اور پھر سنا دیتا ہے۔

سورۂ نحل میں اسلام کے مخالفین کی باتوں اور لوگوں پر ان کے شیطانی القائات کا کچھ حصہ یوں نقل کیا گیا ہے: "وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ..." [۱] یعنی ہم تحقیقاً جانتے ہیں کہ یہ (مشرکین) آپ کی نسبت کہتے ہیں کہ آپ کو ایک شخص قرآن سکھاتا ہے (حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ جس شخص کی طرف یہ لوگ نسبت دیتے ہیں وہ عجمی ہے (اور عربی زبان بخوبی نہیں جانتا) اور یہ تو صاف صاف عربی ہے۔

اور سورۂ مدثر میں ان کی کچھ اور باتیں نقل کی گئی ہیں: "اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ ..." [۲] یعنی اس نے سوچا اور منصوبہ بنایا۔ خدا اسے مار ڈالے اس نے کیسا منصوبہ بنایا۔ پھر اس نے دیکھا اور منہ پھلا لیا اور تیوری چڑھائی۔ پھر پیٹھ پھیر لی اور اکڑ بیٹھا۔ پھر کہنے لگا: یہ قرآن تو جادو ہے جو پرانے ساحروں سے چلا آرہا ہے اور آدمی کے کلام کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اور اسی طرح سورۂ فصلت میں ہے کہ: "وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ ..." [۳] یعنی کفار یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن پر کان نہ دھرو اور جب یہ پڑھا جائے تو شور و غل مچاؤ۔ شاید اس وسیلے سے تم غالب آجاؤ۔

❋

یہ باتیں اور ان سے ملتی جلتی دوسری چیزیں ہی قرآن مجید کے بارے میں شیطانی القائات ہیں اور یہ وہی شکوک و شبہات ہیں جو شیطان قرآن مجید کے متعلق پھیلاتے تھے۔ یہی وہ گوناگوں معرکے تھے جو قرآن مجید کو جھٹلانے کے لیے انجام پاتے تھے۔ ان سب کو خدا نے منسوخ فرما دیا اور نابود کر دیا اور اس کے مقابلے میں اپنی آیات کو معجزاتی فصاحت اور انسان کی قدرت سے بالاتر مفاہیم سے اور بنی نوع انسان کو ان کا

---

[۱] سورہ نحل - آیت ۱۰۳ [۲] سورۂ مدثر - آیت ۱۸ - ۲۵ [۳] سورہ حٰم سجدہ - آیت ۲۶

مثل پیش کرنے کا چیلنج دے کر استحکام بخشا۔ مثلاً فرمایا کہ:

"جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے اگر تم اس میں شک رکھتے ہو تو اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اپنی مدد کے لیے جس کسی کو چاہو بلا لو.... اور اگر تم یہ کام نہ کرسکو ـــــ اور ہرگز نہ کرسکو گے ـــــ تو پھر (قرآن کی مخالفت کے بارے میں) دوزخ کی آگ سے ڈرو۔" [1]

خدا نے یوں اپنی آیات کی پشت پناہی کرکے انھیں استحکام بخشا اور شیطانی القائات کو کمزور کرکے پائے اعتبار سے گرا دیا اور قرآنی آیات کے بارے میں ان کے اثرات کو زائل کر دیا جیسے کہ گزشتہ زمانے میں اور سابقہ امتوں میں شیطانی القائات اور شیطانی کوششوں کو مٹا دیا تھا۔

یوں اُمنیہ رسولؐ میں شیطان کا القاء (خواہ اُمنیہ تلاوت کے معنی میں ہو خواہ آرزو، امید اور رغبت کے معنی میں ہو) قرآن مجید کے بارے میں شبہات کے القاء سے عبارت ہے جس کا دو صورتوں میں انجام پانا ممکن ہے:

۱- جنوں میں سے ایک شیطان جو دکھائی نہ دے خیال، وسوسہ اور شبہ القاء کرے یعنی مشرکین کے دلوں میں جو کفر کے مرض میں گرفتار ہیں شبہات ڈال دے اور انھیں ایسے شکوک و شبہات پھیلانے پر اکسائے۔

۲- دراصل وسوسے اور شکوک و شبہات پیدا کرنے والے شیطان صفت انسان ہوں۔

قرآن مجید ان دونوں اقسام کے شیطانی القائات کی جانب واضح اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ....." [2] یعنی جس طرح ہم نے تمہارے لیے دشمن قرار دیے ہیں اسی طرح ہر پیغمبر کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین کو ان کا دشمن بنایا ہے جن میں سے بعض دوسروں کو فریب دینے کے لیے

---

[1] سورۂ بقرہ- آیت ۲۳ [2] سورۂ انعام- آیت ۱۱۲

ان کے بارے میں چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں۔

یہ شیاطین آیاتِ الٰہی کو نابود کرنے کے لیے اپنی تمام کوششیں بروئے کار لاتے تھے لیکن خدا ان کے اثرات کو زائل کر دیتا تھا اور مکمل پشت پناہی کے ساتھ اپنی آیات کو ناقابل شکست استحکام بخشتا تھا۔ شیطان اور شیطان صفت ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے تھے اور اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ خدا کی آیات کی قدر و قیمت اور اعتبار ختم کر دیں لیکن خدا وسوسوں کو واضح کر کے اور شبہات کو رد کر کے اپنی آیات کو استحکام بخشتا تھا۔ اس قسم کی جنگ اور مقابلے کا تعلق فقط حضرت خاتم النبیینؐ سے ہی نہیں تھا بلکہ ہر نبی اور ہر رسول جو اپنی امت کے لوگوں کی ہدایت کی آرزو کرتا تھا اور انھیں خدا کی آیات پڑھ کر سناتا تھا ان کے دھوکے، فریب اور خطرناک منصوبوں میں گرفتار ہو جاتا تھا اور اس کے مقابلے میں خدا ان منصوبوں اور وسوسوں کو ناکام بنا دیتا تھا اور نابود کر دیتا تھا۔

۳۔ سورۂ بنی اسرائیل کا مطالعہ

ہم نے گزشتہ صفحات میں افسانۂ غرانیق کے ضمن میں طبری سے جو روایات نقل کی تھیں[1] ان میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیات کا ذکر بھی آیا تھا۔

"وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا"...[2]

ان آیات کے دقیق معنی یہ ہیں:

"اے رسولؐ! ہم نے جو عصمت اور مصونیت تمھیں عطا کی ہے اگر ہم اس کے ذریعے تمھیں ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم بھی (مخالف گروہ میں دولت اور قوت جیسے طاقتور عوامل کی بنا پر) ان کی (مشرکین کی) جانب جھک جاتے لیکن ہم نے تمھیں ثابت قدمی عنایت کی ہے لہٰذا جو کچھ مشرک چاہتے ہیں اسے قبول کرنا

---

[1] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۴۰ - ۳۴۱ مطبوعہ محمد ابوالفضل ابراہیم میں محمد بن کعب قُرظی اور محمد بن قیس کی روایت۔ [2] سورۂ بنی اسرائیل - آیت ۷۳ - ۷۴

تو در کنار تم ان سے رتی بھر رغبت بھی پیدا نہ کرو گے ۔"

اس آیت کے مطابق آنحضرت ص مشرکین کی خواہشات پوری نہیں کرتے حتیٰ کہ ان کی جانب رتی بھر رغبت بھی اپنے اندر نہیں پاتے تھے اور نہ ہی ان سے نزدیکی اور میلان کا آپ کے اندر کوئی امکان موجود تھا۔ یہ آیت بیان کے لحاظ سے اس آیت سے پوری مشابہت رکھتی ہے جو یوسف علیہ السلام کے حق میں وارد ہوئی اور جس میں کہا گیا ہے کہ: " وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ "[1] اگر یوسف ع نے اپنے پروردگار کی برہان کو نہ دیکھا ہوتا تو اس عورت کی جانب رغبت اور قصد کرتے ۔ یوسف ع نے اس ناروا کام کی خواہش اور قصد نہ کیا کیونکہ انھوں نے اپنے رب کی برہان دیکھ رکھی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات اس بارے میں بالکل واضح ہیں کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ رسول اکرم ص مشرکین سے ذرہ برابر رغبت کریں یا ان کی خواہشوں کا مثبت جواب دیں۔

غرانیق کے بارے میں روایات کی تشخیص

اب تک ہم نے زیر بحث آیات کی تفسیر عربی زبان میں آیات کے لغوی معنوں اور ان سوروں میں آیات کے لب و لہجے اور ان کے سیاق وسباق پر توجہ دیتے ہوئے اور سب سے بڑھ کر پورے قرآن مجید پر نظر رکھتے ہوئے بیان کی ہے ۔ اس سلسلے میں ہم نے ان روایات کو نظر انداز کر دیا ہے جو ان آیات کے ذیل میں مکتب خلافت کی تفاسیر میں وارد ہوئی ہیں لیکن اگر ہم ان روایات کی جانب رجوع کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ ان کی سند اور متن کا مطالعہ کریں اور پہلے سند کو تاریخ اور علم رجال کی کسوٹی پر پرکھیں اور پھر تطبیقی بحث میں قرآن مجید کی روشنی میں ان کے متن کی جانچ پڑتال کریں۔

---

[1] سورۂ یوسف ۔ آیت ۲۴

قرآن مجید کے مقابلے میں روایات

ہم نہیں جانتے کہ کچھ علمائے اسلام مثلاً ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ ہجری)، ابوالحسن علی بن احمد واحدی (متوفی ۴۶۸ھ ہجری)، ابوالقاسم جاراللہ محمود بن عمر زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ ہجری)، ابوسعید ناصرالدین عبداللہ بن عمر بیضاوی (متوفی ۶۹۱ھ ہجری) اور ابوبکر جلال الدین عبدالرحمٰن بن محمد سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ ہجری) اور کئی ایک دوسروں نے کیونکر اس قسم کی احادیث کو اپنی تفاسیر اور تواریخ میں جگہ دی ہے اور انھیں حقیقت کی نشاندہی کرنے والے مواد کے طور پر مدون کرکے پیش کیا ہے۔

ہماری سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ انھوں نے کس طرح شیطان کے رسولِ اکرمؐ پر تسلط کے بارے میں روایات کی تصدیق کی ہے اور انھیں قبول کیا ہے کہ جبکہ خود قرآن مجید فرماتا ہے: "فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ..."[۱] یعنی جب تم قرآن کی قرأت کرو تو مردود شیطان سے خدا کی پناہ طلب کر لیا کرو۔ جو لوگ اپنے پروردگار پر بھروسا کرتے ہیں ان پر شیطان کا کوئی بس نہیں چلتا اور اس کا زور تو صرف ان لوگوں پر چلتا ہے جو اس کی پیروی کرتے ہیں اور خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔

اور پھر فرماتا ہے: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ..."[۲]

یعنی جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تجھ کو (شیطان کو) حکومت اور غلبہ حاصل نہ ہوگا۔

اور شیطان خود کہتا ہے کہ: "فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ"[۳]

یعنی (اے خدا) تیرے عزت و جلال کی قسم! ان میں سے تیرے خالص بندوں کے سوا سب کے سب کو گمراہ کروں گا۔

★

۱۔ سورۂ نحل۔ آیت ۹۸۔۱۰۰ ۲۔ سورۂ حجر۔ آیت ۴۲ اور سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۶۵۔
۳۔ سورۂ صٓ۔ آیت ۸۵ اور سورۂ حجر کی ۳۹ ویں آیت میں بھی اسی مضمون کی تکرار کی گئی ہے۔

ان علماء نے ایسی روایات نقل کی ہیں اور انھیں قبولیت کی نگاہ سے دیکھا ہے حالانکہ قرآن مجید فرماتا ہے :

"وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ"... [1] یعنی یہ قرآن تو ایک عالی رتبہ کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے ہی پھٹک سکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے اور یہ حکمت والے اور تعریف کیے گئے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ : اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ." [2] یعنی بلاشبہ اور قطعی طور پر ہم نے خود قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود حقیقتاً اس کی حفاظت کریں گے۔

نہ جانے ان علماء نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ قرآن مغلوب ہونیوالی چیز نہیں ہے اور کوئی چیز خواہ اس کا تعلق گزشتہ زمانے سے ہو یا آئندہ زمانے سے ہو اسے باطل نہیں کر سکتی اور یہ مکمل طور پر خدائے تعالیٰ کی حفاظت میں ہے اور یہی چیز اس کے شیطان کی شعبدہ بازیوں سے محفوظ رہنے کے لیے کافی ہے۔

مذکورہ بالا تمام روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے شیطان کی وضع کردہ آیات قرآن مجید میں شامل کر دیں حالانکہ خدائے تعالیٰ قرآن مجید میں اپنے پیغمبرؐ کے متعلق یوں فرماتا ہے : " وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ." [3] یعنی وہ اپنی نفسانی خواہش سے کچھ کہتے ہی نہیں اور ان کی تمام باتوں کی بنیاد پروردگار کی وحی پر ہے۔

اور یہ بھی ارشاد فرماتا ہے کہ : " قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ." [4] یعنی کہہ دیجیے کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ میں فقط اس کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا گیا ہے۔

نیز ارشاد فرماتا ہے کہ : " وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ." [5]...

---

[1] سورۂ حٰمٓ سجدہ ۔ آیت ۴۲ [2] سورہ حجر ۔ آیت ۹ [3] سورۂ نجم ۔ آیت ۲ - ۳
[4] سورۂ یونس ۔ آیت ۱۵ [5] سورۂ الحاقہ ۔ آیت ۴۴ - ۴۷

یعنی اگر ــــ بفرض محال ــــ پیغمبر ہم سے کوئی غلط بات منسوب کرتے تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور ان کی رگِ گردن کاٹ دیتے اور تم میں سے کوئی بھی ہمیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا۔

ان آیات کے مطابق رسولِ اکرمؐ جو کچھ بھی کہیں وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے وحی اور الہام ہے اور وہ اپنی مرضی سے کسی چیز میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے اور اگر بفرض محال وہ ایسا کریں بھی تو خدا اپنی لامحدود قدرت کے ذریعے انہیں ایسا کرنے سے روک دے گا اور ان کا ہاتھ پکڑ لے گا اور ان کی زندگی کا خاتمہ کر دے گا لیکن بدقسمتی سے یہ علماء روایت کرتے ہیں کہ خدا نے شیطان کو اس معاملے میں آزاد چھوڑ دیا اور رسولِ اکرمؐ نے اس کے القائات کی بنا پر جعلی آیات قرآن مجید میں شامل کریں اور انھیں خدا کی کتاب کی آیات کے طور پر قبول کر لیا۔

غرانیق کا قصہ جعلی اور غلط قرار دینے کے لیے اس قرآنی بحث پر توجہ دینے اور متعلقہ آیات کی تفسیر کو مدِنظر رکھنے کے بعد کچھ اور کہنے اور کوئی اور دلیل پیش کرنے کی حاجت نہیں رہتی لیکن اس کے باوجود ہم تحقیق کی راہ میں ایک اور قدم اٹھائیں گے اور ان احادیث کا دوسرے زاویوں سے مطالعہ کریں گے۔

غرانیق کے قصے میں روایات کی اسناد

ہم اس بحث میں اختصار کی خاطر غرانیق کے قصے کے بارے میں روایات کی اسناد کا فقط ایک پہلو سے مطالعہ کریں گے اور وہ یہ کہ ہم دیکھیں گے کہ کیا یہ راوی سورۂ نجم کے نزول کے وقت موجود تھے اور کیا انھوں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر نقل کیا ہے تاکہ اتصال سند کی رو سے ان کی روایات سے انسان مطمئن ہو جائے؟ جیسا کہ آپ دیکھیں گے کہ سند میں دوسرے کمزور نقاط کے علاوہ احادیث کے پہلے نقل کرنے والوں میں سے کسی نے بھی اس واقعہ کا زمانہ نہیں دیکھا اور اس نقطۂ نگاہ سے یہ روایات معتبر نہیں ہیں۔

جو روایات ہم نے تفسیر طبری سے نقل کی ہیں ان کے راویوں کا سلسلہ افراد پر ختم ہوتا ہے:

۱- پہلی اور دوسری روایت کی سند محمد بن کعب بن سلیم قرظی تک پہنچتی ہے جو بنی قریظہ کے یہودیوں کی نسل میں سے تھے۔ وہ ہجرت کے چالیسویں سال میں یعنی رسولِ اکرمؐ کی رحلت سے تقریباً تیس سال بعد پیدا ہوئے اور ۱۰۸ھ یا ۱۲۰ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ محمد بن کعب کا شمار مدینہ کے تابعین میں ہوتا ہے۔[۱]

۲- طبری کی روایت کی سند میں آخری راوی محمد بن قیس، محمد بن کعب کے ہمراہ ہیں[۲]۔ وہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں سرکاری مذہبی نمائندے تھے اور ولید بن یزید بن عبدالملک کے دور میں تقریباً ۱۲۶ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ علمائے رجال نے محمد بن قیس کو تابعین کے طبقے میں شمار کیا ہے[۳]۔

---

[۱] تقریب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۲۰۳ مطبوعہ قاہرہ - ابن حبان: مشاہیر علماء الامصار صفحہ ۶۵ شمارہ ۴۳۶ مطبوعہ قاہرہ تحقیق فلایشھر۔ علاوہ ازیں ابن سعد کی طبقات الکبریٰ جلد ۵ صفحہ ۳۷۰ - ۳۷۱ اور جلد ۷ صفحہ ۵۰۱۔ خلیفہ ابن خیاط کی الطبقات جلد ۲ صفحہ ۶۶۱ اور رازی کی الجرح والتعدیل جلد ۴ ق ۱ صفحہ ۶۷ سے رجوع کیجیے۔

[۲] جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں طبری نے اپنی تاریخ میں یہی پہلی اور دوسری روایات نقل کی ہیں اور حدیث کی سند کا سلسلہ انہیں دو راویوں پر ختم ہوتا ہے۔ دیکھیے تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۳۸ - ۳۴۱ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم مطبوعہ دارالمعارف مصر۔

[۳] تہذیب الکمال مخطوط، مصور مجمع علمی اسلامی جزو ۷ صفحہ ۶۲۰۔ تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۴۱۴ - خلیفہ بن خیاط: کتاب الطبقات جلد ۲ صفحہ ۶۴۸ الجراح والتعدیل جلد ۴ ق ۱ صفحہ ۶۴ - میزان الاعتدال جلد ۴ صفحہ ۱۶۔

۳۔ تیسری اور چوتھی روایت کی سند ابو العالیہ رفیع بن مہران پر منتہی ہوتی ہے جنہوں نے رسولِ اکرمؐ کی وفات کے دو سال بعد اسلام قبول کیا اور اس بنا پر وہ دوسرے طبقے کے راویوں اور تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی وفات کا سال ۹۲ھ یا ۹۳ھ یا ۱۰۶ھ یا ۱۱۱ھ ہجری بتایا گیا ہے[1]

۴۔ پانچویں اور چھٹی روایت سند کی رو سے سعید بن جبیر پر منتہی ہوتی ہے جو تابعی ہیں اور راویوں کے تیسرے طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔ حجاج بن یوسف نے انھیں ۹۲ھ یا ۹۴ھ یا ۹۵ھ ہجری میں قتل کرا دیا جبکہ ان کی عمر ۴۹ سال سے زیادہ نہ تھی[2]

۵۔ ساتویں روایت عبداللہ بن عباس سے ہے اور وہ ایسی روایات کے واحد راوی ہیں جن کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے اور باقی راوی اور مفسرین جنہوں نے اس افسانے کا ذکر کیا ہے تابعین تھے یعنی ان کا تعلق صحابہ سے بعد کے طبقے سے تھا۔ ابن عباس ہجرت سے قبل تیسرے سال میں پیدا ہوئے تھے[3]

۶۔ طبری نے آٹھویں روایت اور کچھ جملوں کی تفسیر ضحاک بن مزاحم ہلالی سے نقل کی ہے۔ ضحاک کا تعلق راویوں کے پانچویں طبقے سے تھا اور وہ

---

[1] طبقات الکبریٰ جلد ۷ صفحہ ۱۱۲ - ۱۱۷ - الطبقات خلیفہ بن خیاط جلد ۱ صفحہ ۴۸۲ - تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۶۱ - تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۲۸۴ - تقریب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۲۵۲ - خلاصہ تذہیب الکمال صفحہ ۱۰۱ - طبقات الحفاظ صفحہ ۲۲۔

[2] طبقات الکبریٰ جلد ۶ صفحہ ۲۵۶ - ۲۶۷ - تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۱۱ - تقریب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۲۹۲ - تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۷۶ - حلیۃ الاولیاء جلد ۴ صفحہ ۲۷۲ - المعارف صفحہ ۴۴۵ - ۴۴۶ - طبقات الحفاظ: سیوطی صفحہ ۳۱۔

[3] استیعاب جلد ۳ صفحہ ۹۳۳ - ۹۳۹ تحقیق علی محمد البجاوی - اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۲۹۰ - ۲۹۴ مطبوعہ دار الشعب - اصابہ جلد ۲ صفحہ ۳۲۲ - ۳۲۶ - شرح حال شمارہ ۴۷۸۱ مطبوعہ سال ۱۳۵۸ھ مصر - تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۴۰ - طبقات الحفاظ صفحہ ۱۰

۱۰۵ھ یا ۱۱۰ھ ہجری میں فوت ہوئے۔[1]

۷۔ نویں روایت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث سے نقل کی گئی ہے جو تابعین میں سے ہیں اور راویوں کے تیسرے طبقے میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ۹۴ھ ہجری میں فوت ہوئے[2] ان کی پیدائش خلیفہ عمر کی حکومت کے زمانے میں بتائی گئی ہے[3]

۸۔ زیر بحث آیت (سورۂ حج۔ آیت ۵۲) کی تفسیر میں کچھ کلمات مجاہد سے نقل کیے گئے ہیں۔ وہ مجاہد بن جَبر ابوالحجاج مکی ہیں جو ۲۱ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۰۳ھ، ۱۰۴ھ یا ۱۰۵ھ ہجری میں فوت ہوئے۔[4]

۹۔ طبری نے قتادہ سے بھی روایت نقل کی ہے۔ وہ قتادہ بن دعامۃ بن قتادہ سدوسی ہیں جو چوتھے طبقے کے راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ۶۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷ھ یا ۱۱۸ھ ہجری میں طاعون سے فوت ہوئے۔[5]

۱۰۔ مذکورہ بالا روایات کے علاوہ سیوطی نے ایک روایت سُدّی سے نقل کی ہے۔

---

[1] المعارف صفحہ ۴۵۷ - ۴۵۸ مطبوعہ ثروت عکاشہ۔ ابن حبان: مشاہیر علماء الامصار صفحہ ۹۴، شمارہ ۱۵۶۲ - تقریب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۲۷۳ - میزان اعتدال جلد ۲ صفحہ ۳۲۶ -

[2] ابن حبان: مشاہیر علماء الامصار صفحہ ۶۵، شمارہ ۴۳۳ - تہذیب التہذیب جلد ۱۲ صفحہ ۳۰ - تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۶۳ - ۶۴ - خلاصہ تذہیب الکمال صفحہ ۳۸۲ -

[3] طبقات الحفاظ صفحہ ۲۴

[4] طبقات الکبریٰ جلد ۵ صفحہ ۴۶۶ - ۴۶۷ - تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۹۲ - ۹۳ - تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۴۲ - تقریب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۲۲۹ - میزان الاعتدال جلد ۳ صفحہ ۴۳۹ - ۴۴۰ - طبقات الحفاظ صفحہ ۳۵ - ۳۶

[5] طبقات الکبریٰ جلد ۷ صفحہ ۲۲۹ - ۲۳۱ مطبوعہ بیروت - البدایہ والنہایہ جلد ۹ صفحہ ۳۱۳ - ۳۱۴ - تہذیب التہذیب جلد ۸ صفحہ ۳۳۷ تقریب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ - تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۱۲۲ - ۱۲۴ - طبقات الحفاظ صفحہ ۴۷ - ۴۸

وہ ابو محمد اسماعیل بن عبدالرحمٰن ابن ابی ذویب سُدّی ہیں جو راویوں کے چوتھے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ۱۲۷ھ ہجری میں فوت ہوئے۔[۱]

۱۱۔ نیشاپوری نے بھی اپنی تفسیر میں ایک اور روایت ابن عباس سے نقل کی ہے۔ جن اسناد پر بھروسہ کرتے ہوئے مؤرخین اور سیرت نویسوں نے اپنی روایات نقل کی ہیں انھیں چند دستوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جو کچھ طبری نے اپنی تاریخ[۲] میں لکھا ہے وہ وہی پہلی اور دوسری روایات ہیں جن کا متن ہم پڑھ چکے ہیں اور ان کی سندوں کا مطالعہ بھی کر چکے ہیں۔ ابن اثیر وغیرہ جیسے جن مؤرخین نے طبری کی پیروی کی ہے انھوں نے ان روایات کو مختصر کر کے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔[۳]

جو کچھ سیرت نویسوں نے نقل کیا ہے وہ تین طریقوں سے ہے۔ پہلی ابن اسحاق کی روایات ہیں جو وہی ہیں جو تاریخ طبری میں نقل کی گئی ہیں اور جن کا تجزیہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ دوسری وہ ہیں جو موسیٰ بن عقبہ نے اپنی سیرت میں نقل کی ہیں اور جنہیں ذہبی نے تاریخ الاسلام میں اور کلاعی نے الاکتفاء میں اور دوسرے علماء نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے[۴] تاہم موسیٰ بن عقبہ[۵] کی روایات محمد بن مسلم زہری[۶] پر ختم ہوتی ہیں۔

---

[۱] طبقات الکبریٰ جلد ۶ صفحہ ۳۲۳۔ طبقات خلیفہ ابن خیاط جلد ۱ صفحہ ۳۲۷ مطبوعہ دمشق ۱۹۶۶ء۔ مشاہیر علماء الامصار صفحہ ۶۶ شمارہ ۸۴۲۔ المعارف صفحہ ۵۹۶۔ تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۵۵ مطبوعہ کراچی۔ الکنیٰ والالقاب جلد ۲ صفحہ ۳۱۱-۳۱۲۔ تقریب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۷۲۔ میزان الاعتدال جلد ۱ صفحہ ۲۳۶-۲۳۷۔

[۲] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۳۸-۳۴۱۔ دوسرا ایڈیشن تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم مطبوعہ دارالمعارف۔ مصر۔

[۳] ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۵۲-۵۳ مطبوعہ دارالکتاب العربی۔

[۴] تاریخ الاسلام جلد ۲ صفحہ ۱۱۲-۱۱۳۔ دوسرا ایڈیشن۔ اَلْاِکْتِفَاءُ فِیْ مَغَازِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ جلد ۱ صفحہ ۳۵۱-۳۵۳

(جاری ہے)۔

جو چوتھے طبقے کے راویوں اور محدثوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ۵۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴ھ ہجری میں فوت ہوئے۔

تیسرے طریقے کی روایات وہ ہیں جو واقدی کے شاگرد ابن سعد نے طبقات الکبریٰ میں درج کی ہیں۔ ابن سعد اپنی روایات اپنے استاد محمد بن عمر واقدی (متوفی ۲۰۷ھ ہجری) سے نقل کرتا ہے[1] واقدی کی روایات کل تین عدد ہیں۔ ان میں سے پہلی روایت دو راویوں یعنی محمد بن فضالہ ظفری اور مطلب بن عبداللہ بن حنطب سے ہے اور دوسری اور تیسری روایت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث سے ہے۔ یہ ابوبکر بن عبدالرحمٰن وہی ہیں جن کا ذکر اوپر نمبر شمار ۷ پر کیا گیا ہے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے ان کا شمار تیسرے طبقے کے راویوں میں ہوتا ہے۔

علمائے رجال نے مطلب بن عبداللہ بن حنطب کو چوتھے طبقے کے راویوں میں شمار کیا ہے[2] اسی طرح محمد بن فضالہ نامی ایک شخص کا نام لیا جاتا ہے اور اس کا تعارف فقط یہ کہہ کر کرایا جاتا ہے کہ وہ شام کے شیوخ میں سے ہے اور ہشام بن عمار سلمی کا شاگرد ہے[3] اور ہشام بن عمار کے سوانح حیات کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ وہ ۱۵۳ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۲۴۵ھ ہجری میں فوت ہوئے[4] لہٰذا لازم ہے کہ ان کا

---

[5] ان کے سوانح حیات کے لیے تذکرۃ الحفاظ جلد ا صفحہ ۱۴۸۔ طبقات الحفاظ صفحہ ۶۳۔ شذرات الذہب جلد ا صفحہ ۲۰۹ - ۲۱۰ مطبوعہ بیروت سے رجوع کریں۔

[6] خلیفہ بن خیاط: طبقات جلد ۲ صفحہ ۶۵۲ - ۶۵۳ - المعارف صفحہ ۴۷۲ - تذکرۃ الحفاظ جلد ا صفحہ ۱۰۸ - الجرح والتعدیل جلد ۴ ق ا صفحہ ۱۷ - تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۴۴۵ - میزان الاعتدال جلد ۴ صفحہ ۴۰ - طبقات الحفاظ صفحہ ۴۲ - ۴۳ پہلا ایڈیشن - قاہرہ۔

[1] ملاحظہ کیجیے: طبقات الکبریٰ جلد ۵ صفحہ ۲۰۵ - ۲۰۶ مطبوعہ بیروت۔ شذرات الذہب جلد ۲ صفحہ ۱۸۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ا صفحہ ۳۴۸ [2] خلیفہ بن خیاط: طبقات جلد ۲ صفحہ ۶۴۰۔ تقریب التہذیب جلد ا صفحہ ۲۵۵ [3] میزان الاعتدال جلد ۴ صفحہ ۶ شمارہ ۸۰۵۵۔

[4] میزان الاعتدال جلد ۴ صفحہ ۳۰۲ - ۳۰۴۔ شذرات الذہب جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ - ۱۱۰۔

شاگرد دوسری اور تیسری صدی کے درمیان یا تیسری اور چوتھی صدی کے درمیان زندہ رہا ہو۔

●

اسناد کی چھان بین کا نتیجہ یہ ہے کہ جن راویوں پر غرانیق کے قصے کی سند منتہی ہوتی ہے وہ عبداللہ بن عباس کو چھوڑ کر سب کے سب تابعین میں سے تھے یہاں تک کہ ان میں سے کچھ رسولِ اکرم ص کے زمانے سے چند نسلیں دُور تھے اور جیسا کہ علم تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے جسے مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر تاریخی نقل اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے۔ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے ان راویوں میں فقط ایک "صحابی" ہیں اور وہ عبداللہ ابن عباس ابن عبدالمطلب ہیں اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے عبداللہ رسولِ اکرم ص کی ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ولادت مکہ میں ہوئی تھی اور رسول اکرم ص کی وفات کے وقت ان کی عمر ۱۳ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

سورۂ "نجم" قطعی طور پر اور مفسرین کے اتفاق کے مطابق مکہ میں یعنی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی یہاں تک کہ کچھ مفسرین اور اوّلین صحابہ مثلاً ابن مسعود اس بات کے معتقد ہیں کہ یہ پہلا سورہ ہے جس کی تلاوت رسولِ اکرم ص نے مکہ میں علانیہ طور پر فرمائی[1] اس سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ سورۂ نجم ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

۲۔ اس سورے کا نزول بعثت کے ابتدائی زمانے میں ہوا ہے۔

ان دو نتیجوں اور ابن عباس کی پیدائش کے سال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ عبداللہ ان سالوں میں پیدا نہیں ہوئے حتیٰ کہ اگر ہم کم از کم یہ مان بھی لیں کہ یہ سورت رسولِ اکرم ص کے مکہ میں قیام کے آخری ایام میں نازل ہوئی ہے تب بھی عبداللہ ابن عباس اس وقت ایک کم سن بچے تھے یا شیر خوار تھے اور ایک

---

[1] تفسیر درمنثور، سورۂ حج کی ۵۲ ویں آیت کی تفسیر

عینی گواہ کے طور پر یہ واقعہ نقل نہیں کر سکتے تھے۔ یوں ابن عباس کی روایت بھی اپنی سند کھو بیٹھتی ہے اور اس کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو دوسری روایتوں کا ہوا۔

اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ ان روایات کو نقل کرنے والوں میں سے کوئی بھی واقعہ رونما ہونے کے وقت موجود نہ تھا اور وہ سب اس کے وقوع پذیر ہونے کے بعد پیدا ہوتے ہم پوچھتے ہیں کہ انھوں نے یہ روایات کیسے نقل کیں اور اسکی پوری پوری جزئیات اور تفصیلات کس طرح بیان کیں؟

ہم اس جعلسازی اور اتنے بڑے افترا کے گناہ کا بوجھ ان کے کندھوں پر نہیں ڈالنا چاہتے۔ ہمارے نزدیک زیادہ احتمال اس بات کا ہے کہ کچھ جعلسازوں نے یہ روایات ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت گھڑی ہیں اور ان راویوں سے منسوب کر دی ہیں۔ انشاء اللہ ہم آئندہ بحثوں میں اس مسئلے کو زیادہ واضح کریںگے۔

غرانیق کے افسانے کی روایات کے متون میں تضاد اور تناقض

ان روایات کی دوسری تمام خامیوں سے قطع نظر ہمیں ان میں تناقضات نظر آتے ہیں یا ان میں سے کچھ روایات میں دوسری روایات کیساتھ تضادات دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ہم پہلی اور دوسری روایت کی چھان بین کریں تو پتا چلتا ہے کہ دوسری روایت پہلی روایت کی تفصیل ہے۔ دوسری روایت کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ: جب جبرئیل سورۂ نجم رسولِ اکرمؐ پر وحی کر رہے تھے اور اس آیت پر پہنچے کہ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی تو شیطان نے تِلْكَ الْغَرَانِيق والی عبارت آنحضرتؐ کی زبان پہ القاء کر دی اور آپ نے اسے قرآن کی آیات کے ساتھ پڑھا اور پھر سورہ آخر تک تلاوت کیا۔ اس کے بعد آپ نے سجدہ کیا اور مسلمان اور مشرکین بھی سجدے میں گر گئے۔

روایت کے آخری حصے میں راوی کہتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اس وقت سجدہ کیا جب شیطانی کلمات "تِلْكَ الْغَرَانِيق ...." ختم ہوئے۔ اس کے بعد جبرئیل

آنحضرتؐ کے پاس آئے اور بولے کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے آیات کے درمیان ایک ایسی چیز پڑھ دی جو میں آپ کے لیے نہیں لایا تھا۔ اس واقعہ سے رسولِ اکرمؐ غمگین ہوگئے۔ اس موقع پر خدا نے آپ کو تسلی دینے کے لیے سورۂ حج کی ۵۲ ویں آیت آپ پر نازل کی۔ پھر شیطان نے جو کچھ آپ پر القاء کیا تھا خدا نے اسے منسوخ کردیا اور آیت "وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ" آپ پر نازل فرمائی۔

اس بنا پر روایت کے آخر کا مطلب اور مضمون یہ ہے کہ سجدہ شیطانی آیات کی تلاوت کے بعد کیا گیا اور اس سجدے کے بعد باقیماندہ سورہ نازل ہوا اور شیطانی القائات منسوخ کردیے گئے جبکہ روایت کے شروع میں کہا گیا ہے کہ یہ تمام حوادث سورے کے ختم ہو جانے کے بعد انجام پائے۔ یوں یہ جھوٹا شخص بھول کا شکار ہوگیا ہے اور اس نے ایک ہی روایت میں ایسی باتیں کہی ہیں جو ایک دوسری کی نقیض ہیں۔

علاوہ اس واضح تناقض کے جو دوسری روایت کے متن میں موجود ہے جب مختلف روایات کے متون کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا جاتا ہے تو ان کے تناقضات سامنے آتے ہیں۔

ان روایات میں سے چند ایک میں لکھا ہے کہ رسولِ اکرمؐ قریش کے خداؤں کے بارے میں اپنے دل میں کچھ خیالات رکھتے تھے اور یہ خیالات مذکورہ بالا آیات کی شکل میں آپ کی زبان پر جاری ہوگئے۔

کچھ دوسری روایات میں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان نے یہ الفاظ آپ کی زبان پر القاء کردیے۔

تیسری روایت میں لکھا ہے کہ شیطان ایک سفید رنگ والی مخلوق کی شکل میں رسولِ اکرمؐ کے سامنے آیا اور ان سے کہا کہ میں جبرئیل ہوں۔

چوتھی روایت میں کہا گیا ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے رسولِ اکرمؐ نے توقف فرمایا تو اس دوران میں شیطان نے اپنے الفاظ انھیں القاء کردیے۔

ایک روایت میں نقل کیا گیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ یہ سورہ نماز میں تلاوت فرما رہے تھے لیکن ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ آپ نے اسے نماز میں نہیں بلکہ اپنی قوم کے

اجتماع میں پڑھا اور بالآخر ایک اور روایت میں بتایا گیا ہے کہ شیطان نے اپنے کلمات اس وقت رسول اکرمؐ پر القاء کیے جب آپ قیلولہ فرما رہے تھے۔ اس قصے کے مضامین رسولِ اکرمؐ کے حالات سے تناقض اور تضاد رکھتے ہیں۔

قصّۂ غرانیق آنحضرتؐ کے حالات کے متضاد ہے

جو متعدد دلائل گزشتہ صفحات میں پیش کیے گئے ہیں ان میں ہم اس چیز کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ غرانیق کے قصے سے مربوط روایات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اصولاً رسولِ اکرمؐ کی تمام زندگی کے دوران آپ کے حالات، اخلاق اور طرزِ عمل کے برعکس اور متضاد ہے۔ پچھلے باب میں ہم نے پڑھا ہے کہ جب بحیرا راہب نے آنحضرتؐ کو "لات اور عزیٰ" کی قسم دی تو آپ نے اس سے کہا کہ "لات اور عزیٰ کی قسم دیکر مجھ سے کوئی چیز مت پوچھو۔ خدا کی قسم میں جتنی دشمنی اور بغض ان دونوں سے رکھتا ہوں اور کسی چیز سے نہیں رکھتا۔" یہ اس وقت کی بات ہے جب آنحضرتؐ کی عمر آٹھ یا بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔[۱]

اسی طرح جب شام کے دوسرے سفر میں بصریٰ کے بازار میں آنحضرتؐ اور ایک تاجر کے درمیان لین دین کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا تو اس تاجر نے آپ سے کہا کہ لات اور عزیٰ کی قسم کھائیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: میں نے کبھی ان چیزوں کی قسم نہیں کھائی اور جب کبھی ان کے پاس سے گزرتا ہوں تو (نفرت کی بنا پر) ان کی جانب سے منہ پھیر لیتا ہوں۔[۲]

---

[۱] طبقات الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۱۳۰ اور ۱۵۴۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۸۲۔ البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۲۸۳۔ سیرت الحلبیہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۲۔ بیہقی: دلائل النبوۃ جلد ۱ صفحہ ۳۱۱۔ سیوطی: الخصائص الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ ۱۳۸۷ھ مصر۔ الوفاء باحوال المصطفیٰ جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ تحقیق مصطفیٰ عبدالواحد۔

[۲] طبقات الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۱۵۶۔ الاکتفاء جلد ۱ صفحہ ۱۹۷۔ عیون الاثر جلد ۱ صفحہ ۴۸ خصائص الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۲۲۷۔

جب رسولِ اکرمؐ کو دعوت اور رسالت کے اظہار کے لیے خدا کا صریح حکم ملا تو آپ نے اپنے پہلے عمومی پیغام میں جب آپ مکہ میں تشریف فرما تھے مشرکین قریش سے یوں ارشاد فرمایا: میں خدا کی طرف سے تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں اور تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ فقط خدا کی پرستش کرو اور بتوں کی عبادت ترک کر دو کیونکہ یہ نہ تو کوئی فائدہ بخشتے ہیں اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں، نہ پیدا کر سکتے ہیں اور نہ رزق دیتے ہیں، نہ زندہ کرتے ہیں اور نہ مارتے ہیں[1] تاریخ میں بھی لکھا ہے کہ ظہور اسلام کے زمانے میں جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی قوم کو اسلام کی جانب بلاتے تھے تو وہ لوگ آپ سے دوری اختیار نہیں کرتے تھے لیکن جب ان کے خداؤں کا ذکر چھڑ گیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان کی عیب جوئی کرنے لگے اور ان پر تنقید کرنے لگے تو قریشی آپ کے دشمن بن گئے اور آنحضرتؐ کی مخالفت پر تل گئے اور کوشش کی کہ جس طرح بھی ہو سکے آپ کو اس کام سے باز رکھیں۔ چنانچہ وہ قریش اور بنی ہاشم کے شیخ اور رئیس ابوطالبؑ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

اے ابوطالب! آپ عمر، شرافت اور رتبے کے لحاظ سے ہمارے درمیان ممتاز ہیں۔ ہم نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ اپنے بھتیجے کو اس کے کاموں اور باتوں سے باز رکھیں۔ خدا کی قسم! ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی ہمارے باپ دادا کو بُرا کہے اور ان کا تمسخر اڑائے یا ہمارے خداؤں میں عیب نکالے اور انھیں برا بھلا کہے، یا تو آپ اسے روکیں گے اور یا آپ کو ہمارا مقابلہ کرنا پڑے گا۔

اس ملاقات کے ختم ہونے کے بعد ابوطالبؑ نے کسی کو بھیج کر رسولِ اکرمؐ کو اپنے پاس بلایا اور جب آپ اپنے چچا کے پاس پہنچے تو ابوطالبؑ نے کہا: بھتیجے! تمھاری قوم اور قبیلے کے لوگ اور رشتہ دار میرے پاس آئے تھے اور انھوں نے مجھ سے یہ باتیں کیں۔ دیکھو کوئی ایسا کام نہ کرو کہ میں اور تم نیست و نابود ہو جائیں۔ میرے کندھوں پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اسے برداشت نہ کر سکوں۔

---

[1] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۷، مطبوعہ نجف

رسول اکرمؐ نے جواب میں فرمایا: چچا جان! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تاکہ میں یہ راستہ اور یہ کام ترک کر دوں تو میں ایسا نہیں کروں گا حتیٰ کہ کامیاب ہو جاؤں یا اس راستے میں ہلاک ہو جاؤں۔ یہ کہتے ہوئے آنحضرتؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر آپ اٹھے اور چچا کے پاس سے چلے گئے۔ جب آپ نے چچا کی جانب پیٹھ کی تو ابو طالبؑ نے آواز دی: بھتیجے واپس آجاؤ۔ پھر کہا: جاؤ جو تمہیں پسند آئے کہو۔ خدا کی قسم میں تمہیں ہرگز ان لوگوں کے سپرد نہیں کروں گا اور تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔[1]

تاریخ اس امر کی بھی گواہی دیتی ہے کہ ہجرت کے نویں سال ماہ رمضان میں اہل طائف نے اپنے کچھ آدمی بطور نمائندہ رسولِ اکرمؐ کے پاس بھیجے تھے۔ وہ لوگ ایک مدت تک مدینہ منورہ میں رہ کر آنحضرتؐ کے ساتھ مذاکرات کرتے رہے اور بالآخر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تاہم انھوں نے آنحضرتؐ سے چند درخواستیں کیں جو یہ تھیں:

۱۔ "لات"[2] تین سال تک ان کے پاس صحیح سلامت اور محفوظ رہے اور اسے توڑا نہ جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس وسیلے سے عام لوگوں کے اعتراضات اور ناراضگی سے امان میں رہیں تاہم رسولِ اکرمؐ نے ان کی درخواست نہ مانی۔ انھوں نے جو مہلت مانگی تھی اسے گھٹا دیا اور دو سال پر راضی ہو گئے لیکن آنحضرتؐ پھر بھی نہیں مانے۔ پھر انھوں نے ایک سال اور گھٹا دیا لیکن آنحضرت رضامند نہ ہوئے۔ بالآخر وہ ایک مہینے پر راضی ہو گئے لیکن رسول اکرمؐ

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۶۴-۲۶۶ مطبوعہ مصر ۱۳۷۵ھ۔ تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۲ صفحہ ۸۴-۸۵ دوسرا ایڈیشن۔ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۲۲-۳۲۶ دوسرا ایڈیشن۔ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم۔ ابن اثیر: تاریخ کامل جلد ۲ صفحہ ۴۲-۴۳۔

[2] وَاللَّاتُ بِالطَّائِفِ وَهِيَ أَحْدَثُ مِنْ مَنَاةٍ وَكَانَتْ صَخْرَةً مُرَبَّعَةً۔
(کلبی: الاصنام صفحہ ۱۶ سے رجوع کریں)۔

نے یہ بھی قبول نہ کیا۔

۲۔ انھوں نے درخواست کی کہ انھیں نماز پڑھنے سے معاف رکھا جائے۔ رسولِ اکرمؐ نے یہ بات بھی نہ مانی اور فرمایا: "جس دین میں نماز نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔"

مذاکرات ختم ہونے کے بعد آنحضرتؐ نے دو آدمی ان کے ساتھ بھیجے تاکہ وہ اس بُت کو توڑ دیں۔[1]

رسولِ اکرمؐ نے مختلف مواقع پر جو موقف اختیار کیا اور جن میں سے چند ایک کی جانب ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، کیا اس کی روشنی میں غرانیق کے جعلی قصے پر یقین کرنا ممکن ہے؟

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ صاحبانِ عقلِ سلیم اس قصے کو کس طرح قبول کر سکتے ہیں! کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ مارکس (Marx) لینن (Lenin) یا اسٹالن (Stalin) سرمایہ دارانہ نظام کے حامیوں کے کسی مجمع میں تقریر کرے اور اس نظام پر شدید حملے کرے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہے کہ:

> "انسان کی نجات سرمایہ دارانہ نظام میں ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے اقتصادی نظام میں محروم اور زحمت کش طبقے کی خوش بختی کا کوئی امکان نہیں۔"

ظاہر ہے کہ جو مقرر یہ کہتا ہے وہ اپنے ان الفاظ کا مفہوم نہیں جانتا! اور اسے یہ علم نہیں کہ ان کا اثر کیا ہوگا اور سننے والے جو سب کے سب سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ہیں یہ جملہ سن کر خوش ہو جاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ساری تقریر سرمایہ داری پر حملے اور تنقید سے عبارت ہے اور صرف ایک جملہ ان کی خواہش کے مطابق بولا گیا ہے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد۲ صفحہ ۵۳۸ - ۵۴۰۔ تاریخ طبری جلد۳ صفحہ ۹۶ - ۹۹۔ عیون الاثر جلد۲ صفحہ ۲۲۸ - ۲۲۹۔ الاکتفاء جلد۲ صفحہ ۳۹۸ - ۴۰۱۔ تاریخ کامل جلد۲ صفحہ ۱۹۳ - ۱۹۴۔

کیا کوئی متوازن سمجھ بوجھ کا مالک ایسے قصے پر یقین کر سکتا ہے؟ ایک انسان جو عقل سلیم رکھتا ہو ایک ایسے پیغمبر سے مذکورہ قصہ منسوب کر سکتا ہے جو سورۂ یوسف میں مشرکین سے صاف صاف کہتا ہے کہ "مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ..." [1] یعنی تم خدا کو چھوڑ کر جن چیزوں کی پرستش کرتے ہو وہ کچھ بھی نہیں ہیں اور فقط نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے انہیں دیے ہیں اور خدا نے ان کے لیے کوئی دلیل اور حجت نازل نہیں کی۔

اور سورۂ اعراف میں ان الفاظ میں خبردار کرتا ہے کہ "اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ..." [2] یعنی کیا تم مجھ سے ان ناموں کے لیے جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیے ہیں؟

اور اسی سورۂ نجم میں جو مورد بحث ہے لات، عزیٰ اور منات کا ذکر کرنے کے بعد مشرکین سے کہتا ہے کہ: اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ..." [3] یعنی یہ کوئی چیز نہیں ہیں بجز ناموں کے جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے انھیں دیے ہیں اور خدا کی طرف سے ان کے بارے میں کوئی دلیل وجود نہیں رکھتی۔

اور سورۂ انبیاء میں انھیں مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ "اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا ..." [4] یعنی تم کو اور تمہارے جھوٹے معبودوں کو جن کی تم پوجا کرتے ہو یقیناً دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اگر یہ سچے معبود ہوتے تو انھیں دوزخ میں نہ جانا پڑتا لیکن ایسا نہیں ہے اور یہ سب یقیناً ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

اور سورۂ کافرون میں جو بعثت کے پہلے سال میں نازل ہوئی ہے فرمایا گیا ہے: "قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ وَلَآ اَنَا..." یعنی اے رسول! تم کہہ دو کہ اے کافرو! تم جن چیزوں کو پوجتے ہو میں انھیں

---

[1] سورۂ یوسف - آیت ۴۰
[2] سورۂ اعراف - آیت ۷۱
[3] سورۂ نجم - آیت ۲۳
[4] سورۂ انبیاء - آیت ۹۸-۹۹

نہیں پوجتا اور جس (خدا) کی میں عبادت کرتا ہوں تم اس کی عبادت نہیں کرتے اور جنہیں تم پوجتے ہو میں ان کا پوجنے والا نہیں اور جس کی میں عبادت کرتا ہوں تم اس کی عبادت کرنے والے نہیں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔ کیا ان تمام آیات اور دوسری بہت سی آیات کے باوجود جو سارے قرآن مجید میں بکھری ہوئی ہیں عقل سلیم یہ باور کرسکتی ہے کہ جن روایات میں غرانیق کا قصہ نقل کیا گیا ہے وہ درست اور صحیح ہوسکتی ہیں؟

انبیاءؑ کا معصوم ہونا

اگرچہ مکتبِ خلفاء کے علماء جنہوں نے یہ جھوٹا قصہ نقل کیا ہے اہلبیتؑ کے تربیت شدہ افراد کی طرح انبیاء کے تمام اقوال اور افعال میں ان کی عصمت کے قائل نہیں ہیں لیکن وہ کم ازکم وحی کی تبلیغ کے بارے میں ان کی خطا سے مصوٗنیت کے معتقد ہیں اور بلا شبہ یہ چیز بجائے خود وحی حاصل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کے متعلق ان کے معصوم ہونے پر اعتقاد لازم قرار دیتی ہے کیونکہ اگر ہم آسمانی وحی کے حصول اور نگہداشت کے متعلق انبیاء کو معصوم نہ سمجھیں تو یہ ان کی تبلیغ کے معاملے میں عصمت کے منافی ہوگا جس پر سب کا اتفاق ہے یعنی اگر رسولِ اکرمؐ آسمانی علوم کو غلطی کھائے بغیر نہیں سیکھ سکتے اور ان کی مناسب طور پر حفاظت نہیں کرسکتے تو وہ اپنی رسالت کو صحیح طور پر کیسے انجام دے سکتے ہیں؟ لہذا اس مکتب کے بعض علماء کا ایسی روایات پر اعتقاد ان کے آنحضرتؐ کے وحیٔ الٰہی کی تبلیغ، حصول اور حفاظت کے بارے میں عصمت پر اعتقاد کے متضاد اور منافی ہے کیونکہ ان جھوٹی روایات کے مطابق رسول اکرمؐ شیطانی القائات سے محفوظ نہیں رہے اور وحی کی تبلیغ، حصول اور نگہداشت میں عصمت اور خدا کی جانب سے حفاظت ان کے شامل حال نہیں رہی۔ جب کم ازکم اس معاملے میں بھی انھیں عصمت اور خدا کی جانب سے حفاظت میسر نہ ہو تو پھر قرآن مجید پر کیا یقین اور اعتماد باقی رہ جاتا ہے؟ اگر شیطان قرآن مجید میں ایک جگہ دخل اندازی کرسکتا ہے تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے باقی حصے اس کی دستبرد سے محفوظ

رہے ہیں ؟ کیا کوئی کہنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر یہ قصہ درست ہو تو شیطانی القائات کے منسوخ ہونے کے بارے میں آیت بجائے خود ایک شیطانی القاء ہے تاکہ اس کی آڑ میں وہ اپنی دوسری غیر اسلامی باتیں قرآن مجید میں داخل کر دے! اس سے پتا چلتا ہے کہ جن لوگوں نے اس قسم کی روایات گھڑی ہیں ان کے مقاصد بڑے خطرناک تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اس طریقے سے اسلام کی سب سے مضبوط دلیل کو پایۂ اعتبار سے گرا دیں۔

جن جھوٹی اور جعلی روایات سے گزشتہ درسوں میں بحث کی گئی ہے ان سب میں پیغمبر اسلام کی شخصیت پر حملہ کیا گیا تھا اور اس کی آسمانی منزلت اور تقدس کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور قرآن مجید کو جو اسلام کی دلیل اور اس کا جاودانی معجزہ ہے شک و شبہ کا نشانہ بنایا گیا تھا لیکن اب ان لوگوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور فقط رسول اکرمؐ کو ہی نہیں بلکہ قرآن مجید اور وحی کو بھی اپنے حملے کا ہدف بنایا اور اس کی مصوئنیت کو جو شک و شبہ سے بالاتر تھی مشکوک بنا دیا۔

حقیقت کا انکشاف

اب تک جو تحقیقات انجام دی گئیں اور جن تطبیقی بحثوں کا مشاہدہ کر کے ان روایات کے متن اور سند کو مختلف زاویوں سے پرکھا گیا وہ سب درست تھیں لیکن ان کی افادیت واقعہ کی اصلی حقیقت کے اظہار سے پہلے تھی لیکن جب حادثے کی اصلیت پر سے پردہ اٹھا دیا جائے تو پھر اس بحث اور تحقیق کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی اور واقعہ دراصل یہ ہے:

دوسری صدی کا باخبر مؤرخ کلبی (متوفی ۲۰۴ھ ہجری) اپنی کتاب "الاصنام" میں لکھتا ہے کہ جب قریشی مکہ میں طواف کرتے تھے تو یہ کہتے تھے:

وَاللَّاتَ وَالْعُزّٰی   وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰی

فَاِنَّهُنَّ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى   مِنْهَا الشَّفَاعَةُ تُرْتَجٰى

قریشیوں کا اعتقاد تھا کہ یہ بت خدا کی بیٹیاں ہیں جو اس کے پاس شفاعت کرتی ہیں لیکن جب خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو ان لوگوں کے درمیان مبعوث فرمایا تو (ان باطل

اعتقادات کے مقابلے میں آنحضرتؐ پر یہ آیت نازل کی: "اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی اَلَکُمُ الذَّکَرُ...." [1]

اس بنا پر یہ کلمات کہنے والے رسولِ اکرمؐ نہیں بلکہ قریشی تھے اور قریشیوں نے بھی یہ کلمات ایک مرتبہ نہیں کہے بلکہ ان کی عادت تھی کہ طواف کرتے وقت انہیں ایک ذکر کی حیثیت سے اپنی زبانوں پر جاری کرتے تھے اور ان کی تکرار کرتے تھے۔

ان کلمات میں جن نامعقول اعتقادات اور جاہلانہ خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا سورۂ نجم انھیں رد کرنے کے لیے نازل کی گئی تھی۔ اس میں ان لوگوں کے اعتقادات کے پوچ اور مہمل ہونے کے بارے میں دلائل دیے گئے تھے اور انھیں سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کی گئی تھی لیکن بدقسمتی سے جو روایات زیرِ بحث ہیں انھوں نے حقیقت کو الٹا کر رکھ دیا اور ایک بہت بڑے جھوٹ اور افترا کے ذریعے ان کلمات کو اسلام کے عظیم پیغمبرؐ سے منسوب کر دیا حالانکہ نہ تو یہ باتیں رسولِ اکرمؐ کے ذہن میں آئیں اور نہ ہی آپ نے انہیں زبان سے ادا کیا۔

جب صورت یہ ہے تو ہمیں چاہیے کہ ایسی روایات کے وجود میں آنے کے سرچشمے کا پتا چلائیں اور ان کے اختراع کی وجوہات کی جستجو کریں۔ تحقیق اور بلاواسطہ مدارک کے مسلسل مطالعہ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخِ اسلام کے گزشتہ دور میں علمائے اسلام میں سے کچھ محققین نے اس کی وجہ معلوم کر لی تھی۔ ان میں سے ایک محقق محمد بن اسحاق بن خزیمہ (متوفی ۳۱۱ھ ہجری) ہیں۔ انھوں نے غرانیق کے بارے میں روایات کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ روایات زنادقہ اور ملحدوں کے ہاتھوں گھڑی گئی ہیں۔" [2] انہوں

---

[1] الاصنام، ابن کلبی، تحقیق احمد زکی صفحہ ۱۹ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۴ھ ہجری۔ یہ آیات سورۂ نجم سے مربوط ہیں۔ ۱۸ویں سے ۲۲ویں آیت تک۔

[2] یہ عبارت فخر رازی نے نقل کی ہے۔ تفسیر کبیر جلد ۲۳ صفحہ ۵۰ پہلا ایڈیشن۔ مصر نیز الصادی علیٰ تفسیر الجلالین جلد ۳ صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ بیروت ۱۳۸۵ھ ہجری کے حاشیہ اور فتح القدیر شوکانی جلد ۳ صفحہ ۶۲ ۴ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۵ھ ہجری سے رجوع کریں۔

نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جو بدقسمتی سے ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی تاکہ ہم جان سکتے کہ انھوں نے اس مسئلے کا مطالعہ اور تحقیق کس حد تک کی ہے اور اس حقیقت کے بارے میں بیشتر واقفیت حاصل کر سکتے۔

اب ہم زنادقہ کی سرگرمیوں اور ان کی تخریب کاری کا اندازہ لگانے کے لیے صاحبِ نظر حضرات کی تحریروں سے رجوع کرتے ہیں۔ علمائے حدیث میں سے محققین نے زنادقہ اور اسلام کے ابتدائی ادوار میں موجود ملحدین کی سازشوں اور تخریب کاریوں کے بارے میں تحقیق کی ہے اور ایسی وضاحتیں کی ہیں جو کسی حد تک ان کرتوتوں پر سے پردہ اٹھاتی ہیں۔ چھٹی صدی کے محقق اور عالمِ حدیث سبط ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ ہجری) ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے حدیث نقل کرنے میں جان بوجھ کر دروغ گوئی سے کام لیا ہے یوں لکھتے ہیں:

> "پہلا دستہ زنادقہ ہے جن کا مطمحِ نظر دین اور شریعت میں بگاڑ پیدا کرنا، لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا اور اعتقادات سے کھیلنا تھا۔ ان میں سے ایک عبدالکریم ابن ابی العوجاء تھا۔ وہ معن بن زائدہ کا ماموں اور حماد بن سلمہ کا منہ بولا بیٹا تھا۔ ابن ابی العوجاء (جو دوسری صدی کے مشہور زندیقوں میں سے ہے) جعلی احادیث کتب حدیث میں شامل کر دیا کرتا تھا۔"

ابن جوزی مزید کہتے ہیں: "علمِ حدیث کے ممتاز عالم ابواحمد بن عدی نے کہا ہے کہ جب ابن ابی العوجاء کو اس کے الحاد کی بنا پر گرفتار کر کے محمد بن سلیمان بن علی کے سامنے لایا گیا تو اس نے حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ جب ابن ابی العوجاء کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو اس نے کہا: خدا کی قسم میں نے تمہارے درمیان چار ہزار ایسی جعلی حدیثیں منتشر کر دی ہیں جنہوں نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال میں تبدیل کر دیا ہے۔ میں نے تمہارے روزے کے دن کو افطار کے دن میں اور افطار کے دن کو روزے کے دن میں تبدیل کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں مہدی عباسی سے نقل کیا گیا ہے کہ اس نے کہا: زنادقہ میں سے ایک شخص نے میرے سامنے اقرار کیا کہ

اس نے چار سو ایسی جھوٹی حدیثیں گھڑی ہیں جو مسلمانوں میں گردش کر رہی ہیں۔"

ابن جوزی نے مزید کہا ہے کہ جن لوگوں نے جعلی حدیثیں گھڑیں ان میں "مغیرہ بن سعید" اور "بیان" شامل ہیں۔ پھر وہ ابن نمیر کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"مغیرہ جادوگر اور بیان زندیق تھا اور خالد بن عبد اللہ قسری حاکم نے ان دونوں کو قتل کر دیا اور ان کی لاشیں جلا دیں۔ ان زندیقوں میں کئی اشخاص ایسے بھی تھے جنھوں نے علمائے حدیث کو فریفتہ کر لیا اور ان کی حدیث کی کتابوں میں جعلی احادیث شامل کر دیں۔ بعد میں ان محدثین نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ احادیث انھوں نے خود نقل کی ہیں انھیں دوسروں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا۔ حکم بن مبارک سے نقل کیا گیا ہے کہ حماد بن زید کہا کرتا تھا کہ زندیقوں اور ملحدوں نے بارہ ہزار جھوٹی حدیثیں رسول اکرمؐ سے منسوب کی ہیں۔۔۔"[1]

ان بیانات کے علاوہ خود میں نے اپنی کتابوں "عبد اللہ بن سبا و اساطیر اُخریٰ" (دو جلدیں) اور "خمسون ومائة صحابی مختلق" (دو جلدیں) میں اس زمانے کے زندیقوں کی تخریب کاریوں کے نتائج اور تاریخ اسلام کے حقائق میں تحریف کی نشاندہی کی ہے۔ وہ تحریف و جعلسازی اور جھوٹ اور سچ کو خلط ملط کرنے میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے اندھیری رات کو روشن دن اور روشن دن کو اندھیری رات کر کے دکھایا۔ اس گروہ میں سے ہم نے ایک شخص کا تعارف کرایا ہے جس کا نام سیف بن عمر تمیمی تھا اور جس پر زندیق اور ملحد ہونے کا الزام تھا۔ اس نے اپنی دو کتابیں "الفتوح والردۃ" اور "جمل و مسیر عائشہ و علی" لکھ کر اسلام کی تاریخ کو جھوٹ سے پُر کر دیا۔ اس شخص کی تحریروں میں جن دریافتوں کا ذکر کیا گیا اور جن کی وجہ سے ان زندیقوں کی حرکتوں پر سے پردہ اٹھ گیا ان میں ایسے صحابیوں، عظیم فاتحوں، رزمیہ اشعار لکھنے والے شاعروں اور جنگ کے میدانوں، شہروں، علاقوں، دریاؤں اور پہاڑوں

---

[1] سبط ابن جوزی: الموضوعات جلد ۱ صفحہ ۳۷-۳۸- پہلا ایڈیشن۔ مدینہ منورہ ۱۳۸۶ہجری

کے نام موجود تھے جو سب کے سب سوائے جھوٹ، جعلسازی، تحریف اور اختراع کے اور کچھ نہ تھے۔[1]

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی احادیث اور روایات تاریخِ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں زندیقوں اور ملحدوں کے ہاتھوں گھڑی گئیں تاکہ مسلمانوں کے عقائد اور خیالات پراگندہ ہو جائیں اور ان میں شک، شبہ اور بے اعتقادی پیدا ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے یہ احادیث بھولے بھالے اور جلدی یقین کر لینے والے محدثین کے ذہنوں میں ڈال دیں یا صاحبان کتب حدیث کو پتا چلے بغیر ان کتابوں میں لکھ دیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ حدیثیں دوسری صدی ہجری کے ابتدائی حصے میں گھڑی گئیں کیونکہ ماہرین کا کہنا ہے کہ ابن اسحاق نے جو تقریباً ۱۵۲ ہجری میں فوت ہوا ان میں سے کئی ایک اپنی کتاب "سیرت النبیؐ" میں درج کی ہیں۔[2]

یہ جھوٹی روایتیں خواہ کسی زمانے میں گھڑی گئی ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ان کے اثرات خلفاء کے مکتب کی تفسیری اور تاریخی کتابوں میں پھیل گئے اور ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہے حتیٰ کہ حالیہ زمانے میں اپنی انتہا کو پہنچ گئے اور اس کے اثر سے اس مکتب کے بہت سے افراد کی ذہنیت تشکیل پائی ہے اور دروغ بافی نے موجودہ زمانے میں ایک نئے المیے کو جنم دیا ہے اور یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے میدان میں اتر کر اس قسم کے منابع تک رسائی حاصل کی ہے۔ انھوں نے استعماری اور تبلیغی اغراض و مقاصد کے تحت علمی اور تحقیقی کاموں میں ہاتھ ڈالا ہے اور ان کی خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل ایسی کتابوں اور روایتوں کے ذریعے ہوئی ہے لہٰذا انھوں نے ان روایتوں کو خاص آب و تاب اور رنگ آمیزی کے ساتھ جو انھوں نے موجودہ علوم سے عاریتاً لیے ہیں اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے

---

[1] "عبداللہ بن سبا" اور "خمسون ومائة صحابي مختلق" سے رجوع فرمائیں۔

[2] جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں طبری نے اپنی تاریخ میں اس قسم کی دو روایتیں ابن اسحاق سے نقل کی ہیں۔

اور اسے "اسلام شناسی" کا نام دیکر اور پیغمبر اسلامؐ کی زندگی اور قرآن کے مطالعہ وتحقیق کے عنوان کے تحت دنیا کے علمی اداروں میں منتشر کیا ہے۔ بدقسمتی سے انھوں نے فقط ان جعلی روایتوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انھیں جلا دینے کے لیے خود اپنے خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے اور اسے مسئلے کے تاریخی تجزیے اور واقعہ کی اجتماعی یا انفرادی سبب شناسی کا نام دیکر اور عینی اور غیر جانبدارانہ تحقیق کے عنوان سے پیش کیا ہے۔
آئندہ صفحات میں ہم ممتاز مستشرقین کے ہاتھوں غرانیق کے افسانے کی جو تحقیقات انجام پائی ہے اس کے چند نمونے پیش کریں گے اور ان لوگوں کے علمی کاموں اور تحقیقی مطالعات کی قدر و قیمت بہتر طور پر پہچان سکیں گے۔

اسلام شناسوں کے اقوال

اسلام شناسی کا استاد اور ایڈنبرگ یونیورسٹی (سکاٹ لینڈ) میں عربی کا صدر پروفیسر منٹگمری واٹ اپنی ایک کتاب "محمدؐ پیغمبر اور سیاستدان" میں کہتا ہے:

"ایک خدا کی پرستش اہل مکہ کے نزدیک ایک مبہم چیز تھی اور وہ اسے شرک کے مکمل طور پر برعکس ہونے کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور یہ بات "شیطانی آیات" کے قصے میں واضح ہو گئی ہے۔ محمدؐ جو مکہ والوں کی مخالفت کی وجہ سے تھک ہار گئے تھے ایسی وحی کے انتظار میں تھے جو مکہ کے رؤسا کے اعتراضات ختم کر دے۔ اسی عالم میں وحی آئی جو دو یا تین آیتوں سے زیادہ نہیں تھی اور مکہ کے معابد کے کچھ خداؤں کو شفاعت کی اجازت دیتی تھی۔ بعد میں ان کو پتا چل گیا کہ یہ آیات رسول اکرمؐ کو خدا نے الہام نہیں کی تھیں بلکہ شیطان نے انہیں القا کیا تھا اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یکتا پرستی کے اس مرحلے پر بعض ما فوق الفطرت موجودات کے حق میں جنھیں ایک قسم کا فرشتہ سمجھا جاتا تھا احترام اور دعا سے انکار نہیں کرتے تھے۔"[1]

---

[1] محمدؐ: پیامبر و سیاستمدار (فارسی) مترجمہ اسماعیل والی زادہ صفحہ ۳۳۔

اس کتاب میں ایک اور مقام پر لکھا ہے :

"اس واقعہ کی جزئیات کی شرح میں اختلاف ہے لہٰذا بہتر ہوگا کہ ہم پہلے ان روایات کی وضاحت کریں جو معتبر ہیں (!) .... بظاہر ایک وقت ایسا تھا جب محمدؐ نے قرآن میں ایسی آیات شامل کر دیں جو ممکنہ طور پر بتوں کی جانب سے شفاعت کی اجازت دیتی تھیں۔ ان آیات میں سے ایک کا مضمون یہ ہے : " أَفَرَءَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَىٰ وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَىٰ " کچھ مدت کے بعد ان پر ایک اور وحی نازل ہوئی جس نے مذکورہ بالا آیات کو منسوخ کر دیا۔ پہلی اور دوسری آیات ہر جگہ پھیل گئیں اور اس اصلاح اور تنسیخ کی وضاحت یہ کی گئی کہ محمدؐ کے متوجہ ہوئے بغیر شیطان پہلی آیات میں دخل انداز ہو گیا تھا۔ یہ قصہ بڑا عجیب اور حیرت انگیز ہے۔ ایک پیغمبر جو توحید پرستی کے سب سے بڑے دین کی تبلیغ کرتا ہے وہ خود شرک میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ درحقیقت یہ واقعہ اتنا عجیب ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کی بنیاد صحیح ہے (!) اور یہ خیال ہی نہیں آتا کہ کسی نے اسے گھڑا ہے اور مسلمانوں سے اسے قبول کرنے کو کہا ہے .... اس قصے کا ایک دلچسپ پہلو وہ ہے جو اپنے زمانے کے بارے میں محمدؐ کا نظریہ اور عقیدہ ہم پر واضح کرتا ہے حالانکہ وہ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ ان آیات کے کہنے والے وہ نہیں ہیں اور یہ ان پر نازل ہوئی ہیں لیکن شروع میں انہیں اس بات کا خیال نہیں آیا کہ یہ آیات اس دین کے خلاف ہیں جس کے وہ مبلغ ہیں (!) کیا اس کے معنی یہ نہیں کہ اس زمانے میں وہ خود مشرک تھے؟ ....[1]"

۲- پروفیسر منٹگمری اپنی ایک اور کتاب میں "شیطانی آیات، وجوہات اور تفسیریں" کے عنوان کے تحت مفصل بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :

---

[1] محمدؐ، پیامبر و سیاستمدار صفحہ ۷۶ - ۷۷

"علمائے اسلام اور فقہا جو تدریجی تکامل کے مغربی مفہوم کو نہیں سمجھ پاتے محمدؐ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ شروع سے ہی اسلامی عقیدے کے مکمل مضمون سے واقف تھے اور ان کے لیے یہ تسلیم کرنا بے حد مشکل ہے کہ محمدؐ اصولاً شیطانی آیات بیان کرنے کو اپنے عقیدے کے خلاف نہیں سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے روشن خیال ہمعصروں کی توحید پرستی کی طرح ان کی توحید پرستی بھی پیچیدگی اور ابہام سے خالی نہیں ہے اور ان خداؤں کو قبول کرنے کو وہ توحید کے منافی اور متضاد نہیں سمجھتے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لات، عزیٰ اور منات کو آسمانی موجودات لیکن رتبے میں خدا سے کمتر سمجھتے ہیں...... اس میں کوئی شک نہیں کہ محمدؐ اس وسیلے سے رؤسا قریش کو اپنے نظریات کی جانب راغب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کوششیں کی گئیں کہ وہ مکہ کے نواحی معابد میں عبادت کے لیے جواز کا اعتراف کر لیں۔ وہ شروع میں مادی منفعت کی خاطر یہ تجویز قبول کرنے پر آمادہ تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کام ان کے خیالات کی بہ آسانی کامیابی میں مددگار ثابت ہو گا۔ بعد میں انھیں خداوندی ہدایات سے پتا چلا کہ مشرکین کا رفیق اور ہم خیال بننا اسلام کے لیے تباہ کن ثابت ہو گا لہٰذا انھوں نے شرک ترک کرنے کا اعلان کر دیا اور یہ کام اتنے تیز و تند الفاظ میں کیا کہ ہر قسم کی رفاقت کی راہیں مسدود ہو گئیں۔" [1]

۳۔ ولندیزی مستشرق اور اسلام شناس جوزف شاخت [2] (متولد سنہ ۱۹۰۲ء) نے جو لیڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کا استاد ہے اور قاہرہ، الجزائر، آکسفورڈ (انگلستان)، فرایبورگ (سوئٹزرلینڈ) اور کولمبیا (امریکہ) کی یونیورسٹیوں میں بھی استاد رہا ہے "دائرۃ المعارف اسلامی" کے مادہ "اصول" میں غرانیق کے جعلی اور

---

[1] M. Watt: Muhammad at Mecca pp. 104–109

[2] J. Sshacht

من گھڑت قصے اور شیطان کی دخل اندازی کی جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:
"مسلمانوں میں سے کوئی بھی قرآن کی قطعیت اور مصئونیت کے بارے میں شک نہیں کرتا باوجودیکہ ممکن ہے کہ شیطان نے (اپنے افکار اور کلمات) قرآن سے خلط ملط کر دیے ہوں"۔ [1]

۴۔ لیپزگ یونیورسٹی کا استاد اور ڈنمارک کا ممتاز مستشرق اور اسلام شناس ایف بوہل [2] (۱۸۵۰ء۔ ۱۹۳۲ء) "دائرۃ المعارف اسلام" میں مادۂ قرآن میں ضروری تمہید کے بعد اسی جعلی اور من گھڑت قصے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:
"پیغمبرؐ ان الفاظ کو پہچاننے اور ان میں امتیاز کرنے کے لیے تیار تھے جو ان کے ضمیر سے نادانستہ طور پر ان پر القاء ہو رہے تھے ۔۔۔ ان کا فرض تھا کہ شیطان کی خفیہ آوازوں کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں ۔۔۔ لیکن بعض اوقات ان کا ارادہ ہوتا تھا کہ وحی اور شیطان کی ان خفیہ آوازوں کو آپس میں خلط ملط کر دیں۔ یہ مسئلہ سورۂ نحل کی ۹۸ ویں آیت سے مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو شیطان کی آوازوں سے محفوظ رکھنے کے لیے خدا سے اپنی حفاظت کی درخواست کیا کرتے تھے۔
قابل اعتماد (!!) روایات سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو اجازت دی کہ شیطان کے ہاتھوں بہک جائیں اور لات، عزیٰ اور منات کی تعریف کریں لیکن بعد میں انھیں اپنی لغزش کا احساس ہو گیا اور پھر آپ پر سورۂ نجم کی ۱۹ ویں آیت وحی ہوئی"۔ [3]

مستشرقین کا یہ گروہ ذاتی اغراض اور بعض اوقات ناسمجھی کے علاوہ زیادہ تر مغرب کی استعماری طاقتوں اور بڑی بڑی نوآبادیاتی حکومتوں کی وزارتِ خارجہ یا وزارت نوآبادیات کا تنخواہ دار رہا ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور گروہ بھی ہے جس نے خاورشناسی اور

---

[1] Shorter Encyclopaedia of Islam p. 612 New York
[2] F. Buhl
[3] Shorter Encyclopaedia of Islam pp. 274 – 275

اسلام شناسی کا کام اپنایا ہے۔ یہ کلیسا کے علماء ہیں۔ پہلے مرحلے میں ان کا ہدف دنیا کو عیسائی بنانا ہے اور دوسرے مرحلے میں وہ ایک واسطے کے ساتھ استعماری طاقتوں کے کارکن اور مددگار کا کام کرتے ہیں۔ اس گروہ کے لوگ بعض اوقات تعصب میں پہلے دستے کے علماء کو بھی مات کر دیتے ہیں۔ اس گروہ کا ایک برجستہ نمونہ لامانس P. F. Lammens ہے جو ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۳۷ء میں فوت ہوا۔ دائرۃ المعارف الاسلام کے پہلے ایڈیشن میں اس کے اسی مقالے اور اس کے علاوہ اس کی اور بہت سی کتابیں اس کے اسلام اور مکتب اہل بیت کے خلاف انتہائی تعصب اور دشمنی کے آئینہ دار ہیں۔ علماء کے اس گروہ نے غرانیق کے قصے تک بھی دسترس حاصل کی ہے اور اسلام کے خلاف اپنی تحریروں میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ ان تحریروں میں سے ایک وہ رسالہ ہے جو بیسویں صدی کے شروع میں مصر میں عربی زبان میں شائع ہوا اور امریکی مسیحی علماء کے ایک ادارے کے ذریعے اسلام کے خلاف اس کی تدوین کی گئی ہے۔ یہ رسالہ "الھدایہ" کے نام سے چار جلدوں میں چھپا ہے اور اس کے مؤلف یا مؤلفین نے غرانیق کا قصہ نقل کر کے اسے رسولِ اکرمؐ کے بتوں کی جانب میلان کی سب سے بڑی دلیل قرار دیا ہے[1]

بحث کا خلاصہ

اس سے پچھلے باب میں ہم نے وحی کے آغاز کے بارے میں مکتب خلفاء کی روایات میں درج افسانے کا مطالعہ اور چھان بین کی تھی۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا تھا کہ ــــ نعوذ باللہ ــــ رسولِ اکرمؐ نے خدا کی وحی میں شک کیا اور وحی لانے والے فرشتے کو جن یا شیطان سمجھا۔ پھر ہم نے اس واقعہ کے متعلق اہلبیتؑ کے مکتب کی روایات نقل کر کے اس کی حقیقت واضح کی۔

اس بحث میں ہم مذکورہ بالا جھوٹ سے بھی ایک بڑے جھوٹ کی تحقیق کرتے ہیں۔ یہ وہ جھوٹ ہے جو غرانیق کے افسانے سے عبارت ہے اور جس کی مکتب خلفاء کی تفاسیر

---

[1] "الھدایہ" جلد ۱ صفحہ ۶۱-۶۵ دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۰ء مصر زیر نظر میسونھای مسیحی امریکی

تواریخ اور سیرت کی کتابوں میں پوری پوری تشہیر کی گئی ہے۔

اس افسانے کا خلاصہ طبری اور بہت سے دوسرے علماء نے یوں روایت کیا ہے:

جب رسولِ اکرمؐ سورۂ نجم کی تلاوت فرماتے ہوئے اس آیۂ مبارکہ پر پہنچے: "اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی" تو شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کردیے "تِلۡکَ الۡغَرَانِیۡقُ الۡعُلٰی مِنۡھَا الشَّفَاعَۃُ تُرۡتَجٰی"۔[1] رسولِ اکرمؐ نے بھی یہ شیطانی کلمات قرآن کی آیات کے طور پر دوسری آیات کے ساتھ ساتھ تلاوت کیے۔ جب مشرکین نے دیکھا کہ آنحضرتؐ ان کے بتوں کی تعریف کر رہے ہیں تو بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر سجدہ کیا اور چونکہ ولید، جو قریش کے سربرآوردہ اشخاص میں سے تھا کبرسنی کی وجہ سے سجدہ نہیں کرسکتا تھا اس لیے اس نے مٹھی بھر مٹی اٹھائی اور اس پر سجدہ کیا۔

اس واقعہ کی اطلاع مسلمان مہاجرین کو حبشہ میں ملی۔ انھوں نے سمجھا کہ مشرکینِ مکہ نے اسلام قبول کرلیا ہے لہٰذا وہ وطن واپس آگئے لیکن وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ مشرکین اپنے شرک اور کفر پر قائم ہیں۔

اس واقعہ کے بعد جبرئیل رسولِ اکرمؐ پر نازل ہوئے اور انھیں بتایا کہ مذکورہ بالا جملے شیطان کے تھے۔ یہ سن کر آنحضرتؐ کو رنج ہوا اور خدا نے انھیں تسلی دینے کے لیے یہ آیت بھیجی: "وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ"...

★

یہ تھا اس بڑے جھوٹ اور اس جعلی اور خطرناک قصے کا خلاصہ اور ہم نے اپنے بیان میں اس کے بہت سے ضعیف نقاط کی نشاندہی کی ہے۔

یہ قصہ سورۂ نجم اور سورۂ حج کی آیات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ قصہ سورۂ نجم کے جس حصے سے مربوط ہے اس کی وہ آیات جس میں عرب کے تین مشہور بتوں کے نام لیے گئے ہیں اس سورے کی آیات کے ایک ایسے دستے میں واقع ہیں جو نمبر ۱۸ سے نمبر ۳۰

---

[1] جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ عبارت مختلف روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ شیطان سے منسوب کی گئی ہے۔

تک مسلسل جاری رہتی ہیں۔

موضوع بحث کے لحاظ سے سورۂ نجم کی آیات کا یہ دستہ ایک انجام اور ایک واحد مطلب رکھتا ہے اور ان میں تمام تر گفتگو عرب کے ان تین بتوں کے بارے میں ہے۔ قرآن مجید نے انھیں کئی ایک ناقابل تردید دلائل کے ساتھ بار بار رد کیا ہے اور مشرکین کے اعتقادات کو لغو قرار دیا ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ یہ بت فرشتوں کی شبیہہ اور خدا کی بیٹیاں ہیں جو قیامت کے دن ان کی شفاعت کریں گی۔ سورۂ نجم کی ان آیات میں بھی اسی مقصد کے پیش نظر فرمایا گیا ہے کہ "کیا تمہارے تو بیٹے ہیں اور خدا کی بیٹیاں ہیں" اسی طرح سورۂ صافات میں بھی فرمایا گیا ہے کہ "کیا تمہارے پروردگار کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے یا یہ کہ خدا نے اپنے فرشتوں کو مادہ بنایا ہے؟" [1]

سورۂ نجم کی آیات میں مشرکین کے اس اعتقاد کے خلاف جنگ جاری رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ "یہ بت نشاندہی کرنے والے اور تجسم بخشنے والے اور فرشتوں کی شبیہہ نہیں ہیں اور شفاعت کی قدرت نہیں رکھتے" پھر فرمایا گیا ہے کہ "آسمان میں بہت سے ایسے فرشتے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی ....." قرآن مجید یہ فرما کر انسان کو اس بات کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ جب فرشتوں کی شفاعت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو یہ بتوں کے بے جان اور بے شعور مجسمے جنھیں تم ان فرشتوں کی شبیہہ سمجھتے ہو کیا شفاعت کر پائیں گے؟

قرآن مجید کی ایسی آیات مشرکین کے ساتھ مناظرے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور لات، عزیٰ اور منات کے بارے میں ان کے اعتقادات کا تمسخر اڑاتی ہیں۔ اس موضوع پہ یہ آیات قرآن مجید کی واضح ترین آیات ہیں اور جو شخص عربی زبان اور اس کی لغت سے واقف ہو وہ سمجھ جاتا ہے کہ شیطانی آیات کو ان آیات کے درمیان ڈالنے سے ایسی ناہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جس کا ہر عربی دان کو پتا چل جاتا ہے اور وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک ایسے برتن میں جس میں سفید شکر

---

[1] سورۂ صافات۔ آیات ۱۹۴۔۱۹۵۔

رکھی ہو کوئلے کا ایک ٹکڑا ڈال دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایک بینا شخص کی نگاہ سے ان دو چیزوں کی ناہم آہنگی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

●

یہ تھا نتیجہ سورۂ نجم کی آیات کے مطالعے کا اور جھوٹی باتوں کا جو اس کی تفسیر میں کہی گئی ہیں اور ان افسانوں کا جو اس کی آیات کے ذیل میں گھڑے گئے ہیں۔

جہاں تک سورۂ حج کا تعلق ہے۔ بحث آیۂ کریمہ " وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِىٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى ..... " کے بارے میں اور ان افسانوں کے بارے میں ہے جو تفسیر کی شکل میں اس کے متعلق بیان کیے گئے ہیں۔

یہ آیت بھی ایسی آیات کے ایک دستے کے درمیان نازل ہوئی ہے جن کا موضوع ایک ہے اور جو ایک دوسری کے ساتھ وابستہ ہیں اور تھوڑے سے غور و خوض کے بعد ان کی اس پیوستگی کا پتا چل جاتا ہے۔ آیات کا یہ دستہ ۴۲ ویں آیت سے شروع ہوتا ہے جہاں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: " اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے نوحؑ کی قوم نے اور عاد و ثمود کی قوم نے اور ابراہیمؑ کی قوم نے بھی اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا ہے"

اور گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور خدائے عز و جل فرماتا ہے:

" جو لوگ ہماری آیات کو عاجز اور نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اہل دوزخ ہیں اور ہم نے تم سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ جب اس نے اپنی رسالت کی تمنا اور آرزو کی شیطان نے اس کے راستے میں وسوسے اور شبہات القا کر دیے اور پروردگار نے ان القائات کو نابود اور زائل کر دیا اور اپنی آیات کو استحکام بخشا"

اس سورے کی آیات یوں کہتی ہیں اور کلام کا انداز ۵۸ ویں آیت تک اسی طرح جاری رہتا ہے جس کا خلاصہ ہم اس شکل میں کر سکتے ہیں: اے رسولؐ! تمہاری قوم کا تمہیں جھٹلانا اور تمہارے مکتب کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا تمہاری ذات اور تمہارے مکتب سے مخصوص نہیں ہے۔ اگلی قوموں کے مشرکین نے بھی اپنے پیغمبروں مثلاً نوحؑ، صالحؑ اور ابراہیمؑ کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ ان سب نے کوشش

کی تھی کہ خدا کی نشانیوں کو نابود کردیں اور کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جسے اپنے مقدس مقصد کے حصول کی خاطر شیطان کے پیدا کیے ہوئے شبہات، مشکلات اور وسوسوں سے دوچار نہ ہونا پڑا ہو۔ شیطان نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ پیغمبر لوگوں کو ہدایت کرنے کے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ بلاشبہ پروردگار نے شیطان کی تمام کوششیں اور منصوبے خاک میں ملا دیے اور اپنی آیات کو استحکام بخشا۔

خدائے تعالیٰ نے یہی باتیں ایک اور مقام پر یوں بیان فرمائی ہیں:

"اور اسی طرح پروردگار نے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا اور ان میں سے کئی ایک بعض دوسروں کو مہمل اور بے حقیقت لیکن بظاہر خوشنما اور پرکشش کلمات القاء کرتے ہیں۔۔۔۔ تاکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ ان کی باتیں سنیں اور پسند کریں۔"[1]

خدا شیطانوں کے اس قسم کے تمام الہامات اور القائات کو منسوخ کردیتا ہے اور ان کا اثر زائل کردیتا ہے۔ لوگوں کو ہدایت کی خاطر انبیاء کی کوششوں کے مقابلے میں شیطانوں کے طور طریقے ایسے رہے ہیں اور اس سلسلے میں خدائے تعالیٰ کی مہربانیوں کی کیفیت بھی ایسی رہی ہے۔

قرآن مجید کے ان دو سوروں کے مفاہیم پوری وضاحت کے ساتھ اور کسی قسم کے الجھاؤ اور ابہام کے بغیر ایسے ہیں جیسے کہ بیان کیے گئے ہیں، اور یہ اس صورت میں ہیں جب ہم خالی الذہن ہوں اور پہلے سے کوئی فیصلہ کیے بغیر قرآن مجید کی جانب رجوع کریں۔ تاہم بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اگر ہم ان احادیث کی جانب رجوع کریں جو کتب خلفاء کی سیرت، تاریخ اور تفسیر کی کتابوں میں موجود ہیں تو جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں صورتحال قرآن مجید کے بالکل برعکس دیکھنے میں آتی ہے لیکن ان روایات کے مطالعے اور چھان بین کے بعد مندرجہ ذیل حقائق کا پتا چلتا ہے۔

(۱) یہ روایات اپنے مندرجات کے نقطۂ نظر سے گوناگوں تناقضات کا شکار ہیں:

---

[1] سورۂ انعام۔ آیت ۱۱۲

(۱) یہ احادیث کہتی ہیں کہ جب رسولِ اکرمؐ سورۂ نجم کی تلاوت فرماتے ہوئے عرب کے مشہور بتوں (لات، عزّیٰ اور منات) کے ناموں پر پہنچے تو شیطان نے "تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلىٰ ...." کے الفاظ آپ کی زبان پر القاء کر دیے اور آنحضرتؐ نے بھی نادانستہ طور پر ان کی تلاوت کی لیکن جب جبرئیل نے انہیں بتایا کہ یہ عبارت وحی شدہ نہیں ہے تو آنحضرتؐ غمگین ہو گئے اور خدا نے آپ کی تسلی کے لیے سورۂ حج کی ۵۲ ویں آیت (یعنی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ ....") نازل فرمائی۔ یہ سب کچھ اس کے باوجود کہا گیا ہے کہ سورۂ حج مدنی ہے یعنی مدینہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ غرانیق کے واقعے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے مدینہ ہجرت فرمانے سے کئی سال پہلے مکہ میں پیش آیا۔

(۲) مندرجات کے لحاظ سے ان احادیث کے کچھ حصے ان کے کچھ دوسرے حصوں سے تناقض اور تضاد رکھتے ہیں۔ بالخصوص دوسری حدیث (جو ان احادیث میں سے مفصل ترین ہے) کے مختلف حصے ایک دوسرے سے واضح طور پر متضاد اور متناقض ہیں۔

(۳) ان تمام احادیث کے مندرجات کم از کم وحی کے حصول اور اس کی تبلیغ کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے منافی ہیں اور قرآن مجید کی ان قطعی اور مسلم نصوص کے متضاد ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ شیطان مومنین اور صاحبِ اخلاص لوگوں پر کسی قسم کا غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔

(۴) یہ قصہ رسولِ اکرمؐ کے ان حالات سے متناقض ہے جو تواریخ، حدیث اور سیرت کی کتابوں میں متواتر بیان کیے گئے ہیں کیونکہ یہ تمام کتابیں بتاتی ہیں کہ آنحضرتؐ بچپن سے ہی بتوں کو برا سمجھتے تھے۔

یہ ان تضادات اور تناقضات کے چند نمونے ہیں جو ان روایات میں موجود ہیں۔

(ب) سند کے لحاظ سے بھی زیرِ بحث روایات مختلف اقسام کے تناقض اور ضعف کا شکار ہیں کیونکہ ایک روایت کے علاوہ باقی سب کی سب سند کے نقطۂ نظر سے ایسے افراد پر ختم ہوتی ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ اس واقعہ کا زمانہ نہیں دیکھا بلکہ در اصل صحابہ کے بعد کے طبقہ یعنی تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔

جو روایت عبداللہ بن عباس سے نقل کی گئی ہے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ عبداللہ بن عباس کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ ہجرت سے قبل تیسرے سال میں پیدا ہوتے اس لیے اس واقعہ کے وقت جو بعثت کے ابتدائی سالوں میں وقوع پذیر ہوا دنیا میں نہیں آئے تھے اور بالفرض اگر وہ اس وقت پیدا ہو بھی چکے تھے تو اتنے چھوٹے تھے کہ اس واقعہ کو سمجھنے یا اس کے پیش آنے کے وقت موجود ہونے کے قابل نہ تھے۔

لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان راویوں نے جو اس واقعہ کے رونما ہونے کے وقت موجود نہ تھے اسے کیسے نقل کیا؟

حقیقت کا انکشاف

ان تمام احادیث کے مطابق پہلا شخص جس نے جملہ " تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى مِنْهَا الشَّفَاعَةُ تُرْتَجٰى " اپنی زبان سے ادا کیا وہ رسول اکرمؐ تھے اور قریشیوں نے یہ عبارت آنحضرتؐ سے سن کر پڑھی لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد اور قابل اعتماد تاریخ نویس ہشام بن محمد کلبی نے واقعہ کی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ اپنی مشہور کتاب " اصنام " میں کہتے ہیں:

جب قریشی خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے تھے تو کہتے تھے:

وَاللَّاتَ وَالْعُزّٰى وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى
فَاِنَّهُنَّ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى مِنْهَا الشَّفَاعَةُ تُرْتَجٰى

ان کا عقیدہ تھا کہ مذکورہ بالا بت خدا کی بیٹیاں ہیں اور اس کے پاس شفاعت کریں گی لیکن جب رسولِ اکرمؐ مبعوث ہوتے تو اس عقیدے کو غلط قرار دینے کے لیے خدائے تعالیٰ نے آپ پر یہ کلام نازل فرمایا: " اَفَرَءَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ..... " یعنی کیا تم نے لات عزیٰ اور تیسرے بت منات کو نہیں دیکھا؟ کیا تمہارے فرزند بیٹے ہیں اور خدا کی اولاد بیٹیاں ہیں؟ یہ تقسیم تو بڑی ظالمانہ ہے۔ یہ بت ان ناموں کے علاوہ کچھ نہیں ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے انھیں دے رکھے

ہیں۔ خدا نے کوئی حجت اور دلیل ان کے بارے میں نہیں بھیجی۔

اب تک جو تحقیقات ہوئی ہیں اس کی رو سے امام جعفر صادقؑ کے شاگرد ہشام بن محمد کلبی نے اس واقعہ کی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے[1] اور مذکورہ احادیث کے جعلی اور وضعی ہونے کی نشاندہی کی ہے[2]

ہشام بن محمد کلبی کی تحریریں اتنی دقیق ہیں اور ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان سے امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں کے علمی تبحر اور وسعت نظر کا تھوڑا سا اندازہ ہو جاتا ہے۔

یہاں ممکن ہے کہ کوئی حقیقت کا متلاشی سوال کرے کہ پھر ان روایات کا سرچشمہ کہاں ہے اور یہ کس شخص یا اشخاص کے ہاتھوں گھڑی گئی ہیں؟

اس سوال کا جواب ایک قدیم اسلامی عالم محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے دیا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر ایک کتاب تالیف کی ہے اور محکم دلائل اور براہین سے ثابت کیا ہے کہ یہ جھوٹی روایات زندیقوں اور ملحدوں نے گھڑی ہیں۔

●

اس عاجز (یعنی مؤلف) نے اپنی کتاب "عبداللہ بن سبا" کی پہلی جلد کے مقدمے میں اور کتاب "خمسون ومائة صحابی مختلق" میں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی غرض سے زندیقوں کے احادیث گھڑنے کے طریقِ کار کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

بہر حال یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ امام صادقؑ کے شاگرد (ابن کلبی) کی روایت

---

[1] احمد بن علی النجاشی: کتاب الرجال ۳۳۹ - ۳۴۰ مطبوعہ مرکز نشر کتاب

[2] ابن کلبی کی تحریریں دقیق ترین تاریخی معلومات کی حامل ہیں چنانچہ عرب کی اور بالخصوص حیرہ کی قدیم تاریخ کے بارے میں ان کے بیشتر اقوال کی تائید کھدائیوں اور نئی دریافتوں سے ہو گئی ہے۔ اس بارے میں تاریخ الادب العربی جلد ۳ صفحہ ۳۰-۳۱ اور تاریخ عرب جلد ۱ صفحہ ۹۵-۴ ملاحظہ فرمائیں۔

جو حقیقت کو واضح کرتی ہے نشر نہ ہوئی اور عموماً وہ روایات نشر ہوئیں جو زندیقوں ملحدوں اور اسلام کے دشمنوں نے گھڑی تھیں۔ قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اہل بیتؑ کے مکتب کے علماء میں سے کسی نے غرانیق کا من گھڑت قصہ روایت نہیں کیا بجز ان حضرات کے جنہوں نے اس پر تنقید کرنے اور اس کے متعلق اپنا فیصلہ دینے کی غرض سے اس کا ذکر کیا ہے۔

اسلام کے دشمنوں کا اس قصے سے غلط فائدہ اٹھانا

موجودہ زمانے میں عیسائی مبلغین، یہودی اور عیسائی مستشرقین اور کمیونسٹوں نے اسلام کے مختلف پہلوؤں کی شناخت کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی اور شائع کی ہیں جن میں سے سب سے زیادہ اہم اور مفصل "دائرۃ المعارف اسلامی" کا سلسلہ ہے[1]۔

یہ کتابیں جو اسلام کے عقائد اور احکام کی پہچان اور تاریخ ملل و نحل اور مسلمانوں کے فکری، اعتقادی اور سیاسی انقلابات اور قرآن اور اس کی تاریخ اور رسول اکرمؐ اور آپ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ہیں، سب کی سب یا بیشتر ایک خودغرضانہ مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں اور یہ مقصد اسلام کی تباہی اور بربادی ہے۔ ان اشخاص نے غرانیق کے جعلی اور مہمل قصے سے بالخصوص استفادہ کیا ہے۔ اسے اہل عالم کے سامنے پیش کرنے کے علاوہ انھوں نے اس پر حاشیہ آرائی اور کافی تجزیہ و تحلیل کرکے اس میں رنگ آمیزی کی ہے تاکہ انھیں اسلام، قرآن اور پیغمبرؐ کو نشانہ بنانے کے لیے ایک

---

[1] دائرۃ المعارف کا سلسلہ ہالینڈ کی سرکاری اکیڈمی کی مدد سے اتحاد بین الملکی اکیڈیمز کی زیرِ نگرانی شروع کیا گیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن کئی ایک معروف مستشرقین کے زیرِ انتظام سنہ ۱۹۱۳ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں چھپا۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں اس کا خلاصہ شائع ہوا اور سنہ ۱۹۶۰ء میں اس کے نئے ایڈیشن کی پہلی جلد نشر کی گئی۔

نئی سمت میسر آجائے۔ ان مستشرقین اور عیسائیت کے مبلغین نے سرزمین مشرق اور اسلام کی جانب علمی سفر نہیں کیا تاکہ وہ امام جعفر صادق ؑ کے مکتب کے شاگرد ہشام بن حکم یا اس مکتب کے دوسرے ممتاز علماء سے رجوع کرتے اور چونکہ اہلبیت ؑ کے مکتب کے شاگردوں کے ذریعے ان کی استعماری خواہشات پوری نہ ہوسکیں لہذا انھوں نے مجبوراً اس مکتب کی جانب سے منہ پھیر لیا اور اس طرف گئے جہاں ان کے مقاصد پورے ہو سکتے تھے۔

جن روایات میں غرانیق کے قصے کا ذکر کیا گیا ہے انھوں نے رسول اکرم ؐ کی برگزیدہ شخصیت کو ایک معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے بھی نیچے گرا دیا ہے اور اس کے علاوہ جیسا کہ ہم نے مستشرقین کے عمل میں مشاہدہ کیا ان روایات نے قرآن مجید کے بارے میں شک وشبہ کی راہ بھی کھول دی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس بڑے جھوٹ پر سے پردہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائی ؛

وَالصَّلَاةُ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ۔

●●●●●

توراۃ اور انجیل کی بشارتیں

خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بارے میں توراۃ اور انجیل کی بشارتوں کے نمونے

توراۃ اور انجیل کے جتنے بھی نسخے دستیاب ہیں ان سب میں تحریف کی گئی ہے۔ اس تحریف کے نمونے زیر نظر کتاب کے مؤلف (سید مرتضیٰ عسکری) کی ایک فارسی تالیف میں دیے گئے ہیں جس کا نام "ادیان آسمانی و مسئلہ تحریف" ہے۔[۱]

لیکن ان تمام تحریفات کے باوجود بعض اوقات ہمیں انہیں نسخوں میں رسولِ اکرمؐ کی بعثت کے بارے میں گزشتہ پیغمبروں کی بشارتوں کے نمونے مل جاتے ہیں مثلاً ان نسخوں میں جو مجمع علمی اسلامی ایران کی لائبریری میں موجود ہیں اور ان میں دو کتابیں بنام توراۃ سامری اور انجیل برنابا شامل ہیں۔

تاہم چونکہ یہ دو کتابیں تمام عیسائیوں کے لیے قابل قبول نہیں ہیں اس لیے ہم اس موضوع پر ان میں سے کوئی چیز نقل نہیں کریں گے اور تین دوسرے نسخوں سے نقل کرنے پر اکتفا کریں گے۔

---

[۱] یہ کتاب مجمع علمی اسلامی نے شواھد تحریف کے نام سے اردو میں شائع کی ہے۔

الف ۔ تورات کی کتاب استثنا باب ۱۸، آیت ۱۸ میں بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ کی بشارت یوں آئی ہے :

سفر تثنیه ۱۸

وخداوند بمن کفت آنچه کفتند نکو کفتند * نبیٔرا برای ایشان از میان برادران ایشان مثل تو مبعوث خواهم کرد وکلام خودرا به دهانش خواهم کذاشت وهرآنچه باو امر فرمایم بایشان خواهد کفت * وهرکسی که سخنان مرا که ویهم من کوید نشنود من ازاو مطالبه خواهم کرد *

کتاب استثنا باب ۱۸

ترجمہ : اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا ★ اور جو کوئی میری باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا ★ [1]

---

[1] عہدین میں سے تورات کی کتاب استثنا کے جس حصے کا ترجمہ اوپر دیا گیا ہے وہ مجمع علمی اسلامی ایران کی لائبریری کے نمبر شمار ۸ ۹ ۱۸ پر موجود ہے۔ اس کے سرورق کی آفسٹ کردہ نقل سامنے کے صفحے پر ہے۔

یہ اردو ترجمہ "کتاب مقدس" مطبوعہ پاکستان بائیبل سوسائٹی ، انارکلی لاہور سے لیا گیا ہے جس کا SBN نمبر 6 564 00266 ہے۔

کتاب مقدس

یعنی کتب

عهد عتیق و عهد جدید

که از زبانهای اصلی عبرانی و کلدانی
و یونانی ترجمه شده است

و بنفقهٔ جماعت مشهور به بریتش و فورن
بیبل سوسائیتی دار السلطنهٔ لندن
مطبوع گردید
فی سنهٔ ۱۹۳۲

ب - اپنی وفات کے وقت حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو جو وصیت کی تھی وہ تورات کی کتاب استثنا کے ۳۳ ویں باب میں یوں آئی ہے :

باب سي و سيوم

۱ واينست دعاي خيركه موسى مرد خدا قبل از مردن بر بني اسرائيل خواند

۲ وگفت كه خداوند ازسيناي برآمد و ازسعير نمودار گشت و از كوهٔ فاران نور افشان شد و با ده هزار مقرّبان ورود نمود و از دست راستش شريعتي آتشين براي ايشان رسيد

۳ بلكه قبائل‌را دوست داشت و همگي مقدّساتش در قبضهٔ تو هستند ومقرّبان پاي تو بوده تعليم ترا خواهند پذيرفت

۴ موسى مارا بشريعتي امر كرد كه ميراث جماعت بني يعقوب باشد

۳۳واں باب

۱- اور یہ ہے وہ دعائے خیر جو مردِ خدا موسیٰؑ نے اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کے سامنے پڑھی!

۲- اور اس نے کہا: خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے نمودار رہوا اور کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا اور دس ہزار مقربین کے ساتھ وارد ہوا اور اس کے داہنے ہاتھ سے ان کے لیے آتشی شریعت پہنچی۔

۳- بلکہ وہ قبائل کو عزیز رکھتا ہے اور اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں میں رہ کر تیری تعلیم قبول کریں گے۔

۴- موسیٰؑ نے ہمیں اس شریعت کا حکم دیا جو بنی یعقوبؑ کی جماعت کی میراث ہے۔[1]

---

[1] تورات کے اس اقتباس کا فارسی نسخہ مجمع علمی اسلامی ایران کی لائبریری کے نمبر شمار ۲۲۲۸ پر موجود ہے اور اس کے سرورق کی نقل سامنے کے صفحہ پر ہے۔
یہ آیات فارسی سے ترجمہ کی گئیں (مترجم)

كتاب المقدس

وهو

كتاب العهد العتيق

كه آنرا

تومما رابنسن قسّيس

از اصل عبراني به عبارت فارسي

ترجمه نمود

جلد اوّل

في مدينة لندن المحروسة

بدار الطباعة رِچارد وَاطْس

۱۸۳۹
سنة المسيحية

ج ۔ حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی رحلت کے وقت بھی ان کی وصیت کے بارے میں یوحنا کی انجیل کے ۱۴ ویں، ۱۵ ویں اور ۱۶ ویں ابواب میں یوں آیا ہے:

انجيل يوحنا * ١٤ *

ان كنتم
١٦ تحبونني فاحفظوا وصاياي * وانا اطلب من الاب فيعطيكم فارقليط اخر
١٧ ليثبت معكم الي الابد * روح الحق الذي لن يطيق العالم ان يقبله
ومن لا يحبني ليس يحفظ
كلامي وكلمتي التي سمعتموها ليست لي بل للاب الذي ارسلني
٢٦ * كلمتكم بهذا مقيما عندكم * والفارقليط روح القدس الذي يرسله الاب
٢٧ باسمي هو يعلمكم كل شيء وهو يذكركم كلما قلته لكم *

٣٠ * والان قد قلت لكم قبل ان يكون حتي اذا كان تومنوا * من الان لا
٣١ اكلمكم كثيرا لان اركون هذا العالم ياتي

انجيل يوحنا * ١٥ *

فاما اذا جاء الفارقليط الذي ارسله انا اليكم من
٢٧ الاب روح الحق الذي من الاب ينبثق هو يشهد لاجلي *

الاصحاح السادس عشر

* ولم اخبركم بهذه من البدي
لاني معكم والان فاني منطلق الي من ارسلني وليس احد منكم يسالني
٧ الي اين تذهب * بل لاني قلت لكم هذه فالكابة ملات قلوبكم * لكني
اقول لكم الحق انه خير لكم ان انطلق لاني ان لم انطلق لم ياتكم الفارقليط
٨ فاما ان انطلقت ارسلته اليكم * فاذا جاء ذاك فهو يوبخ العالم علي
٩ خطية وعلي بر وعلي حكم * اما علي الخطية فلانهم لم يومنوا بي
١١ * واما علي البر فلاني منطلق الي الاب ولستم ترونني بعد * واما علي

١٢ الحكم فان اركون هذا العالم قد دين *وان لي كلاما كثيرا اقوله
١٣ لكم ولكنكم لستم تطيقون حمله الان *واذا جاء روح الحق ذاك فهو
يعلمكم جميع الحق لانه ليس ينطق من عنده بل يتكلم بكلما يسمع
١٤ ويخبركم بما سياتي *وهو يمجدني لانه ياخذ مما هو لي ويخبركم
١٥ *جميع ما هو للاب فهو لي فمن اجل هذا قلت ان مما هو لي ياخذ
١٦ ويخبركم [1]

---

[1] ہم نے یوحنا کی انجیل کا یہ حصہ عہد-من کے اس نسخے سے آفسٹ کیا ہے جو مجمع علمی اسلامی ایران کی لائبریری کے نمبر شمار ۱۸۹۹ پر موجود ہے اور اس کے سرورق کی نقل اگلے صفحے پر موجود ہے۔

كتاب المقدس

المشتمل علي

كتب العهد العتيق

الموجودة في الاصل العبراني

وايضاً

كتاب العهد الجديد

لربنا

يسوع المسيح

طبعه العبد الفقير رِجَارْدْ وَاطْسْ في لَنْدَن المحروسة
سنة ١٨٣١ المسيحية علي النسخة المطبوعة في رومية
العظمي سنة ١٦٧١ لمنفعة الكنايس الشرقية

انجیل کی گزشتہ بشارتوں کا فارسی نسخہ اور اس کا اردو ترجمہ :

انجیل یوحنا ۱۴

اگر مرا دوست دارید احکام مرا نگاه دارید * ومن از پدر
۱۱ سؤال میکنم وتسلی دهنده دیگر بشما عطا خواهد کرد تا همیشه با شما بماند *

وآنکه

مرا محبت نماید کلام مرا حفظ نمیکند وکلامیکه میشنوید از من نیست بلکه از
۲۵ ۲۶ پدریست که مرا فرستاد * این سخنانرا بشما گفتم وقتیکه با شما بودم * لیکن تسلی
دهنده یعنی روح القدس که پدر اورا بنام من میفرستد او همه چیزرا بشما تعلیم

۲۷ خواهد داد وآنچه بشما گفتم بیاد شما خواهد آورد

۲۹ ۳۰ والآن قبل از وقوع بشما گفتم تا وقتیکه واقع گردد ایمان آورید * بعد
بسیار با شما نخواهم گفت زیراکه رئیس این جهان میآید

یوحنا کی انجیل - باب ۱۴

ترجمہ : اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے احکام پر عمل کرو گے ★ اور میں
باپ سے سوال کروں گا اور وہ تمہیں دوسرا تسلی دہندہ عطا کرے گا جو ہمیشہ
تمہارے ساتھ رہے ★
اور جو مجھ سے محبت نہیں رکھتا وہ میرے کلام کو جو حفظ نہیں کرتا اور جو کلام
تم سنتے ہو وہ میرا نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ★ میں نے یہ باتیں تم
سے اس وقت کہیں جب میں تمہارے ساتھ تھا ★ لیکن تسلی دہندہ یعنی
روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہ تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو
کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب باتیں تمہیں یاد دلائے گا۔
اور میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب ہو جائے تو

تم یقین کرلو★ اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ اس دنیا کا سردار آنے والا ہے۔

انجیل یوحنا ۱۵

لیکن چون تسلّی دهنده که اورا از جانب پدر نزد شما میفرستم آید یعنی روح راستی که از پدر صادر میگردد او بر من شهادت خواهد داد ٭

انجیل یوحنا ۱۶

ومن بشما راست میگویم که رفتن من برای شما مفید است زیرا اگر نروم تسلی دهنده نزد شما

۸ نخواهد آمد امّا اگر بروم اورا نزد شما میفرستم ٭ وچون او آید جهانرا بر گناه
۹ وعدالت وداوری ملزم خواهد نمود ٭ امّا بر گناه زیراکه بمن ایمان نیاورند ٭
۱۰ ۱۱ برعدالت از آن سبب که نزد پدر خود میروم ودیگر مرا نخواهید دید ٭ و...
۱۲ داوری از آنرو که بر رئیس اینجهان حکم شده است ٭ وبسیار چیزهای دیگر
۱۳ دارم بشما بگویم لکن الآن طاقت تحمل آنهارا ندارید ٭ ولیکن چون او ٭
روح راستی آید شمارا بجمیع راستی هدایت خواهد کرد زیراکه از خود تکلّم نمیکند
بلکه بآنچه شنیده است سخن خواهد گفت واز امور آینده بشما خبر خواهد داد ٭
۱۴ او مرا جلال خواهد داد زیراکه از آنچه آنِ من است خواهد گرفت و—
۱۵ خبر خواهد داد ٭ هرچه از آنِ پدر است از آنِ من است از اینجهة گفتم که
۱۶ از آنچه آنِ من است میگیرد وبشما خبر خواهد داد ٭

یوحنا کی انجیل۔ باب ۱۵

ترجمہ: لیکن جب وہ تسلی دہندہ آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کیطرف سے بھیجوں گا یعنی روحِ حق جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا★

یوحنا کی انجیل۔ باب ۱۶

ترجمہ: اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ

اگر میں نہ جاؤں تو وہ تسلی دہندہ تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا ★ اور جب وہ آئے گا تو دنیا کو گناہ اور عدل و انصاف کے بارے میں قصوروار ٹھہراتے گا ★ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے ★ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے ★ انصاف کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے ★ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن اس وقت تم انھیں برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ★ لیکن جب وہ روحِ حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا ★ وہ مجھے جلال دے گا کیونکہ جو کچھ میرا ہے وہ لے گا اور خبریں دیگا ★ جو کچھ باپ کا ہے وہ میرا ہے اس لیے میں نے کہا کہ وہ جو میرا ہے وہ لے لے گا اور تمہیں خبریں دے گا ★ [1]

دونوں نسخوں میں فرق

فارسی نسخے میں (جس کا اردو ترجمہ اوپر دیا گیا ہے) اور عربی نسخے میں اہم ترین فرق یہ ہے کہ عربی نسخے کے لفظ "فارقلیط" کو بدل کر فارسی نسخے میں لفظ "تسلی دہندہ" استعمال کیا گیا ہے۔

عبرانی زبان میں "فارقلیط" کے وہی معنی ہیں جو عربی زبان میں "احمد" کے اور فارسی زبان میں "ستودہ" کے ہیں اور یہ تحریف اس لیے کی گئی ہے تاکہ انجیل کی عبارت میں حضرت خاتم النبیین ؐ کا اسمِ مبارک بالصراحت موجود نہ ہو۔

دو پیغمبروں کے ارشادات کا خلاصہ:

کتاب استثنا کے اٹھارہویں باب میں حضرت موسیٰ ؑ نے بنی اسرائیل کو

---

[1] یوحنا کی انجیل کا یہ ترجمہ اسی مذکورہ بالا کتاب (تورات) کے فارسی ترجمے سے کیا گیا ہے جس کا سرورق صفحہ ۳۵۱ پر دیا گیا ہے۔

بشارت دی کہ خدا فرماتا ہے: "میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔"

اور اسی کتاب کے ۳۳ ویں باب میں حضرت موسیٰؑ کی وصیت کا خلاصہ یوں پیش کیا گیا ہے:

خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے نمودار ہوا اور کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا۔ (پھر) دس ہزار مقربین کے ساتھ (مکہ میں) وارد ہوا اور اس کے داہنے ہاتھ سے ان کے لیے آتشی شریعت (شریعتِ جنگ) پہنچی۔

حضرت عیسیٰؑ کی وصیت

حضرت عیسیٰؑ نے یوحنا کی انجیل کے باب ۱۴- ۱۵ اور ۱۶ کے مطابق جو وصیت فرمائی اس کا خلاصہ یہ ہے:

میں خدا سے سوال کرتا ہوں کہ وہ تمہیں ایک اور پیغمبر عطا کرے تاکہ (اس کی شریعت) ہمیشہ تمہارے پاس رہے۔

اور جو مجھ سے محبت نہیں رکھتا وہ میرے کلام کو حفظ نہیں کرتا اور جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا نہیں بلکہ خدا کا ہے جس نے مجھے بھیجا۔ میں نے یہ باتیں تم سے اس وقت کہیں جب میں تمہارے ساتھ تھا لیکن جب خدا (فارقلیط کو) بھیجے گا تو وہ تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب باتیں تمہیں یاد دلائے گا۔ میں نے تمہیں یہ بات اس کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی بتا دی ہے تاکہ جب یہ واقع ہو تو تم ایمان لے آؤ۔ اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ اس دنیا کا سردار آنے والا ہے۔

اور جب (فارقلیط) خدا کی جانب سے آئے گا تو وہ میری گواہی دے گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے مفید ہے کیونکہ اگر میں نہیں جاؤں گا

تو (فارقلیط) تمہارے پاس نہیں آئے گا اور جب میں جاؤں گا تو وہ آئے گا اور دنیا کو گناہ اور عدل و انصاف کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن اس وقت تم انھیں برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے لیکن جب وہ آئے گا تو تمہیں تمام سچائی کی راہ دکھائے گا کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جو کچھ (خدا سے) سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا اور وہ میری تجلیل کرے گا۔

عہدین کی آیات کا قرآن کی آیات سے تقابل

اب ہم قرآن مجید کی طرف لوٹتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ حضرت مسیحؑ نے جو پیشین گوئی کی ہے اس کی گواہی قرآن مجید نے کیسے دی ہے:

سورۂ صف کی چھٹی آیت میں ارشاد ہوا ہے:

"جب مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ نے کہا:" اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس خدا کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں اور جو کتاب مجھ سے پہلے آئی ہے (یعنی تورات) اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک پیغمبر کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئیں گے اور جن کا نام احمدؐ ہو گا۔"

اور اس بارے میں کہ رسول اکرمؐ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے سورہ نجم میں یوں فرمایا گیا ہے:

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى"

یعنی وہ تو اپنی نفسانی خواہش سے کچھ کہتے ہی نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ اس وحی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

اور یہودی جو حضرت مریمؑ سے ناروا چیزیں منسوب کرتے تھے ان کے مقابلے میں حضرت عیسیٰؑ کی تجلیل کے بارے میں سورہ آل عمران کی ۴۲ ویں آیت

یس قرآن مجید یوں فرماتا ہے :

"اے مریمؑ ! تمہیں خدا نے پاک وپاکیزہ کیا ہے اور (اپنے زمانے کی) تمام عورتوں میں سے چن لیا ہے۔"

اور ۴۵ ویں آیت میں فرماتا ہے :

اور جب فرشتوں نے کہا: "اے مریمؑ ! خدا تمہیں اپنے ایک کلمے کی (صرف اپنے حکم سے ایک لڑکے کے پیدا ہونے کی) خوش خبری دیتا ہے جس کا نام عیسیٰ مسیح ابن مریمؑ ہوگا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں جہان میں باعزت اور خدا کے مقرب بندوں میں ہوگا۔"

اور سورۂ انبیاء کی ۹۱ ویں آیت میں فرماتا ہے :

"اور مریمؑ کو یاد کرو جس نے اپنا دامن پاک رکھا اور ہم نے اس (کے شکم) میں اپنی روح پھونک دی اور اسے اس کے بیٹے کے ساتھ سارے جہان کے لیے معجزہ اور (اپنی قدرت کی) عظیم نشانی قرار دیا۔"

اور سورۂ مریم کی ۳۴ ویں آیت میں فرماتا ہے :

"یہ ہے عیسیٰؑ ابن مریمؑ کا سچا قصہ جس میں لوگ شک کیا کرتے ہیں۔"

چند سوالات

اب مناسب ہوگا کہ ہم چند سوالات عیسائیوں کے سامنے رکھیں اور ان سے پوچھیں کہ :

- وہ کونسا نبی تھا جس کے متعلق حضرت موسیٰؑ نے خبر دی تھی کہ خدائے عزوجل اسے بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے مبعوث کرے گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا ؟
- وہ کونسا نبی تھا جس پر وحی حضرت موسیٰؑ کی تورات کی طرح الواح کی شکل میں نازل نہیں ہوئی بلکہ اس کی زبان پر رکھی گئی ؟
- وہ کونسا نبی تھا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد آیا اور حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ

اور حضرت عیسیٰؑ کی طرح بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا؟
اور ان سے یہ بھی پوچھیں کہ:

- سینا سے آنے اور سعیر سے نمودار ہونے کے بعد خداوند کوہِ فاران (مکہ) میں کس شخص پر جلوہ افگن ہوا؟
- اور وہ کون شخص تھا جو دس ہزار مقربین کے ساتھ (مکہ میں) وارد ہوا اور جس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت تھی؟
- اور وہ کون شخص تھا جس کے آنے کی حضرت عیسیٰؑ نے بشارت دی تھی، خواہ اس کا نام فارقلیط یعنی احمد ہو یا یہ کہ اس میں تحریف کر کے اسے "تسلی دہندہ" یا "معزی" بنا دیا جائے۔ بہرصورت حضرت عیسیٰؑ نے کسی شخص کے آنے کی خبر دی تھی۔ وہ شخص کون تھا جس کی انھیں انجیلوں میں حضرت عیسیٰؑ کی زبانی یوں تعریف کی گئی ہے:

خدا فارقلیط کو بھیجے گا۔ وہ تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب باتیں تمھیں یاد دلائے گا۔ اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ اس دنیا کا سردار آنے والا ہے۔

فارقلیط خدا کی جانب سے آئے گا۔ وہ میری گواہی دے گا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے مفید ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط (احمد) تمہیں آئے گا اور جب میں جاؤں گا تو وہ آئے گا اور جب وہ آئے گا تو دنیا میں انصاف کرے گا۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن اس وقت تم انہیں برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ جب وہ آئے گا تو تمھیں تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہے گا بلکہ جو کچھ خدا سے سنے گا وہی کہے گا اور تمھیں آئندہ کی خبریں دے گا اور میری تجلیل کرے گا۔

- ان صفات کا مالک کون تھا؟
- وہ کون شخص تھا جو حضرت عیسیٰ مسیح کے بعد آیا اور اس نے ان کی تجلیل کی اور اس کی راستگوئی کی شہادت دی؟

- وہ کون شخص تھا جو حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے بعد آیا اور جس نے دنیا میں انصاف کیا اور اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا سکھایا اور آئندہ کی خبریں دیں اور لوگوں کو ہر چیز کی تعلیم دی؟
- وہ کون شخص تھا جس نے اپنی مرضی سے کوئی بات نہ کی بلکہ جو کچھ خدا سے سنا وہی کہا؟
- خواہ اس کا نام احمد ہو یا فارقلیط یا معزّی یا تسلّی دہندہ، وہ کون تھا؟
- وہ کون تھا جس کے بارے میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں نے کہا: اس پر موسیٰؑ کی تورات کی الواح کی مانند وحی نہیں ہو گی بلکہ خدا اپنا کلام اس کی زبان پر ڈالے گا؟

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

گیارھواں درس

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰى. مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمۡ وَمَا غَوٰى. وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى. اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى.

اس درس میں ہم چند ایسی احادیث کو زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں جو پیغمبر اسلامؐ کو ان لوگوں کی نظروں سے گرانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں جو ان احادیث پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ ان احادیث میں سے کچھ حدیثیں ایسی بھی ہیں جن میں دوسرے لوگوں کو آنحضرتؐ پر اس طرح ترجیح دی گئی ہے کہ جو انسان ان احادیث کو صحیح سمجھتا ہو وہ اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ جب ان اشخاص کا خیال اور رائے رسول اکرمؐ کے قول کے خلاف ہو تو ان کے خیال اور رائے کو ترجیح دے اور آنحضرتؐ کے ارشاد کو ترک کر دے۔ ایسی احادیث کے کچھ برجستہ نمونے وہ ہیں جو "موافقاتِ عمر" کے نام سے مشہور ہیں۔

یہ احادیث مکتبِ خلافت کی صحاح، مسانید اور سنن جیسی کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔ ذیل میں ہم نمونے کے طور پر صحیح بخاری سے ایسی ہی ایک حدیث نقل کرتے ہیں[1]

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی القبلۃ جلد ۱ صفحہ ۸۰۹ مطبوعہ سنہ ۱۳۱۳ھ ق اور اسی کتاب میں پہلی آیت کی تفسیر جلد ۶ صفحہ ۲۰۔ صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۲۰۶ مطبوعہ مصر۔ سنن نسائی جلد ۲ صفحہ ۳۲۳ باب الاشربۃ

خلیفہ عمر کی پروردگار کے ساتھ موافقت

مکتب خلافت کی معتبر کتابوں میں روایت کی گئی ہے کہ خلیفہ عمر نے کہا: میں نے اپنے پروردگار کے ساتھ تین مسئلوں میں موافقت کی ہے:

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جب میں نے رسول خداؐ سے کہا: "یا رسول اللہؐ! اگر ہم مقام ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ (مصلّٰی) قرار دیدیں تو اس میں کیا حرج ہے؟" تو میری اس تجویز کے بعد یہ آیۂ کریمہ "وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۵) نازل ہوئی۔

دوسرے مسئلے کا تعلق پردے سے تھا۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! آپ اپنی بیویوں کو حکم دیجیے کہ وہ پردہ کیا کریں کیونکہ اس وقت ہر شخص خواہ وہ اچھا ہو یا برا ان کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ میری اس تجویز کے بعد آیۂ حجاب: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ الخ (سورۂ احزاب۔ آیت ۵۹) نازل ہوئی۔

تیسرا مسئلہ بھی ازواج رسولؐ کے بارے میں تھا۔ رسول خداؐ کی بیویوں نے رشک اور حسد کی وجہ سے آپ کے خلاف آپس میں اتفاق کرلیا۔ میں نے ان سے کہا: اگر رسول اکرمؐ تمہیں طلاق دیدیں تو امید ہے کہ خدا انہیں تم سے بہتر بیویاں عطا فرمائے گا۔ اس کے بعد اسی مضمون کی آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ: عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمَاتٍ" (سورۂ تحریم۔ آیت ۵)

طیالسی اپنی مسند میں خلیفہ عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: "میں نے اپنے پروردگار کے ساتھ چار چیزوں میں موافقت کی ہے"۔ پھر گزشتہ حدیث میں مذکورہ تین موافقتیں بیان کرنے کے بعد اس مسئلہ کا اضافہ کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:
"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ....." (سورۂ مومنون۔ آیت ۱۲-۱۴)
تو میں نے کہا: "تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ"۔ اس کے بعد وحی نازل ہوئی اور گزشتہ آیات میں اس عبارت کا اضافہ کیا گیا:

"فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" [1]

صحیح بخاری کے شارحین ابن حجر (۸۵۲ھ ہجری) نے فتح الباری میں اور عینی (۸۵۵ھ) نے عمدۃ القاری میں مذکورہ بالا حدیث کی شرح اور تفسیر یوں کی ہے:

وَافَقْتُ رَبِّيْ مِنَ الْمُوَافَقَةِ مِنْ بَابِ الْمُفَاعَلَةِ الَّتِيْ تَدُلُّ عَلٰى مُشَارَكَةِ اثْنَيْنِ فِيْ فِعْلٍ يُنْسَبُ اِلٰى اَحَدِهِمَا مُتَعَلِّقًا بِالْاٰخَرِ، وَالْمَعْنٰى فِي الْاَصْلِ: وَافَقَنِيْ رَبِّيْ، فَاَنْزَلَ الْقُرْاٰنَ عَلٰى وِفْقِ مَا رَاَيْتُ، وَلٰكِنَّهٗ رَاعَى الْاَدَبَ فَاَسْنَدَ الْمُوَافَقَةَ اِلٰى نَفْسِهٖ لَا اِلَى الرَّبِّ جَلَّ وَعَزَّ۔ [2]

کلمہ "وَافَقْتُ" مصدر "مُوَافَقَت" سے لیا گیا ہے اور یہ مصدر باب مُفَاعَلَہ میں "دو اشخاص کی ایک کام میں شراکت اور ہمکاری" کے معنوں میں ہے۔ بلاشبہ عمل ان دو میں سے ایک سے منسوب کیا جاتا ہے جبکہ وہ دوسرے سے بھی وابستہ ہوتا ہے اور وہ دوسرا درحقیقت مفعول فعل ہے۔ جو جملہ خلیفہ سے نقل کیا گیا ہے اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ میرے پروردگار نے خیال اور رائے میں میرے ساتھ موافقت کی ہے اور اپنے قرآن کو میری رائے کے مطابق نازل کیا ہے۔ شارح کہتا ہے: خلیفہ نے پاس ادب سے موافقت کو خدا کی جانب نہیں بلکہ خود اپنی جانب نسبت دی ہے۔ یعنی انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے پروردگار کے ساتھ موافقت کی ہے اور یہ نہیں کہا کہ پروردگار نے میرے ساتھ موافقت کی ہے۔

موافقتوں کی تعداد میں اضافہ!

خلیفہ عمر کی زبانی موافقتوں کی جو تعداد نقل کی گئی ہے وہ چار سے زیادہ نہیں ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ موافقتیں زیادہ ہوتی گئی ہیں۔ مثلاً چھٹی صدی کے فقیہ ابوبکر بن عربی (۵۴۳ھ ہجری) نے موافقتوں کی تعداد گیارہ کردی ہے [3] اور ان

---

[1] مسند طیالسی صفحہ ۹ حدیث ۴۲، مطبوعہ ہندوستان [2] فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۵۱ اور عمدۃ القاری جلد ۴ صفحہ ۱۴۴ [3] عمدۃ القاری جلد ۴ صفحہ ۱۴۴

کے بعد بھی موافقتوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ صحیح بخاری کے ممتاز شارح ابن حجر اپنی کتاب فتح الباری میں کہتے ہیں " موافقتوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد جو ہمیں واضح طور پر چھان بین کے بعد معلوم ہوئی ہے پندرہ ہے۔" [۱]

موافقتوں کی تعداد اسی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ جیسا کہ دسویں صدی کے مشہور عالم سیوطی (۹۱۱ھ ہجری) نے اپنی کتاب "تاریخ الخلفاء" میں نقل کیا ہے یہ تعداد بیس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ [۲]

یہ محدّثین اور علماء خلیفہ عمر کی موافقتوں کے بارے میں ان کے بیٹے عبداللہ ابن عمر سے استشہاد کرتے ہیں جنہوں نے کہا ہے کہ: " کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جس کے متعلق لوگوں نے کچھ نہ کچھ کہا ہو اور عمر نے بھی اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی ہو مگر یہ کہ اس سلسلے میں قرآنی آیات عمر کے کہنے کے مطابق نازل ہوئی ہوں۔" [۳]

قرآن کا خلیفہ عمر کے الفاظ کی متابعت کرنا

مذکورہ بالا موافقتوں میں ہمیں ایسے نمونے ملتے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قرآن نے حضرت عمر کے الفاظ اور عبارت کی متابعت کی ہے جیسا کہ خلیفہ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا:

۱۔ جب میں نے کہا: یا رسول اللہؐ! لَوِ اتَّخَذْنَا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى. [۴]
تو یہ آیت نازل ہوئی وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى. [۵]

---

[۱] فتح الباری۔ جلد ۲ صفحہ ۵۱

[۲] جلال الدین سیوطی۔ تاریخ خلفاء مطبوعہ قاہرہ ۱۳۷۱ھ ہجری۔ باب موافقات عمر صفحہ ۱۲۲۔

[۳] ابن عساکر۔ تاریخ مدینہ دمشق جلد ۱۳ صفحہ ۱، ۸ اور ۱۰ عکسی نسخہ، جو مجمع علمی اسلامی کی لائبریری میں موجود ہے۔

[۴] کیا ہی اچھا ہو اگر ہم (خانۂ کعبہ کو تعمیر کرتے وقت) مقام ابراہیمؑ کو نماز کا مقام قرار دیں۔

[۵] مقام ابراہیمؑ کو نماز کا مقام قرار دو۔

ب۔ ایک اور موقع پر انھوں نے کہا ہے: رسول اکرمؐ کی بیویاں (ایک دوسری سے حسد کی بنا پر) آنحضرتؐ سے سرکشی پر اتر آئیں تو میں نے ان سے کہا: "عَسٰی رَبُّهٗ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ"[1] میرے یہ کہنے کے بعد قرآن کی آیت بعینہٖ انھی الفاظ میں نازل ہوئی: "عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ الخ"

ج۔ مزید برآں انھوں نے کہا ہے: قرآن مجید میں انسان کی تخلیق کے عمل کے بارے میں بیان سننے کے بعد میں نے کہا: "تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" اس کے بعد بعینہٖ اسی عبارت میں آیت نازل ہوئی: "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ"

د۔ ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ کسی یہودی نے خلیفہ عمر سے ملاقات کی اور کہا: یہ جبرئیل جس کا تمہارے دوست (رسول اکرمؐ) ذکر کرتے ہیں ہمارا دشمن ہے۔ خلیفہ نے اس سے کہا: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكَالَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ[2]

اور اس کے بعد قرآن مجید کی آیت بھی انھیں الفاظ میں نازل ہوئی: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكَالَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِيْنَ۔

یہ تھا ایک نمونہ قرآن کی ان آیات کا جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ خلیفہ عمر کے الفاظ کی متابعت میں نازل ہوئی ہیں۔

قرآن کی خلیفہ کی رائے سے موافقت

ان موافقتوں میں بعض ایسے مواقع بھی دیکھنے میں آتے ہیں جب خدا اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ وہ خلیفہ عمر کے خیال اور رائے کی متابعت کریں۔

مثلاً خلیفہ سے یوں روایت کی گئی ہے: میں نے کہا: یا رسول اللہؐ! برے اور

---

[1] امید ہے کہ اگر رسول اللہؐ تمہیں طلاق دیدیں تو اللہ انھیں تم سے بہتر بیویاں عنایت کریگا۔

[2] اگر کوئی شخص خدا، اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو بے شک خدا بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔

اچھے دونوں قسم کے لوگوں سے آپ کی بیویوں کا آمنا سامنا ہوتا ہے، لہٰذا آپ ان کو حکم دیجیے کہ وہ پردہ کیا کریں۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِکَ وَبَنَاتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۵۹)

اسی طرح جب عبداللہ بن اُبّی (رئیس المنافقین) کی موت واقع ہوگئی تو رسول اکرمؐ سے درخواست کی گئی تو اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ خلیفہ عمر کا کہنا ہے کہ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور آنحضرتؐ کے سامنے کھڑے ہوکر کہا: کیا آپ خدا کے دشمن کی نماز پڑھانے لگے ہیں۔ کیا یہ وہی شخص نہیں جس نے فلاں دن (آپ کے اور اسلام کے خلاف) یہ یہ باتیں کی تھیں؟ خدا کی قسم زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْھُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ اِنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَاتُوْا وَھُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (سورۂ توبہ۔ آیت ۸۴)

خلیفہ عمر کی رائے کی موافقت میں قرآن مجید کی آیات کے نزول کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے یہ چند نمونے تھے۔

مذکورہ بالا احادیث سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

ا۔ خلیفہ عمر کا مقام و مرتبہ اتنا بلند ہے کہ خدا کبھی ان کے الفاظ اور کبھی انکا خیال قبول کرلیتا ہے اور اپنی آیات کو ان کے الفاظ اور عبارات کے مطابق نازل فرماتا ہے۔

ب۔ رسول اکرمؐ کا مقام و مرتبہ اور آپ کی اخلاقی و ادراکی قوتیں اس قدر گر جاتی ہیں کہ خلیفہ عمر کے اخلاق و ادراک کی سطح سے نیچے قرار پاتی ہے۔

خلیفہ عمر کے فضائل

جو نتیجہ مذکورہ احادیث سے اخذ کیا گیا ہے اس کا مشاہدہ فضائل کے بارے میں احادیث میں بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں:

ابوذرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا:

"خدا نے سچّائی کو عمر کی زبان پر قرار دیا ہے اور وہ سچی بات کہتے ہیں۔"
کچھ نسخوں میں حدیث کی عبارت یوں ہے:
"خدا نے عمر کے دل و زبان کو سچّائی سے بھر دیا ہے۔"
یہ حدیث ابو سعید خُدری سے تین سندوں کے ساتھ ابو ہریرہ سے دو سندوں کے ساتھ عبداللہ ابن عمر سے تیرہ سندوں کے ساتھ اور ابو بکر سے بھی تیرہ سندوں کے ساتھ نقل کی گئی ہے [۱]
اور مندرجہ ذیل حدیث امیر المومنین علی ع سے انیس سندوں کے ساتھ نقل کی گئی ہے:
"سکون، ایمان اور اطمینان عمر کی زبان پر بولتے ہیں۔"
نیز بعض روایات میں "عمر کی زبان اور قلب پر" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ:
"ہم اصحاب محمدؐ تعداد کے لحاظ سے اپنی تمام تر کثرت کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ اطمینان عمر کی زبان پر بولتا ہے۔
یہ عبارت طارق بن شہاب اور ابو سعید خُدری سے دو سندوں کے ساتھ اور عبداللہ ابن عمر سے تیرہ سندوں کے ساتھ روایت کی گئی ہے۔
علاوہ ازیں ایک حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ترمذی، مسند احمد بن حنبل اور مسند طیالسی میں نقل کی گئی ہے۔ ہم یہاں اس حدیث کو صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔ اس حدیث کے مطابق رسول اکرمؐ فرماتے ہیں: لَقَدْ کَانَ فِی مَا مَضٰی قَبْلَکُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ وَاِنْ کَانَ فِی اُمَّتِی ھٰذِہٖ مِنْھُمْ فَاِنَّہٗ عُمَرُ۔ " [۲]
یعنی تم سے پہلے کی امّتوں میں ایسے اشخاص ہوا کرتے تھے جن سے فرشتے گفتگو کرتے تھے۔ اگر میری امّت میں کوئی شخص اس خصوصیت کا حامل ہے تو وہ عمر ہے۔
اور انھیں احادیث میں سے ایک عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے جنہوں نے کہا:

---

[۱] ابن عساکر: تاریخ مدینہ دمشق جلد ۱۲ صفحہ ۷ تا ۹۔ [۲] فٹ نوٹ صفحہ ۳۷۰ پر دیکھیے

"لوگوں نے کسی چیز کے بارے میں بات نہیں کی جس کے متعلق عمر نے بھی کچھ کہا ہو مگر یہ کہ قرآنی آیات اسی شکل میں نازل ہوئیں جیسے کہ عمر نے کہا۔" [۱]

مکتب خلافت کے ایک اور مشہور مفسر قرآن مجاہد سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا: جب کبھی عمر اپنا نظریہ اور رائے پیش کرتے تھے، قرآن اس کے مطابق نازل ہوتا تھا۔[۲] نیز امیر المومنین علیؑ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "قرآن مجید میں عمر کا خیال اور رائے موجود ہے۔" [۳]

اسی طرح بلالؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ: رسول خداؐ نے فرمایا: "اگر میں تمہارے درمیان رسولؐ بنا کر نہ بھیجا گیا ہوتا تو عمر اس کام پر مبعوث ہوتے۔" [۴]

اور عقبہ بن عامر سے نو سندوں کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اکرمؐ سے سنا: "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتا۔" [۵]

اور تقریباً یہی مضمون عبداللہ بن عمر سے بھی نقل کیا گیا ہے۔[۶]

صحیح بخاری، کتاب الانبیاء حدیث ۵۴ جلد ۴ صفحہ ۱۷۴ مطبوعہ بولاق مصر اور کتاب فضائل اصحاب النبیؐ جلد ۵، صفحہ ۱۲۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ جلد ۷ صفحہ ۱۱۵ مطبوعہ قاہرہ۔ صحیح ترمذی، کتاب المناقب جلد ۵ صفحہ ۶۲۲ حدیث ۳۶۶۳، مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۳۹ اور جلد ۶ صفحہ ۵۵، مسند طیالسی حدیث ۳۳۴۸۔

[۱] ابن عساکر: تاریخ مدینۂ دمشق جلد ۱۳ صفحہ ۸ اور ۱۰۔

[۲] ـــــ ایضاً ـــــ

[۳] جلال الدین سیوطی: تاریخ خلفاء صفحہ ۱۲۲ باب موافقاتِ عمر

[۴] ابن عساکر: تاریخ مدینۂ دمشق جلد ۱۳ صفحہ ۱۱

[۵] ـــــ ایضاً ـــــ صفحہ ۱۰-۱۱

[۶] ـــــ ایضاً ـــــ صفحہ ۱۱

وہ احادیث جو رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کو گھٹاتی ہیں

کتب احادیث میں ایسی بہت سی احادیث ملتی ہیں جو جہاں دوسروں کا مقام بڑھاتی ہیں وہاں رسول اکرمؐ کی شخصیت کو گھٹاتی ہیں۔ مثلاً رسول اکرمؐ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: "عمر سے بہتر کسی شخص پر سورج طلوع نہیں ہوا۔[۱]

جیساکہ ہم اس حدیث میں دیکھتے ہیں خلیفہ عمر تمام انبیاء پر جن میں خاتم النبیینؐ بھی شامل ہیں برتری حاصل کر لیتے ہیں۔

کہا گیا کہ رسول اکرمؐ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے

اسی مجموعے کی کچھ اور روایات ہیں جو خلیفہ اور مغیرہ سے نقل کی گئی ہیں: رسول اکرمؐ فلاں قبیلے کے کوڑے پر گئے اور وہاں کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ اس حالت میں انہوں نے اپنے پاؤں ایک دوسرے سے دور رکھے۔[۲]

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ: رسول اکرمؐ ایک کوڑے دان پر گئے جو ایک دیوار کے پیچھے واقع تھا اور وہاں کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔ پھر آپ نے پانی مانگا اور وضو کیا۔[۳]

ایک اور روایت میں راوی کہتا ہے: "میں چل دیا تاکہ وہاں سے دُور ہو جاؤں

---

[۱] ابن عساکر: "تاریخ مدینۃ دمشق صفحہ ۲۹۲ اور صحیح ترمذی' باب مناقب عمر

[۲] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۴۶

[۳] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۳۷۔ باب البول عند صاحبہ جلد ۲ صفحہ ۴۸ باب البول عند سباطۃ قوم، سنن ابن ماجہ باب ما جاء فی البول قائما (الحدیث: ۳۰۵ اور ۳۰۶) سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۱۷۱۔ صحیح مسلم کتاب الطہارۃ (الحدیث: ۳۷۳)۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۹۴ اور ۴۰۲۔ سنن نسائی باب الرخصۃ فی البول قائما من کتاب الطہارۃ۔ سنن ابی داؤد کتاب الطہارۃ جلد ۱ صفحہ ۷ اور سنن ترمذی جلد ۱ صفحہ ۳۰

لیکن آنحضرتؐ نے مجھے اپنے نزدیک بلایا حتیٰ کہ میں ان کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔[۱]

اور چوتھی روایت میں آیا ہے کہ:

میں اور رسول اکرمؐ پیدل چل رہے تھے۔ آنحضرتؐ ایک دیوار کی جانب گئے جہاں مذبلہ تھا۔ جس طرح لوگ کھڑے ہوتے ہیں آپ بھی اسی طرح کھڑے ہو گئے اور پیشاب کیا۔ میں ان کے پاس سے دُور ہٹ گیا لیکن انھوں نے مجھے اشارہ کر کے نزدیک آنے کو کہا۔ میں آنحضرتؐ کے نزدیک گیا اور ان کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو گئے۔[۲]

رسولِ اکرمؐ بتوں کے لیے کی گئی قربانی کا گوشت کھاتے ہیں

اب ہم ایک ایسی حدیث پیش کرتے ہیں جو رسول اکرمؐ کی عظیم شخصیّت کو گرانے اور دوسروں کا مرتبہ بلند کرنے حتیٰ کہ انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر برتری دینے کے لیے گھڑی گئی ہے۔

بخاری نے عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے کہ:

رسول اکرمؐ نے "بلدح"[۳] زیریں کے علاقے میں زید بن نفیل سے ملاقات کی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی آنحضرتؐ پر وحی نازل نہیں ہوئی تھی اور آپ پیغمبری پر مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ رسول اکرمؐ نے دسترخوان بچھایا اور زید کو اپنے ساتھ گوشت کھانے کی دعوت دی۔ زید نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا:

۱-۲ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۳۷ باب البول عند صاحبہ، جلد ۲ صفحہ ۴۸ باب البول عند سباطۃ قوم۔ سنن ابن ماجہ، باب ماجاء فی البول قائما (الحدیث ۳۰۵ اور ۳۰۶) سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۱۷۱۔ صحیح مسلم کتاب الطہارۃ (الحدیث: ۷۳)۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۹۴ اور ۴۰۲۔ سنن نسائی باب الرخصۃ فی البول قائما من کتاب الطہارۃ، سنن ابی داؤد کتاب الطہارۃ جلد ۱ صفحہ ۷ اور سنن ترمذی جلد ۱ صفحہ ۳۰۔

۳ بلدح مکہ سے باہر مغرب کی جانب ایک سرزمین ہے۔ معجم البلدان مادہ "بلدح"۔

''جو کچھ آپ بتوں کی خاطر جمع کریں ہیں وہ نہیں کھاتا اور کوئی چیز نہیں کھاؤں گا بجز اس کے جو خدا کے نام پر ذبح کی گئی ہو۔'' [1]

احمد بن حنبل سعید بن زید بن عمرو بن نفیل سے نقل کیا ہے کہ: ایک دن مکہ میں زید بن عمرو بن نفیل، رسول اکرمؐ اور زید بن حارث کے پاس سے گزرا۔ وہ دونوں کھانا کھا رہے تھے اور انھوں نے زید کو بھی کھانے کی دعوت دی۔ زید نے کہا: ''اے بھتیجے! میں وہ چیز نہیں کھاتا جو بتوں کے لیے ذبح کی گئی ہو۔'' سعید کا کہنا ہے کہ اس کے بعد نہیں دیکھا گیا کہ آنحضرتؐ نے بتوں کے لیے دی گئی قربانی میں سے کچھ کھایا ہو۔ [2]

اس حدیث کا نتیجہ:

جب ہم اس حدیث پر غور کرتے ہیں تو اس سے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں: پہلا یہ کہ خلیفۂ ثانی کے چچا زاد بھائی زید کی انسانی اور دینی منزلت کو بلند کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ رسول اکرمؐ کی منزلت گھٹ گئی ہے اور زید کے مقابلے میں نیچے آگئی ہے۔

حدیث کی چھان بین:

عبد اللہ بن عمر بعد بعثت پیدا ہوئے اور انہوں نے قبل بعثت کا زمانہ دیکھا۔ اس صورت میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے بعثت سے پہلے کی جو حدیث نقل کی ہے وہ صحیح ہو؟ [3]

سعید کا باپ زید بن عمرو بن نفیل خلیفہ کا چچا زاد بھائی تھا اور بعثت سے پہلے فوت ہو چکا تھا۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ زید صحیح دین کی جستجو کی غرض سے شام کا سفر کرنے کے بعد دوبارہ اپنے وطن واپس نہیں پہنچا اور اسی جگہ یا راستے میں مارا گیا یا اسے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الذبائح: باب ماذبح علی النصب والاصنام جلد ۳ صفحہ ۲۰۶، ۲۰۷ - کتاب مناقب الانصار، باب ۲۴ جلد ۲ صفحہ ۲۱۰ اور مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۶۹، ۸۹ اور ۱۲۷۔

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ا صفحہ ۱۸۹ الحدیث: ۱۶۴۸ اور مجمع الزوائد جلد ۹ صفحہ ۴۱۷۔

[3] تقریب التہذیب جلد ا صفحہ ۴۳۵۔

زہر دے دیا گیا۔[1]

لہٰذا جن ملاقاتوں کا ان روایات میں ذکر کیا گیا ہے اصولاً وہ وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔

"نصب" کا لفظ جو اس حدیث کے متن میں استعمال ہوا ہے اس کی جمع "انصاب" ہے۔ "نصب" وہ پتھر تھے جو خانۂ کعبہ کے اردگرد رکھے ہوئے تھے اور ان پر بتوں کی خاطر قربانیاں دی جاتی تھیں۔[2]

رسولِ اکرمؐ کے آباد اجداد کی شخصیّت کو گھٹانا

ان احادیث کے ایک اور حصّے میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ کے آباد اجداد کی قدر و منزلت بھی گھٹائی جائے۔ مثلاً مسلم نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے کہ:

ایک شخص نے رسول اکرمؐ سے سوال کیا: یا رسول اللہ! میرا باپ (جو مر چکا ہے) اس وقت کہاں ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: جہنّم میں۔ جب وہ شخص جانے لگا تو آپ نے اسے بلا کر فرمایا: "میرا باپ اور تیرا باپ دونوں جہنم میں ہیں"۔[3]

رسول اکرمؐ کی شخصیّت کو گھٹانے کے لیے جو احادیث گھڑی گئی ہیں ان میں سے بعض میں کسی حد تک میانہ روی اختیار کی گئی ہے، یعنی آنحضرتؐ اور دوسروں کے درمیان مساوات عمل میں لائی گئی ہے۔ یہ چیز ہم نے گزشتہ حدیث میں دیکھی ہے اور عرباض

---

[1] المحبر صفحہ ۱۷۵، سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۳۲ مطبوعہ ابراہیم الابیاری، مسعودی: مروج الذہب جلد ۱ صفحہ ۴۸ مطبوعہ اسعد داغر۔ بلوغ الادب جلد ۳ صفحہ ۲۵۲۔

[2] راغب: مفردات القرآن "مادہ "نصب"۔ المصباح المنیر۔ مختار الصحاح اور القاموس المحیط مادہ "نصب"

[3] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ مطبوعہ محمد علی صبیح و اولادہٗ۔ قاہرہ، سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۵۰۱ الحدیث ۱۵۷۳ (اس حدیث کا مضمون بھی تقریباً وہی ہے جو محولہ حدیث کا ہے)۔

بن سلیم کی مندرجہ ذیل حدیث میں بھی نظر آتی ہے۔

سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، سنن ترمذی، سنن دارمی اور مسند احمد بن حنبل میں عرباض بن سلیم سے روایت کی گئی ہے کہ اس نے کہا: ایک دن جب رسول اکرمؐ لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر وعظ فرما رہے تھے۔ انھوں نے ہمارے لیے ایسا بلیغ وعظ ارشاد فرمایا جسے سن کر حاضرین کے دل خوف سے لرز گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کا آخری وعظ ہے۔ اگر یہ صورت ہے تو ہمیں وصیت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: تمہیں چاہیے کہ خدا کی طرف توجہ دو، تقویٰ اختیار کرو اور (فرمانرواؤں کی) اطاعت کرو، خواہ تمہارا فرمانروا ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ میرے بعد جلد ہی تم شدید اختلاف دیکھو گے۔ اس صورت میں تمہارا فرض ہے کہ میری اور خلفائے راشدین و مہدیین کی سنت کا اتباع کرو اور جہاں تک ممکن ہو سکے ان سنتوں کی حفاظت کرو۔ [1]

تبصرہ اور تحقیق:

اگر ہم چاہیں کہ جس طرح ہم نے پہلی وحی کے نزول اور غرانیق کے مسئلوں کے بارے میں تحقیق کی تھی، اسی طرح ان احادیث کے متعلق بھی چھان بین کریں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ نیز ایک ہی دفعہ تمام مطالب کا مطالعہ کرنا ممکن نہیں۔ پھر بھی ہم بعض اہم مطالب کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں:

خلیفہ کی موافقتوں کی تحقیق:

خدا عمر کی خدا کے ساتھ یا خدا کی خلیفہ عمر کے ساتھ موافقت کے بارے میں تمام روایات میں کہا گیا ہے کہ خلیفہ بعض اوقات کوئی تجویز رسول اکرمؐ کے سامنے پیش کرتے تھے یا آنحضرتؐ کو کوئی کام کرنے سے منع کرتے تھے تو اس بارے میں خدا کی جانب سے

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب لزوم السنۃ جلد ۴ صفحہ ۲۰۰۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۱۵-۱۶، الحدیث ۴۲۔ سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۴۴، باب اتباع السنۃ۔ سنن ترمذی جلد ۵ صفحہ ۴۴۔ الحدیث ۲۶۷۶۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۲۶۔

بالخصوص وحی نازل ہوتی تھی اور رسول اکرم ؐ کو حکم دیا جاتا تھا کہ خلیفہ کے کہنے کے مطابق عملدرآمد کریں۔ یہاں ہم پہلے خود ان آیات کی جانب رجوع کرتے ہیں تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ آیا وہ اس دعوے کی تائید کرتی ہیں یا نہیں۔

۱۔ مقام ابراہیمؑ کے بارے میں موافقت

صحیح بخاری کی روایات میں خلیفہ کی خدا سے یا خدا کی خلیفہ سے موافقتوں کے بارے میں جس پہلے واقعہ کا ذکر آیا ہے وہ یوں نقل کیا گیا ہے:

خلیفہ نے رسول اکرم ؐ سے کہا: "لَوِ اتَّخَذْنَا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى"۔ خلیفہ کے یہ بات کہنے کے بعد رسول اکرم ؐ کو قرآن مجید کی آیات میں انہیں الفاظ کے ساتھ مخاطب کیا گیا جو خلیفہ نے ادا کیے تھے یعنی: "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى۔"

اس موافقت کی تحقیق:

یہ جملہ سورۂ بقرہ کی ایک آیت کا حصہ ہے جو ۱۲۴ سے ۱۳۲ تک کی آیات کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ کا تذکرہ ہے اور ان کے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر خانۂ کعبہ تعمیر کرنے اور ان پر خدا کی عنایات کی داستان بیان کی گئی ہے۔ بالخصوص ۱۲۴ ویں اور ۱۲۵ ویں آیت میں یوں ارشاد ہوا ہے:

> جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور انہوں نے انھیں پورا کر دیا (اور ان سے بخوبی عہدہ برآ ہو گئے) تو انکے پروردگار نے ان سے کہا: میں تمھیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیمؑ نے عرض کیا: اور میری اولاد میں سے؟ پروردگار نے فرمایا: میرا یہ عہد جو کہ امامت ہے اس پر کوئی ظالم فائز نہیں ہو سکتا۔ (آیت ۱۲۴)
>
> اور جب ہم نے کعبہ کو لوگوں کے (امان کی جانب) لوٹنے کی جگہ قرار دیا اور (کہا کہ) مقام ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ قرار دو اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ سے عہد و پیمان لیا اور فرمایا کہ میرے اس گھر کو طواف و اعتکاف اور رکوع و سجدہ کرنیوالوں کے لیے پاک و پاکیزہ کر دو۔ (آیت ۱۲۵)

اس آیت میں جملہ "اور مقام ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ قرار دو" اکیلا نہیں آیا تاکہ اس مقام پر خدا کی خلیفہ کے ساتھ موافقت کے متعلق روایت صحیح ثابت ہو جائے بلکہ یہ جملہ ۱۲۵ ویں آیت کا ایک حصہ ہے۔ جب کہ خود آیت ۱۲۴ تا ۱۳۲ کا جزو ہے جن سب میں تین باتوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

۱۔ ان آیات میں حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کا اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہؑ کے ساتھ مل کر خانۂ کعبہ تعمیر کرنے کا ذکر ہے اور بالخصوص ۱۲۴ ویں اور ۱۲۵ ویں آیت کے شروع میں ہی خدا حضرت ابراہیم پر اپنی عنایات کا ذکر فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ چونکہ ابراہیمؑ نے اس کی بتائی ہوئی تمام باتیں پوری کر دیں اس لیے اللہ نے انہیں لوگوں کا امام قرار دیا۔

۲۔ اس کے بعد خدا فرماتا ہے کہ اس نے اپنے گھر کو لوگوں کے لیے دارالامان اور پناہ گاہ قرار دیا ہے۔

۳۔ پھر حکم دیتا ہے کہ اس گھر میں مقام ابراہیمؑ کو مصلیٰ یعنی نماز کی جگہ قرار دو۔

اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جملہ "مقام ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ قرار دو" اکیلا نہیں آیا تاکہ یہ کہا جا سکے کہ یہ جملہ خلیفہ عمر کی رائے کی موافقت میں نازل ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں مقام ابراہیمؑ کا ذکر فقط اس موقع پر ہی نہیں کیا گیا بلکہ سورۂ آل عمران کی آیات ۹۵ تا ۹۷ میں بھی اس کے متعلق یوں فرمایا گیا ہے:

"یقیناً پہلا گھر (قبلہ) جو لوگوں کے لیے قرار دیا گیا ہے یہی کعبہ ہے جو مکہ میں ہے جو مبارک ہے اور سارے جہان کے لوگوں کا رہنما ہے۔ اس گھر میں خدا کی روشن نشانیاں ہیں اور منجملہ ان کے مقامِ ابراہیمؑ ہے۔"

اس مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی امامت، بیت اللہ اور مقامِ ابراہیمؑ کی حرمت کا ذکر اس تسلسل کے ساتھ قرآن میں دو جگہ ایک ہی طرح آیا ہے اور مقامِ ابراہیمؑ کا نام ایک مرتبہ اور ایک جملے میں نہیں لیا گیا تاکہ

اس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ خدا نے یہاں خلیفہ کے کلام کی پیروی کی ہے۔

ب۔ ازواجِ رسولؐ کے بارے میں موافقت

پھر اسی روایت میں خلیفہ سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے کہا:
رسول اکرمؐ کی بیویوں نے رشک اور حسد کی وجہ سے آنحضرتؐ کے خلاف ایکا کر لیا۔ میں نے ان سے کہا: "اگر رسول اکرمؐ تمہیں طلاق دیدیں تو امید ہے کہ خدا انھیں تم سے بہتر بیویاں عنایت کرے گا۔" پھر اسی کے مطابق آیت نازل ہوئی۔

اس موافقت کی تحقیق:

یہ جملہ بھی اکیلا نازل نہیں ہوا تاکہ کہا جا سکے کہ خلیفہ نے یوں کہا اور آیت ان کی موافقت میں نازل ہوئی۔ بلکہ یہ جملہ سورۂ تحریم کی پانچویں آیت کا ایک حصہ ہے اور سورۂ تحریم کی تمام آیات ام المومنین بی بی عائشہ اور ام المومنین بی بی حفصہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور بالخصوص چھٹی آیت تک بالکل واضح ہے کہ سب آیات ایک مطلب کے متعلق نازل ہوئی ہیں جیسا کہ ان کے مندرجہ ذیل ترجمے سے ظاہر ہے:

(اے رسولؐ!) جو چیز خدا نے تمہارے لیے حلال کی ہے تم نے اسے اپنے اوپر کیوں حرام کیا تاکہ تم اپنی بیویوں کو خوش کر سکو اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

خدا نے تم لوگوں کے لیے قسموں کو توڑنے کا کفّارہ مقرر کر دیا ہے۔ وہ تم بندوں کا آقا ہے (اور اس کا حکم نافذ ہے) اور وہ ہر چیز کا جاننے والا اور حکمت والا اور مخلوق کے تمام امور سے آگاہ ہے۔ اور جب پیغمبرؐ نے اپنی بیویوں میں سے بعض (حفصہ) سے رازدارانہ کوئی بات کہی اور پھر اس نے پیغمبرؐ کا بھید دوسری بیوی (بی بی عائشہ) کو بتا دیا۔ خدا نے اس امر کو اپنے رسولؐ پر ظاہر کر دیا۔ انھوں نے اس بیوی کو کچھ بات جتا دی اور کچھ پر ازراہِ کرم پردہ رکھا اور ظاہر نہ کی۔ اس بیوی نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟ (کہ میں نے آپ کا راز کسی کو بتا دیا ہے)۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا: مجھے اس کے متعلق اس خدا نے خبر دی ہے جو دانا و بینا ہے۔

اب اگر تم دونوں خدا کی بارگاہ میں توبہ کرو (تو خیر کیونکہ بلاشبہ) تمہارے دل ٹیڑھے ہیں اور اگر تم انھیں (رسول اکرمؐ کو) تکلیف پہنچانے کے لیے ایکا کرلو تب بھی تم ہرگز ان پر غلبہ نہ پاسکو گی، کیونکہ خدا ان کا مددگار اور نگہبان ہے اور جبرئیل امین اور مومنین میں سے صالح بندے (سنی اور شیعہ روایات کے مطابق علیؑ) اور خدا کے فرشتے ان کے حمایتی اور معاون ہیں۔

امید ہے کہ اگر رسولؐ تمہیں طلاق دیدیں تو عنقریب ان کا پروردگار تمہارے بدلے میں انھیں تم سے بہتر بیویاں عطا کرے گا جو فرمانبردار، ایماندار، خدا و رسولؐ کی مطیع، توبہ کرنے والی، عبادت گزار اور روزہ رکھنے والی ہوں گی خواہ وہ کنواری ہوں یا بیوہ ہوں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جملہ ("امید ہے کہ" سے لیکر "عطا کرے گا" تک) اس داستان کا ایک حصّہ ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اکیلا جملہ خلیفہ کے قول کی موافقت میں نازل ہوا ہے۔

ج۔ جملہ تبارک اللہ[1]... کے بارے میں موافقت

طیالسی نے اپنی مسند میں خلیفہ سے روایت کی ہے کہ جونہی آیت لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ...... الخ ختم ہوئی کہ جس میں انسان کی خلقت کی تعریف کی گئی تھی میں نے کہا: تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

اس موافقت کی چھان بین:

جملہ "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" بھی سورۂ مومنون کی ۱۴ویں آیت کا ایک حصہ ہے اور خود یہ آیت اپنے سے پہلی اور بعد کی آیات کے ساتھ مل کر مطلب یوں بیان کرتی ہے:

---

[1] وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ .... الی .... فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ۔ (سورہ مومنون آیات ۱۴ تا ۲۳)

بالتحقیق ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے انسان کی نسل کو ایک محفوظ جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم نے نطفہ کو جما ہوا سرخ خون بنایا۔ پھر ہم نے منجمد سرخ خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا۔ پھر ہم نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا اور پھر ہم ہی نے اسے ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔ بابرکت ہے اللہ جو سب پیدا کرنے والوں سے بہتر ہے۔ پھر اس کے بعد تمھیں مرنا ہے اور پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں انسان کی خلقت کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ کن مراحل سے گزر کر بالآخر درجۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ یہ بات یہاں بالکل واضح ہے کہ گزشتہ آیات کی مانند یہ آیات بھی ایک مطلب اور ایک موضوع کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور تمام دوسری آیات کی طرح ایک مرتبہ رسول اکرمؐ پر نازل ہوئیں جبکہ موافقت کے بارے میں روایت کیا گیا ہے کہ خدا نے پہلے یہ آیات "تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ" کے جملے کے بغیر رسول اکرمؐ پر نازل ہوئیں اور آنحضرتؐ نے بھی یہ آیات اس جملے کے بغیر مسلمانوں کے سامنے پڑھیں۔ حضرت عمر یہ آیات سن کر جملہ (تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ) اپنی زبان پر لائے۔ حضرت عمر کے یہ کہنے پر خدا نے بھی اس جملے کو پسند فرمایا اور اسے قرآن میں شامل کر لیا یا امینِ وحی (جبرئیل) کے ذریعے اپنے پیغمبر پر نازل فرمایا اور آنحضرتؐ نے اسے اس جگہ قرآن مجید میں درج فرمایا!

سچ تو یہ ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس بارے میں کیا کہیں!

ہم قرآن مجید کی روشنی میں خدا کے ساتھ خلیفہ کی موافقتوں کے اتنے مطالعہ پر اکتفا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خلیفہ کی دوسری موافقتیں بھی انہیں جیسی ہیں۔ تمام موافقتوں کے بارے میں احادیث یہ کہتی ہیں کہ پہلے خلیفہ نے کوئی جملہ اپنی زبان سے ادا کیا اور پھر خدا نے وہ جملہ پسند فرمایا اور اسے قرآن میں شامل کر دیا لیکن مطالعہ کرتے وقت ہم دیکھتے ہیں کہ زیر بحث جملوں میں سے کوئی جملہ ایسا نہیں جو اکیلا

نازل ہوا ہو تاکہ اس کے متعلق حضرت عمر کی موافقتوں کے بارے میں روایات صحیح سمجھی جائیں بلکہ وہ سب کے سب جملے اس مطلب کا جزو ہیں جو چند آیات کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے موافقتوں کا مطالعہ

یہاں ہم نمونے کے طور پر حضرت خلیفہ کی خدا کے ساتھ یا خدا کی حضرت خلیفہ کے ساتھ موافقتوں کے چند واقعات کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱- ازواج رسولؐ کے پردے کے بارے میں

اس موافقت کی روایت صحیح بخاری میں آئی ہے اور جس آیت کے ساتھ یہ موافقت بتائی گئی ہے اس کی عبارت یوں ہے:

(اے رسولؐ!) اپنی بیویوں، لڑکیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی چادروں کا گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ یہ ان کی پہچان کے لیے بہت مناسب ہے اور پھر انھیں کوئی چھیڑے گا نہیں اور خدا تو بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

(سورۂ احزاب- آیت ۵۹)

منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور جو مدینہ میں افواہیں پھیلاتے اور فتنہ کھڑا کرتے ہیں، اگر اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں گے تو ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے اور پھر وہ قلیل عرصے کے علاوہ مدینہ میں آپ کے ہمسائے نہیں رہیں گے۔ خدا کی رحمت سے دور ہو جائیں گے اور جہاں کہیں نظر آئیں گے پکڑے جائیں گے اور ذلت کے ساتھ مارے جائیں گے۔ جو قومیں پہلے گزر گئیں ان کے بارے میں بھی خدا کی سنت (قانون)، یہی رہی ہے اور تم خدا کی سنت (قانون) میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

اس موافقت کی تحقیق:

آیات کے اس دستے کی پہلی آیت میں رسول اکرمؐ کی بیویوں اور دوسری

مومنہ عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ پردہ کیا کریں تاکہ پہچانی جائیں (کہ وہ کنیزوں میں سے نہیں) اور کوئی (ہوس وان) ان سے تعرض نہ کرے۔ پھر بعد کی آیات میں مومنہ عورتوں کو پریشان کرنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر وہ شرارتوں سے باز نہیں آئیں گے تو قتل کر دیے جائیں گے یا شہر بدر کر دیے جائیں گے۔

لہٰذا آیۂ حجاب ایک داستان کی مناسبت سے نازل ہوئی ہے جسے جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ان روایات سے رجوع کیا جائے جو مطلب کو واضح کرتی ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے چند روایات نقل کرتے ہیں۔

روایات کے مطابق آیۂ حجاب کی شانِ نزول

اس بارے میں ابن عباس، انس بن مالک، محمد بن کعب قرظی اور دوسروں سے روایات نقل کی گئی ہیں جو سب کی سب یکساں ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم ان جملوں کو حذف کرتے ہوئے جن کی تکرار کی گئی ہے چند روایتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ:

جب رسول اکرمؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو چونکہ وہاں آپ کا کوئی گھر نہ تھا اس لیے آپ نے اہل مدینہ کے گھروں میں قیام فرمایا۔ چونکہ وہ گھر بھی چھوٹے اور تنگ تھے اس لیے آپ کی بیویاں اور دوسری مسلمان عورتیں رفع حاجت کے لیے رات کے وقت گھر سے باہر نکلتی تھیں اور قریبی مقامات پر چلی جاتی تھیں۔ جب رات کے وقت اندھیرا پھیل جاتا تو مدینہ کے کچھ بدچلن لوگ راستے پر آجاتے اور عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ تاہم اگر وہ کسی عورت کو چادر اوڑھے ہوئے دیکھتے تو کہتے کہ یہ آزاد عورت ہے اور اس سے کوئی سروکار نہ رکھتے لیکن اگر کسی عورت کو چادر کے بغیر دیکھتے تو کہتے کہ یہ کنیز ہے اور اس کا پیچھا کرتے۔

ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ:

ایک منافق مرد مومن عورتوں کو پریشان کرتا تھا اور جب اس سے باز پرس کی جاتی تو کہتا کہ میں سمجھا تھا کہ یہ کوئی لونڈی ہے۔ اسی بنا پر خدا نے عورتوں کو

حکم دیا کہ اپنا لباس کنیزوں جیسا نہ رکھیں اور سر پہ اوڑھنی اوڑھ لیا کریں اور ایک آنکھ کے سوا باقی چہرہ ڈھانپ لیا کریں تاکہ پہچانی جائیں کہ آزاد عورتیں ہیں۔

ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا:

خدا نے مومن عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر جائیں تو اپنا چہرہ اوڑھنی سے ڈھانپ لیا کریں اور ایک آنکھ کھلی رکھیں[1]

بی بی ام سلمہ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا:

جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس کے بعد انصار کی عورتیں اس حالت میں گھر سے باہر نکلتی تھیں کہ انھوں نے سیاہ اوڑھنیاں اوڑھی ہوئی ہوتی تھیں جن کی وجہ سے ان کے سر سیاہ کوؤں کی مانند دکھائی دیتے تھے۔

بی بی عائشہ کی روایت میں کہا گیا ہے کہ:

آپ اپنی چادر کو دوہرا کر لیتی تھیں اور اسے سر پہ ڈال لیتی تھیں اور رسول اللہؐ کی نماز جماعت میں اس حالت میں حاضر ہوتی تھیں کہ سیاہ اوڑھنی کی وجہ سے ان کا سر سیاہ کوے کی مانند لگتا تھا۔

ان آیات کے ساتھ ان روایات کا تناسب واضح ہے اور جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کے مطابق پردے کا حکم فقط رسول اکرمؐ کی بیویوں کے لیے ہی نہیں تھا تاکہ کہا جا سکے: کہ: خدا نے خلیفہ عمر کی موافقت میں رسول اکرمؐ کی بیویوں کو پردے کا حکم دیا۔ بلکہ آیۂ حجاب کے نزول کی وجہ فاسق مردوں کی مومن عورتوں سے چھیڑ چھاڑ تھی۔

ب۔ رسول اکرمؐ کی بیویوں کے رشک کرنیکے بارے میں

قرآن مجید کی روشنی میں اس موافقت کے مطالعہ سے دیکھنے میں آیا ہے کہ

---

[1] محمد بن سیرین کہتا ہے کہ میں نے عبیدہ سے آیہ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ کے معنی پوچھے (تو انھوں نے مجھے عملاً یوں جواب دیا کہ) ان کے پاس جو چادر تھی اسے سر پہ اوڑھ لیا اور اسکے ساتھ بھوؤں تک سارا سر ڈھانپ لیا اور اپنا چہرہ یوں ڈھانپا کہ بائیں آنکھ کو بائیں جانب سے کھلا چھوڑ دیا۔

رسول اکرمؐ کی دو بیویوں نے آنحضرتؐ کے خلاف ایکا کر لیا اور سورۂ تحریم کی آیات (جملہ "عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ" جن کا ایک جزو ہے) اس بارے میں نازل ہوئیں اور جب ہم روایات کی جانب رجوع کرتے ہیں[۱] تو ہمیں تیس سے زیادہ ایسی روایات ملتی ہیں جن میں تصریح کی گئی ہے کہ یہ دو خواتین ام المومنین بی بی عائشہ اور ام المومنین بی بی حفصہ تھیں۔ ہم یہاں فقط ایک روایت نقل کرتے ہیں:

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی اور دوسری کتابوں میں ابن عباس سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا:

میری بڑی آرزو تھی کہ خلیفہ سے پوچھوں کہ وہ دو خواتین کون کون سی ہیں جن کے بارے میں خدا نے فرمایا ہے کہ: "مگر تم دونوں خدا کی طرف لوٹو اور توبہ کرو کیونکہ یقیناً تمہارے دل ٹیڑھے ہیں۔" آخر خلیفہ حج کے لیے گئے اور میں بھی ان کے ساتھ حج کو گیا۔ مکہ کے راستے میں وہ رفع حاجت کے لیے راستے سے ہٹ گئے۔ میں نے طہارت کے لیے پانی کا برتن لیا اور ان کے پیچھے گیا۔ خلیفہ قضاء حاجت سے فارغ ہوئے اور واپس آئے تاکہ وضو کریں۔ میں ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالنے لگا اور اس دوران میں نے کہا: اے امیر المومنین! رسول اکرمؐ کی وہ دو بیویاں کونسی ہیں جن کے بارے میں خدا نے فرمایا ہے: "مگر تم خدا کی طرف لوٹو اور توبہ کرو کیونکہ یقیناً تمہارے دل ٹیڑھے ہیں۔" خلیفہ نے کہا: اے ابن عباس مجھے تم پر تعجب ہے! وہ عائشہ اور حفصہ تھیں[۲]

یہ اور دوسری دسیوں حدیثیں واضح طور پر متفق ہیں کہ یہ آیات بی بی عائشہ اور بی بی حفصہ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور اس میں مزید کسی قیل وقال کی گنجائش نہیں تاکہ کہا جاسکے کہ رسول اکرم کی تمام بیویوں نے آپ کیخلاف ایکا کر لیا تھا اور خلیفہ نے یوں کہا اور خدا نے ان کی موافقت میں ایکا کرنیوالیوں کے خلاف یہ جملہ نازل فرمایا۔

---

۱ سورہ تحریم کی شان نزول کا ایک موقع پر مطالعہ کرتے ہوئے مجھے ایسی ۳۷ روایات ملیں جن میں رسول اکرمؐ کی ان دو بیویوں کے ناموں کی تخصیص کی گئی ہے اور یہ تمام روایات اسی سورے کی تفسیر میں سیوطی کی درمنثور میں مل سکتی ہیں۔ ۲ سیوطی کی تفسیر درمنثور میں اس آیت کی تفسیر سے رجوع کریں

ج- شراب کی حرمت کے بارے میں

اس موافقت کی چھان بین کرنے کے لیے ہمیں دوسری موافقتوں کے مقابلے میں روایت سے رجوع کرنے کی زیادہ ضرورت ہے تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ ان آیات کی شانِ نزول کیا ہے۔ یہاں ہم چند روایات کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

روایت کی گئی ہے کہ خلیفہ عمر کہتے ہیں: جب شراب کے حرام اور ممنوع ہونے کا حکم نازل ہوا تو عمر نے کہا:

اے پروردگار! شراب کے بارے میں واضح بیان نازل فرما۔ ان کے یہ کہنے کے بعد سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی: يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ ..... الخ [1] (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۱۹)۔

خلیفہ عمر کو بلایا گیا اور یہ آیت انھیں پڑھ کر سنائی گئی لیکن انھوں نے اس آیت پر اکتفا نہ کیا اور کہا: "بارالٰہا! شراب کے بارے میں واضح بیان فرما۔" اس کے بعد سورۂ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى" [2]

اس کے بعد جب رسول اکرمؐ کا مؤذن لوگوں کو نماز کی طرف بلاتا تھا تو باآواز بلند کہتا تھا: یاد رکھو! جو لوگ نشے میں ہوں انھیں نماز کے قریب نہیں آنا چاہیے۔ اس مرتبہ پھر خلیفہ عمر کو بلایا گیا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی گئی لیکن اس دفعہ بھی انہوں نے کہا: اے خداوندا! شراب کے بارے میں روشن اور واضح بیان نازل فرما۔ لہٰذا

---

[1] (اے رسولؐ!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے (ان کے لین دین میں) فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدہ سے زیادہ ہے۔

[2] اے ایمان والو! تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ کیونکہ تم نہیں جانتے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (سورہ مائدہ ۔ آیت ۹۱)[1]

طبری نے اس داستان کی تفصیل اپنی تفسیر میں یوں بیان کی ہے:

ابوالقموص زید بن علی کہتے ہیں: شراب کے بارے میں خدا نے تین مرتبہ آیات نازل فرمائیں۔ پہلی آیت یوں تھی: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۔

بعض مسلمان اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی شراب پیتے رہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے دو آدمی جنھوں نے شراب پی رکھی تھی نماز پڑھنے لگے اور نماز کی حالت میں اول فول بکنے لگے ۔ اس پر خدا نے یہ آیت نازل فرمائی: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ (سورۂ نساء ۔ آیت ۴۳)

اس کے باوجود کچھ لوگ شراب پیتے رہے لیکن نماز کے وقت وہ اس سے پرہیز کرتے تھے۔ صورت حال اسی طرح رہی۔ یہاں تک کہ ابوالقموص کی نقل کے مطابق ایک آدمی نے شراب پی اور نشے اور بے خبری کی حالت میں جنگ بدر میں قتل ہونیوالے مشرکین کے لیے مرثیہ خوانی کی ....." اس مرثیہ خوانی کی خبر رسول اکرمؐ کو ملی۔ آنحضرتؐ کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ چنانچہ اس حالت میں کہ آپ کی عبا زمین پر گھسٹتی جا رہی تھی۔ آپ اس شخص کے پاس پہنچے۔ جب اس شخص نے دیکھا کہ آنحضرتؐ کے ہاتھ میں جو چیز ہے اس سے آپ اسے تنبیہ کے طور پر مارنا چاہتے ہیں تو کہنے لگا:

---

[1] شیطان تو بس یہی چاہتا تھا کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور دشمنی ڈال دے ۔ کیا تم اس سے باز آؤ گے (یا نہیں؟ بس کرو کہ شیطان کے فتنے میں مبتلا نہ ہو جاؤ)۔ اس موقع پر خلیفہ عمر نے کہا: ہم نے بس کیا۔ ہم نے بس کیا۔

(سنن ابی داؤد جلد ۳ کتاب الاشربۃ صفحہ ۳۲۵ ۔ سنن ترمذی تفسیر سورۂ مائدہ۔)

میں خدا اور رسولؐ کے غضب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں اور خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ شراب نہیں پیوں گا۔ اس کے بعد خدا نے شراب کی حرمت کا قطعی حکم نازل فرمادیا:

یَاۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ ..... فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ۔[1]

عمر بن خطاب(رض) نے اس موقع پر کہا: اِنْتَھَیْنَا اِنْتَھَیْنَا (ہم نے بس کیا! ہم نے بس کیا!)[2]

طبری نے کہا ہے: "ایک آدمی نے شراب پی اور جنگ بدر کے مشرک مقتولین کا مرثیہ پڑھا" لیکن اس نے اس آدمی کا نام نہیں بتایا۔ تاہم کتاب المستطرف کے مصنف الشیھی نے اس کا نام لیا ہے اور اپنی روایت میں یوں کہا ہے:

"...... پس کچھ مسلمان شراب پیتے رہے اور ایک گروہ نے اسے ترک بھی کر دیا۔ یہاں تک کہ عمر(رض) نے شراب پی اور ایک اونٹ کے منہ کی ہڈی اپنے ہاتھ میں لی اور اس کے ساتھ عبدالرحمٰن کا سر پھوڑ کر بیٹھ گئے اور اسود بن یعفر کے اشعار پڑھ کر جنگ بدر کے مقتولین کے لیے نوحہ خوانی کرنے لگے ....

یہ خبر رسول اکرمؐ کو ملی اور آنحضرت غصے کے عالم میں گھر سے نکلے۔ غصے کی شدت کی وجہ سے آپ کی چادر زمین پر گھسٹ رہی تھی اور آپ کے ہاتھ میں جو چیز تھی وہ آپ نے عمر کے سر پہ دے ماری۔ خلیفہ عمر نے کہا: میں خدا اور اس کے رسولؐ کے غضب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس موقع پر خدا نے یہ آیت نازل فرمائی "اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ"۔

پھر عمر(رض) نے کہا: ہم نے ختم کر دیا اور بس کر دیا۔"[3]

قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس واقعہ کا ایک اور پہلو اجاگر کیا ہے اور سعید بن جبیر سے یوں روایت کی ہے:

---

[1] اے ایمان والو! شراب، جوا بت اور تیر کے ذریعہ پاسا پھینکنا قطعاً ناپاک اور شیطانی کام ہیں۔ پس تم ان سے بچے رہو... کیا تم ان سے باز نہیں آؤ گے۔ [2] تفسیر طبری جلد ۲ صفحہ ۲۱۱۔

[3] المستطرف فی کل فن مستظرف جلد ۲ صفحہ ۲۶۰ تالیف محمد بن احمد الشیھی ۸۵۰ھ مطبوعہ حلبی مصر ۱۳۷۱ھ

لوگ زمانۂ جاہلیت کی عادات اور رسوم کے مطابق عمل کرتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ خدا کی جانب سے ان سے باز رہنے کا حکم صادر ہو جاتا تھا۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں مسلمان شراب پیتے تھے حتیٰ کہ آیہ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ الخ نازل ہوئی۔ لوگوں نے کہا: ہم شراب اس سے حاصل ہونے والے منافع کی خاطر پیتے ہیں۔ صورتِ حال اسی طرح رہی۔ حتیٰ کہ ایک آدمی نے شراب پی کر نماز کی امامت کی۔ جو سورہ اس نے پڑھا اس کے ضمن میں کہا: یَا اَیُّهَا الْکَافِرُوْنَ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (اے کافرو! میں اسے پوجتا ہوں جسے تم پوجتے ہو)۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ اس موقع پر کچھ مسلمانوں نے کہا ہم اوقاتِ نماز کے علاوہ باقی اوقات میں شراب پیا کریں گے۔[۱]

اس واقعہ کی ایک جھلک اس روایت میں موجود ہے جو حاکم نیشاپوری نے امام علیؑ سے نقل کی ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

شراب کی حرمت کے متعلق حکم نازل ہونے سے پہلے ایک انصاری نے ہمیں کھانے کی دعوت دی اور ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ ابھی ہم اس کے گھر میں ہی تھے مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ ہم میں سے ایک شخص نے آگے کھڑے ہو کر نماز جماعت پڑھانی شروع کی۔ قرأت کے دوران جب اس نے سورۂ "کافرون" پڑھی تو غلطی کھائی۔ اسی وجہ سے آیۂ شریفہ "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی" نازل ہوئی۔

پھر حاکم نیشاپوری کہتا ہے: یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے لیکن انھوں نے اسے نقل نہیں کیا۔ پھر کہتا ہے: اس حدیث میں ایک بہت بڑا فائدہ موجود ہے اور وہ یہ کہ خوارج اس مستی اور اس غلط قرأت کو کسی دوسرے سے نہیں بلکہ امیر المومنین علی بن ابی طالب (علیہ السلام) سے منسوب کرتے ہیں۔ تاہم خدا نے اس حدیث کے ذریعے ان کی برأت اور پاکدامنی ثابت کر دی ہے اور جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ امامؑ نے بھی یہ داستان کسی دوسرے شخص کے بارے میں نقل کی ہے۔[۲]

---

[۱] تفسیر قرطبی جلد ۵ صفحہ ۲۰۰ [۲] مستدرک علی الصحیحین حاکم نیشاپوری جلد ۲ صفحہ ۳۰۷

یوں تھی خلیفہ عمر کی اپنے پروردگار کے ساتھ موافقتوں کی داستان جو آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ ہم نے یہ نمونے مختصر طور پر پیش کیے ہیں اور یہ ایسے نمونے ہیں جن سے دوسری موافقتوں کی حقیقت کا پتا چل سکتا ہے تاکہ قارئین جان لیں کہ باقیماندہ موافقتیں بھی ان نمونوں سے کوئی مختلف چیز نہیں ہیں۔

رسول اکرمؐ کے کھڑے ہو کر پیشاب کرنیکے بارے میں حدیث

دوسری داستان جس کے بارے میں ہم تھوڑی بہت تحقیق کرنا چاہتے ہیں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا مسئلہ ہے جسے نعوذ باللہ ـــ رسول اکرمؐ سے منسوب کیا گیا ہے ـــ تاہم جب ہم درجۂ اوّل کی کتابوں کی جانب رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ مندرجات سو فی صد اس کے برعکس ہیں۔

ام المومنین بی بی عائشہ کہتی ہیں: جو شخص تمہارے سامنے نقل کرتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا وہ جھوٹ بولتا ہے۔ آنحضرتؐ نے کھڑے ہو کر کبھی یہ عمل انجام نہیں دیا۔[1]

مغیرہ بن شعبہ سے نقل کیا گیا ہے کہ جب رسول اکرمؐ قضائے حاجت کے لیے جاتے تھے تو لوگوں سے مکمل طور پر دور ہو جاتے تھے۔[2]

عبدالرحمٰن بن ابی قراد نے کہا: میں اور رسول اکرمؐ قضائے حاجت کے لیے خلوت کے مقام پر گئے اور جب کبھی آنحضرتؐ اس کام کے لیے جاتے تھے تو دوسروں سے مکمل طور پہ دور ہو جاتے تھے۔[3]

---

[1] سنن نسائی کتاب الطہارۃ جلد ۱ صفحہ ۲۶۔ سنن ترمذی آٹھواں باب، سنن ابن ماجہ چودھواں باب اور مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۹۲ - ۲۱۳ [2] سنن نسائی کتاب الطہارۃ جلد ۱ صفحہ ۱۷ - ۱۸ باب الابعاد الحاجہ [3] سنن نسائی کتاب الطہارۃ، باب الابعاد عند ارادہ الحاجہ، مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۴۳ اور جلد ۴ صفحہ ۲۲۴ - ۲۳۷، سنن ابوداؤد کتاب الطہارۃ الحدیث (۱)۔ سنن ترمذی ابواب الطہارۃ باب (۱۶)

ابو موسیٰ نے رسول اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ اس کام کے لیے مناسب جگہ تلاش کرے[1]

خلیفہ عمر کہتے ہیں: رسول اکرمؐ نے مجھے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا: اے عمر! کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا کرو۔ اس کے بعد میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا[2]

جابر بن عبداللہ انصاری نے کہا ہے: رسول اکرمؐ لوگوں کو کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے منع فرماتے تھے[3]

رسول اکرمؐ کے ان تمام ارشادات اور برعکس عمل کے باوجود ان احادیث کے نشر کرنے کی کیا وجہ ہے جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ (نعوذ باللہ) کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے؟ ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ ہو سکتا ہے کہ تیز بین قاری اس سوال کا جواب مندرجہ ذیل مطالب میں تلاش کر لے:

سنن ابن ماجہ میں کہا گیا ہے کہ عربوں کی عادت تھی کہ کھڑے ہو کر پیشاب کیا کرتے تھے[4]

مالک نے اپنی کتاب موطاء میں عمرو بن میمون سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے دیکھا کہ عبداللہ بن عمر کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے[5]

خلیفہ عمر نے کہا: کھڑے ہو کر پیشاب کرنا دبر کے لیے بہترین پوشش ہے[6]

---

[1] سنن ترمذی کتاب الطہارۃ باب ۱۶، سنن ابن ماجہ باب ۲۳، مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۹۶، ۳۹۹ اور ۴۱۳۔

[2] سنن ابن ماجہ کتاب الطہارۃ باب ۱۴ فی البول قائماً جلد ۱ صفحہ ۱۱۲۔ سنن ترمذی باب ۸ [3] سنن ابن ماجہ کتاب الطہارۃ باب ۱۴

[4] ——— ایضاً ———

[5] موطاء مالک ——— ایضاً ———

[6] فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۳۴۴، ارشاد الساری جلد ۱ صفحہ ۲۷۷ اور شرح النووی جلد ۳ صفحہ ۱۶۵

بتوں کی قربانی کا گوشت کھانا

تیسری حدیث جس کی ہم تھوڑی بہت چھان بین کرنا چاہتے ہیں وہ بتوں کی خاطر دی گئی قربانی کا گوشت رسول اکرمؐ کے کھانے اور نعوذ باللہ آنحضرتؐ کے آباؤ اجداد کے کفر اور شرک کے بارے میں ہے۔

قبل بعثت کے زمانے میں رسول اکرمؐ کے طور طریقوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کے لیے مناسب ترین کام یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بہترین دوست اور نزدیک ترین شاگرد اور ساتھی یعنی امیرالمومنین امام علیؑ سے رجوع کیا جائے تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ رسول اکرمؐ کے سلوک اور طرز عمل کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا:

وَلَقَدْ قَرَنَ اللّٰهُ بِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ مِنْ لَّدُنْ اَنْ کَانَ فَطِیْمًا۔[۱]

اللہ نے آپ کی دودھ بڑھائی کے وقت ہی سے فرشتوں میں سے ایک عظیم المرتبت فرشتے کو آپ کے ساتھ لگا دیا تھا جو آپکو شب و روز عمدہ خصلتوں اور پاکیزہ عادتوں کی راہ پرلے چلتا تھا۔

امام محمد باقرؑ نے بھی اسی حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

یُوَکِّلُ اللّٰهُ بِاَنْبِیَآئِهٖ مَلٰٓئِکَةً ..... وَ وَکَّلَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ مَلَکًا عَظِیْمًا مُنْذُ فُصِلَ مِنَ الرِّضَاعِ یُرْشِدُهٗ اِلَی الْخَیْرَاتِ وَمَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ وَیَصُدُّهٗ عَنِ الشَّرِّ وَمَسَاوِئِ الْاَخْلَاقِ۔[۲]

خدا نے اپنے تمام انبیاء کے ساتھ ایک فرشتہ فرشتہ مامور کیا اور آنحضرتؐ کی حفاظت و نگہداشت کے لیے بھی ان کی رضاعت کے زمانے ہی سے اپنے سب سے بڑے فرشتے کو مامور کیا تاکہ وہ ان کو نیکی اور

---

[۱] خطبۂ قاصعہ، نہج البلاغہ، تحقیق صبحی صالح صفحہ ۳۰۰۔ شرح نہج البلاغہ محمد عبدہ مصری جلد ا صفحہ ۱۸۲ [۲] سید ہاشم بحرانی حلیۃ الابرار جلد ا صفحہ ۱۸، مطبوعہ قم

اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دے اور بدی اور برے اخلاق سے باز رکھے۔

اب ہم رسول اکرمؐ کے آباؤ اجداد کے بارے میں بھی اہلبیتؑ کے مکتب کی جانب رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ انھوں نے ان کے متعلق کیا کہا ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے اور ان کے والد سے اور ان کے دادا سے اور حضرت امیرالمومنینؑ سے اور رسول اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی وصیت میں فرمایا: "یَا عَلِیُّ! اِنَّ عَبْدَ الْمُطَّلِبِ کَانَ لَا یَسْتَقْسِمُ بِالْاَزْلَامِ وَلَا یَعْبُدُ الْاَصْنَامَ وَلَا یَاْکُلُ مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَیَقُوْلُ: اَنَا عَلٰی دِیْنِ اَبِیْ اِبْرَاهِیْمَ۔"[1]

اے علیؑ! میرے دادا عبدالمطلب نے الازم[2] سے پاسا نہیں پھینکا اور جوا نہیں کھیلا۔ انھوں نے بتوں کو نہیں پوجا اور ان بتوں کی خاطر انصاب[3] میں ذبح کیے گئے جانوروں کا گوشت نہیں کھایا۔

اصبغ بن نباتہ کہتے ہیں: میں نے امیرالمومنینؑ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

"خدا کی قسم، میرے والد (ابو طالبؑ) نے، میرے دادا عبدالمطلب نے (ان کے والد) ہاشم نے اور (ان کے والد) عبد مناف نے کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا"

آپ سے عرض کیا گیا: پھر وہ کس کی عبادت کرتے تھے؟

آپ نے فرمایا: وہ خدا کے گھر کی جانب منہ کر کے حضرت ابراہیمؑ کے دین کے مطابق نماز پڑھتے تھے اور انہیں کے طور طریقوں پر چلتے تھے۔

یہ تھا اجداد پیغمبر کے مقام و مرتبہ کے بارے میں اہلبیتؑ کا نظریہ!

وَاَهْلُ الْبَیْتِ اَدْرٰی بِمَا فِیْهِ

---

[1] اکمال الدین یا کمال الدین صفحہ ۱۰۴، بحار الانوار جلد ۱۵ صفحہ ۱۴۴ اور من لا یحضرہ الفقیہ باب نوادر

[2] قرعہ ڈالنے یا فال نکالنے کی غرض سے تیر پھینکنا۔

[3] انصاب، نصب کی جمع ہے۔ یہ وہ پتھر کی سلیں تھیں جن پر بتوں کے سامنے قربانی دی جاتی تھی۔

محولہ احادیث کے مسلمانوں کے اعتقادات پر بُرے اثرات

مکتبِ خلافت کی کتب احادیث میں یہ روایات نقل کی گئی ہیں:

ا۔ رسول اکرمؐ نے بعثت سے پہلے زید بن عمرو بن نفیل کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ دسترخوان پر جو کھانا موجود تھا وہ گوشت تھا۔ زید نے اسے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا: تم جن چیزوں کی بتوں کی خاطر قربانی دیتے ہو میں وہ نہیں کھاتا۔ میں فقط ان جانوروں کا گوشت کھاتا ہوں جو خدا کے نام پر ذبح کیے جائیں۔

ب۔ بعثت کے بعد آنحضرتؐ نے ایک شخص سے فرمایا: میرا باپ اور تمہارا باپ دونوں دوزخ میں ہیں۔

ج۔ رسول اکرمؐ نے اس حالت میں کہ آپ کھڑے ہو کر پیشاب کر رہے تھے حذیفہ کو اپنے نزدیک بلایا اور وہ آنحضرتؐ کے پیشاب سے فارغ ہونے تک آپ کی پشت پر کھڑے رہے۔

د۔ آنحضرتؐ پر جادوگروں کا جادو چل گیا اور جو کام نہیں کیا ہوتا تھا اس کے متعلق سمجھتے تھے کہ وہ کر لیا ہے۔

ھ۔ عید کے دن دو جوان لڑکیاں رسول اکرمؐ کے پاس بیٹھی گا رہی تھیں۔ اتنے میں خلیفہ ابو بکر آ گئے اور کہنے لگے: شیطانی ساز و آواز؟ شیطانی ساز و آواز؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: اے ابو بکر! انہیں کچھ نہ کہو۔ ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور آج ہماری عید ہے (عید فطر یا عید قربان)۔

و۔ عید کے دن رسول اکرمؐ نے ام المومنین بی بی عائشہ کو اپنے پیچھے یوں کھڑا کیا کہ ان کا سر آنحضرتؐ کے کندھے پر اور ان کا گال آپ کے گال پر تا کہ وہ مسجد میں حبشیوں کا کھیل دیکھ سکیں۔ اتنے میں خلیفہ عمر مسجد میں آ گئے اور انہوں نے حبشیوں کو کھیل کود سے روک دیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اے عمر! انہیں کچھ نہ کہو۔ پھر حبشیوں کو مخاطب کر کے فرمایا: اے حبشی زادو! تم آزاد ہو اور امان میں ہو۔

ز۔ خلیفہ عمر دروازے سے داخل ہوئے تو لوگ انہیں دیکھ کر حبشیوں کے ارد گرد سے جو کہ ناچ رہے تھے اور ہنس رہے تھے منتشر ہو گئے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا: میں نے دیکھا ہے کہ جنوں اور انسانوں میں جو شیطان ہیں وہ عمر کو دیکھ کر بھاگ نکلتے ہیں۔

ح۔ بریدہ رسول اکرمؐ کے پاس بیٹھا دف بجا رہا تھا۔ جب خلیفہ عمر وارد ہوئے تو اس نے دف اپنے نیچے رکھ لی اور اس پر بیٹھ گیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اے عمر! شیطان تم سے ڈرتا ہے۔

رسول اکرمؐ کے مسلمانوں پر لعنت کرنے کے بارے میں احادیث

جن احادیث سے پتا چلتا ہے کہ رسول اکرمؐ مسلمانوں پر لعنت کیا کرتے تھے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جو لوگ اس بارے میں آنحضرتؐ سے سوال کرتے تھے ان کے جواب میں آپ فرماتے تھے: میں نے اپنے پروردگار سے عہد کیا ہے کہ میں ایک انسان ہوں۔ مجھے بھی عام انسانوں کی طرح خوشی ہوتی ہے اور غصہ آتا ہے۔ پس اے پروردگار اگر میں اپنی امت کے کسی شخص پر لعنت کروں اور وہ لعنت کا مستحق نہ ہو تو میری لعنت کو اس کے لیے پاکیزگی اور قیامت کے دن اپنے تقرب کا سبب بنا دے۔

ایک اور روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: اے پروردگار! اگر میں نے کسی کو تکلیف دی ہو یا برا بھلا کہا ہو یا اس پر لعنت کی ہو یا اسے تازیانے لگائے گئے ہوں تو تُو میرے اس عمل کو اس کے لیے رحمت، پاکیزگی، تقرب اور اجر کا موجب قرار دے۔

دنیاوی امور کے بارے میں رسول اکرمؐ کا اپنی لاعلمی کا اقرار

آنحضرتؐ نے لوگوں کو کھجور کے درختوں کی تلقیح سے منع فرمایا۔ اس سال درختوں نے اچھا پھل نہ دیا۔ آپ نے پوچھا: ان کھجوروں کی یہ حالت کیوں ہو گئی؟ لوگوں نے جواب دیا کہ آپ کے زیرہ چھڑکنے سے منع کرنے کے نتیجے میں ہماری فصل خراب ہو گئی۔

آپ نے فرمایا: اپنے دنیاوی امور کے بارے میں تم لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہو! ٥

نماز کے دوران رسول اکرمؐ کا بھول جانا

روایات میں کہا گیا ہے کہ ایک دن مغرب اور عشاء کی نماز میں رسول اکرمؐ نے دو سے زیادہ رکعتیں ادا نہ کیں۔ پھر آپ اٹھے اور ایک لکڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے جو کہ مسجد میں رکھی تھی۔ لوگوں نے کہا: کیا آپ نماز کا باقیماندہ حصہ بھول گئے ہیں یا رکعتوں کے لحاظ سے نماز میں کمی کر دی گئی ہے؟ آپ نے فرمایا: نہ تو میں بھولا ہوں اور نہ ہی نماز میں کمی واقع ہوئی ہے لیکن جب سبھی نے یک زبان ہو کر کہا کہ فقط دو رکعتیں پڑھی گئی ہیں تو آنحضرتؐ محراب میں واپس آئے اور نماز کا باقیماندہ حصہ با جماعت پڑھا۔

رسول اکرمؐ کا جنابت کی حالت میں نماز ادا کرنا

روایات میں کہا گیا ہے کہ ایک دن صبح کے وقت جب نماز جماعت کے لیے صفیں تشکیل پا گئیں تو رسول اکرمؐ محراب میں اپنی نماز کی جگہ پر تشریف لے گئے تا کہ امامت کرائیں۔ اچانک انہیں یاد آیا کہ مجھے تو غسلِ جنابت کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: میرے واپس آنے تک تم لوگ اپنی اپنی جگہ پر رہو۔ پھر آپ گھر گئے اور غسل کر کے اس حالت میں مسجد میں واپس پہنچے کہ ابھی پانی کے قطرے آپ کے سر کے بالوں میں سے ٹپک رہے تھے۔ پھر آپ نے تکبیر کہی اور نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

نتیجہ

اب تک ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ رسول اکرمؐ کی اخلاقی شخصیت کے بارے میں تھا۔ مندرجہ ذیل روایت کا تعلق آنحضرتؐ کی رسالت اور تبلیغ سے ہے جو بحیثیت رسولؐ آپ کی شخصیّت کی بنیاد ہے:

۱۔ روایات میں کہا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ ایک سورے کی چند آیات بھول گئے اور

جب اس سورے کی قرائت فرماتے تو وہ آیات چھوڑ جاتے تھے۔ ایک دن آپ نے ایک مسلمان کو مسجد میں وہی آیات (جو آپ بھول چکے تھے) پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: "اے پروردگار! اس شخص پر اپنی رحمت نازل فرما۔ قرآن کا جو حصہ میں بھول گیا تھا وہ اس نے یاد دلا دیا ہے۔

ب۔ روایات میں کہا گیا ہے کہ جب رسول اکرمؐ پر غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ کو وحی لانے والے فرشتے کے بارے میں شک گزرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شیطان یا جن ہو اور آپ سے مذاق کر رہا ہو۔ انہیں وحی کے متعلق بھی شک ہوا کہ وہ کاہنوں کی مقفیٰ عبارت کے مانند نہ ہو جو شیطان یا جن ان پر القا کرتے ہیں اور وہ خود بھی کاہن نہ بن گئے ہوں۔ آنحضرتؐ وحی اور خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے کے بارے میں اسی طرح شک کرتے رہے، حتیٰ کہ ورقہ بن نوفل نے انہیں اس پریشانی سے نجات دلائی، اطمینانِ قلب بخشا اور انہیں ان کے کام میں ثابت قدم کر دیا۔

ج۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ بہتانِ عظیم ہے جو غرانیق کے قصے میں رسول اکرمؐ پر باندھا گیا اور یہ کہا گیا کہ شیطان نے رسول اکرمؐ پر قابو پا لیا اور بتوں کی تعریف میں جملے آپ کی زبان پر جاری کر دیے۔ یہاں تک کہ آپ جبرئیل میں اور شیطان میں اور خدا کے کلام میں اور شیطان کے کلام میں تمیز نہ کر سکے اور شیطانی جملوں کی تلاوت قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ آسمانی وحی کے طور پر کی۔ کچھ اور روایات میں مصیبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ خدا اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ وہ قانون سازی کے معاملے میں کسی اور کی پیروی کریں۔ احادیث میں آیا ہے کہ قرآن کچھ عام افراد کی رائے اور نظریے کے تابع ہے۔

د۔ رسول اکرمؐ، عبد اللہ ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھنے جا رہے تھے کہ خلیفہ عمر ان کے سامنے آئے اور کہنے لگے: کیا خدا نے آپ کو منافقوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع نہیں کیا؟ رسول اکرمؐ نے فرمایا: مجھے دو کاموں میں سے کسی ایک کے کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ کیونکہ خدا نے فرمایا ہے:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ...[1]

اس کے باوجود رسول اکرمؐ نے عبداللہ ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ...[2]

۸۔ روایت کی گئی ہے کہ جب مقام ابراہیمؑ کو مسلمانوں کے لیے نماز کی جگہ قرار دیا گیا تو آسمانی حکم خلیفہ کی تجویز کے مطابق نازل ہوا۔

۹۔ اور رسول اکرمؐ کی بیویوں کے پردہ کرنے کے بارے میں بھی حکم اسی طرح نازل ہوا۔ ایسے ہی اور بہت سے نمونے حدیث، تفسیر اور مناقب کی کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں لیکن ہم کلام کی طوالت سے بچنے کے لیے ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

ان احادیث نے مکتب خلافت میں ایک خاص طرز فکر کو جنم دیا

گزشتہ احادیث کے مطابق رسول اکرمؐ کے آباؤ اجداد کافر اور بت پرست تھے جبکہ دوسرے روز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف کے پیرو تھے۔ خود آنحضرتؐ بھی ایسے ہی تھے کیونکہ وہ بتوں کے لیے ذبح کیے گئے جانوروں کا گوشت کھاتے تھے، حالانکہ دین حنیف کے پیرو ایسی غذا کھانے سے پرہیز کرتے تھے۔

لہٰذا ایسے اشخاص زمانۂ جاہلیت میں رسول اکرمؐ سے برتر تھے (العیاذ باللہ)۔

جب رسول اکرمؐ منصب رسالت پر فائز ہوئے تو ایک عیسائی عالم رسالت کے معاملے میں آنحضرتؐ سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتا تھا اور اگر عیسائی عالم نہ ہوتا تو آنحضرتؐ کو اپنی ماموریت کا پتا ہی نہ چلتا۔ لہٰذا یہ عیسائی رسول اکرمؐ سے زیادہ بصیرت رکھتا تھا اور وہ بھی آپ کے رسالت پر مبعوث ہونے کے بعد!

---

[1] آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں (کوئی فرق نہیں پڑتا) خواہ آپ ستر بار بھی استغفار کریں پروردگار انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

[2] ان میں سے جو بھی مرجائے اس کی نماز جنازہ نہ پڑھو اور اس کے لیے دعائے مغفرت طلب کرنے کی خاطر اس کی قبر کے پاس مت کھڑے رہو۔ (سورۃ توبہ۔ آیت ۸۴)

بعثت کے بعد رسول اکرمؐ کے طور طریقے ایسے تھے کہ آپ دوسروں کے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے اور دوسروں کی طرح ان پر بھی جادو اثر کرتا تھا جس سے ان کے شعوری حالات بدل جاتے تھے۔ بعض حالات میں دوسرے ان سے برتر تھے۔ چنانچہ وہ خود نماز کی ایک رکعت یا دو رکعتیں ادا کرنا بھول جاتے تھے لیکن دوسرے یاد رکھتے تھے اور ان کی غلطی انھیں جتلا دیتے تھے۔

رسول اکرمؐ اپنی جنابت کو بھول جاتے تھے اور نماز کی امامت کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے اور اس دوران میں انھیں اپنی جنابت یاد آتی تھی۔

رسول اکرمؐ لوگوں پر لعنت کرتے اور انہیں برا بھلا کہتے تھے جبکہ ان کے اکثر پیرو ان کاموں سے بچتے تھے۔

آنحضرتؐ غلطی کی بنا پر مدینہ کے لوگوں کو کھجور کے درختوں کی تلقیح سے منع کرتے ہیں اور اس سال کھجور کی فصل تباہ ہو جاتی ہے اور یہ اس حالت میں ہے کہ جس سرزمین میں کھجور کے درخت پیدا ہوتے ہیں وہاں کے بچے تک اس مسئلہ سے واقف ہیں۔ لہٰذا ایسے بچے دنیاوی امور میں رسول اکرمؐ سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

رسول اکرمؐ اپنی بیوی کو مسجد میں اپنے پیچھے اس انداز سے کھڑا کرتے ہیں کہ اس کا گال آنحضرتؐ کے گال پر رکھا ہوتا ہے تاکہ وہ حبشیوں کا ناچ دیکھ سکے جبکہ آپ کے اکثر پیرو ایسے خراب کام سے پرہیز کرتے ہیں۔ لہٰذا عام مسلمان رسول اکرمؐ سے برتر ہیں۔

آنحضرتؐ گانے سنتے ہیں جبکہ ان کے دو صحابی (ابوبکر و عمر) اس کام سے پرہیز کرتے ہیں۔ پس یہ دونوں آنحضرتؐ سے افضل ہیں۔

رسول اکرمؐ قرأت کے وقت قرآن مجید کی کچھ آیات نہیں پڑھتے کیونکہ وہ انھیں بھول چکے ہوتے ہیں اور یہ آیات انہیں دوسرے شخص کی قرأت سن کر یاد آتی ہیں۔ لہٰذا دوسروں کا حافظہ آنحضرتؐ سے تیز ہے اور وہ آپ سے افضل ہیں۔

مکتب خلافت میں ایسی احادیث نشر ہونے کی وجہ

خلفاء کی دنیاوی لذتوں میں ڈوبی ہوئی مادی زندگی مقام خلافت (معصوم پیغمبرؐ

کی جانشینی) سے جس کے وہ دعویدار تھے مکمل طور پر متناقض تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تناقض ان کی حکومت کے لیے بڑے صدمے کا موجب تھا۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ اس مکتب میں ایسی احادیث رسول اکرمؐ سے منسوب کی جائیں جو آنحضرتؐ کے جانشین کی حیثیت سے ان کے کردار کی توجیہہ کریں اور اسے شرعاً درست قرار دیں۔

ان خلفاء کی داستان بغداد کے اس گورنر کی مانند ہے جو رشوت نہیں لیتا تھا۔ یہ داستان جو عراق کے لوگوں میں مشہور تھی یوں ہے:

عثمانی حکومت کا ایک گورنر جو بغداد میں تعینات تھا بہت سادہ دل اور نیک انسان تھا۔ وہ رشوت قبول کرنے سے پرہیز کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے اہلکاروں نے بھی رشوت لینی چھوڑ دی۔ جو لوگ رشوت کے ذریعے اپنی خواہشات کی تکمیل کرتے تھے وہ اس سے محروم ہو گئے اور ان کے لیے مشکل صورت حال پیدا ہو گئی۔ گورنر کے ہم نشینوں میں سے ایک شخص نے ذمہ لیا کہ اگر وہ لوگ اس کی تجویز پر عمل کریں تو رشوت کا دروازہ دوبارہ کھل سکتا ہے۔ لہٰذا اس کی تجویز کے مطابق یہ طے پایا کہ جب وہ صبح کے وقت گورنر سے ملاقات کریں تو اس سے کہیں کہ آپ بیمار ہیں اور آپ کے چہرے سے بیماری کی علامتیں ظاہر ہیں۔ پھر ہم اس کی جلد شفایابی کے لیے خدا سے دعا کریں۔ دوسرے دن صبح کے وقت انھوں نے اس منصوبے کو عملی شکل دیدی۔ ان کی باتوں نے گورنر پر اثر کیا اور وہ اپنے آپ کو بیمار محسوس کرنے لگا اور بالآخر چارپائی سے لگ گیا۔ اس موقع پر منصوبے کے اصلی خالق نے ایک سرکاری اہلکار کو بلایا اور اسے کچھ رقم دی تاکہ وہ چند بھیڑیں خرید کر گورنر کی صحت یابی اور صدقے کے طور پر دے۔

جب یہ عمل انجام پا گیا تو گورنر کے ہم نشین یکے بعد دیگرے اس کی بیمار پرسی کے لیے پہنچے۔ رفتہ رفتہ وہ اس بیماری کی علامات زائل ہونے کی مبارکباد دینے لگے اور دبی زبان سے کہنے لگے: الحمدللہ آپ عنقریب شفایاب ہونے والے ہیں کیونکہ خدا نے ہمارے صدقے قبول کر لیے ہیں۔ یوں گورنر بیماری کے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کار منصبی پر واپس آ گیا۔

دوسرے دن منصوبے کے خالق نے رقم کی ایک تھیلی گورنر کو پیش کی اور کہا:

یہ تھیلی ایک حاجتمند شخص آپ کے لیے ہدیہ اور رشوت کے طور پر لایا ہے تاکہ آپ فلاں معاملے میں فیصلہ اس کے حق میں دیدیں۔ گورنر نے رقم قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر اس شخص نے کہا: کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ خدا نے کس طرح ہماری رشوت قبول کی اور آپ کو اس خطرناک بیماری سے شفا عنایت فرمائی!

گورنر یہ دلیل سن کر طمع میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے رشوت قبول کرلی اور اس آدمی کا کام کردیا۔ یوں اس کے ہم نشینوں کے لیے رشوت کا دروازہ کھل گیا۔

خلفاء کی داستان بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ عیش و نشاط کی محفلیں سجائیں ساز بجائیں اور جن چیزوں سے شرع نے منع کیا ہے ان کو اپنے آپ پر مباح کریں۔ حکومت کی ضرورت کا تقاضا تھا کہ خلیفہ اور اس کے اہلکاروں کے افعال کو جائز قرار دینے کے لیے روایات اور احادیث وضع کی جائیں تاکہ کہا جاسکے کہ ان حاکموں سے پہلے خود رسول اکرمؐ سے بھی ایسے اعمال صادر ہوئے ہیں۔

لہٰذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسی احادیث کی کیا بنیاد تھی اور ان کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ بدقسمتی سے مستشرقین نے زیادہ تر ایسی احادیث پر ہی انحصار کیا ہے اور اپنی خود غرضانہ سرگرمیوں کی خاطر ان تک رسائی حاصل کی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مستشرقین نے اس قسم کی احادیث کو کیوں اپنی دستاویز قرار دیا؟

اسلام اور دیگر مشرقی مذاہب کی تحقیقات کے سلسلے میں عیسائی اور یہودی علماء کی یہ خواہش رہی ہے کہ قرآن کو انسانی کلام کے طور پر پیش کریں۔ (وحی کی نفی کرتے ہوئے) اسلام کو ایک زمینی مظہر SOCIAL PHENOMENON کے طور پر متعارف کرائیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ان کے لیے بہتر تھا کہ اسلامی مدارک سے دلیل لائیں لیکن جب انھیں مکتب اہلبیتؑ کی معتبر کتابوں میں اپنی خواہشوں کے مطابق قطعاً کوئی مواد نہ ملا تو انہوں نے ان مدارک سے مکمل طور پر روگردانی اختیار کی اور مکتب خلافت کی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ بلاشبہ اس مکتب میں بھی انہوں نے ان احادیث پر انحصار کیا جن سے ان کا مقصد حل ہو سکتا تھا اور جو صحیح روایات اس مکتب کی کتابوں میں موجود تھیں اور ان کے

مقاصد کے خلاف جاتی تھیں ان کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔

مثلاً مستشرقین مندرجہ ذیل داستان کو جو امیرالمومنین امام علیؑ سے نقل کی گئی ہے نظرانداز کر دیتے ہیں: اس روایت میں علیؑ نے بتایا ہے کہ پہلی وحی کے نزول کے وقت میں غارِ حرا میں موجود تھا اور میں نے اس وقت کسی کے رونے کی آواز سنی۔ رسول اکرمؐ نے مجھے بتایا کہ یہ شیطان کے رونے کی آواز ہے جو اپنے پوجے جانے سے مایوس ہوگیا ہے۔

انہوں نے مکتب اہلبیتؑ کی روایات نقل کرنے سے اجتناب برتا۔ مکتب خلافت کے مدارک سے رجوع کیا اور اس مکتب کی ان احادیث پر انحصار کیا جن سے انکا مذموم مقصد حاصل ہوتا تھا۔

مستشرقین نے ایسی روایات سے یوں نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کو وحی اور اس کے لانے والے پر شک گزرا اور وہ سمجھے کہ جو چیز ان پر وحی ہوئی ہے وہ کاہنوں کے مقفیٰ کلمات ہیں جو شیطان نے ان پر القا کیے ہیں۔ انہوں نے یوں نقل کیا ہے جیسے کہ آنحضرتؐ بھی دوسرے کاہنوں کی طرح ایک کاہن بن گئے ہوں۔

تاہم انہوں نے مکتب خلفاء کی کتب میں موجود درست روایات نقل نہیں کیں اور اگر نقل بھی کی ہیں تو انھیں مشکوک قرار دیا ہے۔ مثلاً وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ یہودی اور عیسائی احبار اور علماء نے آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے ہی ان کے اقربا کو خبر دیدی تھی کہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بشارت گزشتہ نبیوں نے دی ہے۔

مستشرقین نے ایسی دسیوں روایات سے چشم پوشی کر کے ان احادیث پر ہاتھ ڈالا تاکہ آپ کی پاک و پاکیزہ شخصیت کو داغدار کرسکیں۔ انہوں نے غرانیق کے افسانے کے بارے میں روایات کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک دستاویز قرار دیا ہے اور اسے نفسیاتی اور عمرانی تجزیے سے مزین کیا ہے۔ تاہم جو کچھ امام جعفر صادقؑ کے شاگرد ہشام بن حکم کلبی نے لکھا ہے اس کی جانب انھوں نے ہرگز رجوع نہیں کیا اور وہ مواد حاصل نہیں کیا جو مکتب خلافت کی روایات سے متناقض ہے ورنہ انہیں پتا چل جاتا کہ یہ رسول اکرمؐ

نہیں بلکہ) قریش تھے جو یہ جملے بتوں کی تعریف میں اپنی زبان پر لاتے تھے اور سورۂ نجم ان کی رد میں نازل ہوئی تھی۔

یہ قول ان مستشرقین کی نفسانی خواہش سے مطابقت رکھتا تھا کہ:

"رسول اکرمؐ نے لوگوں کے دنیاوی امور میں مثلاً کھجور کے درختوں پر زیرہ چھڑکنے کے بارے میں ان کے علم کے برعکس حکم دیا اور یوں کھجور کی فصل کو بہت بڑا نقصان پہنچایا اور جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو کہا: تم لوگ اپنے دنیاوی امور میں مجھ سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے ہو۔"

یہ مقولہ عیسائیت کے نقطۂ نگاہ کے عین مطابق ہے اور ان کے ہاں مشہور مثل ہے کہ: "جو کچھ قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو کچھ خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔"

اس طرح مستشرقین یہ جتلانا چاہتے ہیں کہ اگر مسلمان چاہیں تو اپنی سماجی اور اقتصادی پالیسیاں وضع کرنے کے لیے مشرق و مغرب سے رجوع کر سکتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی ان کے مادی طرزِ فکر کی پیداوار ہے کہ مذہب ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے کیونکہ مذہب کا تعلق فرد سے ہے اور یہ صرف فرد کا رابطہ خدا سے استوار کرتا ہے۔ لہٰذا مسلم مملکتوں کے اجتماعی روابط مشرقی یا مغربی پالیسیوں کے مطابق متعین ہونے چاہئیں۔

مسلمانوں کے عقائد پر ان احادیث کے اثرات

جو کچھ اب تک کہا گیا ہے اس کے علاوہ دوسرے اثرات بھی وجود رکھتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ گزشتہ احادیث اور مکتبِ خلافت کی اسلامی کتابوں میں ان کی بہت سی مثالیں ان روایات کے ماننے والوں کا ایک خاص عقیدہ وجود میں لاتی ہیں جو خود ان روایات سے ہم آہنگ ہے۔ مثلاً بعض اسلامی گروہ کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ دوسروں پر کوئی فوقیت نہیں رکھتے۔ جیسا کہ ہم نے ان کے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ:

"محمدؐ میرے جیسے ہی ایک آدمی تھے اور مر گئے۔"

اس فرقے کا اعتقاد ہے کہ خود اپنے جیسے لوگوں کے لیے خدا کا پیغام لانے کا نقطۂ نگاہ

سے رسول اکرمؐ کی حیثیت ایک ڈاکیے کی ہے۔ جس طرح ایک ڈاکیہ چٹھی بھیجنے والے یا چٹھی وصول کرنے والے پر کوئی فوقیت نہیں رکھتا اور فقط چٹھی پہنچانے کا فریضہ انجام دیتا ہے اسی طرح آنحضرتؐ بھی رسالت الٰہی کے حامل ہیں اور کسی دوسرے پر کوئی برتری نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرقے کے لوگ حضرت خاتم النبیینؐ کی قبر مطہر کی لازمی حرمت کی رعایت نہیں کرتے اور آپ سے شفاعت کی درخواست کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ حتٰی کہ اسے شرک سمجھتے ہیں اور اس بارے میں جو آیات و احادیث آئی ہیں ان کی تاویل کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے مقصد سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

ب۔ جس طرح انسان کو اپنی اجتماعی زندگی میں ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جو دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ اس کے تعلقات کو باضابطہ بناتے اور ان کے ساتھ مل جل کر رہنے اور معاملات کرنے میں ان کی رہنمائی کرے تاکہ وہ اس نظام کی بدولت فطرت اور اس کی لذتوں سے بہرہ مند ہو اور برائیوں سے پرہیز کرے۔ اسی طرح اسے ایک ایسے نمونے کی بھی ضرورت ہے جس کے وجود میں وہ نظام منعکس ہو تاکہ انسان اسے دیکھ کر اپنی راہ و رسم پہچانے اور اس کے نقشِ قدم پر چلے اور جہاں تک ہو سکے اس کے طور طریقوں کی پیروی کرے۔ یہ نمونہ خواہ خالق کی جانب سے معین کیا جائے یا مخلوق کی جانب سے[1] اپنے پیروؤں پر بہت گہرا اثر کرتا ہے۔

یہی بات " اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ " کے جملے میں کہی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ حکام کے طور طریقوں اور بادشاہوں کے دین پر چلتے ہیں اور وہی قوموں کے زعماء اور رہبر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جتنا اثر دوسرے رہبر اپنے پیروؤں پر ڈالتے ہیں اس کے مقابلے میں خدا کی جانب سے مقرر کیے گئے نمونے اور رہبر اپنے پیروؤں

---

[1] قرآن مجید میں دو قسم کے اماموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: (۱) جو خدا کی جانب سے مقرر ہوتے ہیں اور (۲) جو جہنم کی جانب دعوت دیتے ہیں۔

پر کہیں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس تمہید کی بنا پر اگر انسان کا یہ نظریہ ہو کہ آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک سب نبی گناہوں کے مرتکب ہوتے رہے ہیں اور وہ اپنے اس نظریے کی تائید میں قرآن کی متشابہ آیات پر انحصار کرے اور ان کے مبہم مفاہیم پر اصرار کرے حتیٰ کہ اپنی رائے کو صائب ثابت کرنے کے لیے ان آیات کی توجیہہ اور تاویل ان کے ظواہر کے خلاف کرے۔ نیز ان احادیث پر بھی تکیہ کرے جن میں کچھ انبیائے کرام سے گناہ منسوب کیے گئے ہیں جیساکہ داودؑ کی "اوریا" کی بیوی سے[1] یا رسول اکرمؐ کی زینب سے شادی کے متعلق نقل کیا گیا ہے[2] پس اگر کوئی شخص ان احادیث کی صحت پر اعتقاد رکھتا ہو تو وہ کیونکر گناہوں سے باز رہ سکتا ہے جبکہ وہ یہ مانتا ہے کہ انبیاءؑ بھی گناہ کرتے تھے لیکن پھر بھی وہ قیامت کے دن بلندترین رتبے پر فائز ہوں گے!!

اس مکتب کے مقابلے میں اہلبیتؑ کا مکتب ہے جو اس بات پر شدید اصرار کرتا ہے کہ انبیاءؑ بچپن سے معصوم ہوتے ہیں اور خدا کی حفاظت میں رہتے ہیں۔ جو متشابہ آیات ان کے قول وفعل کے بارے میں وجود رکھتی ہیں ان کے بارے میں محکمات کی جانب رجوع کرکے ان کے صحیح معنی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اہلبیتؑ کے مکتب میں کسی نبی کے خطاکار ہونے کے بارے میں کوئی روایت موجود نہیں بلکہ اس مکتب کے پیروؤں اور عالموں کا یہ اعتقاد ہے کہ تمام انبیاءؑ اور ان کے اوصیاءؑ جن میں ائمۂ اطہار بھی شامل ہیں معصوم ہیں۔ ائمۂ اہلبیتؑ کی علوطبع اور نفسانی خواہشات سے دوری کے بارے میں بہت سی روایات موجود ہیں۔ نیز ان کے ارشادات میں پاکی اور پاکیزگی کی جانب دعوت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ امام علیؑ کے کچھ خطبے اور امام سجادؑ کی دعائیں اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

علاوہ ازیں دنیا میں ان کے زہد و تقویٰ کی بنا پر گریہ وزاری کے ساتھ مکمل دلبستگی

---

[1] تورات ، دوسری کتاب سیموئیل گیارھواں باب

[2] طبری مطبوعہ یورپ جلد ۱ صفحہ ۱۴۶۰-۱۴۶۲

اور رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اسلام کے ہر پہلو میں ان کی کوششوں کے بارے میں کثیر روایات نقل کی گئی ہیں۔ لہٰذا سچے شیعوں کے لیے لازم ہے کہ ان پیشواؤں کی سراسر پاکیزہ زندگی اور ان کے گرانبہا ارشادات سے سبق حاصل کریں اور زندگی کے ہر شعبے میں انکی پیروی کریں۔

ان احادیث کا بدترین اثر

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ جو لوگ ان احادیث پر اعتقاد رکھتے ہیں یہ ان کے اذہان میں رسول اکرمؐ کے متعلق ایک خاص انداز فکر پیدا کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرتؐ دوسروں پر کوئی فوقیت یا برتری نہیں رکھتے۔

اب ہم اس قول پر اس بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ کچھ احادیث اپنے معتقدین میں ایک اور خیال کو جنم دیتی ہیں اور وہ یہ کہ کوئی غیر پیغمبر، پیغمبرؐ سے برتر ہے! اس قسم کی احادیث میں سے کچھ وہ ہیں جو مناقب کے باب میں نقل کی گئی ہیں۔ مثلاً رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"سورج کسی ایسے شخص پر طلوع نہیں ہوا جو عمر سے بہتر ہو!"

لہٰذا وہ تمام بنی نوع انسان سے بشمول انبیائے کرام اور خاتم النبیینؐ برتر ہیں۔

رسول اکرمؐ نے مزید فرمایا:

"حق عمر کی زبان پر قرار دیا گیا ہے۔ وہ حق بات کہتے ہیں اور ان کا دل حق آگاہ ہے۔ ایمان عمر کی زبان پر بولتا ہے۔

نیز رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

"گزشتہ امتوں میں کچھ ایسے لوگ تھے جو فرشتوں سے گفتگو کرتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے تو وہ عمر ہیں۔"

آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا:

"اگر میں پیغمبری پر مبعوث نہ ہوتا تو عمر پیغمبر بنائے جاتے۔"

اور یہ بھی فرمایا کہ:

"اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتے۔"

پھر خلیفہ عمر کی پروردگار سے موافقت یا درحقیقت پروردگار کی خلیفہ عمر سے

موافقت کے بارے میں متعدد واقعات نقل کیے گئے ہیں۔

ان مواقع پر خلیفہ عمر نے اپنی رائے ظاہر کی اور اس کے بعد خدا نے ان کی رائے کے مطابق قرآن کی آیت نازل کی اور بعض اوقات الفاظ کے معاملے میں بھی انکے ساتھ موافقت کی۔

یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ کچھ مواقع پر خلیفہ اور رسول اکرمؐ کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور خدا نے خلیفہ کی رائے کی تائید میں قرآن کی آیات نازل فرمائیں اور آنحضرتؐ کو حکم دیا کہ خلیفہ کی رائے کی متابعت کریں اور اسی کے مطابق عمل کریں۔

اسی بنا پر کہا گیا کہ:

لوگوں نے کسی چیز کے متعلق بات نہیں کی کہ جس میں عمر نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہو۔ مگر یہ کہ قرآن عمر کے نظریے اور رائے کے مطابق نازل ہوا۔

نیز یہ کہ:

سچ تو یہ ہے کہ قرآن میں عمر کے خیالات موجود ہیں۔

ان روایات کے اثرات اور نتائج

رسول اکرمؐ:

رقص و سرود کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیات بھول جاتے ہیں اور انھیں قرأت سے حذف کر دیتے ہیں اور شیطان بتوں کی تعریف میں کلمات ان کی زبان پر القاء کر دیتا ہے اور وہ قرآنی آیات کے طور پر ان کی تلاوت کرتے ہیں۔

مومنوں پر بلاوجہ لعنت کرتے ہیں اور انھیں ناسزا باتیں کہتے ہیں اور اسی قسم کی اور بہت سی غلطیاں کرتے ہیں....

مگر

خلیفہ راگ سننے اور ناچ دیکھنے سے پرہیز کرتے ہیں اور شیطان انہیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

خدا حق کو خلیفہ کی زبان پر جاری کرتا ہے، ایمان ان کی زبان پر بولتا ہے اور

فرشتے ان سے گفتگو کرتے ہیں۔

خلیفہ رسول اکرمؐ کو کسی کام سے منع کرتے ہیں اور آنحضرتؐ وہ عمل بجالاتے ہیں تو وحی نازل ہوتی ہے اور انھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جس کام سے خلیفہ نے منع کیا ہے اسے ترک کر دیں۔

خلیفہ رسول اکرمؐ کو کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں اور آپ وہ کام انجام نہیں دیتے۔ تب بھی وحی نازل ہوتی ہے اور آپ سے کہا جاتا ہے کہ خلیفہ نے جو کچھ کہا ہے اسے انجام دیں۔

یہ چیز اتنی مرتبہ دہرائی جاتی ہے کہ لوگ کہتے ہیں:

"لوگوں نے (یہاں "لوگوں" سے مراد رسول اکرمؐ ہیں) کسی چیز کے متعلق بات نہیں کی جس میں عمر نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہو، مگر یہ کہ قرآن عمر کے نظریے اور رائے کے مطابق نازل ہوا۔"

اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ:

"قرآن میں عمر کا نظریہ اور رائے موجود ہے۔"

پس ان احادیث اور انہیں جیسی دوسری بہت سی دیگر احادیث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے کچھ فرقوں کی نظر میں یہ عقیدہ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد بھی جاری رہا۔

مثلاً رسول اکرمؐ نے جو کچھ اپنی زندگی میں فرمایا تھا، اگر خلیفہ عمر نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اس کے خلاف کہا تو لوگوں نے خلیفہ کے قول اور رائے کے مطابق عمل کیا اور رسول اکرمؐ کے ارشادات کو ترک کر دیا۔ اس عقیدے کے بارے میں انھوں نے ایک روایت پر انحصار کیا جو رسول اکرمؐ سے نقل کی گئی ہے جس کے مطابق آپ نے فرمایا:

"اگر میں تمہارے درمیان مبعوث نہ ہوتا تو عمر پیغمبر بنائے جاتے۔"

اور

"اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔"

خلیفہ کے اجتہاد پر مسلمانوں کے عمل کا ایک نمونہ

لوگوں کے خلیفہ عمر کی رائے اور اجتہاد پر عمل کرنے اور رسول اکرمؐ کی سنت کی مخالفت کرنے کے نمونوں میں سے ایک نمونہ ''متعہ حج'' ہے۔

رسول اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے سفر کے دوران خدا کے حکم سے عمرۂ تمتع مسلمانوں کے لیے واجب قرار دیا اور مسلمانوں نے جن کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی، آنحضرتؐ کے حکم کے مطابق عمرۂ تمتع ادا کیا۔ بعد میں خلیفہ عمر نے اپنی خلافت کے زمانے میں مسلمانوں کو اس حکم کی انجام دہی سے منع کر دیا اور کہا:

''مُتْعَتَانِ کَانَتَا عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِؐ وَاَنَا اَنْهٰی عَنْهُمَا، وَ اُعَاقِبُ عَلَيْهِمَا[1] وَهُمَا مُتْعَةُ الْحَجِّ وَمُتْعَةُ النِّسَآءِ۔''

(حکم) رسول اللہؐ کے زمانے میں جو دو متعہ (جاری) تھے میں ان کی ممانعت کرتا ہوں اور ان کو انجام دینے پر سزا دوں گا اور وہ دو متعہ، متعہ حج اور متعہ نساء ہیں۔

خلیفہ عمر کی جانب سے یہ حکم جاری ہونے کے بعد مسلمان ہمیشہ حج کو عمرے سے جدا رکھتے تھے اور عمرہ کے بغیر حج ادا کرتے تھے اور بلاشبہ وہ خلیفہ عمر کے حکم کی تعمیل کی خاطر ایسا کرتے تھے۔

یہ رسم خلیفہ عثمان کے زمانے میں بھی جاری رہی۔ خلیفہ عثمان بھی عمرۂ تمتع ادا کرنے سے منع کرتے تھے لیکن حضرت علیؑ اسے انجام دینے کا حکم دیتے تھے۔

ایک دفعہ یہ دونوں حج کے لیے جاتے ہوئے ہم سفر ہو گئے۔ امیرالمومنینؑ نے خلیفہ عثمان سے فرمایا: ''تم وہ کام کرنے سے کیوں منع کرتے ہو جس کا خود رسول اکرمؐ نے

---

[1] سنن بیہقی جلد ۷ صفحہ ۲۰۶، بدایۃ المجتہد جلد ۱ صفحہ ۳۴۶، زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۲۰۵، ابن قدامہ: المغنی جلد ۷ صفحہ ۵۲۷، ابن حزم: المحلی جلد ۷ صفحہ ۱۰۷، ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۱۶۷۔ پہلا ایڈیشن

حکم دیا اور اس کے مطابق عمل بھی کیا۔ خلیفہ عثمان نے کہا: ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔ امام علیؑ نے فرمایا: میں یہ نہیں کر سکتا کہ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔

جب امام علیؑ نے یہ صورت دیکھی تو عمرہ اور تمتع کے لیے ایک نیت باندھ کر لبیک کہنا شروع کیا اور دونوں کو ایک ساتھ بجالائے[1]

عبداللہ بن زبیر کے عہد میں

ابن زبیر کے عہد میں عبداللہ بن عباس لوگوں سے کہتے تھے کہ وہ عمرہ تمتع بجا لائیں جبکہ عبداللہ بن زبیر اس کام سے منع کرتے تھے[2] اور لوگوں سے کہتے تھے کہ: حج تنہا اور بغیر عمرے کے بجالاؤ اور اس اندھے کی باتوں پر کان نہ دھرو۔[3]

عبداللہ ابن عباس نے جواب میں کہا: تم ہی وہ شخص ہو جس کی آنکھیں خدا نے اندھی کر دی ہیں۔ تم یہ مسئلہ اپنی ماں سے کیوں نہیں پوچھتے؟ پس ابن زبیر نے کسی کو اپنی ماں کے پاس بھیجا اور اس سے سوال کیا۔ اس کی ماں نے جواب میں کہا: ابن عباس نے ٹھیک کہا ہے۔ جب ہم رسول اکرمؐ کے ساتھ حج کے لیے آئے تھے تو پہلے ہم نے عمرۂ مفردہ ادا کیا تھا۔ پھر ہم نے احرام کھول دیا اور محرم کے لیے جو محرمات ہوتے ہیں ان سے حتیٰ کہ شوہر اور بیوی کی ہم بستری کی ممانعت سے بھی آزاد ہو گئے[4] اور حج تمتع کے لیے احرام کے دن تک یہی صورت رہی۔

عبداللہ بن زبیر کے بھائی عروہ بن زبیر نے ابن عباس سے کہا: "اے ابن عباس!

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۱۹۰ اور سنن نسائی جلد ۲ صفحہ ۱۵ دیکھیں۔ دوسرے مصادر کے لیے مقدمہ مرآۃ العقول سے رجوع کریں۔

[2] صحیح مسلم صفحہ ۸۸۵ الحدیث ۱۴۵

[3] ابن زبیر نے ابن عباس کو اندھا کہا کیونکہ وہ آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔

[4] زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۲۴۸ اور الزوائد الثمانیہ جلد ۱ صفحہ ۳۳۰ حدیث ۱۱۰۸۔ نیز ابن ابی شیبہ کی المصنف دیکھیں۔

تم کب تک لوگوں کو گمراہ کروگے؟" انہوں نے جواب میں کہا: "اے عروہ! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" عروہ نے کہا: تم ہمیں حج کے مہینوں میں عمرے کا حکم دے رہے ہو۔ حالانکہ ابوبکر اور عمر نے اسے انجام دینے سے منع کیا ہے۔

ابن عباس نے کہا: یہ کام رسول اکرمؐ نے انجام دیا ہے[1] (اور میں یہ حکم رسول اکرمؐ کے عمل اور ان کے فرمان کی بنا پر دے رہا ہوں)۔

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ابن عباس نے کہا: اپنی ماں سے پوچھو!

عروہ نے کہا: لیکن ابوبکر اور عمر نے یہ کام انجام نہیں دیا۔

ابن عباس نے کہا: میں تمہیں رسول اکرمؐ کے عمل کے بارے میں بتا رہا ہوں اور تم مجھے ابوبکر اور عمر کے عمل کا حوالہ دے رہے ہو۔[2]

یہ بالکل فطری امر تھا کہ وہ لوگ سنتِ رسولؐ کے مطابق لیکن سنتِ عمر کے خلاف فتویٰ دینے کو گمراہی تصور کریں کیونکہ انہیں نے تو نقل کیا تھا کہ خدا نے حق کو عمر کی زبان پر قرار دیا ہے اور ایمان ان کی زبان پر بولتا ہے۔ نیز یہ کہ خدا نے ان کی رائے اور نظریے کو شرعی حکم قرار دیا ہے اور قرآن کو ان کے مطابق نازل کیا ہے۔ جب ایک آیت کے بعد دوسری آیت نازل ہوتی ہے تو رسول اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر ان کا عمر کے ساتھ اختلاف رائے ہو گیا ہے تو وہ عمر کے خیال اور رائے کی پیروی کریں!

یہ بالکل فطری بات تھی کہ ایسی احادیث پر اعتقاد رکھنے والے لوگ خلیفۂ عمر کے خیالات اور اجتہادات کے مطابق عمل کریں اور انہیں رسول اکرمؐ کے احکام پر ترجیح دیں۔ جیسا کہ ہم عمرۂ تمتع کے نمونے میں دیکھ چکے ہیں اور دوسرے نمونوں (مثلاً مسئلہ خمس[3]، حدیث رسولؐ لکھنے پر پابندی[4]، طبقاتی نظام کی بنیاد پر بیت المال کی تقسیم،

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۵۲ - زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۲۵۷

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۳۳۷ - زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۲۵۷

[3] مراۃ العقول کے مقدمے سے رجوع کریں جلد ۱ صفحہ ۷۶ - ۹۹

[4] ــــــ ایضاً ــــــ جلد ۱ صفحہ ۲۷ - ۴۲

تین دفعہ طلاق دینے کی بجائے ایک ہی مجلس میں تین مرتبہ طلاق کہنا اور رمضان المبارک میں نافلہ نماز باجماعت ادا کرنا) میں دیکھتے ہیں۔ ایسے بہت سے نمونے ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر امیرالمومنین علیؑ نے اپنے ایک خطبے کے آخر میں کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"خدا کی قسم! میں نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ماہ رمضان میں فقط واجب نمازیں باجماعت ادا کریں اور انہیں بتادیا کہ نافلہ نماز باجماعت پڑھنا بدعت ہے۔ میں نے دیکھا کہ میرے کچھ سپاہیوں نے جو میرے ہمراہ جنگ لڑ رہے تھے شور مچادیا کہ: "اے اہل اسلام! عمر کی سنت تبدیل کر دی گئی ہے۔ ہمیں ماہِ رمضان میں مستحب نماز سے باز رکھا جارہا ہے۔" مجھے خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں یہ گروہ میری فوج کے ایک حصے میں انقلاب نہ برپا کردے۔" [۱]

اسی طرح لوگ صحابہ میں سے بننے والے خلفاء مثلاً ابوبکر، عثمان اور معاویہ کے نظریات کے مطابق عمل کرتے تھے اور ان کے حق میں بہت سی روایات نقل کر کے ان سے استناد کرتے تھے [۲] اور صحابہ کے بارے میں بھی وہ ایک قسم کی عصمت کے قائل تھے اگرچہ وہ عصمت کو عدالت کا نام دیتے تھے اور کہتے تھے کہ:

"تمام صحابہ کی عدالت ثابت اور مسلمہ ہے" اور "تمام صحابہ عادل ہیں اور ان کے بارے میں کسی قسم کی کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔" [۳]

ہم نے کتاب مقدمہ مراۃ العقول [۴] میں صحابی خلفاء کے اجتہادات کی کچھ

---

[۱]

[۲] مثلاً روایت: "اِقْتَدُوا بِالَّذِيْنِ بَعْدِيْ اَبِيْ بَكْرٍ وَّ عُمَرَ" مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۸۲، ۳۸۵، ۳۹۹ اور ۴۰۲۔ سنن ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۰۹ حدیث ۳۶۶۹۔ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۳۷ حدیث ۹۷ [۳] مقدمہ کتاب الاستیعاب اور اسد الغابہ۔

[۴] مؤلف کی یہ کتاب عربی زبان میں ۲ جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

مثالیں دی ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ: وہ واحد شخص جن کا رسول اکرمؐ کے ارشادات اور حدیث و سنت کے مقابلے میں کوئی اظہار رائے یعنی اجتہاد ہمیں نہیں ملا وہ امیرالمومنین امام علیؑ ہیں۔ لیکن جہاں تک غیر صحابی خلفاء کی آراء اور نظریات کا تعلق ہے وہ بعد میں آنے والوں کے لیے سنت اور قابل تقلید قرار نہیں پائے۔ حالانکہ خلفاء کے مکتب نے پورا زور لگا کر کوشش کی کہ خلافت کے منصب کو بڑا دکھائیں اور اس کے مقابلے میں نبوت اور رسالت کے مقام کی تحقیر کریں۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل واقعات سے ظاہر ہے:

۱۔ ایک دن حجاج نے اپنے خطبے میں کہا:
لوگو! خدا کے خلیفہ اور اس کے چنے ہوئے عبدالملک بن مروان کی اطاعت کرو اور اس کے حکم پر کان دھرو۔[۱] پھر لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: کیا تمہارے نزدیک اس شخص کی قدر و قیمت زیادہ ہے جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے یا اس کی جو تمہارے خاندان کے درمیان تمہارا جانشین ہے؟[۲] (اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ پیغمبر خداؐ تو لوگوں کی جانب خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں لیکن عبدالملک خلق خدا کے درمیان جو خدا سے وابستہ ہیں خدا کا خلیفہ اور نمائندہ ہے) لہٰذا رسول اکرمؐ تو درحقیقت ایک چٹھی رساں کی مانند ہیں لیکن خلیفہ ایک خاندان کے بزرگ کے بڑے بیٹے کی طرح ہے جو باپ کی غیر موجودگی میں خاندان چلاتا ہے۔ پس دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔

ب۔ حجاج نے اموی حاکم عبدالملک کو اپنے ایک خط میں منصب خلافت کی بلندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا: زمین و آسمان فقط خلافت اور خلیفہ کے مقام کی قدر و قیمت اور اعتبار کی بنا پر قائم ہیں۔ خلیفہ خدا کے نزدیک ملائکہ مقرب اور انبیائے مرسلین سے بہتر اور برتر ہے کیونکہ خدا نے آدمؑ کو اپنے ہاتھ سے بنایا، انہیں اپنے بہشت میں جگہ دی، پھر زمین پر بھیج کر اپنا خلیفہ قرار دیا اور

---

[۱] سنن ابی داؤد۔ باب الخلفاء الحدیث ۴۶۴۵

[۲] سنن ابی داؤد جلد ۵ صفحہ ۲۰۹، عقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۵۲، مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۱۴۷

فرشتوں کو اپنے قاصد کے طور پر ان کے پاس بھیجا۔
عبدالملک یہ خط پڑھ کر بے حد خوش ہوا اور کہنے لگا: کیا ہی اچھا ہوتا کہ کچھ خارجی اس وقت میرے پاس ہوتے تاکہ میں ان سے اس خط کے مضمون کی بنیاد پر بحث مباحثہ اور استدلال کرتا۔[۱]

ج۔ ایک سال ولید بن عبدالملک نے حاکم مکہ عبداللہ بن خالد کو شہر مکہ میں پانی کا ایک کنواں کھودنے کا حکم دیا۔ کنواں کھودا گیا تو اس کا پانی بہت میٹھا نکلا۔ اس پر عبداللہ نے حکم دیا کہ کنویں سے پانی نکال کر چاہِ زمزم سے متصل ایک چمڑے کے بنے ہوئے حوض میں ڈالا جائے تاکہ لوگوں پر اس کنویں کے پانی کی آبِ زمزم پر برتری واضح ہو جائے۔ پھر اس نے ایک خطبہ دیا جس میں کہا:
اے لوگو! یہ بتاؤ کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ ایک شخص کا اس کے خاندان میں نمائندہ اور خلیفہ یا وہ شخص جو اس کا پیغام اس کے گھر والوں تک پہنچائے؟ بخدا اگر تم خلافت کے مقام کی فضیلت نہیں جانتے تو اس حادثے پر غور کرو۔ ابراہیمؑ خلیل الرحمٰن نے پروردگار سے پانی کی درخواست کی اور خدا نے انہیں کھاری پانی دیا اور جب خلیفہ نے خدا سے پانی کی درخواست کی تو اس نے اسے میٹھا پانی عطا کیا! اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ خلیفہ کے حکم سے جو کنواں کھودا گیا اس کا پانی چاہِ زمزم کے پانی سے بہتر ہے۔
اس کے بعد وہ کنواں خشک ہو گیا اور کسی کو پتا نہ چلا کہ اس کا کیا بنا۔[۲]

د۔ جب ولید بن یزید بن عبدالملک جیسے فاسق کو خلافت ملی تو ارمینستان کے والی مروان بن محمد نے اسے ایک خط لکھا اور اسے خلافتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے پر مبارکباد دی۔[۳]

---

[۱] عقد الفرید جلد ۵ صفحہ ۵۱
[۲] تاریخ طبری جلد ۵ صفحہ ۶۷ ۸۹ ہجری کے حوادث۔ تاریخ ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۲۰۵ تاریخ ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۷۶
[۳] تاریخ ابن کثیر جلد ۱۰ صفحہ ۸

۵۔ جب خلیفہ مہدی عباسی کی مجلس میں کہا گیا کہ ولید بن یزید زندیق تھا تو اس نے کہا: خدا کی خلافت کا مقام اس سے بالاتر ہے کہ ایک زندیق کے سپرد کر دی جائے۔[1]

یوں خلافت کے حامیوں نے خلافت کا مقام رسول اکرمؐ کی خلافت سے بلند کر کے خود خدا کی خلافت تک پہنچا دیا اور دریں اثنا عدالت اور استحکام اسلام کی پابندی کی شرط ان احادیث میں سے جو انہوں نے خود روایت کیں، حذف کر دی جیسا کہ حذیفہ سے صحیح مسلم میں نقل کیا گیا ہے کہ: رسول اکرمؐ نے فرمایا:

میرے بعد ایسے امام ہوں گے جو میرے طور طریقوں پر نہیں چلیں گے اور میری سنت قبول نہیں کریں گے۔ ان میں ایسے آدمی ہوں گے جن کے دل شیطانوں کے اور بدن انسانوں کے ہوں گے۔

حذیفہ کا کہنا ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! اگر میں اس زمانے میں زندہ ہوں تو کیا کروں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: تمہیں چاہیے کہ امیر کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ اگرچہ وہ تمہیں تازیانے لگائے اور تمہارا مال چھین لے پھر بھی اس کی اطاعت کرو اور اس کے فرمانبردار رہو۔[2]

اسی طرح ابن عباس کی زبان سے بھی ایک جعلی حدیث روایت کی گئی ہے جس کے مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا: جو شخص اپنے امام سے کوئی ایسی چیز دیکھے جس سے وہ نفرت کرتا ہو تو اسے چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک قدم یا ایک بالشت دور ہو جائے اور مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔[3]

ایک اور روایت میں نقل کیا گیا ہے کہ:

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۱۰ صفحہ ۸

[2] صحیح مسلم۔ باب الامر بلزوم الجماعۃ جلد ۶ صفحہ ۲۱

[3] ـــــ ایضاً ـــــ جلد ۶ صفحہ ۲۰۔۲۱

کوئی شخص حکومت کی اطاعت کی حد سے ایک قدم باہر نہیں رکھتا اور نہیں مرتا مگر یہ کہ وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے[1]

جس زمانے میں یزید بن معاویہ کی فوج نے مدینہ پر چڑھائی کی، وہاں لوٹ مچائی، شہر کے رہنے والوں کو قتل کیا اور ان کی بے آبروئی کی، اسی زمانے میں عبداللہ بن عمر نے یہ روایت نقل کی۔

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جو شخص حکومت سے اطاعت کا رشتہ توڑ لے گا خدا اس سے قیامت کے دن اسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ اس کے پاس اس فعل کے لیے کوئی عذر یا دلیل نہ ہو گی اور جو شخص مر جائے اور اس کی گردن پر کسی حاکم کی بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے[2]

علمائے حدیث کے امام، نووی نے اس حدیث کی شرح میں یوں کہا ہے:

"عموم اہل سنت یعنی فقہاء، محدثین اور متکلمین نے کہا ہے کہ: خلیفہ فسق و فجور، ظلم و تعدی اور لوگوں کے حقوق کی پامالی کے جرم میں خلافت سے معزول نہیں ہو جاتا اور ایسے اعمال کی بنا پر اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا جائز نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اسے وعظ و نصیحت کی جائے اور عذاب الٰہی سے ڈرایا جائے کیونکہ اس بارے میں احادیث میں یہی حکم دیا گیا ہے"[3]

نووی ایک اور مقام پہ کہتے ہیں:

خلفاء کے خلاف قیام اور ان سے جنگ کرنا خواہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہوں مسلمانوں کے اجماع کے مطابق حرام ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کے متعلق بہت سی حدیثیں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں اہل سنت کا اس امر پہ اجماع ہے کہ سلطان فسق کی بنا پر معزول نہیں ہوتا[4] اور خلیفہ کی اطاعت کے واجب ہونے کے بارے میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

[1-2] صحیح مسلم: باب الامر بلزوم الجماعۃ جلد ۶ صفحہ ۲۰-۲۱

[3-4] شرح نووی بر صحیح مسلم جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۹

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ...."

اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور تم میں جو اولی الامر ہو اس کی اطاعت کرو ... (سورۂ نسار آیت ۵۹)

تیسری صدی ہجری کے اواخر کے ایک حنفی فقیہہ جو اس مذہب کے عظیم پیشواؤں میں سے تھے اپنی ایک کتاب میں جو انہوں نے عوام کے لیے لکھی ہے یوں کہتے ہیں:

ساتواں مسئلہ یہ ہے کہ ایک جابر یا عادل امیر کے پیچھے نماز پڑھنا روا ہے کیونکہ سلطان کی اطاعت کرنا فرض ہے اور اس کا ترک کرنا گناہ اور بدعت ہے۔ جو شخص سلطان کی اطاعت نہ کرے وہ ذلیل و خوار ہے کیونکہ خدا نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ.

اے ایمان والو خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور امیر کی اطاعت کرو۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ امیروں کے حق میں بد دعا کرنا بدعت ہے اور یہ بھی فرمایا کہ یا رب! امیروں کو نیک بنا اور جاہلوں کو ان پر مسلّط نہ کر، اور تمہیں رافضیوں کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔ جو سلطان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور تلوار کھینچ لیتے ہیں۔ تمہیں کسی بنا پر بھی سلطان کے خلاف بغاوت نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ عدل کرے تو اس کا بدلہ ثواب پاتا ہے اور اگر ظلم کرے تو اس کی سزا اور عذاب بھگتتا ہے۔ ہر حالت میں سلطان کی اطاعت کرنی چاہیے اور جو شخص سلطان کی اطاعت نہ کرے وہ خوارج میں سے ہے۔[1]

گزشتہ مباحث کا نتیجہ

اب تک ہم نے جو احادیث نقل کی ہیں ان سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ: خلیفہ جو حکم

---

[1] ابو القاسم اسحٰق بن محمد حکیم سمرقندی السواد الاعظم۔ تقریباً ۳۷۰ھ ہجری میں اس کا ترجمہ امیر نوح سامانی کے حکم سے کیا گیا۔ ۱۳۴۸ھ ہجری میں عبد الحئی حبیبی کے اہتمام سے تہران میں چھپی۔

بھی دے اس کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔

اب ہم خلیفہ کی مطلق اطاعت کے بارے میں مسلمانوں کے اعتقاد کے کچھ واقعات تاریخ سے پیش کرتے ہیں۔

ا۔ مسعودی مروج الذہب میں لکھتے ہیں:

حصین بن نمیر اور اس کی ماتحت شامی فوجوں نے مکہ کی نواحی پہاڑیوں پر منجنیقیں نصب کر دیں اور خانہ کعبہ پر آگ کے گولے برسائے جس کے نتیجے میں خانہ کعبہ کا کچھ حصہ منہدم ہو گیا اور اس کی عمارت جل گئی۔ اس بارے میں اہل مکہ یہ رجز پڑھتے تھے:

"نمیر کے بیٹے نے برا کام کیا ہے
اس نے مقام ابراہیم اور نماز کی جگہ کو آگ لگا دی"۔[۱]

ب۔ یعقوبی نے کہا ہے:

جب دونوں لشکر جنگ بند کر دیتے تھے، عبداللہ بن زبیر کا سرکاری خطیب اور مقرر عبید بن عمیر لیثی کعبہ کی چھت پر کھڑا ہو جاتا اور بلند آواز سے کہتا تھا:

اے شامیو! یہ خدا کا حرم ہے جو جاہلیت کے زمانے میں ہر اڑنے والے اور رینگنے والے جانور کے لیے جائے امان تھا۔ اے اہل شام! خدا سے ڈرو"۔

شامی جواب میں کہتے تھے: "اطاعت.... خلیفہ کے حکم کی اطاعت...... !

شام سے پہلے صبح کے وقت حملہ......"[۲]

شام کے کچھ لشکری اپنے فعل کی توجیہ ان الفاظ میں کرتے تھے:

"خدا کے گھر کی حرمت اور خلیفہ کی اطاعت کا آپس میں ٹکراؤ ہو گیا۔ خلیفہ کے حکم کی اطاعت اور پیروی کعبہ کی حرمت پر غالب آگئی!"[۳]

---

[۱] مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۷۱-۷۲ مطبوعہ بیروت

[۲] تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۵۱-۲۵۲ مطبوعہ بیروت ۱۳۷۹ھ

[۳] ـــــــــ ایضاً ـــــــــ

ج۔ سیوطی نے تاریخ خمیس اور تاریخ خلفاء میں لکھا ہے:
شامیوں نے منجنیقوں کے ذریعے خدا کے گھر پر آگ کے جو گولے برسائے اس کے نتیجے میں خانہ کعبہ کے پردے اور اس کی چھت جل گئی۔ نیز خدا نے اسماعیلؑ کی جگہ قربان ہونے کے لیے جو مینڈھا بھیجا تھا اس کے سینگوں کو بھی، جو خانہ کعبہ کے دروازے پر لٹکے ہوئے تھے آگ لگ گئی اور وہ جل کر راکھ ہو گئے۔[1]
طبری اور دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ:
خدا کے گھر کو منجنیقوں کے گولوں کا ہدف بنایا گیا اور اسے آگ لگا دی گئی اور شامی یوں رجز خوانی کرتے تھے:

خَطَّارَةٌ مِثْلَ الْفَنِيقِ الْمُزْبِدِ   نَرْمِي بِهَا أَعْوَادَ هٰذَا الْمَسْجِدِ

اس منجنیق کے ساتھ جس کے منہ سے مست اونٹ کی طرح جھاگ نکلتی ہے ہم اس مسجد کی لکڑیوں پر گولہ باری کرتے ہیں۔
ایک اور رجز خوان کہتا تھا:

كَيْفَ تَرَى صَنِيعَ أُمِّ فَرْوَهْ   تَأْخُذُهُمْ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَهْ

تم اس منجنیق کی کارکردگی کو کیسا پاتے ہو جو صفا اور مروہ کے درمیان رہنے والوں پر گولے برساتی ہے۔

شہر امن میں بدامنی

د۔ ذہبی نے روایت کی ہے کہ شام کی فوج کے سالار حجاج نے مکہ کی نواحی پہاڑیوں پر پانچ منجنیقیں نصب کر کے خانۂ کعبہ پر ہر طرف سے پتھروں اور آگ کی بارش کر دی جس کے نتیجے میں کعبہ کے پردے جل گئے۔ اسی اثنا میں ایک ابر ظاہر ہوا جس سے مینہ برسا اور آگ بجھ گئی۔ ساتھ ہی آسمانی بجلی بھی گری جس نے منجنیقوں سمیت پچاس سپاہیوں کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔ تب حجاج نے اپنے

---

[1] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۳۰۳ اور تاریخ خلفاء صفحہ ۲۰۹

سے کہا: تمہیں ان حوادث سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ گھٹاؤں اور بجلیوں کی سرزمین ہے اور جو کچھ ہوا ہے قطرت کے مطابق ہوا ہے[1]

پھر یہ آواز بلندیوں گویا ہوا: اے اہل شام! خدارا خدا کو یاد کرو..... اور خلیفہ کی اطاعت کرو۔[2]

اس نے مزید کہا: وائے ہو تم پر! کیا تم نہیں جانتے کہ گزشتہ امتوں پر آسمانی بجلی گرتی تھی اور ان کی قربانیوں کو جلا دیتی تھی اور یہ بجائے خود کی طرف سے ان کی قربانی کی مقبولیت کی علامت ہوتی تھی۔ لہٰذا اگر تمہارا عمل خدا کی بارگاہ میں قبول نہ ہوتا تو آگ نازل نہ ہوتی اور ان لوگوں کو نہ جلاتی[3]

۷۔ فتح پانے کے بعد حجاج نے رسول اکرمؐ کے صحابی عبداللہ بن زبیر اور کئی دوسرے مسلمانوں کے سر کاٹ کر مدینہ بھیج دیے، جہاں وہ کئی دنوں تک راستے پر رکھے رہے تاکہ آنے جانے والے لوگ انہیں دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔ پھر اس نے وہ سر خلیفہ عبدالملک کے پاس شام بھیج دیے۔ جو شخص سر لے کر خلیفہ کے پاس پہنچا اسے خلیفہ نے پانچ سو دینار انعام دیا اور عمرہ ادا کرنے والے حاجیوں کی طرح شکر باری تعالیٰ کے طور پر اپنے اور اپنے بیٹوں کے سر کے اگلے حصے کے بال کٹوا دیے۔[4]

مدینہ کی تاخت و تاراجی

شامیوں نے خلیفہ کی اطاعت کرتے ہوئے اس کے حکم کے بموجب حرم کعبہ کے

---

[1] ذہبی: تاریخ الاسلام جلد ۳ صفحہ ۱۱۴ کا خلاصہ، تاریخ ابن کثیر جلد ۸ صفحہ ۳۲۹، تاریخ طبری مطبوعہ یورپ جلد ۲ صفحہ ۸۴۴ - ۸۴۵ اور تاریخ خلفاء صفحہ ۲۱۲

[2] ذہبی: تاریخ الاسلام جلد ۳ صفحہ ۱۱۴

[3] تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۳۰۵

[4] تاریخ ابن کثیر جلد ۸ صفحہ ۳۳۲

ساتھ جو کچھ کیا وہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے حرمِ رسولؐ اور قبرِ رسولؐ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

و۔ طبری اس بارے میں کہتا ہے:

یزید بن معاویہ نے اپنے سپہ سالار کو حکم دیا کہ وہ اپنے سپاہیوں کے لیے مدینہ میں تین دن تک قتل و غارت اور آبرو ریزی کو مباح قرار دیدے۔ اس نے بھی خلیفہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو تین دن کے لیے مدینہ شہر میں کھلی چھٹی دیدی۔ ان تاراج گروں نے مدینہ کے مسلمانوں کو قتل کیا، ان کا مال لوٹا اور ان کی عورتوں کے ساتھ زیادتی کی۔ یہاں تک کہ ایک ہزار کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کی جس کے نتیجے میں ہزار بن بیاہی عورتوں نے بچوں کو جنم دیا۔ جب مقتولین کی گنتی کی گئی تو ان میں سات سو مقتولین سر برآوردہ مہاجرینؓ انصار اور موالی تھے جبکہ دس ہزار دوسرے مسلمان تھے۔ قتل ہونے والوں میں سات سو حافظ قرآن بھی شامل تھے۔

تین دن کے قتل و غارت کے بعد چوتھے دن شامی لشکر کے سالار نے شہر کے لوگوں سے بیعت لی کہ وہ یزید کے زر خرید غلام ہیں۔ وہ ان میں سے ہر ایک سے کہتا: تم بیعت کرو کہ تم جنگی مال غنیمت میں سے امیر المومنین یزید کا خاص حصہ ہو اور اسے یہ حق حاصل ہے کہ تمہارے مال اور اولاد کے ساتھ جو جی چاہے کرے۔ اگر کوئی شخص ایسی بیعت کرنے سے انکار کرتا اور کہتا کہ میں کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ پر بیعت کرتا ہوں تو اس کا سر تن سے جدا کر دیا جاتا۔

پھر اس نے مقتولین کے سر یزید کے پاس شام بھیج دیے اور جب وہ سر یزید کے سامنے زمین پر گرائے گئے تو اس نے مشرکین کے شاعر ابن زبعری کے یہ شعر پڑھے [1]

---

[1] ابن زبعری زمانۂ جاہلیت میں کفار قریش کا شاعر تھا۔ اس نے یہ اشعار احد میں شہید ہونیوالے مسلمانوں کے بارے میں کہے تھے اور جنگ میں قتل ہونیوالوں کے متعلق تشفّی کا اظہار کیا تھا۔

اے کاش میرے اجداد جو بدر میں مارے گئے اس وقت موجود ہوتے
اور خزرجیوں کی بے کسی دیکھتے
اور خوش ہوتے اور کہتے
اے یزید تیرے ہاتھ سلامت رہیں۔

ز۔ اہل مدینہ کی سرکوبی کے بعد شام کا لشکر مکہ روانہ ہوا تاکہ وہاں کے باسیوں کو جنہوں نے خلیفہ یزید کے خلاف بغاوت کر رکھی تھی خاموش کر دے۔ راستے میں لشکر کے سالار مسلم بن عقبہ کی موت کا وقت آ پہنچا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں خدا سے مناجات کی اور کہا:

بار الہا! میں نے تیرے خلیفہ یزید بن معاویہ کی جو فرمانبرداری کی ہے اور اہل مدینہ کا جو قتل عام کیا ہے اس کے بعد اگر تو مجھے عذاب دے تو میں بے حد بدنصیب ہونگا۔ بار الہا! میں تیری وحدانیت اور محمدؐ کی رسالت کی شہادت کے بعد اپنی بخشش کے لیے (خلیفہ کی اطاعت کرتے ہوئے) اپنے کسی عمل کو مدینہ کے لوگوں کے قتل عام سے زیادہ امید بخش نہیں سمجھتا اور اگر ایسا کام انجام دینے کے بعد میں دوزخ میں جاؤں تو بلاشبہ میں بڑا بدقسمت ہوں گا۔[1]

اہل مدینہ کے ساتھ بدسلوکی

ح۔ مکہ میں ابن زبیر کو قتل کرنے کے بعد حجاج مدینہ آیا۔ اس نے وہاں تین مہینے قیام

---

[1] مندرجہ ذیل کتابوں کا خلاصہ:
تاریخ طبری جلد ۷ صفحہ ۱۱-۱۴ ۶۳ھ ہجری کے حوادث، تاریخ ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۴۷-۴۹ اور ۱۶۴، تاریخ ابن کثیر جلد ۸ صفحہ ۲۲۰-۲۲۵، تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۵۱-۲۵۲ مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۱۷، انساب والاشراف صفحہ ۲۶۴، فتوح اعثم جلد ۵ صفحہ ۳۰۰ عقد الفرید جلد ۴ صفحہ ۳۹۰، تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۲ صفحہ ۳۵۷ اور اس کی تفصیل مقدمہ مراۃ العقول جلد ۲ صفحہ ۳۳۶-۳۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔

کیا۔ اپنے اس مختصر قیام کے دوران اس نے اہل مدینہ کو سخت تکلیفیں دیں اور ان کا تمسخر اڑایا۔ اس نے خاص کر کے اصحاب رسولؐ کی خوب خوب توہین کی اور ان کی گردنوں پر غلامی کا داغ لگایا۔[۱] اس نے جابر بن عبد اللہ کے ہاتھ اور انس بن مالک کی گردن پر غلامی کی مہر لگادی اور یوں انہیں ذلیل کرنا چاہا۔

اس نے سہل بن سعد کو اپنے پاس بلایا اور کہا:

"تم نے امیر المومنین عثمان کی مدد کیوں نہیں کی؟" اس نے جواب دیا: "میں نے یہ کام کیا تھا۔" حجاج نے کہا: "تم جھوٹ بکتے ہو۔" پھر اس نے حکم دیا کہ اس کی گردن پر مہر لگادی جائے۔[۲]

اہلبیت رسولؐ کو قتل کرنا اور آپ کی بیٹیوں کو قیدی بنانا

ط۔ یہ خلیفہ کی اطاعت کی خاطر تھا کہ اس کے حامیوں نے کربلا میں اہلبیتؑ پر پانی بند کر دیا اور ان کو قتل کیا۔ یہاں تک کہ شیر خوار بچے پر بھی رحم نہ کھایا اور اسے بھی قتل کر دیا۔ شہیدوں کے جسموں پر گھوڑے دوڑائے، اہلبیتؑ کا مال و اسباب لوٹا، ان کے خیموں کو آگ لگائی۔ رسولؐ کی بیٹیوں اور ان کے خاندان کی عورتوں کو قیدی بنایا۔ رسولؐ کے بیٹوں کے سر تن سے جدا کر کے انہیں قیدیوں کے ساتھ شہر بہ شہر پھرایا اور بالآخر کافر قیدیوں کی مانند خلیفہ یزید کے دربار میں پیش کیا

خلیفہ کی اطاعت کی راہ میں

وہ سب کچھ جس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے خلیفہ کی اطاعت کی خاطر انجام پایا۔

---

[۱] خلفاء کی حکومت کے زمانے میں صدقے کے اونٹوں کی گردنیں اور بازو سیسے کی مہر سے داغ دیے جاتے تھے جس کا مطلب تھا کہ یہ حیوان حکومت کی ملکیت ہیں چنانچہ صحابہ کی گردنوں یا ہاتھ پر مہر لگانے کے معنی یہ تھے کہ وہ خاص خلیفہ کی ملکیت ہیں۔

[۲] تاریخ طبری جلد ۷ صفحہ ۲۰۶ ۷۴ھ ہجری کے حوادث۔ تاریخ ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۱۳۹ تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۲۷۲۔

جب شامیوں نے خانۂ خدا پر منجنیقوں سے حملہ کیا اور کسی نے ان سے کہا کہ "یہ خدا کا حرم ہے" تو انہوں نے اس کے جواب میں چلا کر کہا: "اطاعت... اطاعت...!" اور یہ بھی کہا کہ: "خدا کے گھر کی حرمت اور خلیفہ کی اطاعت باہم ٹکرا گئے اور خلیفہ کی اطاعت خدا کے گھر کی حرمت پر غالب آئی۔"

حجاج کی سپہ سالاری کے زمانے میں جب شام کے سپاہیوں پر بجلی گری اور انہوں نے خانہ کعبہ پر حملہ کرنے سے ہاتھ کھینچ لیا تو حجاج نے چلا کر کہا: "خدا کو یاد رکھو۔ خلیفہ عبدالملک کی اطاعت کے بارے میں خدا کو یاد رکھو!"

جب یزید کا سپہ سالار مسلم بن عقبہ اہل مدینہ پر فتح پاتے اور کشت و خون اور بے آبروئی کا بازار گرم کرنے کے بعد مکہ روانہ ہوا تاکہ وہاں کے لوگوں پر بھی ایسے ہی مظالم ڈھائے اور جب راستے میں موت کے چنگل میں پھنس گیا تو اس نے جان کنی کی حالت میں کہا: "بارالہا! میں نے خلیفہ کی جو اطاعت کی ہے اور اہل مدینہ کا جو خون بہایا ہے اگر تو اس کے باوجود مجھے عذاب دے تو یہ میری انتہائی بدقسمتی ہو گی۔"

کربلا میں یزید کے ایک سردار لشکر عمرو بن حجاج نے عاشورا کے دن کوفہ کے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: "اے اہل کوفہ! اطاعت کرنے میں پیچھے مت رہو اور جماعت سے دور نہ رہو۔ جو شخص دین سے باہر نکل گیا ہے اور "امام" یزید بن معاویہ کی مخالفت کرتا ہے اسے قتل کرنے میں لحظہ بھر کے لیے بھی تذبذب کو اپنے دل میں راہ نہ دو۔"

کعب بن جابر کہ جس نے کربلا میں سیدالشہداء کے خلاف جنگ کی تھی خدا سے مناجات میں یوں کہا کرتا تھا: "اے پروردگار! ہم نے (خلیفہ کے ساتھ) اپنا عہد پورا کیا۔ ہمیں ان لوگوں کے برابر قرار نہ دے جنہوں نے خلیفہ سے بے وفائی کی اور اس کی اطاعت سے سرتابی کی۔"

امام حسینؑ کا قاتل شمر بن ذی الجوشن صبح کی نماز کے بعد روشنی پھیلنے تک دعا مانگا کرتا تھا اور اپنی دعا میں کہتا تھا: اے پروردگار! مجھے بخش دے۔" لوگ اس سے کہتے تھے: "خدا تجھے کیسے بخشے گا کہ تو فرزند رسولؐ کے خلاف جنگ کرنے کے لیے گھر سے نکلا اور ان کے قتل میں شریک رہا؟" وہ جواب میں کہتا: "وائے ہو تم پر ہمیں

کیا کرنا چاہیے تھا؟ ہمارے حاکموں نے ہمیں حکم دیا اور ہم نے ان کی مخالفت نہ کی اور اگر مخالفت کرتے تو ان گدھوں سے بھی گھٹیا ہوتے۔" [1]

احکام اسلام میں تبدیلی کا دوسرا عامل

جب خلفاء کے مکتب نے "خلفاء کی اطاعت" کو ایک بہت بڑا اسلامی فریضہ قرار دیا اور اس بات کے معتقد ہو گئے کہ آیہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں "اُولِی الْاَمْرِ" سے مراد رسمی خلفاء ہی ہیں جن کی اطاعت خدا نے واجب کی ہے اور ان احادیث سے بھی استناد کیا جو انہوں نے رسولِ اکرمؐ سے منسوب کیں اور جن میں کہا گیا ہے کہ حکام کی اطاعت ہر حال میں لازم و لابد ہے تو انہوں نے اس بات کی تشہیر کی کہ رسمی خلفاء ہی خدا کے خلفاء ہیں اور وہ جو حکم دیں اس کی اطاعت کرنا فرض اور واجب ہے۔

جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس چیز کا مؤثر اور طاقتور عامل تھا کہ خلفاء کے نظریات خواہ اسلام کے مسلّمہ احکام کے برعکس ہی کیوں نہ ہوں خلفاء کے مکتب کے پیرو انہیں قبول کریں اور انہیں عملی جامہ پہنائیں جیسا کہ لوگوں نے حرمین شریفین، اہلبیت اطہارؑ اور صحابۂ کرامؓ کی عظمت کو پامال کرنے کے سلسلے میں کر دکھایا تھا۔ علاوہ ازیں سیکڑوں دوسری مثالیں بھی موجود ہیں مثلاً جمعہ کے خطبوں میں منبروں سے امیرالمومنین علیؑ پر لعنت کو ایک مستقل سنت قرار دیا گیا اور یوم عاشورا کو جو امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا دن ہے، عید کا دن قرار دیا گیا۔

لیکن اس تمام تقدس کے باوجود جو بھی خلفاء کی آراء کو ان لوگوں کے نزدیک حاصل تھا کسی رائے کو خلفائے راشدینؓ کی آراء اور اجتہادات جیسی پائیدار شرعی اور سنتی حکم کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی کیونکہ جن باتوں کو اموی خلفاء نے سنت کے طور پر رواج دیا تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور بالخصوص عباسی خلافت کے قائم

---

[1] ذہبی: تاریخ اسلام جلد ۳ صفحہ ۱۸-۱۹ پہلا ایڈیشن

ہونے کے بعد بھلا دیا گیا۔ تاہم سنّتِ رسول ص کے مقابلے میں خلفائے راشدین کی سنّت اس وقت سے لیکر اب تک مسلمانوں کے بعض فرقوں کے نزدیک دینی احکام کے طور پر قبول کی جاتی ہے اور وہ ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ فقط وہ جعلی روایات ہیں جن کے بارے میں ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اور جن میں کوشش کی گئی ہے کہ رسول اکرم ص کا رتبہ گھٹا دیا جائے اور خلفائے راشدین کا خصوصاً حضرت عمر بن خطاب کا مرتبہ بڑھایا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ چیز اسلام کے کچھ احکامات میں تحریف کا دوسرا اہم عامل تھی اور یہی مستشرقین کے اس قول کا اصلی سبب ہے کہ اسلام کے احکامات نے رسول اکرم ص کی وفات کے بعد بتدریج ترقی کی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی گیرائی اور گہرائی میں اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ یہودی مستشرقین اگناس گلڈزیھر نے اس موضوع پر "اسلام میں اعتقادات اور احکامات کا تکامل" کے نام سے ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے۔

ائمہ اہلبیت ع سے رجوع نہ کرنے کا نتیجہ

جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ ایک عمل کا نتیجہ ہے اور وہ مسلمانوں کا ائمہ اہل بیت ع سے رجوع نہ کرنا اور دور رہنا ہے۔ ائمہ اہلبیت ع وہ بزرگوار ہیں جو سوال کرنے والے کے جواب میں یوں فرماتے ہیں: مَهمَا اَجَبتُكَ بِشَيءٍ فَهِيَ عَن رَّسُولِ اللّٰهِ ص لَسنَا نَقُولُ بِرَاْيِنَا مِن شَيءٍ [۱] میں نے جو جواب تمہیں دیا ہے وہ یقیناً رسول اکرم ص کی جانب سے ہے۔ ہم اپنے خیال اور رائے سے ہرگز کچھ نہیں کہتے۔

ایک اور موقع پر صادقِ آلِ محمد ع نے فرمایا:

میرا قول میرے باپ کا قول ہے اور میرے باپ کا قول میرے دادا —— کا قول ہے اور میرے دادا کا قول حسین ع کا قول ہے اور حسین ع کا قول حسن ع کا قول ہے اور حسن ع کا قول امیر المومنین علی ع کا قول ہے اور امیر المومنین ع کا قول رسولِ خدا ص کا قول ہے اور رسولِ خدا ص کا قول خدا کا قول ہے۔ [۲]

---

[۱] بصائر الدرجات: مؤلفہ محمد حسن صفار (ت ۲۹۰ ھ) سال ۱۲۸۵ھ صفحہ ۳۰۱

[۲] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۵۳، تحقیق علی اکبر غفاری۔

اگر مسلمان اپنے پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد ان کے اہلبیتؑ سے رجوع کرتے اور اپنے دین کے عقائد و احکام ان سے حاصل کرتے تو اسلام عزیز ان مصیبتوں میں گرفتار نہ ہوتا جن میں وہ گرفتار رہا ہے کیونکہ رسول اکرمؐ نے اپنی امت کو یہ وصیت فرمائی تھی:

اِنِّی مُخَلِّفٌ فِیکُمُ الثَّقَلَیْنِ: کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِی اَھْلَ بَیْتِی مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِی، وَقَدْ اَنْبَانِیَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ اِنَّھُمَا لَا یَفْتَرِقَانِ حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ۔[1]

میں تمہارے درمیان دو گرانمایہ چیزیں چھوڑ رہا ہوں: خدا کی کتاب اور میری عترت اور اہلبیتؑ اگر تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے لطیف و خبیر پروردگار نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہ ہوں گے حتٰی کہ حوض پر میرے پاس پہنچیں۔

نیز یہ کہ رسولِ اکرمؐ کے بعد ہی بزرگوار اولی الامر ہیں کیونکہ معاویہ، یزید، ولید، ہارون، متوکل اور عثمانی خلفاء۔ جیسے حکام مسلمانوں کے اولی الامر نہیں ہو سکتے۔ جس طرح رسول اکرمؐ مکہ میں مسلمانوں کے ولی امر تھے حالانکہ حاکم نہ تھے اسی طرح ائمہ اہلبیتؑ بھی مسلمانوں کے ولی الامر ہیں اور خدا نے آیۂ کریمہ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں حکم دیا ہے کہ ان کی پیروی کی جائے حالانکہ وہ حاکم نہ تھے کیونکہ ولایت امر خدا کی جانب سے ہے۔ اگرچہ حکومت ان کا خاص حق ہے لیکن جب تک لوگ تعاون نہ کریں یہ حق حقدار کو نہیں پہنچ سکتا۔

مکتب اہلبیتؑ میں رسولِ اکرمؐ کے اوصاف

گزشتہ بحث میں ہم نے مکتب خلفاء کی ایسی بہت سی روایات پیش کی ہیں جن میں رسول اکرمؐ کی ذاتِ اقدس سے کچھ ناروا باتیں منسوب کی گئی ہیں۔ اب مناسب ہوگا کہ ہم اس بحث کو بخوبی ختم کرنے کے لیے اہلبیتؑ کی کتابوں سے کچھ روایات نقل کریں:

---

[1] صحیح مسلم: باب فضائل الصحابہ، حدیث ۳۶، ۳۷۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۳۶۶

اس مکتب کی معتبر کتابوں میں حضرت امام حسن ؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا:
میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ تمیمی [۱] سے ـــ جو رسولِ اکرمؐ کے اوصاف بڑے دل نشیں انداز میں بیان کرتے تھے ـــ رسولِ اکرمؐ کی شکل و شباہت کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگے:
رسولِ اکرمؐ کی شبیہہ بڑی دلکش اور دلآویز تھی معلوم ہوتا تھا کہ دیکھنے والے کے سارے وجود کو اپنے اندر جذب کر رہے ہیں۔ آپ کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی مانند درخشاں تھا۔ آپ کے گیسوئے مبارک نہ گھنگھریالے تھے اور نہ ہی بالکل سیدھے تھے۔ اگر آپ انہیں پشت پر گراتے تو مانگ نکال لیا کرتے تھے اور اگر وہ الجھے ہوئے ہوتے تو کان کی لو سے نیچے تک نہیں آتے تھے۔
آپ کا چہرہ روشن، پیشانی بلند اور بھویں کشادہ تھیں۔ آپ کی دونوں بھوؤں کے درمیان ایک رگ تھی جو غصے کے وقت خون کی زیادتی کے سبب ابھر جاتی تھی۔
آپ کی لمبی ناک پر ایک چمکدار لکیر تھی جس کی وجہ سے ہر دیکھنے والا پہلی نظر میں ہی سمجھ جاتا تھا کہ آپ کی ناک بیچ میں ابھار ہے۔ آپ کی گردن روپہلی، بدن میانہ اور پٹھے گھٹے ہوئے تھے۔ آپ کا سینہ اور پیٹ ہموار تھے اور ان میں کوئی ابھار نہ تھا۔ آپ کی ہڈیاں سخت تھیں جبکہ کندھے اور سینہ کشادہ تھے۔ آپ کی ہتھیلیاں فراخ تھیں۔ ٹخنے سے لیکر گھٹنے تک آپ اپنے قوی پاؤں کے ساتھ جن کے تلوؤں میں گڑھے تھے لمبے قدم اٹھاتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے پاؤں زمین سے اکھاڑ رہے ہیں۔ آپ کافی جھک کر بڑی آہستگی اور متانت کے ساتھ راستہ چلتے تھے جیسے کہ کوئی ڈھلوان پر چل رہا ہو۔ آپ کے دونوں بازوؤں پر کہنیوں تک بکثرت بال تھے لیکن پیٹ اور دونوں پستانوں پر

---

[۱] ہند بن ابی ہالہ بی بی خدیجہؓ کے فرزند تھے جو ان کے رسول اکرمؐ سے پہلے شوہر ابی ہالہ سے تھے۔ ہند امام حسنؑ کے سببی ماموں ہوتے تھے۔ وہ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ وہ بڑے ادیبانہ انداز میں رسول اکرمؐ کی مدح سرائی کرتے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کہ منظوم قصیدہ پڑھ رہے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ امام حسنؑ کی باتیں پسند کرتے تھے۔ اس بارے میں علامہ طبرسی کی مکارم الاخلاق صفحہ ۱۱-۲۳ سے رجوع کریں۔

کوئی بال نہ تھا۔ آپ کے سینے پر بال تھے جو ایک سیدھی لکیر کی شکل میں ناف تک جاتے تھے۔ آپ ہمیشہ اپنی آنکھیں نیچی رکھتے تھے۔ آپ کی نگاہ آسمان کے مقابلے میں زمین پر زیادہ رہتی تھی۔ دیکھنے کے لیے آپ پورے بدن کے ساتھ گھوم جاتے تھے اور پھر کسی طرف دیکھتے تھے۔ آپ کبھی آنکھیں پھاڑ کر نہیں دیکھتے تھے بلکہ ملاحظہ آمیز انداز میں دیکھتے تھے جس کسی سے ملاقات ہوتی اسے سلام کہنے میں پہل کرتے تھے۔

امام حسنؑ نے فرمایا: میں نے ان سے (ہند بن ابی ہالہ سے) کہا کہ مجھے رسول اکرمؐ کی باتیں کرنے کے بارے میں بتائیں۔

انہوں نے کہا: آپ ہمیشہ غمگین رہتے تھے اور سوچ بچار کرتے تھے۔ آپ کو آرام میسر نہ تھا، تاہم آپ بلا ضرورت بات نہیں کرتے تھے۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہوتا تھا وہ الفاظ کی صحیح ادائیگی اور پوری وضاحت کے ساتھ کسی کمی بیشی کے بغیر بیان فرماتے تھے۔ آپ بڑبڑا کر یا منہ ہی منہ میں بات نہیں کرتے تھے اور نہ ایسی کوئی بات کرتے تھے جو دوسرے کی سمجھ میں نہ آئے بلکہ حقِ سخن ادا کر دیتے تھے۔ آپ اپنی ملائم طبیعت کی وجہ سے نرمی سے بات کرتے تھے اور آپ کے کلام میں تلخی اور ہلکا پن نہیں ہوتا تھا۔

آپ خدا کی نعمت کو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو بڑی سمجھتے تھے اور اس کی برائی نہیں کرتے تھے۔ ذائقے اور لذت کی بنا پر کھانے کی زیادہ تعریف نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس کی برائی کرتے تھے۔ دنیا سے اور دنیا کی چیزوں سے کبھی بھی غصے میں نہیں آتے تھے لیکن حق کے معاملے میں کوئی چیز اس وقت تک آپ کے غضب کے سامنے نہیں ٹھیر سکتی تھی۔ جب تک آپ حق کی مدد نہیں فرما لیتے تھے۔ اشارہ کرتے وقت آپ پورے ہاتھ سے اشارہ فرماتے تھے اور حیرت کے وقت اپنا دست مبارک الٹا کر دیتے تھے۔ بات کرتے وقت آپ اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے نزدیک لے جاتے تھے اور انگوٹھا بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے تھے۔ غصے کے وقت چہرہ ترش کر کے پھیر لیتے تھے۔ خوشی کے وقت آپ آنکھیں جھکا لیتے تھے۔ آپ کی ہنسی زیادہ تر مسکراہٹ کی شکل میں ہوتی تھی۔ آپ جب منہ کھولتے تو آپ کے سفید دانت چمک دار اور نمایاں ہو جاتے تھے۔

امام حسینؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے اپنے والد بزرگوار سے

درخواست کی کہ مجھے رسولِ اکرمؐ کی سیرت اور آنحضرتؐ کے گھر میں اور گھر سے باہر اور مجلس میں طرزِ عمل کے بارے میں بتائیں۔

میرے والد نے فرمایا: رسول اکرمؐ نے گھر میں اپنا وقت تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصہ خدا کے لیے، دوسرا حصہ خود آنحضرتؐ کے لیے تھا اور تیسرا حصہ خاندان کے لیے تھا اور جو حصہ آپ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا وہ بھی لوگوں کے اختیار میں دے دیا تھا اور اس میں خاص اور عام لوگوں کے کام انجام دیتے تھے۔ جب ہم گھر میں ہوتے تھے تو حاجت مندوں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتے تھے اور کوئی چیز ان سے پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ جو صاحبانِ فضیلت حاجتمند ہوتے تھے اور ایک یا دو یا زیادہ حاجتیں رکھتے تھے ان سے ملاقات ان کی فضیلت کے اندازے اور حاجت کی مقدار کے مطابق مقدم رکھتے تھے اور انہیں اس کام کی ترغیب دیتے تھے جس میں امت کی اور خود ان کی بہتری ہوتی تھی۔ دوسرے لوگوں سے ان کا حال پوچھتے اور انہیں جن چیزوں کا سزاوار سمجھتے ان سے انہیں آگاہ کرتے تھے۔ آپ یہ کام حاضرین کے سپرد کرتے تھے (کہ جو معارفِ اسلامی تم نے مجھ سے سیکھے ہیں) وہ ان تک پہنچا دو جو موجود نہیں ہیں اور اسی طرح ضرورتمندوں کی ضروریات کے بارے میں مجھے اطلاع دو۔ بلاشبہ جو شخص کسی ضرورت مند کی ضرورت کے بارے میں حاکم کو مطلع کرتا ہے آخرت میں خدا اسے صراط پر ثابت قدم رکھے گا اور ڈگمگانے نہیں دیگا۔

لوگ آنحضرتؐ سے ملاقات کے لیے آتے اور اپنے دین و دنیا کے امور کے بارے میں معرفت حاصل کر کے آپ کے پاس سے چلے جاتے تھے۔ بلاشبہ اس قسم کی باتوں کے علاوہ اور کوئی گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ آپ کسی کو کچھ اور کہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

امام حسینؑ فرماتے ہیں: میں نے پوچھا کہ گھر سے باہر رسول اکرمؐ کا طرزِ عمل کیا تھا؟ میرے والد بزرگوار نے فرمایا: آپ ضرورت کے مطابق بات کرتے تھے اور خاموش ہو جاتے تھے، سوائے ان کاموں کے بارے میں جن میں آپ لوگوں کے دلوں کو متحد کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ آپ سے اور خود اپنے آپ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ نہ نکلیں۔ آپ ہر قوم کے معزز شخص کی عزت کرتے تھے اور انھیں ان لوگوں کا سردار بنا دیتے تھے۔ آپ لوگوں کو فتنوں سے خبردار کرتے تھے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی اور خوش خوئی

سے پیش آتے ہوئے ان کے درمیان رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان سے الگ بھی رہتے تھے۔
آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے تھے اور ان کی دلجوئی فرماتے تھے اور لوگوں سے عوام کے حالات دریافت کرتے رہتے تھے۔

آنحضرتؐ اچھائی کی تعریف کرتے تھے۔ آپ میانہ رو تھے اور آپ کے عمل کا معیار دوہرا نہ تھا۔ آپ کے کاموں میں کوئی بے قاعدگی نہ تھی۔ نیک لوگ آپ کے قریب ہوتے تھے اور ان میں سے سب سے بلند مقام اس کا ہوتا تھا جو لوگوں کا سب سے زیادہ خیر خواہ ہوتا تھا۔ آپ کے نزدیک سب سے زیادہ اونچا مرتبہ اس شخص کا ہوتا تھا جو سب سے زیادہ لوگوں کی مدد کرتا تھا۔

آپ نے مزید فرمایا: جب میں نے رسولِ اکرمؐ کی مجلس کی کیفیت کے بارے میں پوچھا تو میرے والد بزرگوار نے فرمایا کہ: آنحضرتؐ خدا کو یاد کیے بغیر نہ اٹھتے تھے نہ بیٹھتے تھے۔ آپ کے بیٹھنے کے لیے کوئی خاص جگہ مخصوص نہ تھی اور آپ دوسروں کو بھی اپنے لیے بیٹھنے کی جگہ مخصوص کرنے سے منع فرماتے تھے۔ آپ جس مجلس میں بھی تشریف لاتے تھے اس جگہ بیٹھتے تھے۔ جہاں تک بیٹھنے والوں کا دائرہ بن چکا ہوتا تھا اور دوسروں کو حکم دیتے تھے کہ مجلس میں اس طرح بیٹھیں۔ آپ تمام اہلِ مجلس کی جانب توجہ دیتے تھے تاکہ کسی کے ساتھ امتیازی سلوک کا گمان نہ ہو۔

اگر کوئی شخص کسی حاجت کے لیے آنحضرتؐ کے پاس بیٹھتا تھا تو آپ اس وقت تک صبر فرماتے تھے جب تک وہ خود نہیں چلا جاتا تھا۔

جب کسی شخص کی ضرورت کسی وجہ سے پوری نہیں ہوسکتی تھی تو آپ اپنی خوش مزاجی اور میٹھی باتوں سے اسے خوش کردیتے تھے۔ آپ امت کے مہربان باپ تھے۔ چنانچہ حق کے معاملے میں سبھی آپ کے سامنے برابر تھے۔

رسولِ اکرمؐ کی مجلس کیسی ہوا کرتی تھی؟

رسول اکرمؐ کی مجلس، بردباری، شرم، صبر اور امانتداری کی محفل ہوتی تھی وہاں بڑوں کی عزت کی جاتی تھی اور چھوٹوں سے شفقت کا برتاؤ ہوتا تھا۔ آپ کی مجلس میں

بے ادبانہ اور اونچی آواز میں گفتگو نہیں کی جاتی تھی۔ وہاں کھلم کھلا لغزشیں نہیں ہوتی تھیں۔

آپ کے تمام ہم نشیں برابر اور ہم رتبہ تھے۔ برتری کا واحد معیار پرہیز گاری اور فروتنی تھا۔ تاہم آپ حاجتمندوں کو اپنے آپ پر مقدم رکھتے تھے اور مسافروں پر مہربانی فرماتے تھے۔

امام حسینؑ مزید فرماتے ہیں: میں نے اپنے والد بزرگوار سے پوچھا کہ رسولِ اکرمؐ اپنے اہلِ مجلس سے کیسا برتاؤ کرتے تھے؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

آنحضرتؐ لوگوں کے ساتھ میل جول میں خوش طبیعت اور نرم خو تھے۔ بد زبانی، عیب جوئی اور ستائش آپ کی فطرت میں نہ تھی۔ اگر کوئی چیز آپ کو پسند نہ ہوتی تو آپ دوسرا کام کرنے لگتے۔ اگر کوئی شخص آرزو لیکر آپ کے پاس آتا تو ناامید ہو کر واپس نہ جاتا۔

آپ نے اپنے آپ میں تین چیزیں ترک کر دی تھیں یعنی لڑائی جھگڑا، باتونی پن اور ہر وہ چیز جس سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس طرح لوگوں کے ساتھ بھی آپ نے تین چیزیں ترک کر دی تھیں یعنی مذمت، سرزنش اور لوگوں کی عیب جوئی۔

آپ بجز اس امر کے بارے میں جس میں خدا کی مرضی شامل ہوتی تھی، کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ آپ کے صحابہ آپ کی مجلس میں خاموش رہتے تھے اور اس وقت بات کرتے تھے جب آپ اپنی بات ختم کر لیتے تھے۔

آپ کی مجلس میں صحابہ ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو یا بحث مباحثہ نہیں کرتے تھے اور جو شخص کچھ کہہ رہا ہوتا تھا اس کی بات ختم ہونے تک اسے توجہ سے سنتے تھے۔ ہنسی، خوشی، حیرت اور دوسرے معاملات میں آپ حاضرین مجلس کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔

آپ غیروں کی بدتمیزی اور کج خلقی برداشت کر لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صحابہ غیروں کو آپ کی مجلس میں لاتے تھے تاکہ وہ آپ سے سوال کریں۔

آپ اپنے صحابہ سے فرماتے تھے کہ جب وہ کسی حاجتمند کو دیکھیں تو اس کی مدد کریں۔ اس کے میزبان بنیں اور اس کی ضرورت پوری کریں۔

آپ تعریف پسند نہیں فرماتے تھے سوائے اس صورت کے کہ وہ حق شناسی اور شکر گزاری پر مبنی ہو۔ آپ کسی کی قطع کلامی نہیں کرتے تھے سوائے اس کے کہ وہ اپنی حد سے بڑھ جائے۔ اس صورت میں آپ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے تاکہ اس شخص کی

بات ادھوری رہ جائے۔

امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب میں نے رسول اکرمؐ کی خاموشی کے بارے میں سوال کیا تو میرے والد بزرگوار نے فرمایا کہ آنحضرتؐ کی خاموشی کی چار قسمیں اور وجوہات تھیں: (۱) حلم اور بردباری کی خاطر (۲) فساد سے، خوف کی خاطر

(۳) اپنے مخصوص طریقے کے مطابق اور خاموشی سے سننے کی خاطر

(۴) سوچ بچار کی خاطر۔

آپ کے صبر اور بردباری کا یہ عالم تھا کہ کوئی چیز آپ کو خشمگیں نہیں کرتی تھی اور آپ آپے سے باہر نہیں ہوتے تھے۔

آپ کا خوف مندرجہ ذیل چار چیزوں کی خاطر تھا:

۱۔ آپ ہر کام میں اچھی چیز کو اختیار کرتے تھے تاکہ دوسرے آپ کی پیروی کریں۔

۲۔ آپ برائی کو ترک فرماتے تھے تاکہ دوسرے بھی اس برائی سے پرہیز کریں۔

۳۔ آپ ان چیزوں کے لیے کوشش فرماتے تھے جن سے امت کی اصلاح ہوسکتی ہو یا جن میں لوگوں کے دین و دنیا کی بھلائی ہو۔

۴۔ آپ کا اپنے طرز عمل میں سکوت اسی انداز سے تھا جس طرح آپ لوگوں کی باتیں یکساں توجہ سے سنتے تھے اور سوچ بچار میں آپ کا سکوت اس بارے میں تھا کہ دنیا و مافیہا اور اس کے معاملات میں کونسی چیز باقی رہنے والی ہے اور کونسی فنا ہونے والی ہے۔

رسول اکرمؐ کے اخلاق کے بارے میں امیرالمومنین علی علیہ السلام نے مندرجہ ذیل چیزیں روایت فرمائی ہیں:

۱۔ یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ آپ نے اپنے ہم نشین کے سامنے اپنے پاؤں پھیلائے ہوں۔

۲۔ جب کبھی آپ پر ظلم ہوا (چونکہ آپ رحمت اللعالمین تھے) آپ نے اس کے خلاف کبھی قیام نہیں فرمایا۔ تاہم آپ کسی حرام فعل کے مقابلے میں چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ قیام نہیں فرماتے تھے بجز اس کے کہ آپ کا غصہ اور قیام خدا کی راہ پر ہوتا تھا۔

۳۔ کھانا کھاتے وقت آپ کبھی کسی چیز سے ٹیک نہیں لگاتے تھے۔ آپ سے کبھی کوئی حاجت پوری کرنے کے لیے نہیں کہا گیا جس کا جواب آپ نے نفی میں دیا ہو۔
۴۔ آپ جو کچھ فرماتے تھے وہ قطعی ہوتا تھا اور ایسا نہیں ہوتا تھا کہ سننے والا پریشانی محسوس کرے اور جو کوئی آپ کے ارشادات سنتا انہیں سمجھ لیتا تھا۔

رسولِ اکرمؐ فرمایا کرتے تھے: تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جس کی عادتیں سب سے اچھی ہوں۔

پھر امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: میں نے کسی کو آنحضرتؐ جیسا نہیں پایا۔

علاوہ ازیں خود رسول اکرمؐ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: "میں مزاح (ہنسی مذاق) کرتا ہوں لیکن سچی بات کے علاوہ کچھ نہیں کہتا۔"

ابن عباس نے رسول اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "مجھے پروردگار نے تربیت دی ہے۔ خدا نے مجھے سخاوت اور نیکی کا حکم دیا ہے اور بخل اور جفا (ترش روئی اور بدخوئی) سے منع فرمایا ہے۔ خدا کے نزدیک کوئی چیز بخل اور بدخوئی سے زیادہ بری نہیں ہے۔ بدخوئی عمل کو اسی طرح خراب کر دیتی ہے جیسے سرکہ شہد کو خراب کر دیتا ہے۔

رسول اکرمؐ کے اوصاف اہلبیتؑ کے مکتب میں اِس طرح اور خلفاء کے مکتب میں میں اُس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

بعض اوقات خلفاء کے مکتب نے اہل بیتؑ کے مکتب سے بھی روایت کی ہے مثلاً حلبی (متوفی ۱۰۴۴ھ) نے اپنی مشہور کتاب "سیرۃ حلبیہ" میں مذکورہ بالا دو روایات امام حسنؑ اور امام حسینؑ سے نقل کی ہیں۔ تاہم اہلبیتؑ کے مکتب نے وہ ناروا باتیں جو آنحضرتؐ سے منسوب کی گئی ہیں اور جن کی چھان بین ہم نے تحریف کے دوسرے عامل کے سلسلے میں کی ہے اپنی کتابوں میں درج نہیں کیں اور خلفاء کے مکتب کی کتابوں سے بھی وہ روایات نقل نہیں کیں۔

کیا واقعی رسول اکرمؐ ایسے ہی تھے جیسے کہ خلفاء کے مکتب کی کتابوں میں کہا گیا ہے؟

کیا آپ مومنین پر لعنت فرماتے تھے؟ کیا آپ لوگوں کے ساتھ بدزبانی کرتے تھے اور انہیں تکلیف پہنچاتے تھے اور اس کے بدلے خدا سے درخواست کرتے تھے کہ آپ کی لعنت کو ملعون کے لیے برکت، رحمت اور پاکیزگی قرار دے؟ کیا آنحضرت ایسے تھے؟

کیا رسول اکرم ؐ کو وہی چیزیں زیب نہیں دیتیں جو اہلبیت ؑ کے مکتب نے روایت کی ہیں یعنی: آپ لوگوں سے میل جول میں نرم خو، خوش طبیعت اور بردبار تھے اور کوئی چیز آپ کو طیش نہیں دلاتی تھی اور نہ ہی آپ آپے سے باہر ہوتے تھے۔ آپ ہمیشہ سچ بولتے تھے اور اپنی ذات کی خاطر کسی پر غضبناک نہیں ہوتے تھے۔ آپ جس بات سے نفرت کرتے تھے وہ کسی کو نہیں کہتے تھے چہ جائیکہ کسی مومن کو بلا وجہ برا بھلا کہیں اور اس پر لعنت کریں۔

جیسا کہ خلفاء کے مکتب نے کہا ہے، کیا رسول اکرم ؐ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے اور کسی کو کہتے تھے کہ ان کے پیچھے کھڑا ہو جائے یا جیسا کہ اہلبیت ؑ کے مکتب نے کہا ہے آپ کسی کے سامنے پاؤں پھیلا کر بھی نہیں بیٹھتے تھے؟ کیا جیسا کہ خلفاء کے مکتب نے کہا ہے رسول اکرم ؐ کے سامنے راگ کی محفلیں جمتی تھیں اور آپ ناچ دیکھا کرتے تھے یا یہ کہ آپ اٹھتے بیٹھتے خدا کو یاد کرتے تھے؟ کیا آنحضرت ؐ ویسے تھے یا ایسے تھے؟

آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمان تمام معارفِ اسلامی اہلبیت رسول ؐ سے حاصل نہیں کرتے تاکہ ان کے اختلافات رفع ہو جائیں، حقیقی اتحاد بین المسلمین پیدا ہو جاتے اور وہ اللہ کی رسی کو صحیح معنوں میں تھام سکیں؟

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ
وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ.

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ
الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

بارھواں درس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ
یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا ۙ وَّ
دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذۡنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا ۔

ہم نے طے کیا تھا کہ اس درس میں ہم تحریف کے تیسرے عنصر یعنی "وضع حدیث" کے بارے میں تحقیق کریں گے لیکن جو اہم مطالب اب تک ہم نے بیان کیے ہیں ان کا ایک تتمّہ ہے جس کے بغیر شاید ان مطالب کے عمیق معانی اس قدر واضح نہ ہوسکیں جتنا کہ ضروری ہے۔

○ قرآن مجید رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرماتا ہے:
"اے نبیؐ! ہم نے آپ کو بھیجا ہے تاکہ آپ لوگوں پر گواہ ہوں (گواہ وہ ہے جو خدا کی جانب سے لوگوں کے اچھے اور بُرے اعمال پر گواہی دے اور خود ایسا ہو جیسا کہ خدا چاہتا ہے) اور یہ کہ آپ نیکوکاروں کو خوشخبری دینے والے، بدکاروں کو وعید دینے والے، خدا کی طرف بلانے والے اور صحیح راستہ بھٹک جانے والوں کی رہنمائی کے لیے روشن چراغ ہوں۔"
(سورۂ احزاب - آیت ۴۵-۴۶)

○ "بلاشبہ اللہ نے صاحبانِ ایمان پر بڑا احسان کیا کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسولؐ مبعوث کیا تاکہ وہ انہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائے، انکے نفسوں کو پاک کرے اور ان کو کتاب و حکمت سکھائے اگرچہ اس رسولؐ کی بعثت سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔"
(سورۂ آل عمران - آیت ۱۶۴)

○ "اے رسولؐ! ہم نے آپ پر بھی اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ پر' ان کے بعد آنے والے دیگر انبیاء پر بھیجی تھی اور ہم نے ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ اور . . . . پر وحی بھیجی تھی . . . . . وہ پیغمبر جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے ہیں تاکہ ان پیغمبروں کے مبعوث ہونے کے بعد لوگوں پر ہماری حجت تمام ہو جائے۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۱۶۳-۱۶۵)

یہ ہے جہانِ آفرینش کا مقصد اور یہ ہے بعثتِ انبیاء کی غایت لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں' وہ لوگ جن کی نفسانی خواہشات ان آسمانی تعلیمات سے ہم آہنگ نہ تھیں بالخصوص وہ طاقتور اور مترف لوگ جو اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر اپنی خواہش نفس کے مطابق عمل کر سکتے تھے اور شریعت کی پابندیاں قبول کرنے کو تیار نہ تھے وہ شریعت اور دینی تعلیمات کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

ادیان میں تحریف کے عوامل

مقابلے اور مخالفت کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ان تعلیمات اور احکامات کی تبلیغ میں رکاوٹ ڈالی جائے۔ لہٰذا ان لوگوں نے احادیث رسولؐ کے نقل اور نشر کرنے پر پابندی لگادی لیکن چونکہ ساری حدیثوں کو نشر ہونے سے روکنا عملاً ممکن نہ تھا اور کوئی نہ کوئی حدیث کہیں نہ کہیں سے مسلمانوں کے کانوں تک پہنچ جاتی تھی اور ممکن تھا کہ یہ احادیث برسر حکومت لوگوں کی سیاست پر ضرب لگائیں اور جن لوگوں نے ان کی حکومت تسلیم کر لی تھی ان کی نظروں میں انہیں بے اعتبار بنا دیں اس لیے وہ مجبور ہو گئے کہ سرے سے رسول اکرمؐ کی احادیث کی وقعت اور تقدس ہی کو ختم کر دیں تاکہ پھر ان پر انحصار کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔

پچھلی دونوں بحثیں کفایت کی حد تک انجام پائی ہیں۔ جو تتمہ ہم یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ خود رسالتمآبؐ کے ارشاد کے مطابق جو کچھ سابقہ امتوں میں واقع ہوا وہ سب کچھ آپ کی امت میں بھی وقوع پذیر ہوگا لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امم سابقہ میں بھی ایسے واقعات رونما ہوئے اور گزشتہ امتوں نے بھی اپنے پیغمبروں پر ایسے ستم روا رکھے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بد قسمتی سے سابقہ امتوں میں بھی جھوٹ بنانے اور جھوٹ بولنے کا سراغ ملتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس بحث کو "اسلام میں تحریف کی کیفیت اور اس کے مختلف پہلو" کے ذیل میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ فی الحال ہم بر سبیل تذکرہ ایک واقعہ نقل کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی بداعمالیاں کیوں اور کیسے ظاہر ہوتی ہیں۔

تمام آسمانی مذاہب کی طرح زرتشتیت میں بھی محرم مردوں یا عورتوں کے ساتھ نکاح جائز نہ تھا لیکن آجکل زرتشت کے نام سے جو مذہب منسوب ہے اس میں صدیوں سے مرد کا اپنی ماں بہن سے شادی کرنا جائز سمجھا جاتا ہے۔ [۱]

جیساکہ رسول اکرمؐ کے اہل کتاب اور مجوسیوں کے ساتھ برتاؤ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت زرتشت مسلمہ طور پر پیغمبر تھے۔

امیرالمومنین امام علی علیہ السلام سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ بہت مدت گزری ایک بادشاہ نے جو زرتشت کے دین کا پیرو تھا ایک رات نشے کی حالت میں اپنی بیٹی کے ساتھ زیادتی کی۔ جب لوگوں کو اس واقعہ کی خبر ہوئی انھوں نے اس کے محل کا گھیراؤ کر لیا اور کہنے لگے: اے بادشاہ! تو نے ہمارا دین برباد کر دیا ہے۔ اپنے محل سے باہر آ تاکہ تجھے سزا دیکر پاک کیا جائے۔ بادشاہ نے کہا: تم سب جمع ہو جاؤ اور جو کچھ میں کہوں اسے غور سے سنو۔ اگر میرا کہا تمہیں مطمئن کر دے تو خوب ورنہ جو تمہارا جی چاہے کرنا۔

جب سب لوگ جمع ہو گئے تو وہ یوں مخاطب ہوا: لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ خدا نے ہم سب کے باپ آدمؑ اور ہم سب کی ماں حوا سے زیادہ معزز کوئی مخلوق پیدا نہیں کی! لوگوں نے کہا: تم ٹھیک کہتے ہو۔ بادشاہ نے کہا: کیا حضرت آدمؑ نے اپنی بیٹیوں کی اپنے بیٹوں کے ساتھ اور اپنے بیٹوں کی اپنی بیٹیوں کے ساتھ شادیاں نہیں کیں؟ لوگوں نے کہا: تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہی حقیقی دین ہے۔ پھر وہ بھی اس عمل پر متفق ہو گئے اور اپنی شریعت کے بارے میں جو کچھ جانتے تھے وہ سب بھول گئے۔ [۲]

---

[۱] پچھلی صدیوں میں زرتشتیوں نے اسلامی معاشروں میں زندگی گزارنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس عمل کو ترک کر دیا۔ دیکھیے سعید نفیسی کی کتاب تاریخی اجتماعی ایران جلد ۲ صفحہ ۳۵ اور کرسٹن سن کی کتاب "ایران ساسانیوں کے عہد میں"۔ [۲] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ صفحہ ۹۸ حدیث ۷، سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۵۲۷

یوں محرم عورتوں اور مردوں کا ایک دوسرے سے نکاح زردتشت کے مذہب میں داخل ہو گیا اور یہ آسمانی دین تحریف کا شکار ہو گیا۔ تحریف کی یہ شکل ہمیشہ حتیٰ کہ اس امت میں بھی موجود رہی ہے کہ طاقتور لوگوں نے پیغمبروں کے اقوال اور افعال کو اس انداز سے پیش کیا کہ وہ ان کی نفسانی خواہشات کے مطابق ہو۔

پچھلے کسی درس میں آپ بغداد میں متعین اس عثمانی گورنر کی داستان بھی پڑھ چکے ہیں جو رشوت لینے سے بے حد پرہیز کرتا تھا لیکن اس کے درباریوں نے کسی طرح رشوت ستانی کا جواز پیدا کیا اور اسے خدا کے نزدیک ایک پسندیدہ عمل کے طور پر پیش کیا حتیٰ کہ سادہ لوح گورنر بھی ان کے مکر کے جال میں پھنس گیا۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ بااثر لوگ چاہتے ہیں کہ اسلام کے مسلمہ احکام کے خلاف رشوت لیں، شراب پئیں، جوا کھیلیں، راگ رنگ کی محفلیں جمائیں، کتے بندر پالیں اور لوگوں کا مال ہڑپ کر لیں لیکن کوئی انکی ان بداعمالیوں پر اعتراض نہ کرے چنانچہ ضروری ہے کہ ان کے پاس کوئی دستاویز ہو جسے وہ شریعت کا رنگ دیدیں۔ یہی وہ موقع ہے جب ساختگان حدیث ان کی مدد کو آتے ہیں اور احادیث کی شکل میں پیغمبرؐ سے ناروا باتیں منسوب کر کے انکی ملکوتی شخصیت کو عام آدمیوں کی سطح پر بلکہ اس سے بھی نیچے لے آتے ہیں حتیٰ کہ یزید اور ولید جیسا کتوں سے کھیلنے والا، جواری، شرابی اور زناکار کسی ممانعت کے بغیر رسول اکرمؐ کے خلیفہ کی حیثیت سے مسلمانوں پر حکومت کرنے لگتا ہے۔ یہ تھا اسلام میں تحریف کا دوسرا عنصر۔

وضع حدیث

اسلام میں تحریف کا تیسرا عنصر احادیث کی گھڑ نت ہے۔ درحقیقت تمام تحریف اسی مقام سے اور اسی وسیلے سے انجام پاتی ہے کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآن مجید خدا کی حفاظت میں ہونے کی وجہ سے ہر قسم کے خطرے اور حملے سے محفوظ ہے لیکن وہ مقام جس پر حملہ ہونا ممکن ہے اور اس پر حملہ مؤثر ہو سکتا ہے وہ قرآن مجید کا بیان اور توضیح و تفسیر یعنی رسول اکرمؐ کی احادیث اور آپ کی سنت ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن اور حدیث اسلام کے دو بنیادی ستون ہیں۔ اس بنا پر حدیث یا سنت پر حملہ درحقیقت اسلام پر حملہ ہے اور اس میں

تحریف اسلام میں تحریف ہے۔ لہٰذا سب سے زیادہ بنیادی چیز جو ہمیں کہنی ہے یہ ہے کہ ہم نے علمی تقسیم بندی میں تحریف کا پہلا عامل حدیث کے نقل کرنے، لکھنے اور نشر کرنے پر پابندی اور دوسرا عامل رسولِ اکرمؐ کی شخصیت کو گرانا قرار دیا ہے اور اس ترتیب سے تیسرا عامل احادیث گھڑنا ہے جس کے ذریعے دشمنوں کو اپنے ناپاک عزائم اور منصوبوں میں کامیاب ہونے کا موقع ملا اور ملحد اور زندیق اس قابل ہو گئے کہ تحریف کر کے روح اسلام کو ختم کر دیں۔ اگرچہ خدا کا دین ائمہ اہلبیتؑ کے ہاتھوں دوبارہ زندہ ہو کر معاشرے کی طرف لوٹ آیا اور یہ بجز احسان خداوندی کے اور کچھ نہ تھا۔ ہم انشاء اللہ آئندہ اس مسئلے پر تفصیلی بحث کریں گے لیکن اس وقت ہم اس کی شکل اور اصل کی چند حصوں میں چھان بین ضروری سمجھتے ہیں۔

احادیث کیوں وضع کی گئیں؟

دوسرا عباسی حاکم ابو جعفر منصور اپنے بیٹے محمد کو مہدی کے لقب سے پکارتا تھا۔ اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ مہدی موعود جس کے ظہور کی خبر رسول اکرمؐ نے دی ہے اس کا یہی بیٹا محمد مہدی ہے۔ جس مجلس میں مہدی کو منصور کا رسمی ولی عہد بنانے کی خاطر اس کے لیے بیعت لی گئی اس میں شاعروں نے ہرزہ سرائی کی۔ ہر شاعر کی یہ کوشش تھی کہ اپنے آپ کو خلیفہ کا مقرب ظاہر کرے اور اسے اپنی طرف متوجہ کرے۔ اس کے ایک درباری نے جس کا نام مطیع بن ایاس تھا یہ حدیث وضع کر کے پیش کی:

رسول اکرمؐ نے فرمایا: "اَلْمَهْدِيُّ مِنَّا، مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ وَاُمُّهُ مِنْ غَيْرِنَا يَمْلَاُهَا عَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ جَوْرًا" یعنی مہدی ہم میں سے ہے اور وہ عبد اللہ کا بیٹا محمد ہے اور اس کی ماں ہمارے خاندان سے نہیں ہے۔ وہ زمین کو اسی طرح عدل سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم سے پر ہو چکی ہو گی۔

اس نے کوشش کی تھی کہ مہدی عباسی کی تمام نشانیاں اس حدیث میں سمو دے۔ حدیث نقل کرنے کے بعد اس نے خلیفہ کے بھائی کی طرف اشارہ کیا جو وہاں موجود تھا اور کہا: انھیں بھی اس حدیث کا علم ہے اور یہ اس حدیث کی صحت سے واقف ہیں۔ اس نے بھی

مجبوراً کہا: "ہاں یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" پھر اس نے اپنے رشتہ داروں سے کہا: "دیکھو اس نے کس طرح ہمیں پھنسایا۔ اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس کے جھوٹ کی تصدیق کروں۔" لہ

یہ اس بات کا ایک نمونہ تھا کہ وقت کے طاقتور خلیفہ کی خوشنودی جعلی احادیث کی تیاری کے لیے کتنی موثر رہی ہے۔

اس خاص منصوبے کے تحت جو عباسیوں کی سیاست میں وجود رکھتا تھا یہ ضروری تھا کہ مہدی عباسی لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف اور مہر و محبت کا برتاؤ کرے۔ مثلاً منصور نے لوگوں کی ایک کثیر دولت ضبط کر لی تھی لیکن اسے اپنی ذات پر یا حکومت کے کاموں پر خرچ نہیں کیا تھا بلکہ اس کے مالکوں کے نام اور پتے کے ساتھ سرکاری خزانے میں بطور امانت رکھ دیا تھا تاکہ جب اس کا بیٹا مہدی برسر اقتدار آئے تو وہ ساری رقم اس کے مالکوں کو لوٹا کر ان کی خوشنودی حاصل کرے اور ان پر واضح کر دے کہ زمین کو عدالت سے پُر کرنے والا شخص وہی ہے اور سبھی جان لیں کہ وہی اسلام کا مہدیٔ موعود ہے۔ اسی منصوبے پر عملدرآمد کی خاطر مہدی پوری پوری کوشش کرتا تھا کہ اس کے کاموں کی ظاہری شکل خوشنما ہو تاکہ سبھی اسے ایک متدین شخص سمجھیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بدقسمتی سے اسے کبوتر پالنے اور ان سے کھیلنے کی عادت تھی جسے ترک کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ایک دن دربار سے وابستہ محدث جس کا نام عتاب بن ابراہیم نخعی تھا مہدی کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے دیکھا کہ خلیفہ کبوتروں کے ساتھ کھیلنے میں مشغول ہے۔ بلاشبہ یہ وضع ایک ایسے شخص کے لیے جو امت کا مہدی موعود ہونے کا دعویدار تھا چنداں مناسب نہ تھی۔ اس صورت حال میں عتاب نے خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے یا اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے یہ روایت نقل کی:

لہ اصفہانی: الاغانی: جلد ۱۳ صفحہ ۲۸۷-۲۸۸ مطبوعہ ۱۹۵۸ء بیروت اور جلد ۱۲ صفحہ ۸۱ مطبوعہ ساسی۔

فلاں نے فلاں سے اور اس نے ابو ہریرہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا: "مقابلہ روا نہیں ہے سوائے تیر اندازی یا گھڑ دوڑ یا اونٹوں کی دوڑ کے" اور پھر اس میں اپنی طرف سے اضافہ کیا "اَوْجُنَاح" یعنی "یا کبوتر بازی کے"۔

عتاب ابراہیم نے ایسی حرکت کیوں کی؟ حالانکہ خلیفہ نے اسے ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا لیکن چونکہ وہ صورت حال بھانپ گیا تھا لہٰذا اس نے خلافت کے مقام کی پاکیزگی ثابت کرنے اور خلیفہ کے فعل کو مطابق شرع قرار دینے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک ایسی حدیث پر اضافہ کر دیا جو بنیادی طور پر صحیح تھی۔ خلیفہ مہدی عباسی نے حکم دیا کہ اسے دس ہزار درہم انعام دیا جائے۔ پھر جب محدث خلیفہ مہدی کی مجلس سے چلا گیا تو اس نے اپنے اہل دربار کو مخاطب کر کے کہا: خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ عتاب نے جھوٹی بات رسول اکرم ؐ سے منسوب کر دی ہے۔ [۱]

بلاشبہ مہدی عباسی نے جو بات کہی اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے اس جعلی حدیث کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اس طرح اپنے آپ کو زیادہ متدین ثابت کر سکے۔

ان دو مواقع پر مطیع بن ایاس اور عتاب بن ابراہیم نے دو عباسی خلفاء یعنی منصور اور اس کے بیٹے مہدی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حدیث میں جعلسازی سے کام لیا۔ اس جعلسازی میں انہوں نے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ رسول اکرم ؐ سے مروی مشہور حدیثوں میں تھوڑا بہت ردوبدل کر دیا۔

پہلے محدث نے یہ ظاہر کیا کہ مہدئ موعود کے بارے میں رسول اکرم ؐ کی جو بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں ان کا مصداق منصور کا ولی عہد مہدی عباسی ہی ہے اور اپنے قول پر حاضرین میں سے ایک گواہی بھی دلوا دی۔

دوسرے محدث نے رسول اکرم ؐ کی گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کے بارے میں حدیث میں

---

[۱] البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صفحہ ۱۵۳، الموضوعات جلد ۳ صفحہ ۷۸، لئالی المصنوعہ جلد ۲ صفحہ ۴۶۸

ایک لفظ (جناح) کا اضافہ کیا تاکہ کبوتر بازی بھی گھڑ دوڑ اور تیر اندازی کے برابر سمجھی جائے اور اسے اسلامی نقطۂ نگاہ سے قدر و قیمت حاصل ہو جائے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ حدیث وضع کرنے میں کبھی تو رسول اکرمؐ کی مشہور احادیث سے استفادہ کیا گیا ہے اور کبھی احادیث میں کمی بیشی کر کے اپنا مقصد حاصل کیا گیا ہے۔

ان دو نمونوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ بیشتر جعلی احادیث اور روایات خلیفہ کی خوشامد کی خاطر گھڑی گئیں حالانکہ بعض اوقات خلیفہ نے اس بارے میں کوئی خاص حکم نہیں دیا تھا۔ البتہ ظاہر ہے کہ اگر خلیفہ اس قسم کا حکم دیتا اور اس پر زور بھی دیتا تو نہ جانے کیا حوادث رونما ہوتے اور جعلی احادیث کی تیاری کا کاروبار کہاں تک جا پہنچتا۔

وضع حدیث کا رسمی حکم

مدائنی[1] جو بہت معتبر قدیم مؤرخین میں سے ہیں اپنی کتاب "الاحداث" میں بیان کرتے ہیں: معاویہ نے عام الجماعہ[2] کے سال میں اپنے اہلکاروں کے نام جو ہندوستان سے افریقہ تک پھیلے ہوئے تمام اسلامی خطوں پر حکومت کر رہے تھے ایک گشتی فرمان بھیجا جس میں کہا گیا کہ جو شخص "ابوترابؑ" یا اس کے خاندان کی فضیلت کے بارے میں کوئی بات روایت کرے اس کا خون مباح ہے۔ اس کے مال کی کوئی ضمانت نہیں اور وہ حکومت کی حفاظت کے دائرے سے باہر ہے۔ گورگانِ شام کے اس فرمان کے جاری ہونے کے بعد اہل کوفہ یعنی علوی خاندان کے حمایتیوں کو دوسروں کے مقابلے میں

---

[1] وہ ۲۲۴ھ یا ۲۲۵ھ میں ۹۳ برس کی عمر میں فوت ہوئے (میزان الاعتدال جلد ۳ صفحہ ۱۵۳ ابن ندیم: الفہرست صفحہ ۱۱۳ مطبوعہ تہران۔

[2] عام الجماعہ سے مراد ۴۰ھ ہے جب معاویہ کو تمام بلاد اسلامی پر تسلّط حاصل ہو گیا۔ اس سال کو عام الجماعہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس سال کسی نے معاویہ کی مخالفت نہیں کی۔ یہ جو خلفاء کے مکتب کے پیروؤں کو اہل سنت والجماعت کہا جاتا ہے یہ اس لیے ہے کہ ان کا خلفاء کی پیروی کے بارے میں اتفاق اور اجماع ہے اور وہ ان کی مخالفت نہیں کرتے۔

زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے امیرالمومنینؑ کے مکتب میں پرورش پائی تھی اوران کی محبت سے آشنا تھے۔ اس شہر کے لوگوں کے درمیان میثم تمارؓ، صعصعۃ بن صوحانؓ، حجر بن عدیؓ اور عدی بن حاتمؓ جیسے بزرگواروں نے زندگی بسر کی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو امیرالمومنینؑ کی ولا کے ساتھ جیے اوران کی ولا کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ لہٰذا وہ اس حکم کی سختی کے سبب قید اور قتل کی اذیتیں سہتے رہے۔

فرمان میں شدت پیدا ہوگئی

اس فرمان کے بعد معاویہ نے اپنے تمام اہلکاروں کو دوسرا حکم جاری کیا کہ شیعیان علیؑ میں سے کسی کی شہادت قبول نہ کریں (ان دنوں تک بھی بعض ممالک میں شیعوں کی شہادت قبول نہیں کی جاتی تھی۔ وہ حکومت کی نظر میں غیر عادل تھے اوران میں سے کوئی کسی عدالت میں گواہی دیتا تھا تو وہ رد کردی جاتی تھی)۔

معاویہ نے لکھا: "عثمان کے دوست داراوران کے فضائل روایت کرنے والے جو لوگ تمہارے علاقے میں زندگی بسر کررہے ہیں ان کا کھوج نکالو اورانہیں اپنے نزدیک کرو۔ ان لوگوں کو انعام واکرام سے نوازو اور عثمان کی فضیلت کے بارے میں وہ جو کچھ نقل کریں وہ مجھے لکھ بھیجو۔ راوی کا نام، اس کی ولدیت اوراس کے خاندان کے کوائف بھی تحریر کرو۔" لہٰذا جب کوئی شخص خلیفہ عثمان کے فضائل کے بارے میں رسول کرمؐ سے کوئی روایت نقل کرتا تو اسے سرکاری دستاویز کی حیثیت حاصل ہوجاتی تھی اور وہ دربار خلافت میں بھیج دی جاتی تھی۔ یہ فرمان جاری ہوتے ہی خلیفہ عثمان کے فضائل کے بارے میں روایات میں بے حد اضافہ ہوگیا کیونکہ معاویہ اس سلسلے میں بے دریغ روپیہ پیسہ خرچ کرتا تھا اوردل کھول کر املاک، زمین اور انعام واکرام غرضیکہ جو کچھ اس کے پاس تھا عربوں اور موالیوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اس بنا پر اسلامی قلمرو کے ہر شہر میں جعلی حدیثوں کی تیاری کا کام زور پکڑ گیا اور دنیا پرست اس ذریعے سے دولت کمانے کے لیے ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے لگے۔ کوئی جلاوطن کیا گیا یا دورافتادہ شخص ایسا نہ تھا جو معاویہ یا کسی سرکاری کارندے کے مقرر کردہ حکام میں سے کسی حاکم سے ملا ہو

اوراس نے خلیفہ عثمان کے فضائل اور مناقب کے بارے میں کوئی روایت نقل کی ہو مگر یہ کہ اس کا نام لکھ لیا جاتا اور وہ ارباب اقتدار کے نزدیک ہو جاتا۔ ایک مدت تک حالات اسی ڈگر پر رہے۔

تیسرے فرمان کا اجراء

اس اعلامیے کے بعد خلافت کی مرکزی انتظامیہ کی طرف سے ایک اور فرمان جاری کیا گیا۔ نئے فرمان میں کہا گیا تھا کہ خلیفہ عثمان کے بارے میں احادیث بہت زیادہ ہو گئی ہیں اور یہ کہ اسلامی مملکت کے تمام شہروں اور بستیوں میں پھیل چکی ہیں۔ لہٰذا جب تمہیں میرا خط ملے تو لوگوں کو دعوت دو کہ وہ صحابہ اور پہلے دو خلفاء کے فضائل کے بارے میں بھی احادیث نقل کریں۔ اور یہ کہ ابوتراب کے متعلق لوگوں نے جو روایت نقل کی ہو صحابہ کے بارے میں اس کی نقیض میرے لیے لائیں کہ اس سے مجھے خوشی ہوتی ہے اور یہ بات میرے لیے زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ یہ ابوتراب اور اس کے شیعوں کے دلائل کا اچھا توڑ ہے اور ان کے لیے عثمان کے فضائل اور مناقب سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔

معاویہ کا حکم نامہ پڑھ کر لوگوں کو سنایا گیا اور اس کے بعد صحابہ کی منقبت میں بہت سی جعلی روایات نقل کی گئیں۔ اس سلسلے میں لوگوں نے بڑی کوششیں کیں یہاں تک کہ یہ روایات مسجدوں کے منبروں تک بھی جا پہنچیں اور مکتبوں کے استادوں تک بھی ان کی رسائی ہو گئی۔ انہوں نے یہ نوعمر بچوں اور نوجوانوں کو پڑھائیں اور انہیں اتنی بار دہرایا کہ ان جعلی روایات کو قرآن مجید کی طرح قبول کیا جانے لگا اور وہاں سے یہ گھروں میں عورتوں لڑکیوں، نوکروں اور غلاموں تک پہنچیں۔ گھر کا مرد یہ احادیث رسمی منبروں پر سے اور نماز جمعہ کے خطبوں میں سنتا تھا اور گھر پہ جا کر عورتوں، بچوں اور نوکروں کے سامنے دہراتا تھا۔ طویل مدت تک حالات اسی طرح رہے۔ معاویہ کو ۴۰ھ سے ۶۰ھ تک حکومت اور خلافت حاصل رہی۔ اس لمبے عرصے میں دنیا پرست لوگ احادیث گھڑنے کے بارے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ یوں بہت سی احادیث وجود میں آگئیں اور بیشمار جھوٹ نشر کیے گئے۔

فقہاء، قاضی اور والی سبھی اس مسئلے میں الجھ گئے اور اسی راستے پر چل نکلے۔ جو لوگ اس کام میں سب سے زیادہ منہمک ہو گئے، وہ ریاکار اور ضعیف الایمان قاری تھے جو بظاہر بڑے عبادت گزار اور پاکباز نظر آتے تھے۔ وہ حدیثیں وضع کرتے تھے تاکہ انہیں والیوں کا قرب حاصل ہو اور وہ مال و دولت اور جائداد حاصل کر سکیں۔ صورت حال یونہی رہی حتیٰ کہ یہ جھوٹی روایات دیندار لوگوں تک پہنچیں جو جھوٹ سے پرہیز کرتے تھے اور انہوں نے اسے درست سمجھ کر نقل کیا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ یہ جھوٹی ہیں تو وہ کبھی ان پر اعتقاد نہ رکھتے اور انہیں نقل نہ کرتے۔[1]

یہ جو ہم اس سے پہلے ہمیشہ کہتے آئے ہیں کہ بیشتر چیزیں جو خلفاء کے مکتب میں دین اور اسلام کے نام سے موجود ہیں وہ معاویہ کے زمانے میں گھڑی گئی ہیں اس قول کی بنیا ایسی ہی تاریخی اسناد پر ہے۔

چوتھی صدی کے مؤرخ ابو عبداللہ بن محمد[2] المعروف بہ نفطویہ نے اپنی تاریخ میں ایسی چیزیں لکھی ہیں جو مضمون کے لحاظ سے بعینہ ویسی ہیں جیسی کہ مدائنی نے کہی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "بیشتر جھوٹی احادیث جن میں صحابہ کے فضائل بیان کیے گئے ہیں، بنی امیہ کے زمانے میں گھڑی گئی ہیں۔ یہ احادیث گھڑنے والے اور نقل کرنے والے چاہتے تھے کہ اس کے ذریعے سے دربارِ خلافت تک رسائی حاصل کریں اور اموی حکومت کی توجہ اور دلچسپی کا مورد بنیں۔ اموی بھی یہ چاہتے تھے کہ یہ کام کر کے بنی ہاشم کو جتنا نیچا دکھا سکیں، دکھائیں۔"[3]

---

[1] بنا بنقل ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۱۵-۱۶ قدیم ایڈیشن اور جلد ۱۱ صفحہ ۴۴-۴۵ مطبوعہ مصر، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم۔

[2] ان کے حالات زندگی کے لیے ابن ندیم کی "الفہرست" صفحہ ۹۰ مطبوعہ تہران سے رجوع کریں۔

[3] جیسا کہ ابن ابی الحدید نے نقل کیا ہے: شرح نہج البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۱۵ اور بعد کے صفحات۔ قدیم ایڈیشن اور جلد ۱۱ صفحہ ۴۶ مطبوعہ مصر، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم۔

اب ہم اس قسم کی احادیث کے چند نمونوں کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ مدائنی اور نفطویہ کے اقوال کی صحت کا احساس کر سکیں۔

یوم الدار کی حدیث

جب آیۂ شریفہ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (سورۂ شعراء - آیت ۲۱۴) نازل ہوئی اور رسول اکرمؐ کو حکم ملا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو (یعنی عبدالمطلب کے فرزندوں کو اسلام کی دعوت دیں، یہ پہلا موقع تھا کہ آنحضرتؐ اس دعوت کو اپنے گھر سے باہر لے گئے۔ اس دن تک یعنی بعثت سے تقریباً تین سال بعد تک آپ کی رسالت آپ کے گھر تک محدود تھی اور فقط امام علی علیہ السلام اور بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اسے قبول کیا تھا۔[1] آیت نازل ہوئی اور رسول اکرمؐ کو حکم ملا کہ اپنی دعوت کا دائرہ وسیع تر کر دیں۔ یہ داستان ہم نے گزشتہ درسوں میں تفصیل سے نقل کی ہے۔

حضرت علی بن ابی طالبؑ، رسول اکرمؐ کے گھر میں رہ رہے تھے کیونکہ جب وہ پانچ سال کے تھے اور قحط پڑا تھا تو آنحضرتؐ نے ان کو ان کے والد بزرگوار سے اپنی کفالت میں لے لیا تھا۔ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اس وقت امام علی علیہ السلام کی عمر ۱۳ سے ۱۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ رسول اکرمؐ نے آپ کو حکم دیا کہ مینڈھے کی ایک ران پکائیں ایک بڑے پیالے میں چھاچھ کا انتظام کریں۔ بنی ہاشم کو کھانے کی دعوت دی گئی۔ وہ تقریباً چالیس افراد تھے۔ رسول اکرمؐ نے ان سے فرمایا:

> "اللہ نے مجھے یہ پیغام دیکر بھیجا ہے کہ تم اس کی توحید اور میری رسالت کا اقرار کرو۔" پھر آپ نے فرمایا: "تم میں سے ایسا کون ہے جو اس کام میں میرا ساتھ دے تاکہ وہ تمہارے درمیان میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہو؟" یہ سن کر سب حاضرین نے منہ پھیر لیے۔ البتہ ان میں سے امام علی علیہ السلام جو عمر میں سب سے چھوٹے تھے اٹھے اور بولے:

---

[1] اور شاید زید نے بھی کیونکہ وہ بھی اسی گھر میں رہتے تھے اور اسکے فرد شمار ہوتے تھے۔

"یارسول اللہ! میں اس کام میں آپ کی مدد کروں گا۔" جب یہ بات تین دفعہ دہرائی جاچکی تو رسول اکرم نے فرمایا: "یہ تمہارے درمیان میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔ وہ جو فرمان دے اسے سنو اور اس کے حکم کی اطاعت کرو۔" [1]

یہ روایت مکتب خلفاء کی تاریخ و حدیث کی معتبر کتابوں میں صحیح اور معتبر سند کے ساتھ نقل کی گئی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا معاویہ نے حکم دیا تھا کہ ابوتراب اور ان کے اہل بیت کی جو فضیلت بھی روایت کی جائے اس کے مقابلے میں اس کی نقیض ایک جھوٹی روایت گھڑ لی جائے۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ اس روایت کی کاٹ کی جائے جو حضرت امیرؑ کے سابق الایمان ہونے کی ایک واضح ترین دلیل ہے اور جس میں آپ کی وصایت اور خلافت پر صریح نص اور رسول اکرم کا قطعی اور رسمی فرمان موجود ہے اور ایسی روایات گھڑی جائیں جو اس کی نقیض ہوں۔

اس روایت کی نقیض روایات

خلفاء کے مکتب کی اول درجے کی کتابوں میں صف اول کے راویوں کی زبانی اس روایت کی نقیض روایات نقل کی گئی ہیں۔

۱۔ ام المومنین عائشہ کی زبانی

ایک روایت ام المومنین بی بی عائشہ کی زبانی نقل کی گئی ہے اور ان سے منسوب

---

[1] تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۱۱۷۲ - ۱۱۷۴ مطبوعہ لیڈن اور جلد ۲ صفحہ ۳۱۹ - ۳۲۱ مطبوعہ مصر، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم۔ تفسیر طبری جلد ۱۹ صفحہ ۷۴ - ۷۵۔ البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۳۹ - ۴۰۔ ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۶۲ - ۶۳، مطبوعہ دار الکتاب العربی۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۵۲ حدیث ۱۳۷۱ مطبوعہ احمد محمد شاکر۔ درمنثور جلد ۵ صفحہ ۹۷۔

کی گئی ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ آیا یہ بات انہوں نے خود کہی ہے یا وضع کر کے ان سے منسوب کر دی گئی ہے۔

روایت یوں ہے:

جب آیۂ مبارکہ "وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ" نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے فرزندان عبدالمطلب کو جمع کیا اور ان سے فرمایا: "اے عبدالمطلب کے بیٹو! اے میرے رشتہ دارو! اے عبدالمطلب کی بیٹی صفیہ! اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہؑ! خدا سے ڈرو اور اس کی عبادت کرو۔ میں تمہارے لیے کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔ میں تمہارے بارے میں خدا کی جانب سے کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا۔ [1]

یہ دو روایتیں ایک دوسری کی نقیض ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کونسی حقیقی ہے اور کونسی جعلی ہے اور ہمارے پاس پہلی کے درست ہونے اور دوسری کے وضعی ہونے کی کیا دلیل ہے؟

خلفاء کے مکتب میں ام المومنین بی بی عائشہ کو اتنا بلند رتبہ دیا گیا ہے کہ وہ رسول اللہؐ کے بعد خلیفہ ابوبکر اور خلیفہ عمر سے بھی برتر قرار پائی ہیں۔ اس فعل کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس مکتب کے پیرو جو روایات ام المومنین کے نام سے اور ان سے نقل کرتے ہیں اور ان کے نام سے جو ٹھوس اعتبار انہیں حاصل ہوتا ہے اس کے ذریعے وہ چاہتے ہیں کہ ضروری مطالب مسلمانوں تک پہنچا دیں۔ لہٰذا جو روایت ام المومنین عائشہ کے نام سے نقل کی جائے اور امیرالمومنینؑ سے منقول روایت کی نقیض ہو وہ خلفاء کے مکتب میں مقدم سمجھی جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ جس روایت سے امیرالمومنین علیؑ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے وہ پایۂ اعتبار سے گر گئی ہے۔

اب ہم ان دو حدیثوں کو حدیث شناسی کے قواعد کے مطابق جانچتے ہیں۔ جو نکات یہاں قابل غور ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ تمام علمائے اسلام کے اتفاق اور اجماع کے مطابق زیر بحث آیت بعثت کے

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ مطبوعہ محمد علی صبیح و اولادہٗ

تیسرے سال میں نازل ہوئی ہے۔[1]

۲۔ دوسری حدیث کی ناقل بی بی عائشہ بعثت کے بعد چوتھے سال میں پیدا ہوئیں۔[2] اور جس واقعہ کا حدیث میں ذکر آیا ہے اس کی شاہد نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا جو حدیث ان سے نقل کی گئی ہے وہ حدیث مرسل ہے اور غیر معتبر ہے جبکہ امیرالمومنین سے نقل کی گئی روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہے[3] اور ہر قسم کے خدشے سے خالی ہے اور اس واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کے وقت خود آپ کی عمر پندرہ سال کے لگ بھگ تھی۔

۳۔ بی بی فاطمہ زہرا علیہا السلام جن کا نام دوسری حدیث کے متن میں آیا ہے قول صحیح کے مطابق رسول اکرمؐ کی بعثت کے بعد پانچویں سال میں دنیا میں تشریف لائیں[4] اور اگر دوسروں کا قول کہ جس کے بارے میں سخت اختلاف ہے قبول بھی کر لیا جائے تو وہ ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچی تھیں اور ان کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ سال تھی اور معمول کے مطابق ایک رسمی دینی خطاب کی مخاطب نہیں ہو سکتی تھیں۔

---

[1] طبری میں تیسرے سال کے حوادث کے ذکر سے رجوع کریں۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۱۶۹-۴۰، مطبوعہ یورپ اور جلد ۲ صفحہ ۳۱۹ مطبوعہ مصر تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم۔ تاریخ ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۴۱۔ تاریخ ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۴۰۔ تاریخ الخمیس جلد ۱ صفحہ ۲۸۷۔ طبقات الکبری جلد ۱ صفحہ ۱۹۹ اور بعد کے صفحات۔ انساب الاشراف جلد ۱ صفحہ ۱۱۵ اور بعد کے صفحات۔ الاکتفاء جلد ۱ صفحہ ۲۷۹ - ۲۸۱ مطبوعہ مصر۔

[2] طبقات الکبریٰ جلد ۸ صفحہ ۵۸ مطبوعہ بیروت، اسد الغابہ جلد ۶ صفحہ ۱۸۸-۱۹۲، ترجمہ ۷۰۸۵۔

[3] دیکھیے تحقیق مسند احمد بن حنبل بذریعہ احمد محمد شاکر جلد ۲ صفحہ ۳۵۲ حدیث ۱۳۷۱۔

[4] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۴۵۷-۴۵۸، ابن ابی ثلج: تاریخ ائمہ جلد ۶، طبرسی: تاج المواليد صفحہ ۹۷، مجموعہ نفیسہ، المستدرک علی الصحیحین جلد ۳ صفحہ ۱۵۶۔

بالخصوص جب ان کی تین بڑی بہنیں اس وقت موجود تھیں اور بیاہی جا چکی تھیں لہٰذا اگر خطاب کرنا ضروری تھا تو انہیں موردِ خطاب قرار دینا چاہیے تھا نہ کہ ان کی سب سے چھوٹی بہن کو جو اگر بالفرض اس وقت پیدا ہو بھی چکی تھیں تو ان کی عمر آٹھ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

۲۔ ابوہریرہ کی زبان سے

اس موضوع پر ابوہریرہ سے دو مفصل روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ پہلی روایت میں ابوہریرہ نے کہا ہے:

جب آیہ "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے قریش کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ جب وہ سب جمع ہو گئے تو آنحضرتؐ نے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اے کعب بن لوی کے فرزندو! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ!" "اے عبدالمطلب کے فرزندو! اپنے آپ کو دوزخ اور آگ سے نجات دو!"

ابوہریرہ کی اس حدیث میں یہاں تک کے ارشادات بطورِ عام تھے لیکن اس کے بعد خصوصی خطاب ہوتا ہے اور آنحضرتؐ خاص افراد کے نام لیکر ان سے بات کرتے ہیں۔ اپنے ارشادات کو جاری رکھتے ہوئے آپؐ فرماتے ہیں:

اے فاطمہؑ! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کے نزدیک میرا تمہارے لیے کسی چیز پہ اختیار نہیں۔ تم خود آگ سے نجات حاصل کرو۔ بلاشبہ تم میرے اہل خاندان اور اقارب ہو اور میں تمہارے ساتھ صلہ رحم کروں گا۔ [۱]

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ کتاب الایمان، حدیث ۳۴۸۔ سنن نسائی جلد ۶ صفحہ ۲۴۸-۲۵۰۔ کتاب الوصایا باب اِذَا اَوْصٰى لِعَشِيْرَتِهِ الْاَقْرَبِيْنَ۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۳۳

بلاشبہ اس کلام سے مراد یہ ہے کہ میں تمہارے لیے شفاعت نہیں کر سکتا اور تمہیں عذاب الٰہی سے نجات نہیں دلا سکتا اور اسی صحابی سے مکتبِ خلفاء کی معتبر کتابوں میں ایک اور حدیث نقل کی گئی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

جب آیہ انذار نازل ہوئی تو رسول اکرم ؐ نے فرمایا: اے قریشیو! اپنے آپ کو خدا سے دوبارہ خرید لو۔ میں تمہارے لیے بارگاہ خداوندی میں کچھ نہیں کر سکتا۔

اے عبدالمطلب کے فرزندو! میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اے رسولِ خدا ؐ کی پھوپھی صفیہ! میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اے محمد ؐ کی بیٹی فاطمہ ؑ! تم مجھ سے جو جی چاہے مانگ لو لیکن میں بارگاہِ الٰہی میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔[1]

جیسا کہ ہم نے ام المومنین بی بی عائشہ سے منسوب روایت میں کہا ہے۔ زیرِ بحث آیت کے نزول کے وقت تک حضرت فاطمہ ؑ کی ولادت ہی نہیں ہوئی تھی کہ رسولِ اکرم ؐ ان سے خطاب فرماتے۔ مزید برآں ان دو روایات کی صحت کے بارے میں ایک اور بہت بڑا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بعثت کے تیسرے سال میں ان روایات کے پہلے راوی ابوہریرہ خود کہاں تھے کہ وہ یہ واقعہ دیکھتے اور نقل کرتے؟ وہ فتح خیبر کے بعد اشعثیوں اور دوسیوں کے ایک گروہ کے ساتھ یمن سے مدینہ آئے تھے[2] لہٰذا اگر وہ اس زمانہ سے پہلے کی کوئی روایت نقل کریں تو اس کے متعلق انہیں یہ بتانا چاہیے کہ وہ کس شخص سے نقل کر رہے ہیں۔ اس بحث سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان دونوں روایتوں میں بھی مرسل ہونے کا عیب ہے یعنی اس کی سند میں تسلسل نہیں ہے اور اس بنا پر یہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ مطبوعہ محمد علی صبیح و اولادہٗ، حدیث ۳۵۰۔ بتحقیق محمد فواد عبدالباقی

[2] طبقات الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۷۸۔ امتاع الاسماع جلد ۱ صفحہ ۳۲۶۔ سیر اعلام النبلاء جلد ۲ صفحہ ۴۳۶ فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۱ اور جلد ۷ صفحہ ۳۹۱۔ الاصابہ جلد ۳ صفحہ ۲۸۷۔ المعارف صفحہ ۲۷۸۔

۳۔ مسلم کی روایت

تیسری روایت جس کی ہم جانچ کرنا چاہتے ہیں وہ مسلم نے ابوعثمان نہدی سے روایت کی ہے۔ ابوعثمان ناقل ہے: قبیصہ بن مخارق اور زہیر بن عمرو نے مجھ سے روایت بیان کی کہ جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو رسولِ اکرمؐ ایک پہاڑی کے نزدیک پتھروں کے ایک ٹیلے پر کھڑے ہوگئے اور بآوازِ بلند فرمانے لگے: اے عبدمناف کے فرزندو! میں تمہیں خبردار کرنے والا ہوں۔ تمہارے ساتھ میری مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو دشمنوں کو دُور سے دیکھے اور ان کے نزدیک جانا چاہے تاکہ اپنی قوم اور قبیلے کے لیے زیادہ معلومات حاصل کرسکے لیکن اسے ڈر ہو کہ وہ ایسا نہ کر پائے گا اور دشمن خود اس سے پہلے اس کے قبیلے تک آپہنچے گا۔ لہٰذا وہ خوف کے مارے پکار کر اپنے رشتہ داروں اور قبیلے والوں کو خبردار کردے۔ میں بھی اس شخص کی طرح تمہیں خطرے کا احساس دلا رہا ہوں اور دوزخ کی آگ سے ڈرا رہا ہوں۔[1] یہ روایت ابوعثمان نے دو اشخاص سے نقل کی ہے:

۱۔ قبیصہ بن مخارق

۲۔ زہیر بن عمرو

۱۔ زہیر بن عمرو کا نام فقط اسی روایت میں آیا ہے اور کسی دوسری جگہ اس کا نام نہیں لیا گیا۔ محققینِ رجال کا کہنا ہے کہ تاریخ زہیر نامی ایک شخص کا پتا دیتی ہے جو بصرہ میں رہتا تھا اور اس سے پہلے اس کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا۔ بصرہ میں جس کی بنیاد ۱۴ھ میں پڑی۔ زہیر کا ایک مکان تھا۔ وہ واحد نشانی جو اس کے صحابی ہونے کے بارے میں میسر ہے یہی ایک روایت ہے۔ علمائے رجال کہتے ہیں کہ اصولاً ہمیں اس کے علاوہ زہیر کی روایت کردہ کسی اور حدیث کا علم نہیں۔ چونکہ بخاری اس حدیث کو صحیح نہیں سمجھتے اس لیے انہوں نے اسے اپنی کتاب میں درج نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں: اس حدیث

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۷۶ اور جلد ۵ صفحہ ۶۰

کے صحیح نہ ہونے اور زہیر کا صحابی نہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ یہ نہیں کہتا کہ اس نے یہ حدیث رسولِ اکرمؐ سے سنی ہے۔[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے زہیر کو صحابی کہا ہے تو اسی حدیث کی بنا پر کہا ہے اور اسی سے استناد کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ روایت نہ صرف یہ کہ اس کی رسولِ اکرمؐ سے ملاقات کی دلیل نہیں ہے بلکہ صاحب نظر حضرات کے استنباط کے مطابق بجائے خود اس کی آنحضرتؐ سے ملاقات کو مشکوک بناتی اور پایۂ اعتبار سے گراتی ہے۔

ب۔ قبیصہ بن مخارق کا تعلق قبیلہ بنی ہلال سے تھا۔ انہوں نے مکہ میں رسول اکرمؐ کی زیارت نہیں کی بلکہ ہجرت کے بعد اپنے قبیلہ کے ایک وفد[2] کے ہمراہ مدینہ میں آنحضرتؐ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا اور پھر اپنی سرزمین کو لوٹ گئے۔[3] لہٰذا قبیصہ بھی اس آیت کے نزول کے وقت موجود نہ تھے اور ظاہر ہے کہ وہ ان واقعات کے چشم دید گواہ نہیں تھے تاکہ انہیں کسی واسطے یا سند کے بغیر نقل کر سکتے۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ زہیر بن عمرو کی رسول اکرمؐ سے ملاقات کے بارے میں کوئی معتبر روایت دستیاب نہیں ہے اور قبیصہ بھی آیت انذار کے نزول کے وقت تک آنحضرتؐ سے نہیں ملے تھے۔

۴۔ اعمش کی ابن عباس سے روایت

یہ واقعہ ایک اور روایت میں بھی نقل ہوا ہے جو اعمش نے عمرو بن مرہ سے، اس نے

---

[1] الاصابہ جلد ۱ صفحہ ۵۳۹، ترجمہ نمبر ۲۸۴۵، تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۳۴۴۔

[2] وفد آدمیوں کے اس دستے سے عبارت ہوتا تھا جس کے افراد ہر قبیلے کے منتخب کر کے رسول اکرمؐ کی خدمت میں بھیجے جاتے تھے تاکہ آنحضرتؐ کے سامنے اپنے اسلام قبول کرنے کا اقرار کریں۔ قبیصہ کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے کے لیے الاصابہ جلد ۳ صفحہ 215 سے رجوع کریں۔

[3] الاصابہ جلد ۳ صفحہ 215 ترجمہ نمبر ۷۰۹۳، نیز دیکھیے طبقات الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۳۰۹۔۳۱۰، اسد الغابہ جلد ۴ صفحہ ۳۸۳۔۳۸۴ ترجمہ نمبر 4259۔

سعید بن جبیر سے اور اس نے ابن عباس سے نقل کی ہے۔ ابن عباس اس روایت میں زیر بحث آیت کی قرأت یوں کرتے ہیں :

اور کہتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ باہر تشریف لائے اور کوہِ صفا پر چڑھ کر "یا صباحاہ" کا خبردار کرنے والا نعرہ بلند کیا۔ لوگوں نے پوچھا: کون ہے جو یہ نعرہ لگا کر خطرے سے خبردار کر رہا ہے؟ جواب دیا گیا: یہ محمدؐ ہیں۔ لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "اے بنی فلاں، اے بنی فلاں، اے بنی عبد مناف، اے بنی عبد المطلب! اگر میں تمہیں بتاؤں کہ دشمن کے سوار اس پہاڑ کے پیچھے چھپے بیٹھے ہیں اور تم پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو کیا تم میری بات کا یقین کرو گے؟" لوگوں نے جواب دیا: "ہم نے آپ کی ساری زندگی میں آپ کو جھوٹ بولتے نہیں سنا۔" آپ نے فرمایا: اِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ (میں تمہیں آنے والے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں)۔ ابولہب نے کہا: تَبًّا لَّکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟ (تمہیں موت آئے۔ کیا تم نے یہی کچھ کہنے کے لیے ہمیں یہاں جمع کیا ہے؟) اسی مناسبت سے سورۂ "تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَھَبٍ وَّ تَبَّ" نازل ہوئی۔[1]

اس حدیث کے جھوٹی ہونے پر پہلی بڑی گواہ آیت وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ وَرَھْطَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ہے جس کے ذیل میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔ کیونکہ اس شکل میں کوئی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ روایت ابن عباس سے نقل کی گئی ہے جبکہ علمائے رجال کی تصریح کے مطابق وہ شعب ابی طالب میں پیدا ہوئے جو ہجرت سے ٹھیک تین سال پہلے[2] یعنی آیت انذار کے نزول سے سات سال بعد کی بات ہے۔ لہٰذا ابن عباس کی یہ حدیث بھی مرسل ہے اور اس کی اسناد مسلسل نہیں ہیں۔

اب تک جن احادیث کی جانچ کی گئی وہ صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں موجود ہیں۔ ان کے بعد تفسیر کی کتابوں کی باری آتی ہے۔ مکتب خلفاء میں معتبر ترین اور مفصل ترین تفسیریں تفسیر طبری اور تفسیر درمنثور ہیں۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۸۱ اور ۳۰۷۔ صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۳۴

[2] الاصابہ جلد ۲ صفحہ ۳۲۲ ترجمہ نمبر ۴۷۸۱۔

۵ تا ۱۰۔ طبری اور سیوطی کی روایات

۵۔ ہم جس پانچویں روایت کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں وہ طبری نے موسیٰ اشعری سے نقل کی ہے۔ ابو موسیٰ کہتے ہیں: جب آیہ "وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ" نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال کر بآواز بلند فرمایا: اے بنی عبد المطلب یا صباحاہ اے پسران عبد المطلب! میں تمہیں خطرے سے خبردار کرتا ہوں۔

یہ روایت سیوطی نے در منثور میں ابن جریر طبری، ترمذی اور دوسروں سے نقل کی ہے[۱] لیکن بدقسمتی سے اس کی کیفیت بھی دوسری روایتوں سے ملتی ہے کیونکہ اس کے پہلے راوی ابو موسیٰ ابو ہریرہ کے ساتھ ہجرت کے ساتویں سال میں مدینہ آئے تھے اور انہوں نے یہ روایت بھی بلاواسطہ نقل کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان کی روایت بھی مرسل ہے اور اسے اہمیت حاصل نہیں ہے۔

۶۔ اس آیت کی تفسیر میں سیوطی نے ایک روایت انس بن مالک سے بھی نقل کی ہے جو متن کے لحاظ سے مکمل طور پر ابو ہریرہ کی روایت سے مشابہ ہے لیکن سند کے لحاظ سے یہ روایت بھی غیر معتبر ہے کیونکہ انس مدینہ میں پیدا ہوئے تھے اور اصولاً انہوں نے ہجرت سے پہلے آنحضرت سے ملاقات نہیں کی تھی اور نہ ہی مکہ آئے تھے۔

علاوہ ازیں اس زمانے میں (یعنی بعثت کے تیسرے سال میں) وہ ابھی شیر خوار تھے کیونکہ رسول اکرمؐ کی ہجرت کے وقت جو اس واقعہ کے ٹھیک دس سال بعد عمل میں آئی انس کی عمر دس سال تھی۔[۲] لہٰذا آیت کے نزول کے سال میں مدینہ میں پیدا ہوئے

---

[۱] تفسیر در منثور جلد ۵ صفحہ ۹۵-۹۷ طبری کے جزء ۱۹ صفحہ ۷۲ اور بعد کے صفحات۔ سنن ترمذی صفحہ ۳۳۸-۳۴۰ حدیث ۳۱۸۴، ۳۱۸۵ اور ۳۱۸۶ مطبوعہ ابراہیم عطوہ عوض۔

[۲] الاصابہ جلد ۱ صفحہ ۸۴-۸۵ ترجمہ نمبر ۲۷۷ ایک اور روایت کے مطابق ہجرت کے سال میں ان کی عمر آٹھ سال تھی۔ لہٰذا آیت کے نزول کے وقت وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ دیکھیے المعارف صفحہ ۳۰۸-۳۰۹

اور مکہ میں نہ تھے اور اگر وہاں ہوتے بھی تو ان کا شمار اس واقعہ کے عینی گواہوں میں نہیں ہو سکتا تھا۔

۷۔ نیز سیوطی نے اسی موضوع پر ایک روایت براء بن عازب سے نقل کی ہے۔ براء بن عازب انصار مدینہ میں سے قبیلہ اوس کے فرد تھے۔ وہ ۲ھ میں جنگِ بدر کے موقع پر حاضر ہوئے لیکن رسولِ اکرمؐ نے ان کی کم سنی کی بنا پر انھیں قبول نہ کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس وقت پندرہ سال کے نہ تھے اور سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے تھے کہ جہاد میں شریک ہو سکتے۔ بنا بریں اس آیت کے ہنگام نزول انس بن مالک کی عمر دو برس سے زائد نہیں تھی اور یہ کہ وہ مدینہ میں رہتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ اس واقعہ کے بلا واسطہ گواہ اور راوی نہیں ہو سکتے تھے۔ [۱]

الغرض یہ کہ ابوہریرہ، انس بن مالک اور براء بن عازب کی روایتوں کے الفاظ یکساں ہیں اور ان تینوں میں سے کوئی بھی صاحب اس واقعہ کے رونما ہونے کے وقت موجود نہ تھا۔ لہٰذا ممکن ہے کہ الفاظ کی یہ یکسانیت اموی حکومت کے احادیث وضع کرنے کے بارے میں سرکاری گشتی مراسلے کی بنا پر ہو خواہ پہلے راویوں نے یہ کام امویوں کے حکم کی اطاعت کے طور پر کیا ہو یا دوسروں نے یہ روایات وضع کی ہوں اور ان کے نام سے بیان کر دی ہوں۔

۸ اور ۹۔ تفسیر طبری اور تفسیر در منثور میں کچھ اور احادیث بھی ہیں جو محمد بن شہاب زہری اور قتادہ جیسے اصحاب سے منسوب ہیں۔ [۲]

---

[۱] الاصابہ جلد ا صفحہ ۱۴۷-۱۴۶، ترجمہ نمبر ۶۱۸۔ اسد الغابہ جلد ا صفحہ ۲۰۵، ترجمہ نمبر ۳۸۹۔ الاستیعاب جلد ا صفحہ ۱۵۴-۱۵۵ ترجمہ نمبر ۱۷۲ تحقیق علی محمد بجاری۔ طبقات ابن خیاط جلد ا صفحہ ۱۸۶، ترجمہ نمبر ۵۲۲ اور صفحہ ۳۰۳، ترجمہ نمبر ۹۲۲ اور صفحہ ۳۴۹، ترجمہ ۱۵۰۰۔

[۲] تفسیر طبری جلد ۱۹ صفحہ ۷۳ اور ۷۵ میں ابن شہاب، ضحاک اور قتادہ میں سے ہر ایک سے ایک روایت موجود ہے جو بالترتیب ۱۲۴، ۱۰۵ اور ۱۱۷ ہجری میں فوت ہوئے ہیں اور تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے رسولِ اکرمؐ کا زمانہ نہیں دیکھا۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں ان دونوں کا زمانہ رسولِ اکرمؐ سے بہت بعد کا ہے اور ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ ہم ان کی روایات کی مزید چھان بین نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ان کا بے سند اور مرسل ہونا اظہر من الشمس ہے۔

۱۰۔ کچھ دیگر روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔ سیوطی نے انہیں زبیر جیسے صحابۂ رسولؐ سے نقل کیا ہے لیکن زبیر تک اس کی سند مسلسل نہیں ہے۔ یعنی سیوطی نے جو دسویں صدی ہجری کے عالم ہیں، ایک یا دو اشخاص کی وساطت سے زبیر سے روایت کی ہے اور ظاہر ہے کہ صحابئ رسولؐ زبیر بن عوام اور سیوطی کے درمیان تو صدیوں کا فاصلہ ایک یا دو اشخاص کے ذریعے پاٹنا ممکن نہیں اور یہ مدّت کم از کم بیس سے زیادہ نسلوں پر محیط ہے۔ لہٰذا یہ احادیث بھی معتبر نہیں ہیں اور ہم اس روایت میں زبیر کے قول کی تشخیص ان کے ذاتی قول کی حیثیت سے نہیں کر سکتے کیونکہ اس بات کا قوی احتمال ہے کہ انہوں نے یہ حدیث نقل نہیں کی اور دوسروں نے وضع کر کے ان سے منسوب کر دی ہے۔ ہمیں جب تک کسی روایت کی سند مسلسل پہلے راوی تک معلوم نہ ہو ہم اس روایت کو اس سے منسوب نہیں کر سکتے۔ پس یہ روایت تحقیق کے دائرے سے باہر اور غیر معتبر ہے۔

دو نکات

یہاں دو نکات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ پہلا یہ کہ ابن عباسؓ سے منسوب روایت میں وَرَهْطَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ [1] کے الفاظ کو قرآن مجید کی آیت کا ایک حصہ بنایا گیا تھا اور اس میں کہا گیا تھا کہ ابن عباسؓ ان الفاظ کو قرآن کا جزو سمجھتے تھے بے حد مشکوک معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں قرآن مجید میں تحریف کی جانب اشارہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ روایت دوسری صدی ہجری کے شروع میں وضع کی گئی ہے۔ کیونکہ میں تاریخ اسلام کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زنادقہ کی اسلام کے نظریات اور اعتقادات کو تباہ و برباد

---

[1] جامع البیان فی تفسیر القرآن، طبری جزء ۱۹ صفحہ ۴۷۔ اس موضوع پر ابن عباس سے تین اور احادیث نقل کی گئی ہیں جو سب کی سب اس اضافے کے بغیر ہیں۔

کرنے کی کوششیں زیادہ تر اسی صدی کے شروع میں انجام پائی ہیں۔ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس روایت کو سعید بن جبیرؒ سے اور اس کے بعد ابن عباسؓ سے منسوب کیا جائے یا کسی اور سے نسبت دی جائے۔ یہ سب کچھ اس ایک نظریے کی پیروی سے وجود میں آئے ہیں جو اسلام سے جنگ کا نظریہ ہے۔

دوسرا نکتہ جس کا ذکر لازم ہے یہ ہے کہ ان جعلی روایات سے جو کچھ میں سمجھ پایا ہوں وہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا روایت کے علاوہ جو دوسری روایات موجود ہیں وہ سب کی سب معاویہ کے زمانے میں گھڑی گئی ہیں۔ مثلاً ابوعثمان نہدی جس نے دو اشخاص سے روایات نقل کی ہیں معاویہ کے زمانے میں اور اس کے حدیث سازی کے بارے میں فرمان جاری کرنے کے وقت موجود تھا۔[1] دوسری روایات بھی ان لوگوں تک پہنچی ہیں جو اسی زمانے میں تھے خواہ ان کا شمار صحابہ میں ہو یا تابعین میں اور انہیں عمداً یا سہواً صحابی تصور کیا گیا ہو۔

ایک سفید جھوٹ

۱۱۔ اس آیت کی تفسیر میں سیوطی نے ایک بہت بڑا جھوٹ طبرانی اور ابن مردویہ سے اور انہوں نے ابوامامہؓ سے نقل کیا ہے کہ ابوامامہؓ نے کہا:

جب آیت انذار نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے اپنے رشتہ داروں، اہل بیتؑ اور اپنے گھر کے لوگوں کو جمع کیا۔ آپ نے ابتدا بنی ہاشم سے کی اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا: اپنی جانیں دوزخ کی آگ سے بچالو۔ میں تمہاری خاطر خدا کے پاس کچھ نہیں کر پاؤں گا۔ پھر اپنے اہل بیتؑ کی جانب منہ پھیر کر فرمایا: اے ابوبکر کی بیٹی عائشہ! اے عمر کی بیٹی حفصہ! اے ام سلمہؓ اور اے فاطمہؑ! اپنی جانیں پروردگار سے خرید لو اور اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی کوشش کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ تب عائشہ رو پڑیں اور کہنے لگیں: "کیا ایسا دن بھی آئے گا؟"[2]

---

[1] ابن قتیبہ: المعارف صفحہ ۴۲۶، تحقیق ثروت عکاشہ۔ طبقات الحفاظ صفحہ ۲۵ ترجمہ نمبر ۵۴۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۶۵۔ تہذیب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۲۷۷۔

[2] سیوطی درمنثور جلد ۵ صفحہ ۹۶۔ مذکورہ آیت کے ذیل میں بارھویں حدیث۔

جیسا کہ ہمیں علم ہے یہ آیت رسولِ اکرمؐ کی بعثت سے تیسرے سال میں نازل ہوئی تھی جبکہ ابو امامہ اسعد بن زرارہؓ انصاری تھے اور مدینہ کے ان حضرات میں شامل تھے جو سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے یعنی انہوں نے اس وقت رسول اکرمؐ کی زیارت کی اور اسلام قبول کیا جب آنحضرتؐ ہجرت کرنے والے تھے۔ لہٰذا اس آیت کے نزول کے وقت وہ موجود نہ تھے۔

اس سے بھی بدتر یہ کہ امہات المومنین بی بی عائشہ اور بی بی حفصہ آنحضرتؐ کی زوجیت میں ہجرت کے بعد آئیں اور جہاں تک ام المومنین عائشہ کا تعلق ہے وہ آیت کے نزول کے وقت نہ صرف یہ کہ رسولِ اکرمؐ کی زوجیت میں نہیں آئی تھیں بلکہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

اس سے مستزاد یہ کہ ابو امامہ اسعد بن زرارہؓ نے ہجرت کے پہلے سال ماہ شوال میں وفات پائی لہٰذا جب امہات المومنین بی بی عائشہ اور بی بی حفصہ رسول اکرمؐ کی زوجیت میں آئیں اور آنحضرتؐ کی اہل خانہ بنیں اس وقت اسعد بن زرارہؓ زندہ ہی نہ تھے کہ اس واقعہ کو دیکھنے کے لیے موجود ہوتے۔ [1]

اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ: ابو امامہؓ، ابن عباسؓ اور بہت سے دوسرے راویوں نے یہ احادیث خود نقل نہیں کیں اور ایسی روایات جعلی احادیث تیار کرنے کے لیے معاویہ کے فرمان کے بعد ۵۰ھ کے لگ بھگ وجود میں آئیں۔ ان جعلسازوں نے اہلبیتِ رسولؐ کے فضائل کے متعلق روایات کو بے اعتبار بنانے کے لیے یہ احادیث گھڑیں اور معتبر یا غیر معتبر راویوں سے منسوب کر دیں۔

ممکن ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے کوہِ صفا پر چڑھ کر یا پتھروں کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر قریشیوں کو ڈرانے کے لیے آواز بلند کرنے کا واقعہ صحیح ہو لیکن یہ قول کہ یہ واقعہ آیت انذار کے نزول کے بعد رونما ہوا تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور کسی وجہ سے بھی درست نہیں ہو سکتا۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے خود اس آیت کریمہ کا متن بہترین دلیل ہے کیونکہ یہ آیت بالصراحت

---

[1] اسد الغابہ جلد ا صفحہ ۸۶-۸۷ ترجمہ نمبر ۹۸۔ الاصابہ جلد ا صفحہ ۵۰ ترجمہ نمبر ۱۱۱۔ الاستیعاب جلد ا صفحہ ۸۲ ترجمہ نمبر ۳۰۔ ابن قتیبہ: المعارف صفحہ ۳۰۹۔

رسولِ اکرمؐ کو یہ ذمہ داری سونپتی ہے کہ اپنے قبیلہ اور قوم کو نہیں بلکہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو خوف دلائیں۔ اگرچہ قریشی آنحضرتؐ کے رشتہ دار تھے لیکن بہت دُور کے رشتہ دار تھے۔ وہ فقط قریشی کے لقب میں آپ کے ساتھ شریک تھے اور شاید ان کے ساتھ آپکا شجرۂ نسب بہت اوپر جا کر ملتا تھا۔

کوہِ صفا پر

قبل ازیں ہم اس امر کی جانب اشارہ کر چکے ہیں کہ شروع شروع میں رسولِ اکرمؐ کی دعوت اپنے گھر تک محدود تھی۔ امیرالمومنین علیہ السلام جو غارِ حرا میں آنحضرتؐ کے ہمراہ تھے آپ کی بعثت کے ابتدائی لمحات میں ہی وحی کی خوشبو سے واقف ہو گئے تھے۔ رسولِ اکرمؐ کی گھر واپسی کے بعد حضرت خدیجہؓ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ اس وقت مسلمانوں کی کل تعداد تین ہو گئی۔ معتبر دستاویزات سے پتا چلتا ہے کہ ایک طویل مدّت تک اسلام کے پیروؤں کی تعداد ان تین سے آگے نہیں بڑھی۔[۱] بعد میں زید بن حارثہ اور جعفر بن ابی طالب بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ تاہم ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ ان دونوں حضرات نے ٹھیک کن دنوں اسلام قبول کیا۔ تین سال تک دعوت کو خفیہ رکھنے کے بعد بعثت کے تیسرے سال میں رسولِ اکرمؐ کو خدا کی جانب سے حکم ملا کہ اپنے بہت قریبی رشتہ داروں اسلام کی جانب بلائیں۔ یہ حکم سورۂ شعراء کی ۲۱۴ ویں آیت میں دیا گیا۔ اس دعوت کی کیفیت ہم امام امیرالمومنین علیہ السلام کی زبان مبارک سے پہلے سن چکے ہیں۔ اسی آسمانی حکم کے موصول ہونے کے بعد رسولِ اکرمؐ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو کھانے کی دعوت دی اور اپنے گھر میں انہیں خدا کا خوف دلایا اور اسلام کا پیغام ان تک پہنچایا۔ اس کے بعد اسلام کی دعوت عام ہو گئی اور مختلف طبقوں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

۱۔ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۱۱-۳۱۲ تین حدیثیں، دوسرا ایڈیشن۔ مطبوعہ مصر۔ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم۔ الاستیعاب علی ہامش الاصابہ جلد ۳ صفحہ ۱۶۳۔ جلد ۲ صفحہ ۴۸۰۔ اسد الغابہ جلد ۴ صفحہ ۴۹ ترجمہ نمبر ۳۶۹۶

تاہم جب تک رسولِ اکرمؐ مکہ میں تھے قریش سے اس طرح کا عام خطاب کرنے کا کوئی امکان نہ تھا کیونکہ سوائے چند ایک کے قریشی آپ پر ایمان نہیں لائے تھے تاکہ ممکن ہوتا کہ آپ انہیں دوزخ کے عذاب سے ڈرائیں اور ان کی شفاعت کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں گفتگو کریں۔ ایسی باتیں اس وقت درست ہو سکتی تھیں جب قریشیوں نے ظاہری طور پر ہی سہی آپ کی رسالت کو قبول کر لیا ہوتا اور اسلامی اعتقادات کو تسلیم کر لیا ہوتا۔ ایک ایسے ماحول میں جس میں رسول اکرمؐ کی' طاقتور قریشیوں اور ان کے حمایتیوں کے ساتھ دن رات کشمکش رہتی تھی۔ وہ آپ کا تمسخر اڑاتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات اونٹ کی اوجھڑی اور کوڑا کرکٹ بھی آپ کے سر پر گرا دیتے تھے یا آپ کو پتھر مارتے تھے' آپ کا یہ فرمانا کہ میں آپ کی شفاعت کی قدرت نہیں رکھتا یا میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور تمہیں چاہیے کہ اپنے اعمال کے ساتھ اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ[1] کچھ معقول نظر نہیں آتا۔ اگر خطاب کا یہ عام انداز ہوتا بھی تو اس وقت ہونا چاہیے تھا جب وہ سب کے سب بظاہر مسلمان ہو جاتے اور آپ کی رسالت قبول کر لیتے۔

جو روایات اہل بیتؑ کے مکتب میں موجود ہیں ان کی یہ شکل ہے:

۱- وہ تمام روایات جن کا آیہ انذار سے تعلق ہے بلا استثنا یہ بتاتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اپنے گھر میں خوف دلایا اور ان میں سے کسی اور چیز کا ذکر نہیں ہے۔[2]

۲- رسولِ اکرمؐ کا کوہِ صفا پر چڑھ کر عام خطبہ دینا فتح مکہ کے بعد تک ملتوی کیا گیا ہے۔

اصلی قصہ کیا ہے؟

ہمیں اہلبیتؑ کے مکتب میں موجود روایات سے اصلی قصے کا پتا چلتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۳۳ اور بعد کے صفحات پر متعلقہ روایات خصوصاً ان میں سے پہلی حدیث ملاحظہ فرمائیں۔ [2] تفسیر البرہان جلد ۳ صفحہ ۱۸۹ - ۱۹۲ ملاحظہ کریں جس میں اس آیت کے ذیل میں اسی مضمون کی دس حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: جب رسول اکرمؐ نے مکہ فتح کیا تو انہوں نے کوہِ صفا پر کھڑے ہوکر فرمایا: اے بنی ہاشم اور اے بنی عبدالمطلب! میں تم پر مہربان ہوں اور تمہارا ہمدرد ہوں۔ یہ مت کہو کہ محمدؐ ہم میں سے ہیں۔ خدا کی قسم تم میں سے اور دوسروں میں سے میرے اقربا سوائے متقیوں اور پرہیزگاروں کے کوئی نہیں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن آؤ اور تمہاری گردن پر دنیا کا بوجھ لدا ہو جبکہ دوسرے آئیں اور آخرت ان کے ہمراہ ہو۔ یہ جان لو کہ میں نے کوئی عذر اپنے اور تمہارے درمیان اور خدا کے اور تمہارے درمیان باقی نہیں چھوڑا۔ میرا عمل میرا مال اور تمہارا عمل تمہارا مال ہے۔ [1]

رسول اکرمؐ اس بے حد بجا خطبے میں یہ فرمانا چاہتے تھے کہ اب جبکہ آپ نے مکہ فتح کرلیا ہے اور فی الحقیقت جزیرۃ العرب کے حاکم بن گئے ہیں آپ کے رشتہ داروں کو یہ نہیں چاہیے کہ آپ کی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے دنیا کی طرف راغب ہوجائیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ رسولِ اکرمؐ سے تعلق اور نزدیکی کی بنیاد تقویٰ کے علاوہ اور کسی چیز پر نہیں اور وہ دنیا پرستی اور لوگوں کا مال ہتھیا لینے کے ساتھ سازگار نہیں۔ انہیں ہر دنیاوی حکومت کی طرح یہ بھی نہیں سوچنا چاہیے کہ اب جبکہ ان کا ایک رشتہ دار قوم و ملک کا سربراہ بن گیا ہے وہ قوت، دولت اور آرام حاصل کرسکتے ہیں اور دنیا و آخرت میں آقا اور سردار ہیں۔

ہم ایک مرتبہ پھر یہ کہیں گے کہ ممکن ہے کہ یہ روایت کسی راوی سے منسوب کردی گئی ہو حالانکہ خود اسے نسبت کا علم نہ ہو۔ مثلاً ہم نے دیکھا ہے کہ جو روایت ابوعثمان نہدی نے زہیر بن عمرو اور قبیصہ بن مخارق سے نقل کی ہے اس کے متعلق حدیث شناسوں نے کہا ہے کہ: فقط اس نے یہ روایت ان دونوں سے نقل کی ہے۔ یعنی کسی دوسرے نے یہ روایت ان دونوں سے نہیں سنی یا وہ روایت جو ابن عباس، ابو امامہ یا براء بن عازب سے نقل کی گئی ہے۔ ممکن ہے ان لوگوں نے یہ باتیں نہ کہی ہوں اور تقریباً یقین کی حد تک اس بات کا احتمال ہے کہ نہیں کہیں لیکن جب معاویہ نے سرکاری فرمان جاری کیا اور اموی حکومت کی

---

[1] صفات الشیعہ، آٹھویں حدیث صفحہ ۱۶۵ از علی و شیعہ مطبوعہ نجف ۱۹۵۸ء۔

ساری مشینری حرکت میں آگئی تاکہ احادیث وضع کیجائیں تو بخوبی تصور کیا جاسکتا ہے کہ عروہ بن زبیر (جس نے ام المومنین بی بی عائشہ سے روایت نقل کی ہے) اور محمد بن شہاب زہری (جس نے ابوہریرہ[1] سے روایت نقل کی ہے) ان روایات کے خالق تھے لیکن انہوں نے یہ روایات بی بی عائشہ، ابوہریرہ اور ابن عباس سے منسوب کر دیں۔ چونکہ اس زمانے میں شہروں میں ذرائع آمد ورفت بے حد محدود تھے اس لیے طالبانِ حدیث کو تحقیق کی فرصت بہت کم ملتی تھی اور اگر کوئی حدیث کسی سے منسوب ہو جاتی تھی تو اس بات کا امکان بہت کم ہوتا تھا کہ انسان اس تک پہنچے اور اس سے حدیث کی صحت کے بارے میں دریافت کرے۔ لہٰذا اگرچہ احادیث جعلی ہوتی تھیں لیکن لوگوں کے ہاتھوں میں یا زبانوں پر باقی رہ جاتی تھیں اور پھر معتبر یا غیر معتبر کتابوں میں منتقل ہو جاتی تھیں اور اس طرح خلافت کے سرکاری اسلام کے معارف اور احکام کا حصہ بن جاتی تھیں۔

اس تمام گفتگو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زیر بحث روایات کے مجموعے میں سے کچھ روایات ایسی ہیں جن کی سند متصل ہے لیکن ایسے اشخاص پر ختم ہوتی ہے جو موقع پر موجود نہ تھے مثلاً وہ روایات جو ام المومنین بی بی عائشہ، ابوہریرہ اور ابن عباس سے نقل کی گئی ہیں۔ کچھ دوسری روایات ایسی ہیں جن کے پہلے راوی تو ممکن ہے موقع پر موجود رہے ہوں لیکن صاحبِ کتاب کی سند میں پہلے راوی تک تسلسل نہیں ہے۔ مثلاً وہ روایت جو زبیر بن عوام سے نقل کی گئی ہے۔ پس اس مجموعے میں سے کوئی روایت بھی تنقید کی بھٹی میں سے صحیح سلامت باہر نہیں آئی اور حدیث شناسی کے معیار کے مطابق ان میں سے کوئی حدیث بھی درست اور مستند ثابت نہیں ہوئی۔

اس دوران میں فقط ایک روایت سامنے آئی ہے جس کی سند صحیح تھی اور جو مکتبِ خلفاء اور مکتبِ اہلبیتؑ دونوں کی کتابوں میں مذکور ہے اور جسے ہم نے اس سند کے ساتھ جو امام امیر المومنینؑ پر منتہی ہوتی ہے آپ کے لیے بالتفصیل نقل کیا ہے۔ اس حدیث کی سند اس بنا پر صحیح تھی کہ اولاً تو مکتب خلفاء کے حدیث شناسوں نے اس

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۳۳-۱۳۴ مطبوعہ محمد علی صبیح و اولادہٗ۔ قاہرہ

کے امیر المومنین تک صحیح اور مسلسل ہونے کا اعتراف کیا ہے [۱] اور ثانیاً اس کے پہلے راوی امیرالمومنینؑ اس واقعہ کے رونما ہونے کے وقت موجود تھے اور اپنی عمر کے تقریباً پندرھویں سال میں تھے۔ [۲]

اسناد حدیث کی چھان بین

ان تمام احادیث کے ہوتے ہوئے جو ام المومنین بی بی عائشہ، زبیر، ابن عباس اور ابوہریرہ جیسے مہاجر صحابیوں میں سے اور انس بن مالک، براء بن عازب اور ابو امامہ جیسے انصار صحابیوں سے نیز قبیصہ اور زہیر جیسے لوگوں جنہیں بے جا طور پر صحابیوں میں شمار کیا گیا ہے اور زہری اور قتادہ جیسے مشہور تابعین سے مکتب خلافت کی صحاح، مسانید اور تفاسیر میں تواتر کے ساتھ روایت کی گئی ہیں اس واقعہ کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی لیکن تھوڑی بہت جانچ پڑتال کے بعد ہم نے دیکھا ہے کہ آیت انذار بعثت کے تیسرے سال میں نازل ہوئی تھی اور اس وقت ان راویوں میں سے سوائے ایک کے کوئی بھی مکہ میں نہ تھا کہ وہ بچشم خود اس واقعہ کا مشاہدہ کرتا اور اس کی خبر دیتا۔ ان میں سے کچھ تو اس وقت پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اور کچھ مکہ میں نہیں رہتے تھے۔ فقط زبیر بن عوام ایک ایسے شخص تھے جو اس وقت زندہ موجود تھے اور مکہ میں سکونت پذیر تھے لیکن سیوطی نے دسویں صدی میں جو روایت نقل کی ہے وہ منقطع ہے اور اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ یہ حدیث کس سلسلے کے ساتھ روایت کرتا ہے۔ یوں اس قسم کی تمام احادیث پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ہیں۔

---

[۱] مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳۵۲ کے حاشیے میں احمد محمد شاکر کی تحقیقات ملاحظہ کریں۔ حدیث ۱۳۷۱

[۲] طبری جلد ۲ صفحہ ۳۱۹ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم۔ ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۴۱ مطبوعہ دارالکتاب العربی۔

احادیث کے متن کا مطالعہ

ام المومنین بی بی عائشہ اور ابو ہریرہ کی روایات میں بی بی فاطمہ زہرا علیہا السلام سے خطاب کیا گیا ہے حالانکہ وہ اس وقت تک متولد نہیں ہوئی تھیں اور اگر پیدا ہو بھی گئی تھیں تو عہدِ طفولیت کی منزل میں تھیں۔ لہٰذا ان سے اس انداز میں خطاب نہیں کیا جا سکتا تھا اور زیادہ مناسب ہوتا کہ یہ خطاب رسول اکرمؐ کی دوسری بیٹیوں سے ہوتا جو بی بی فاطمہؑ سے بڑی تھیں۔

ابنِ عباس کی روایت میں جو قرآن مجید کی آیت میں "وَرَهْطَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ" کے جملے کا اضافہ کیا گیا ہے جو بجائے خود اس حدیث کے وضعی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

گزشتہ روایات کے برعکس ابو امامہ کی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مدینہ میں رونما ہوا ہے اور روئے سخن ازواجِ رسولؐ بی بی عائشہ اور بی بی حفصہ کی طرف ہے جبکہ ابو امامہ ان دونوں بیبیوں کے نکاح میں آنے سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔

ان تمام دلائل کے علاوہ مذکورہ بالا احادیث کے متن سے پتا چلتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اپنے قریبی رشتہ داروں یعنی بنی ہاشم اور دُور کے رشتہ داروں یعنی بنی عبد مناف اور قریش کے دوسرے قبائل کو مخاطب فرمایا اور انہیں آپؐ کے ساتھ رشتہ داری پہ بھروسہ کرنے اور اعمال صالح ترک کرنے سے خبردار کیا جبکہ ایسی باتیں بعثت کے تیسرے سال سے مناسبت نہیں رکھتیں کیونکہ اس وقت قبیلۂ قریش کے تمام خاندان خواہ وہ بنی ہاشم ہوں یا دوسرے آنحضرتؐ کی دعوت کا مذاق اڑاتے تھے۔ اسی طرح اس واقعہ کا مدینہ میں پیش آنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ قریش مدینہ میں سکونت پذیر نہیں تھے کہ ان سے وہاں خطاب کیا جاتا۔

پھر اصلی قصہ کیا ہے؟

جن لوگوں نے یہ روایات وضع کی ہیں انہوں نے مندرجہ ذیل دو احادیث میں

رد و بدل کر کے ایک قصہ بنا لیا ہے اور اسے روایت کر دیا ہے :

ا۔ وہ حدیث جس کا تعلق آیت انذار کے نزول اور قریبی رشتہ داروں کو ڈرانے سے ہے۔

ب۔ رسول اکرمؐ کے فتح مکہ کے بعد اعلان کرنے کے بارے میں حدیث جس میں مخصوص افراد کے نام نہیں لیے گئے بلکہ قریش کو موردِ خطاب قرار دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ آنحضرت کے ساتھ رشتہ داری پر بھروسا نہ کریں۔

جعلسازوں نے ان دو حدیثوں کو ملا کر ــــ جن میں سے ہر ایک بجائے خود درست تھی ــــ نئی روایتیں گھڑ لیں تاکہ ان کے ذریعے لوگ اصلی روایت کو بھول جائیں جو کہ امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کے فضائل کی حامل تھی۔

ان روایتوں کی گھڑنت کا زمانہ

ان روایات میں سے زیادہ تر روایتیں معاویہ کے زمانے میں اموی حکومت کا قرب حاصل کرنے کے لیے گھڑی گئیں لیکن دو دلائل کی بنا پر ابنِ عباس کی روایت کے وضع کرنے کا زمانہ بنی عباس کی خلافت کا ابتدائی دور معلوم ہوتا ہے :

ا۔ ابن عباس سے منسوب روایت میں ایک جملہ قرآن مجید کی آیت میں بڑھایا گیا ہے اور یہ چیز عباسی خلافت کے اوائل میں زنادقہ کی حدیث سازی سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب "خَمْسُوْنَ وَمِائَۃُ صَحَابِیٍّ مُخْتَلَقٍ" کے پہلے جز میں بحث کی ہے۔

ب۔ جعلی احادیث کی تیاری اور انہیں ابن عباس سے منسوب کرنا عباسیوں کی ابتدائی دور سے مناسبت رکھتا ہے۔

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ جعلسازی اپنی وضع کی ہوئی روایات کو عباسیوں کے جد کے نام سے پھیلانا چاہتے تھے اور دوم یہ کہ اس ذریعے سے وہ عباسیوں کا قرب حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ابنِ عباس کے نام سے جو روایات وضع کی گئی ہیں ان میں سے بیشتر اسی زمانے سے مناسبت رکھتی ہیں۔

دو دوسری روایتیں

اس حدیث کی چھان بین کے بعد جو بظاہر متواتر معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت جعلی ہے۔ ہم دو اور جعلی حدیثوں کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ یہ دونوں بھی گزشتہ حدیث کی مانند معاویہ کے زمانے کی جعلسازی کا شکار ہوگئیں اور ان میں امام علی علیہ السلام کے جو فضائل بیان کیے گئے تھے ان کی نفی کر دی گئی۔

پہلی حدیث امیرالمومنین علیہ السلام کے فضائل کے بارے میں مشہور حدیث ہے۔ رسول اکرمؐ اس حدیث میں فرماتے ہیں:

"اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا فَمَنْ اَرَادَ الْمَدِیْنَةَ فَلْیَاْتِ الْبَاب"[1]

میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔ پس جو شخص شہر میں داخل ہونا چاہے وہ دروازے سے آئے۔

یہ مشہور حدیث دوسرے الفاظ میں بھی نقل کی گئی ہے:

اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا فَمَنْ اَرَادَ الْمَدِیْنَةَ فَلْیَاْتِهَا مِنْ بَابِهَا.[2]

اَنَا دَارُ الْحِکْمَةِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا"[3]

اَنَا مَدِیْنَةُ الْحِکْمَةِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا فَمَنْ اَرَادَ الْحِکْمَةَ فَلْیَاْتِ الْبَابَ"[4]

---

[1] مستدرک الصحیحین جلد ۳ صفحہ ۱۲۶۔ تاریخ بغداد جلد ۳ صفحہ ۳۴۸ جلد ۷ صفحہ ۱۷۲، جلد ۱۱ صفحہ ۴۸ اور ۴۹۔ مجمع الزوائد جلد ۹ صفحہ ۱۱۴۔ تہذیب التہذیب جلد ۹ صفحہ ۳۲۰، جلد ۷ صفحہ ۴۲۷۔ اسدالغابہ جلد ۴ صفحہ ۲۲۔ قدیم ایڈیشن اور جلد ۴ صفحہ ۱۰۰ نیا ایڈیشن۔ الجامع الصغیر جلد ۱ صفحہ ۱۰۸ مطبوعہ مصر ۱۳۷۴ھ منتخب کنزالعمال علی ہامش المسند جلد ۵ صفحہ ۳۰۔ الصواعق المحرقہ صفحہ ۱۲۲ مطبوعہ عبدالوہاب عبداللطیف۔ تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۷۰ مطبوعہ کراچی۔

[2] مستدرک الصحیحین جلد ۳ صفحہ ۱۲۷

[3] ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۳۷۔ الجامع الصغیر جلد ۱ صفحہ ۱۰۸۔ منتخب کنزالعمال جلد ۵ صفحہ ۳۰۔

[4] تاریخ بغداد جلد ۱۱ صفحہ ۲۰۴

اس معتبر اور مشہور حدیث کو ایک جھوٹی حدیث میں بدل دیا گیا ہے جس کی عبارت یہ ہے: اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ اَبُوْبَکْرٍ اَسَاسُھَا وَعُمَرُ حِیْطَانُھَا وَعُثْمَانُ سَقْفُھَا وَعَلِیٌّ بَابُھَا.[۱]

میں علم کا شہر ہوں اور ابوبکر اس کی بنیاد اور عمر اس کی دیواریں اور عثمان اس کی چھت اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔

اس حدیث کے متن کے بارے میں ہم اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ایک شہر کی دیواریں اور دروازہ تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کی چھت کا ہونا ایک غیر معقول امر ہے۔

ایک اور روایت جو معاویہ کے زمانے کے جعلسازوں کے چنگل میں پھنس گئی اور اور انھوں نے اسے الٹا کر رکھ دیا۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی فضیلت کے بارے میں رسول اکرمؐ کی یہ مشہور اور معتبر حدیث ہے:

اَلْحَسَنُ وَ الْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ .[۲]

حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔

اموی عہد کے جعلسازوں نے اس حدیث کو بے اعتبار بنانے کے لیے امیر المومنین علیہ السلام کی زبانی یوں روایت کی:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ : اَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ سَیِّدَا کُھُوْلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ اِلَّا النَّبِیِّیْنَ وَ الْمُرْسَلِیْنَ .[۳]

---

[۱] الصواعق المحرقہ صفحہ ۳۴ دوسرا ایڈیشن [۲] سنن ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۵۶ اور ۶۶۱ حدیث ۳۷۶۸ اور ۳۷۸۱۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۳، ۶۲، ۶۴، ۸۲ اور جلد ۵ صفحہ ۳۹۱ و ۳۹۲ حلیۃ الاولیاء جلد ۴ صفحہ ۱۳۹ و ۱۹۰ اور جلد ۵ صفحہ ۵۸ و ۷۱۔ تاریخ بغداد جلد ۱ صفحہ ۱۴۰ اور جلد ۶ صفحہ ۳۷۲ اور جلد ۹ صفحہ ۲۳۱ و ۲۳۲ اور جلد ۱۰ صفحہ ۹۰ و ۲۳۰۔ تہذیب التہذیب ترجمہ زیاد بن جبیر اور سوید بن سعید۔ خصائص نسائی صفحہ ۳۶۔ اسد الغابہ جلد ۵ صفحہ ۵۷۴ قدیم ایڈیشن۔ المستدرک جلد ۳ صفحہ ۱۶۷ و ۳۸۱ سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۴۴ حدیث ۱۱۸ [۳] سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۳۶ حدیث ۹۵۔ سنن ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۱۰۔ ۶۱۱ حدیث ۳۶۶۴، ۳۶۶۵، ۳۶۶۶۔

ابو بکر اور عمر اولین و آخرین میں بہشت کے پیر مردوں کے سردار ہیں سوائے انبیاء و مرسلین کے۔

اس حدیث کے وضعی ہونے کے بارے میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ خلیفہ ابو بکر اور عمر کو بہشت کے پیر مردوں کے سردار گردانا گیا ہے جب کہ اصولاً بہشت میں بڑھاپے کا کوئی وجود نہ ہوگا۔

ملخّص

اس بحث میں ہم نے دیکھا کہ:

۱۔ خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے گھڑ دوڑ اور تیر اندازی سے متعلق حدیث میں "اَوْ جُنَاحٍ" کے الفاظ کا اضافہ کر دیا گیا اور حضرت مہدیؑ کے ظہور سے متعلق روایت میں تبدیلی کی گئی۔

۲۔ خلیفہ کے حکم کے مطابق:

حدیث یوم الدار کے مقابلے میں احادیث وضع کی گئیں۔ نیز اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ کی حدیث میں وَاَبُوْبَکْرٍ اَسَاسُهَا وَعُمَرُ حِیْطَانُهَا وَعُثْمَانُ سَقْفُهَا کے جملوں کا اضافہ کیا گیا۔ اسی طرح اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ والی حدیث کے مقابلے میں اَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ سَیِّدَا کُهُوْلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ والی حدیث بنائی گئی۔

نتیجتاً ان جعلسازیوں اور تحریفوں کے ذریعے احادیث رسولؐ میں اتنے اختلافات اور تناقضات پیدا کر دیے کہ سب کے لیے صحیح اسلام کی شناخت کرنا دشوار ہو گیا۔

اموی دور میں حدیثِ رسولؐ کو جن آفتوں سے دوچار ہونا پڑا ان کے یہ چند نمونے کافی ہیں۔ اس زمانے میں احادیث میں جو اسلام کا دوسرا رکن اور قرآن مجید کی تشریح و توضیح ہیں اس قدر رد و بدل کیا گیا کہ اسلام کے تمام اعتقادی، اخلاقی اور عملی پہلو تحریف کی زد میں آگئے اور ان کی صورت ہی مسخ ہو گئی۔ اس موضوع پر ہم انشاء اللہ آگے چل کر مفصل گفتگو کریں گے۔

گزشتہ بحثوں میں وضع حدیث کو اسلام میں تحریف کا تیسرا عنصر گردانا گیا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں، حدیثیں وضع کرنے میں ان دو میں سے کوئی ایک سبب کارفرما تھا:

۱۔ دربار خلافت کا تقرب حاصل کر کے دنیاوی منافع سے بہرہ مند ہونا۔

۲۔ اسلام دشمنی۔

بلاشبہ بعض اوقات یہ دونوں اسباب اور دونوں عوامل ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ

تیرھواں درس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَھُمْ۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ تحریف کا تیسرا عنصر حدیثیں وضع کرنا تھا۔ موضوع حدیثوں کی تیاری زیادہ تر رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد شروع ہوئی لیکن حدیثیں گھڑنے کا رسمی فرمان صادر نہیں ہوا تھا۔ معاویہ کے عہد میں حدیثیں جعل کرنے کے لیے سرکاری حکم جاری کیا گیا۔ پھر معاملہ اس سے بھی کچھ آگے بڑھ گیا کیونکہ خلافت کی انتظامیہ نے اس کام کے عوض بھاری معاوضہ دینا شروع کر دیا۔ لہٰذا رسمی اسلام ــــــ جس کی نمائندگی دربار خلافت کر رہی تھی ــــــ وہ درحقیقت اموی دور میں، خصوصاً معاویہ کے عہد میں تشکیل پایا۔

امیرالمومنینؑ کے بارے میں روایات کی گھڑنت

معتزلی شافعی عالم ابن ابی الحدید اپنے استاد ابو جعفر اسکافی سے نقل کرتے ہیں کہ:

لہ رسول اکرمؐ سے جھوٹی باتیں منسوب کرنے کی شکل میں حدیثیں وضع کرنے کا کام خود آنحضرتؐ کے زمانہ ہی میں شروع ہو گیا تھا اور آپ نے اس عمل کے بارے میں تہدید آمیز الفاظ استعمال کیے تھے اور اس کی پاداش میں دوزخ کی دعید دی تھی۔ ملاحظہ ہو سنن ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۳۴ حدیث ۳۷۱۵ اور سنن ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۔۱۵ مطبوعہ محمد فواد عبدالباقی۔

معاویہ نے صحابہ اور تابعین (علم حدیث میں صحابہ کے شاگرد) کا ایک بہت بڑا گروہ بھرتی کیا تاکہ وہ علی علیہ السلام کے بارے میں غلط احادیث گھڑیں جو آپ کی شکست اور ذلت کا موجب بنیں اور لوگوں کو آپ سے متنفر کر دیں۔ اس کام کے لیے اس نے بھاری معاوضہ مقرر کیا تاکہ دنیادار لوگ اس کی طرف راغب ہوں۔ اس قسم کے لوگوں نے بھی جو کچھ وہ چاہتا تھا اور پسند کرتا تھا وہ کر دکھایا۔

اس گروہ میں شامل صحابیوں میں سے ابوہریرہ، عمرو بن عاص اور مغیرہ بن شعبہ قابل ذکر ہیں اور تابعین میں عروۃ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

پہلی حدیث

محمد بن شہاب زہری ناقل ہے کہ عروۃ بن زبیر نے اسے بی بی عائشہ کی نقل کی ہوئی ایک حدیث سنائی جس کے مطابق بی بی عائشہ کہتی ہیں:

كُنْتُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ص اِذْ اَقْبَلَ الْعَبَّاسُ وَعَلِيٌّ فَقَالَ: يَاعَائِشَةُ اِنَّ هٰذَيْنِ يَمُوْتَانِ عَلٰى غَيْرِ مِلَّتِيْ. اَوْقَالَ، دِيْنِيْ.

میں رسول خدا ص کے پاس تھی جب عباس اور علی ع دور سے نمودار ہوئے اور وہ ہماری طرف آ رہے تھے۔ رسول اکرم ص نے مجھ سے فرمایا: اے عائشہ یہ دونوں آدمی میری ملت یا دین کے علاوہ کسی اور ملت اور دین پر مریں گے۔

عبدالرزاق، معمر سے نقل کرتا ہے کہ زہری کے پاس دو حدیثیں تھیں جو عروہ نے بی بی عائشہ کے حوالے سے نقل کی تھیں۔ یہ دونوں حدیثیں علی علیہ السلام کے بارے میں تھیں۔ ایک دن میں نے زہری سے ان دونوں اشخاص (عروہ اور عائشہ) کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ تمہیں ان دونوں سے اور ان کی حدیث سے کیا کام؟ خدا ان کے متعلق بہتر جانتا ہے۔ وہ میرے نزدیک بنی ہاشم کے بارے میں (بغض، کینہ اور جھوٹ سے) متہم ہیں۔

دوسری حدیث

دوسری حدیث جو عروہ نے بی بی عائشہ سے نقل کی ہے، یوں ہے:

قَالَتْ كُنْتُ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِهٖ اِذْ اَقْبَلَ الْعَبَّاسُ وَعَلِيٌّ فَقَالَ: يَاعَائِشَةُ! اِنْ سَرَّكِ اَنْ تَنْظُرِيْ اِلٰى رَجُلَيْنِ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَانْظُرِيْ اِلٰى هٰذَيْنِ قَدْ طَلَعَا فَنَظَرْتُ فَاِذَا الْعَبَّاسُ وَعَلِيٌّ.

وہ کہتی ہیں: میں رسول اکرمؐ کے پاس تھی کہ عباس اور علیؑ آئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اے عائشہ! اگر تم دوزخی مردوں کو دیکھنا چاہتی ہو تو ان دو کو دیکھو جو ہماری طرف آرہے ہیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو اچانک مجھے عباس اور علیؑ نظر آئے۔ [1]

ہم نہیں جانتے کہ یہ روایت گھڑنے میں کس کا ہاتھ ہے؟ آیا یہ حرکت عروہ بن زبیر نے کی ہے یا کسی اور نے؟ بہرحال معاویہ کی منحوس سیاست پر عملدرآمد کے نتیجے میں ایسی حدیثیں وضع کرکے نشر کی گئی ہیں۔

تیسری حدیث

عمرو بن عاص نے دو حدیثیں گھڑی ہیں ان میں سے ایک ایسی ہے جو بدقسمتی سے بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کی ہے۔ وہ کہتا ہے: میں نے رسول خداؐ سے سنا کہ آپ نے فرمایا: آلِ ابی طالب میرے دوستوں میں سے نہیں ہیں بلکہ میرے دوست تو خدا اور نیکوکار مومنین ہیں۔ اس بارے میں ہم صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے رجوع کرتے ہیں جنہوں نے یہ حدیث یوں نقل کی ہے:

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ جِهَارًا غَيْرَ سِرٍّ يَقُوْلُ: اَلَا اِنَّ اٰلَ اَبِيْ فُلَانٍ لَيْسُوْا بِاَوْلِيَائِيْ اِنَّمَا وَلِيِّيَ اللّٰهُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ.

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد ۱ صفحہ ۳۵۸ - پہلا ایڈیشن - مصر

عمرو بن عاص کہتا ہے: میں نے رسول اکرمؐ کو سنا کہ بلند آواز سے فرماتے تھے: آل ابی فلاں (ابی طالب) میرے دوست نہیں ہیں. میرے دوست فقط خدا اور مومنین ہیں۔[1]

ایک اور روایت میں بخاری اس حدیث پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ عمرو بن عاص کی نقل کے مطابق رسول اکرمؐ نے اس قول کے بعد فرمایا: "لیکن یہ میرے رشتہ دار ہیں اور میں ان کے ساتھ صلہ رحم کرتا ہوں۔"[2]

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آل ابی طالب کون ہیں!

آل عربی زبان میں کسی شخص کے اہل خاندان اور رشتہ داروں کو کہتے ہیں[3] لہٰذا کسی شخص کے بال بچے لفظ "آل" کے اولین مصداق ہوتے ہیں. حضرت ابوطالبؑ کے چار بیٹے طالب، عقیل، جعفرؓ اور علیؑ اور ایک بیٹی فاختہ ام ہانی تھیں[4] لیکن درحقیقت اس گروہ کے چار افراد حضرت علیؑ سے دشمنی کی وجہ سے اس جعلی حدیث کا شکار ہوئے ہیں ورنہ امویوں کو طالب عقیل اور جعفرؓ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ حتیٰ یہ جو کہا گیا ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کافر تھے اور آخری دم تک ایمان نہیں لائے اس کا مقصد بھی حضرت علیؑ کی

---

[1] صحیح ۔ بخاری، کتاب الادب جلد ۸ صفحہ ۶ مطبوعہ بولاق مصر۔ صحیح مسلم کتاب الایمان جلد ۱ صفحہ ۱۳۶ مطبوعہ مصر۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۰۳۔ مسند ابی عوانہ جلد ۱ صفحہ ۹۶ مطبوعہ ہند۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الادب۔ باب یُبَلُّ الرَّحِمُ بِبِلَالِهَا جلد ۸ صفحہ ۶ مطبوعہ بولاق مصر اور جلد ۳ صفحہ ۲۴ مطبوعہ مصر۔

[3] راغب اصفہانی: مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں: اَلْآلُ: قِيلَ مَقْلُوبٌ عَنِ الْأَهْلِ وَيُصَغَّرُ عَلَىٰ أُهَيْلٍ ... وَيُسْتَعْمَلُ فِيمَنْ يَخْتَصُّ بِالْإِنْسَانِ اخْتِصَاصًا ذَاتِيًّا اَمَّا بِقَرَابَةٍ قَرِيبَةٍ اَوْ بِمُوَالَاةٍ ... وَقِيلَ آلُ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ اَقَارِبُهُ وَقِيلَ الْمُخْتَصُّونَ بِهِ (لفظ آل میں)، نیز جوہری الصحاح میں اور رازی مختار الصحاح میں کہتے ہیں: وَآلُ الرَّجُلِ: اَهْلُهُ وَعِيَالُهُ (لفظ اول میں)، اور قیومی نے المصباح المنیر میں کہا ہے: وَالْآلُ: اَهْلُ الشَّخْصِ وَهُمْ ذَوُو قَرَابَتِهِ وَقَدْ اُطْلِقَ عَلَىٰ اَهْلِ بَيْتِهِ (لفظ اول میں) اور فیروز آبادی القاموس المحیط میں کہتے ہیں: وَالْآلُ: اَهْلُ الرَّجُلِ وَاَتْبَاعُهُ وَاَوْلِيَائُهُ وَلَا يُسْتَعْمَلُ اِلَّا فِيمَا فِيهِ شَرَفٌ غَالِبًا (مادہ آل میں)۔ [4] اعلام الوریٰ باعلام الہدیٰ صفحہ ۱۵۱۔

ذات میں نقص نکالنے کے سوا کچھ نہیں۔

خلیفہ عثمان حضرت علیؑ سے کہا کرتے تھے:

میں کیا کروں۔ قریش آپ کو پسند نہیں کرتے۔ آپ نے جنگ بدر میں ان کے تیس سے زیادہ آدمی قتل کر دیے اور آدمی بھی ایسے جن کے چہرے سونے کی رکابی کی مانند چمکتے تھے۔ حضرت علیؑ واقعی قریشیوں یعنی جزیرۃ العرب کے سب سے زیادہ طاقتور گروہ کی دشمنی اور کینہ کے مضبوط پھندے میں گرفتار تھے۔ انہوں نے جنگ بدر میں قریشیوں کے دورِ جاہلیت کے سب سے اونچے سرداروں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ مزید براں اگر قریشی پڑھے آپ سے خون بہا کے طلبگار نہ بھی تھے تب بھی وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ آپ کو کرسیٔ اقتدار پر دیکھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ نبوت اور خلافت ایک جگہ اور ایک خاندان میں جمع ہو جائیں۔[1] امام علیؑ بھی اکثر ان لوگوں کی شکایت کرتے تھے اور ان سے متعلق شکوے بارگاہِ الٰہی میں پہنچاتے تھے۔[2]

---

[1] تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۲۲۲، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، عمر بن خطاب کی ابن عباس سے گفتگو۔

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۳۳، ۱۷۲، ۲۱۷، ۷۷ صفحات ۲۴۶ اور ۳۳۶ تحقیق صبحی صالح مطبوعہ بیروت ۱۹۶۷ء

خطبہ نمبر ۲۱۷ کا ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے:

خدایا! میں قریش سے انتقام لینے پر تجھ سے مدد کا خواستگار ہوں کیونکہ انہوں نے میری قرابت اور عزیزداری کے بندھن توڑ دیے اور میرے ظرف (عزت و حرمت) کو اوندھا کر دیا اور اس حق کے بارے میں جس کا میں سب سے زیادہ اہل ہوں جھگڑا کرنے کے لیے ایکا کر لیا اور یہ کہنے لگے کہ یہ بھی حق ہے آپ لے لیں اور یہ بھی حق ہے کہ آپ کو اس سے روک دیا جائے۔ یا تو غم و حزن کی حالت میں صبر کیجیے یا رنج و اندوہ سے مر جائیے۔ میں نے نگاہ دوڑائی تو مجھے اپنے اہلبیت کے سوا نہ کوئی معاون نظر آیا اور نہ کوئی سینہ سپر اور معین دکھائی دیا تو میں نے انہیں موت کے منہ میں دینے سے بخل کیا۔ آنکھوں میں خس و خاشاک تھا مگر میں لعاب دہن نگلتا رہا اور غم و غصہ پی لینے کی وجہ سے ایسے حالات پر صبر کیا جو حنظل سے زیادہ تلخ اور دل کے لیے چھریوں کے کچوکوں سے زیادہ المناک تھے۔

(ترجمہ مفتی جعفر حسین صاحب اعلی اللہ مقامہٗ صفحہ ۵۹۷)

گزشتہ احادیث کی تشخیص

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حدیث کیا کام کرنا چاہتی ہے اور کس مقصد کے لیے گھڑی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں معاویہ نے حکم دیا تھا کہ ابو تراب ؑ کی جو فضیلت حدیث میں موجود ہو اس کی نقیض روایت تیار کر کے اس کے سامنے پیش کی جائے۔ اس حدیث میں ایک عام بات کہی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ تمام فضائل جو رسول اکرم ؐ سے امام علی ؑ کی شان میں منقول ہیں اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے ہیں کیونکہ اس سے صرف یہ پتا چلتا ہے کہ آنحضرت ؐ نے اپنے ابن عم حضرت علی ؑ کو خوش کرنے کے لیے صلہ رحم کے طور پر یہ باتیں کہی تھیں۔ کیا رسول اکرم ؐ نے اپنی مشہور اور بے حد معتبر حدیث میں یہ نہیں فرمایا تھا کہ :

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ ۔ [1]

کیا زیر نظر حدیث کی موجودگی میں اس حدیث کے بلند مفہوم میں سے کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے ؟ اگر کسی شخص کو مکتب خلافت کی روائی کتابوں پر عبور حاصل ہو تو وہ دیکھے گا کہ معاویہ کے احکام پر کس طرح حرف بحرف عملدرآمد کیا گیا۔

معاویہ کے زمانے سے لیکر عمر بن عبد العزیز کے زمانے تک مسلمان امویوں کے زیر اثر امیر المومنین علیہ السلام سے کینہ اور دشمنی کی فضا میں پرورش پا رہے تھے اور آپ کی مذمت اور ملامت پر مبنی بے شمار جعلی احادیث لوگوں کے پاس موجود تھیں۔ بالخصوص جو لوگ مکہ اور مدینہ جیسے اسلام کے اصلی مراکز سے دور تھے ان پر ان جعلی حدیثوں کا بڑا بھاری بوجھ لاد دیا گیا تھا۔ آپ نے اکثر سنا ہو گا کہ اسلام کے تمام منبروں اور مسلمانوں کی تمام مسجدوں سے نماز جمعہ کے خطبوں کے ایک واجب جزو کے طور پر امیر المومنین علیہ السلام پر لعنت کی جاتی تھی اور یہ امویوں کی اسلامی حکومت کی سرکاری سیاست تھی۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ایک دن ایک خطیب نماز جمعہ کے خطبے میں لعنت کرنا بھول گیا۔ یہ بات

---

[1] ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۳۳ حدیث ۳۷۱۳ ۔ ابن ماجہ جلد ۱ صفحہ ۴۳ حدیث ۱۱۶ ۔ مستدرک الصحیحین جلد ۳ صفحہ ۱۰۹ ۔ ۱۱۰ اور ۱۱۶ ۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۸۱ ۔ تذکرۃ الاولیاء مناقب امیر المومنین صفحۃ الصفوۃ جلد ۱ صفحہ ۳۱۳

اسے اس وقت یاد آئی جب وہ سوار ہو کر گھر جا رہا تھا۔ اس بھول کے کفارے کے طور پر اس نے حضرت علیؑ پر ہزار بار لعنت کی۔

اس جگہ کو جہاں اس نے یہ فعل انجام دیا تھا مقدس اور بابرکت سمجھا گیا اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی جس کا نام "مسجد اللعن" رکھا گیا۔ اموی دور میں عالمِ اسلام کی فضا کچھ ایسی ہی تھی اور اسی فضا میں رسول پاکؐ کی احادیث نشر ہوتیں۔ بلاشبہ بعد میں ائمۂ اہلبیتؑ اور ان کے اصحاب نیز غیبت کے بعد کے زمانے کے علماء کی کوششوں کے نتیجے میں اموی دور کے ملبے تلے دبی ہوئی حقیقت کسی حد تک نمودار ہو گئی لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر اہل مغرب کے رکیک حملوں اور یہودی، عیسائی اور کمیونسٹ اسلام شناسوں کی مسلسل کوششوں نے حقائق کو جہالت کے ملبے تلے شبہات کی تاریکی میں دفن کر دیا۔

عمر بن عبد العزیز کے بعد، خاص طور سے عباسیوں کے برسرِ اقتدار آنے پر — اور وہ بھی آلِ محمدؐ کے نام پر[1] — اور ائمۂ اطہار اور ان کے جاں نثار اصحاب کی کوششوں کی بدولت امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں وہ باتیں نہیں کی گئیں جن کا کہنا اموی دور کی ابتدا میں ممکن تھا۔ لہٰذا صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے لے کر مسند احمد بن حنبل اور مسند ابی عوانہ تک اس حدیث کے جتنے نسخے موجود ہیں ان میں یہ حدیث اس شکل میں نقل کی گئی ہے: اِنَّ آلَ اَبِی فُلَانٍ لَیْسُوْا بِاَوْلِیَآئِیْ ...... (آلِ ابی فلاں میرے دوست نہیں ہیں) لیکن مکتبِ خلفاء کے ایک بہت بڑے محدث کی تحریر کردہ صحیح بخاری کی شرح میں کہا گیا ہے کہ آلِ ابی فلاں سے مراد آلِ ابی طالب ہیں۔[2] البتہ اس نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ آلِ ابی طالب سے رسول اکرمؐ کی مراد ابو طالب کے وہ فرزند اور ان کے خاندان کے وہ افراد ہیں جو کافر اور مشرک ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ وہ کافر اور مشرک کون کون ہیں؟

---

[1] ابن واضح: تاریخ یعقوبی جلد ۳ صفحہ ۸۱-۸۹ مطبوعہ بیروت اور مسعودی: التنبیہ والاشراف صفحہ ۲۹۳، ابن اثیر: تاریخ کامل جلد ۴ صفحہ ۳۰۱، حوادث سال ۱۲۹ھ اور صفحہ ۳۱۰ حوادث سال ۱۳۰ھ

[2] فتح الباری جلد ۴ صفحہ ۳۵۳ مطبوعہ مصر۔

کیا وہ مسلم و مصدّق اول علی مرتضیٰؑ ہیں؟ کیا وہ شہید موتہ جعفر ذوالجناحین ہیں؟ کیا وہ عقیل اور طالب ہیں؟ کیا وہ امامانِ امت حسنؑ وحسینؑ ہیں؟ کیا تاریخ ابو طالب کے فرزندوں میں سے کسی ایک کے بھی مشرک یا کافر ہونے پر گواہی دیتی ہے یا وہ بیشتر اسلام کے لیے جاں نثاری میں پیش پیش رہے ہیں؟ اور جو چند ایک ایسے نہیں ہیں وہ بھی کم از کم سچے مسلمان ہیں۔

یہ تھی وہ روایت جو عمرو بن عاص سے نقل کی گئی اور بدقسمتی سے مکتبِ خلافت کی صحاح اور مسانید میں بھی داخل ہو گئی ہے۔

چوتھی حدیث

اب ہم اس روایت پر نظر ڈالتے ہیں جو ابو ہریرہ سے نقل کی گئی ہے۔ اعمش روایت کرتا ہے کہ: جب ابو ہریرہ "عام الجماعہ[1]" میں معاویہ کے ہمراہ عراق آیا تو مسجد کوفہ پہنچا۔ اپنے استقبال کرنے والوں کی کثرت دیکھ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور چند مرتبہ اپنے گنجے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہنے لگا: اے اہل عراق! کیا تم سمجھتے ہو کہ میں خدا اور رسولؐ سے جھوٹی باتیں منسوب کر کے اپنے آپ کو دوزخ کی آگ میں جلانا چاہتا ہوں؟ بخدا میں نے رسولِ اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: "ہر پیغمبر کا ایک حرم ہوتا ہے اور میرا حرم مدینہ میں کوہ عیر سے کوہِ ثور تک ہے۔ جو شخص میرے حرم میں حوادث وجود میں لائے اور فتنہ برپا کرے اس پر خدا، ملائکہ اور تمام بنی نوع انسان کی لعنت ہے۔"

عراق امیرالمومنین علیہ السلام کے شیعوں کا مرکز تھا اور اہل کوفہ نے آپ سے تربیت پائی تھی اور آپ کے گرویدہ تھے۔ ابو ہریرہ نے ایسے لوگوں کے سامنے تقریر کی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو میری باتوں کو سچ نہیں سمجھتے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے کہا: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں جھوٹ بولتا ہوں اور اپنے

---

[1] اس اصطلاح کی توضیح کے لیے گزشتہ درس سے رجوع کریں۔

آپ کو دوزخ کی آگ میں جلانا چاہتا ہوں؟ پھر اس نے قسم کھائی کہ میں نے یہ بات خود رسول اکرمؐ سے سنی ہے اور پھر اس جملے کا اضافہ کیا کہ: میں خدا کو گواہ ٹھہرا کر کہتا ہوں کہ علیؑ نے اس سرزمین میں فتنہ و فساد برپا کیا ہے۔

جب ابوہریرہ کی اس تقریر اور اس حدیث کے بیان کرنے کی خبر معاویہ کو ملی تو اس نے اسے اس عظیم خدمت کے بدلے میں انعام و اکرام سے نوازا اور اسے رقم بھیجنے کے علاوہ مدینہ کا حاکم مقرر کر دیا۔[1]

چوتھی حدیث کی تشخیص

اس حدیث میں ابوہریرہ کہتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے: مدینہ میرا حرم ہے اور اس کی حدیں کوہِ عیر سے کوہِ ثور تک ہیں۔ تاہم جو کچھ تاریخ، سیرت اور عرب کے جغرافیے کی کتابوں سے پتا چلتا ہے وہ یہ ہے کہ درحقیقت کوہِ ثور مدینہ اور اس کے گرد و نواح میں نہیں ہے۔ اس نام کا ایک پہاڑ شہر مکہ کے پاس واقع ہے اور یہ وہی پہاڑ ہے جس میں ہجرت کے وقت رسولِ اکرمؐ نے پناہ لی تھی۔[2]

اس موضوع پر بہت سے جغرافیہ دانوں کی تحریریں موجود ہیں جن کی روشنی میں اس حدیث کے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

یعقوبی اپنی کتاب "البلدان" میں کہتا ہے: مکہ بڑے بڑے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے .... جو پہاڑ مکہ کو گھیرے ہوئے ہیں وہ یہ ہیں: "ابو قبیس .... قعیقعان، فاضح، محصب، صفا کے نزدیک ثور، حرا اور ثبیر"....[3] نیز کہتا ہے: "مدینہ کے دو پہاڑ ہیں جن کے نام احد اور عیر ہیں۔"[4]

---

[1] شرح ابن ابی الحدید جلد ۱ صفحہ ۳۵۹ - پہلا ایڈیشن مصر۔

[2] طبری جلد ۲ صفحہ ۳۷۸ مطبوعہ دار المعارف - مصر۔ ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۴۸۵ - ابراہیم الابیاری وغیرہ - دوسرا ایڈیشن - انساب الاشراف جلد ۱ صفحہ ۲۶۰ - مطبوعہ محمد حمید اللہ - ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۷ - مطبوعہ دار الکتاب: طبقات الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۲۲۸ - مطبوعہ بیروت ۔ الوفا باحوال المصطفیٰ جلد ۱ صفحہ ۲۳۶ [3] البلدان صفحہ ۷۸، مطبوعہ نجف [4] البلدان صفحہ ۷۷، مطبوعہ نجف۔

مقدوسی جو اسلام کے بہترین جغرافیہ دانوں میں سے ہے اپنی کتاب "احسن التقاسیم" میں لکھتا ہے:

"غارِ ثور مکہ میں ایک فرسنگ کے فاصلے پر ہے اور منیٰ کی جانب واقع ہے۔" [1]

اسلام کے عظیم ترین جغرافیائی دائرۃ المعارف کا مصنف یاقوت حموی کہتا ہے:

"ثور، مکہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے اور اس میں ایک غار ہے جس میں رسول اکرمؐ نے پناہ لی تھی۔" [2]

محمد بن عبد المنعم حمیری اپنی جغرافیائی ڈکشنری میں تصریح کرتا ہے:

"ثور جسے ثورِ اطحل کہا جاتا ہے مکہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے جو شہر کے جنوبی حصے میں واقع ہے اور مکہ سے اس کا فاصلہ دو میل ہے۔" [3]

عرب کے مشہور فرہنگ نویسوں میں سے جس نے بھی لفظ "ثور" کے بارے میں گفتگو کی ہے اس نے تصریح کی ہے کہ ثور مکہ کے پاس واقع ایک پہاڑ کا نام ہے مثلاً

ابن اثیر (متوفی ۶۰۶ھ) نے اپنی کتاب "النہایہ فی غریب الحدیث والاثر" میں۔

فیومی (متوفی ۷۷۰ھ) نے اپنی کتاب "المصباح المنیر" میں مادۂ ثور میں۔

عرب کے عظیم لغت نویس علامہ ابن منظور (متوفی ۷۱۱ھ) نے اپنی کتاب "لسان العرب المحیط" میں مادۂ ثور میں۔

---

[1] احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم صفحہ ۱۰۲ مطبوعہ بریل ۱۸۸۵ء

[2] معجم البلدان جلد ۲ صفحہ ۸۶-۸۷ مطبوعہ بیروت۔

[3] الروض المعطار فی خبر الاقطار صفحہ ۱۵۱ اور اسی کتاب کے مادۂ غار میں صفحہ ۴۲۵ تحقیق ڈاکٹر احسان عباس۔

فیروزآبادی (متوفی ۸۱۶ھ) نے اپنی کتاب "القاموس المحیط" میں مادۂ ثور میں۔
زبیدی (متوفی ۱۲۰۵ھ) نے عظیم کتاب "تاج العروس" میں جو "القاموس المحیط" کی شرح ہے۔

اس تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ اس روایت کا راوی ابوہریرہ بھلکڑپن کا شکار تھا اور اس نے کوہِ ثور کو جو مکہ کے پاس واقع ہے مدینہ میں قرار دیا ہے۔ مکتبِ خلافت کے متعدد علماء نے اس حدیث کے بارے میں گفتگو کی ہے اور جس طرح یہ مقامات گڈمڈ ہوگئے ہیں اس کی توضیح کرنے کی کوشش کی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ شاید رسولِ اکرمؐ نے مدینہ کے پہاڑوں میں سے ایک کا نام کوہِ ثور رکھ دیا ہے۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شاید رسولِ اکرمؐ مدینہ کے حرم کی حدود کا تعین کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے اس حد کو مکہ کے دو پہاڑوں کے درمیانی فاصلہ سے تشبیہ دی۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ راوی نے غلطی سے کوہِ ثور کا نام لیا ہے جب کہ اسے کوہِ احد کہنا چاہیے تھا۔ چوتھے شخص نے روایت میں کوہِ ثور کا نام ہی نہیں لیا یا مبہم صورت (کذا) میں لیا ہے تاکہ ان الجھنوں میں گرفتار نہ ہو۔

یہ کوششیں مذکورہ بالا اور دوسری صورتوں میں جاری ہیں۔ حتیٰ کہ حنبلی محدّث عبدالسلام بن محمد مصری (متوفی ۶۶۹ھ) کے وسیلے سے اس مسئلے کا قطعی حل تلاش کر لیا گیا۔ یعنی اس نے مدینہ میں ثور نام کا ایک پہاڑ ڈھونڈ نکالا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس پہاڑ کے وجود کے بارے میں سنا گیا۔ صدیوں تک وہ تمام علماء جو کسی وجہ سے اس مسئلے کی شُدبُد رکھتے تھے یہ کہتے رہے کہ ایسا کوئی پہاڑ شہر مدینہ کے پاس نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ حدیث اہلِ عراق نے روایت کی ہے جو مدینہ کے جغرافیائی حالات سے واقفیت نہیں رکھتے۔ پھر اچانک عراق اور بصرہ کے علماء کے درمیان ایک شخص اٹھ کر کہتا ہے کہ کوہِ احد کے پہلو میں ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جس کا نام ثور ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ تمام اہلِ مدینہ اس پہاڑ کو جانتے ہیں۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی اور بعد کی صدی میں ایک اور گواہ مل جاتا ہے۔ وہ

شخص جس کا نام عبداللہ مطری (متوفی ۷۶۵ھ) ہے اپنے مرحوم باپ محمد مطری سے اس پہاڑ کا وجود نقل کرتا ہے اور کہتا ہے: اہل مدینہ پشت ہا پشت سے کوہِ احد کے پہلو میں ثور نامی پہاڑ کو جانتے ہیں جو چھوٹا اور سرخ رنگ کا ہے۔

ہمارے زمانے میں معاصر علماء نے اس روایت کی غلطیاں رفع کرنے کے لیے ایک اور انداز میں کوشش کی ہے۔ "آثار المدینہ" کے مؤلف استاد عبدالقدوس نے اپنی کتاب کے ۱۳۹ ویں صفحے پر پہاڑ کا نقشہ کھینچا ہے اور مشہور کتاب "حیات محمدؐ" کے مصنف ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے اپنی ایک اور کتاب 'منزل الوحی' میں صفحہ ۵۱۲ کے سامنے یہی نقشہ نقل کیا ہے اور اس کتاب کے صفحہ ۴۴۰ پر کہا ہے کہ اس موضوع پر اس نے عبدالقدوس کی تحریر یعنی "آثار المدینہ" سے استفادہ کیا ہے۔ [۱] لیکن استاد ہیکل نے 'حیات محمدؐ' میں دوسرے مورخین اور جغرافیہ نویسوں کی طرح کہا ہے کہ غارِ ثور اور کوہِ ثور مکہ کے قریب واقع ہیں اور انہیں ہجرت کے سفر کے دوران رسولِ اکرمؐ کے پوشیدہ ہونے کے مقام کے طور پر موردِ بحث قرار دیا ہے۔ [۲]

سمرۃ بن جندب کی حدیث سازی

ابن ابی الحدید کے استاد جعفر اسکافی معتزلی اپنی گفتگو کے دوران سمرۃ بن جندب کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: معاویہ نے سمرۃ کو ایک لاکھ درہم بھیجے تا کہ وہ رسول اکرمؐ سے ایک روایت نقل کرے کہ آیہ شریفہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۔ [۳]

(سورہ بقرہ۔ آیت ۲۰۴-۲۰۵)

---

[۱] ان تمام مباحث کے سلسلے میں شرح صحیح مسلم تحقیق محمد فواد عبدالباقی صفحہ ۹۹۵-۹۹۸ مطبوعہ لبنان سے استفادہ کیا گیا۔ [۲] اس سلسلے میں "حیات محمدؐ" صفحہ ۱۷۶-۱۷۷، پہلا ایڈیشن سے رجوع کریں۔ [۳] یعنی لوگوں میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسکی باتیں دنیاوی زندگی میں تمہیں بھلی لگتی ہیں لیکن خدا اسکے دل میں جو کچھ ہے اس سے خوب واقف ہے۔ وہ تمہارا سخت ترین دشمن ہے جب اسے حکومت و سلطنت ملجائے تو وہ صرف یہ کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد کا بیج بوئے۔ وہ کھیتوں، مویشیوں اور انسانوں کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں فرماتا۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور رسولِ اکرمؐ کے قول کے مطابق وہ (علی علیہ السلام) خدا کے دین کے دشمن ہیں۔ اسی طرح آیہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ[1] (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۰۷) امیرالمومنین علی علیہ السلام کے قاتل عبدالرحمن ابن ملجم مرادی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

سمرۃ نے اتنی رقم قبول نہ کی اور معاویہ نے اسے بڑھا کر دو لاکھ درہم بھیج دیے۔ سمرۃ نے یہ رقم بھی قبول نہ کی اور معاویہ نے اسے چار لاکھ درہم تک بڑھا دیا۔ یہ رقم سمرۃ بن جندب نے قبول کر لی اور لوگوں کے سامنے ایک جھوٹی حدیث بیان کر کے معاویہ کی خواہش پوری کر دی۔[2]

یہ منحوس روایت نشر ہو گئی اور اس نے اموی عہد کے اسلامی معاشرے پر گہرا اثر ڈالا۔ یہاں تک کہ اس کی بنا پر خوارج کو "شراۃ" کا نام دیا گیا۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا اور اپنی جانیں خدا کے پاس بیچ ڈالیں کیونکہ اس جعلی روایت میں ابن ملجم کو سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۷ ویں کا مصداق قرار دیا گیا تھا اور ان لوگوں میں شمار کیا گیا تھا جو اپنے آپ کو خدا کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں اور اس کی راہ میں فدا کر دیتے ہیں۔ یہ سمرۃ کی جعلی حدیث کا پہلا منفی اثر تھا لیکن دوسرا اثر یہ ہوا کہ سورۂ بقرہ کی آیات ۲۰۴ اور ۲۰۵ نے امیرالمومنین علیہ السلام کے بارے میں اتنی شہرت پائی کہ جب حضرت امام حسنؑ کو ان کے نانا رسول اکرمؐ کے پہلو میں دفن کرنے کا سوال پیدا ہوا اور ام المومنین بی بی عائشہ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ حجرہ ہے اور عبداللہ ابن عباس نے ان کے ساتھ بحث کی اور کہا کہ آپ رسول اکرمؐ کی نو بیویوں میں سے ایک ہیں اور آنحضرتؐ کے چھوڑے ہوئے ورثے میں سے باقی بیویوں کے آٹھ حصے بنتے ہیں تو بی بی عائشہ نے جواب میں کہا: اَنْتُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (تم جھگڑالو لوگ ہو) یہ مذکورہ بالا آیات کی جانب اشارہ ہے جن کا ذکر جعلی حدیث میں کیا گیا اور امام علیؑ کو ان کا مصداق ٹھہرایا گیا ہے۔

---

[1] یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں۔

[2] شرح نہج البلاغہ جلد ا صفحہ ۳۵۸ - ۳۶۱ (قدیم ایڈیشن)

ان بتوں کو توڑ دینا چاہیئے

تمام طبقوں کے علماء اور مصنفین نے مجھ سے بارہا پوچھا ہے کہ کیا حدیث غدیر مکتب خلافت کی معتبر کتابوں میں موجود نہیں ہے اور کیا حدیث یوم الدار اس مکتب کے علماء کی نظروں سے نہیں گزری ؟ میں اس کا کیا جواب دے سکتا ہوں ؟

جی ہاں انہوں نے یہ احادیث دیکھی ہیں لیکن کیا کیا جا سکتا ہے ؟ حدیث یوم الدار کے مقابلے میں کئی ایک شکلوں میں اور کئی ایک سندوں کے ساتھ اس کی نقیض روایات موجود ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ تحقیق کرنے پر وہ جعلی ثابت ہوں ۔ بلا شبہ امیرالمومنینؑ اور اہلبیتؑ کے فضائل کے بارے میں ہر حدیث کے مقابلے پر اسے پایۂ اعتبار سے گرانے کے لیے اتنی کثیر تعداد میں روایات دستیاب ہیں کہ فی الواقع حقائق جھوٹ اور جعلسازی کے عظیم انبار کے نیچے دب جاتے ہیں ۔ جو شخص تاریخ اسلام میں حقیقت کا جویا ہو وہ اثریات (علم آثار قدیمہ) جیسی چیز کا محتاج ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کا سابقہ بہت سے بتوں سے پڑتا ہے جو اس کے دل و دماغ اور آنکھوں پر چھائے رہتے ہیں ۔ جب تک ان بتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ۔ میں نے جس کام کا بیڑا اٹھا رکھا ہے وہ جھوٹ اور جعلسازی کے ان بتوں کو توڑنا ہے جو مجرموں کے ساختہ پرداختہ ہیں اور جنہیں نادانوں نے پروان چڑھایا ہے ۔ حتیٰ کہ وہ تاریخ انسانی کے بڑے سے بڑے بتوں سے بھی بڑے اور سب سخت جانوں سے زیادہ سخت جان بن گئے ہیں ۔

مجھے کئی ہزار بزرگوں اور اہل علم حضرات نے بارہا کہا ہے کہ تم رسول اکرمؐ کی ایک تحقیقی سیرت کیوں نہیں لکھتے تاکہ اس پر اعتماد کیا جا سکے اور اس سے اسلام کے احکام استنباط کیے جا سکیں ؟ میں جواب میں کیا کہہ سکتا ہوں ۔ تاہم اس نسبتاً طویل بحث کے بعد اور اب جبکہ ان مقدمات سے واقف ہو چکے ہیں میں اصلی بات کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ درحقیقت یہ ممکن ہی نہیں کہ ان وضعی احادیث کے ہوتے ہوئے جن کے متون ظاہراً بڑے معتبر ہیں لیکن دراصل جھوٹ اور تحریف سے پر ہیں میں رسول اکرمؐ کی سیرت لکھ سکوں ۔ ان تمام موانع کے باوجود یہ کیونکر ممکن ہے کہ سیرتِ رسولؐ یعنی مجسم اسلام کے

ایک بہت بڑے حصے کو کاغذ پر منتقل کیا جا سکے ؟

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان دنوں جو احباب رسولِ اکرمؐ کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں خواہ وہ یورپی عیسائی اور یہودی ہوں یا مصری یا ایرانی مسلمان ہوں سب سے پہلے سیرۃ ابن ہشام سے رجوع کرتے ہیں ؟ لیکن مجھے کمال افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سالہا سال کے مطالعے اور تحقیق کے بعد میں اس بات کا معتقد ہوں اور اس اعتقاد کو زبان پر لاتا ہوں تاکہ یہ باقی رہے کہ ابن ہشام[1] سے زیادہ حقیقت پر پردہ ڈالنے والا سیرت نویس آج تک پیدا نہیں ہوا۔[2]

کیا یہ درست نہیں کہ فی زمانہ ہر وہ شخص جو تاریخِ اسلام سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے یا اس کے بارے میں تحقیق کرنا چاہتا ہے طبری[3] کی تاریخ سے رجوع کرتا ہے اور مکتبِ خلافت کے بہت سے عظیم علماء اسے امام المؤرخین سمجھتے ہیں ؟ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ جعلی روایات کو رواج دینے میں وہ سب مؤرخین سے بازی لے گیا ہے۔

اگر ایسی کتابیں تاریخِ اسلام اور سوانحِ پیغمبرؐ کے بہترین بلا واسطہ مصادر اور مدارک سمجھی جائیں تو اسلام کو سمجھنا کیونکر ممکن ہے ؟ نہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ان بتوں کو جو اسلام کو سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ ہیں توڑ دیا جائے۔ اب تک میری لکھی ہوئی کتابوں کی ۴ جلدیں چھپ چکی ہیں اور ان میں تاریخ طبری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ میں خداوندتعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اپنے اس کمزور بندے کے ہاتھوں سے اس بڑے بت کو توڑ دیا۔ ان کتابوں یعنی "عبداللہ بن سبا" کی دو جلدوں اور "خمسون و مائۃ صحابی مختلق" کی دو جلدوں کے ذریعے طبری حقیقت کے غیر جانبدار متلاشیوں کی نظروں میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔

ہمیں چاہیے کہ پہلے باطل کو پہچانیں اور اسے ترک کردیں تاکہ حقیقت کو پہچان

---

[1] ابو محمد عبد الملک بن ہشام معافری (متوفی ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ)

[2] اس قول کی مفصل دلیل مصنف کتاب ہذا کی کتاب "من تاریخ الحدیث" میں دیکھئے ہے۔

[3] محمد بن جریر طبری (متولد ۲۲۴ھ متوفی ۳۱۰ھ)۔

سکیں۔ کہا گیا ہے اور خوب کہا گیا ہے کہ: تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا یعنی ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر رات نہ ہوتی تو دن کی شناخت نہ ہوسکتی۔ اگر اندھیرا نہ ہوتا تو اجالے کا پتا نہ چلتا۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ پہلے ابوہریرہ، انس بن مالک، معاویہ اور عمرو بن عاص جیسے اشخاص کو پہچانیں تاکہ رسولِ اکرمؐ اور امیر المومنینؑ نیز جنگ جمل اور جنگ صفین جیسے حوادث کو پہچاننے کا امکان پیدا ہوسکے۔ جب تک ہم معاویہ اور یزید کو نہ پہچانیں امام حسنؑ کی صلح اور امام حسینؑ کے قیام کو نہیں سمجھ سکتے۔

ان کے علاوہ جب تک ہم تاریخ اسلام میں جعلسازی اور تحریف کرنے والوں کو پرکھ نہ لیں اور جب تک طبری اور ابن ہشام اور ان کے پیروؤں کو معتبر سمجھتے رہیں اس وقت تک نہ تو اسلام کی مثبت شخصیتوں کو پہچان سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی منفی شخصیتوں کو شناخت کر سکتے ہیں۔ جب تک یہ جعلی روایات احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں نہ اسلام کا خدا قابلِ شناخت ہے نہ اسلام کا پیغمبرؐ، نہ اسلام کا علیؑ، نہ خلافت و امامت و وصایت اور بالآخر نہ اسلام کی قیامت۔ لہٰذا سوائے اس راستے کے جس پر ہم ان بحثوں میں چل رہے ہیں خدا کو اور اسلام کو اور حقیقت کو پہچاننے کا اور کوئی راستا نہیں۔ ائمۂ اہلبیت علیہم السلام اپنے خاص شیعوں کے لیے اسی راستے پر چلتے تھے۔ بلاشبہ انہیں اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ ہمارے جتنی زحمت اٹھائیں۔ امام صادق علیہ السلام ایک مختصر جملے کے ساتھ اپنے پیروؤں کا راستا معین فرما دیتے تھے۔ جب آپ اپنے شاگردوں سے فرماتے تھے کہ: ثَلَاثَةٌ كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ: اَبُوْهُرَيْرَةَ وَاَنَسُ بْنُ مَالِكٍ وَامْرَاَةٌ[1] تو وہ صحیح اور ضعیف حدیث کو پہچاننے کا طریقہ سمجھ جاتے تھے لیکن ان دنوں ہمیں اس مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے متعدد کتابیں لکھنے اور مفصل بحثیں کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور امام صادق علیہ السلام کا اشارہ سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ ہم نے سالہا سال تک تتبع اور تحقیق کر رکھی ہو۔

لیکن اگر ہم حدیثِ ثقلین پر کان دھریں اور اسے دل سے تسلیم کر لیں تو ہم تمام ممکنہ گمراہیوں اور ہلاکتوں سے نجات پا سکتے ہیں۔

---

[1] الصدوق محمد بن علی بن الحسین بن بابویہ قمی، کتاب الخصال صفحہ ۱۹۰ مطبوعہ بیروت

چودھواں درس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ
اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَ قَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ
یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَہٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡہُ
وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ۔

میرے لیے موضوع اور تحریف شدہ احادیث کا پڑھنا ایک روحانی کرب کا باعث ہے جب کہ رسول اکرمؐ اور اہلبیتؑ کی صحیح احادیث پڑھنے سے مجھے اس قدر لذت حاصل ہوتی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ کاش ہم اپنی ساری عمر فقط صحیح احادیث کے مطالعے میں گزار سکتے، لیکن کیا کیا جائے کیونکہ جب تک بت ٹوٹ نہ جائیں خدا کی پرستش نہیں ہو گی اور جب تک غلط احادیث کی پہچان نہ ہو صحیح احادیث کی شناخت ممکن نہیں۔

میں چاہتا تھا کہ بحث کو مختصر کروں تاکہ جلدی اصلی مطلب تک پہنچا جا سکے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ بات ابھی مکمل طور پر واضح نہیں ہوئی اور بحث کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے اس مثال سے مطلب واضح ہو جائے: اگر ہم چاہیں کہ قدیم شہر "رے" پہنچیں، اس کی حدود کا پتا لگائیں اور اس کی خصوصیات کو سمجھیں تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم صدیوں سے پڑنے والی اس مٹی کو جس نے اس شہر کو ڈھانپ رکھا ہے، ہٹائیں اور شہر کو اس کے نیچے سے نکالیں۔ بلاشبہ یہ کام بھرپور محنت اور بے تحاشا معلومات کا متقاضی ہے۔

جو اسلام رسول اکرمؐ لائے تھے وہ وضعی احادیث کی دھول کے نیچے دب چکا ہے۔ چنانچہ اسلام کو پہچاننے کے لیے بھی ایک قسم کے علم اور آثار قدیمہ کی ضرورت ہے۔

یہاں ہم وضعی حدیثوں کے ہر دستے اور ہر قسم کا ایک ایک نمونہ نقل کرتے ہیں تاکہ ہم اس گناہِ عظیم کے گوناگوں پہلوؤں سے واقف ہو سکیں۔ اب تک ہم نے جن احادیث کی چھان بین کی ہے فقط وہی اس زمرے میں نہیں آتیں بلکہ ہم نے مطالعات کے مطابق ہر قسم کی احادیث میں سے ایک ایک حدیث بطور نمونہ پیش کی ہے تاکہ پتا چل جائے کہ مظلوم حق پر کیا گزری اور اسے کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور نتیجے کے طور پر ہم اس اسلام کو پہچاننے کے لیے جو رسولِ اکرمؐ لائے تھے اور جسے قیامت تک رہنا چاہیے اور رہے گا اپنا راستا متعین کر سکیں۔

آیاتِ تیمم

مقریزی غزوۂ مُریسیع کے بارے میں لکھتا ہے:

حدیثِ افک اس غزوہ میں وقوع پذیر ہوئی۔ رسول اکرمؐ نے ایک منزل پر پڑاؤ ڈالا تھا اور آپ کے پاس پانی نہیں تھا۔ وہاں ام المومنین بی بی عائشہ کا ہار ان کے گلے سے گر کر گم ہو گیا۔ آنحضرتؐ اس ہار کی تلاش کے سلسلے میں صبح تک وہیں رکے رہے۔ لوگوں کو پانی نہ ہونے کی وجہ سے اس صحرا میں سختی اٹھانی پڑی اور وہ کہنے لگے: یہ عائشہ ہے جس نے ہمیں اس بے آب و گیاہ سرزمین میں روک رکھا ہے۔ خلیفہ ابوبکر کو مسلمانوں کی یہ بات سن کر بہت دکھ ہوا اور انہوں نے اپنی بیٹی کو سرزنش کی۔ اس وقت آیۂ تیمم نازل ہوئی..... پھر مسلمانوں نے وہاں سے کوچ کر کے ایک سرسبز چراگاہ پر پڑاؤ کیا جہاں اراک (پیلو) کے درختوں کی بہتات تھی۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا: اے عائشہ! کیا تم میرے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔ عائشہ نے جواب دیا: جی ہاں! پھر انہوں نے اپنا لباس سمیٹا اور آنحضرتؐ نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ دوڑنے لگے۔ رسولِ اکرمؐ ام المومنین سے آگے بڑھ گئے۔ پھر آپ نے فرمایا: اس مرتبہ میرا آگے بڑھ جانا اس مرتبہ تمہارے آگے بڑھ جانے کے جواب میں ہے۔

قصہ یہ تھا کہ رسول اکرمؐ ابوبکر کے گھر آئے ہوئے تھے۔ عائشہ بھی وہیں موجود تھیں اور ان کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ چیز مجھے دیدو۔ عائشہ نے انکار

کیا اور وہ بھاگ کھڑی ہوئیں۔ آنحضرتؐ بھی ان کے پیچھے بھاگے لیکن انہوں نے زیادہ تیزی دکھائی اور آنحضرتؐ سے آگے بڑھ گئیں۔ اس سفر کے دوران (غزوہ مریسیع میں) عائشہ ایک ہودج پر سوار تھیں جو ایک اونٹ کی پشت پر رکھا ہوا تھا۔ رسول اکرمؐ کا آزاد کردہ غلام ابو مویہبہ اور ایک دوسرا شخص اونٹ کو ہانک رہے تھے۔۔۔[۱] اس کے بعد مقریزی باقیماندہ قصہ اور حدیث افک بیان کرتا ہے۔

جو کچھ مقریزی نے اور دوسروں نے ان تین قصوں کے سلسلے میں لکھا ہے وہ ام المومنین بی بی عائشہ کے طریق کار سے نقل کیا ہے۔ پہلے قصے کا تعلق مقابلے سے ہے

رسول اکرمؐ اور آپ کی بیوی کا مقابلہ

احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں، ہشام بن عروۃ بن زبیر سے اور اس نے اپنے باپ عروہ سے اور اس نے ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کیا ہے کہ عائشہ کہتی ہیں: میں ایک سفر میں رسول اکرمؐ کے ہمراہ تھی۔ اس وقت میں ایک کم سن دبلی پتلی لڑکی تھی اور ابھی فربہ نہ ہوئی تھی۔ سفر کے دوران ایک دن آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ سے فرمایا: تم لوگ آگے بڑھ جاؤ چنانچہ وہ آگے بڑھ گئے۔ پھر آپ نے مجھ سے فرمایا: آگے بڑھو تاکہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ کریں۔ میں نے ان کے ساتھ دوڑ لگائی اور ان سے سبقت لے گئی۔ رسول اکرمؐ خاموش رہے۔ وقت گزرتا گیا حتٰی کہ میں فربہ ہو گئی اور پہلے مقابلے کے بارے میں بھی بھول بھال گئی۔ پھر ایک اور سفر میں، میں آنحضرتؐ کے ہمراہ گئی۔ سفر کے دوران آپ نے صحابہ سے فرمایا: تم لوگ آگے بڑھ جاؤ تا، وہ آگے بڑھ گئے۔ پھر آپؐ نے مجھ سے فرمایا: آگے بڑھو تاکہ میں تمہارے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ کروں۔ میں نے ان کے ساتھ دوڑ لگائی اور وہ مجھ سے آگے بڑھ گئے پھر آپ ہنسنے لگے اور فرمایا: یہ اس کے جواب میں ہے۔[۲]

---

[۱] مقریزی: امتاع الاسلام صفحہ ۲۰۶-۲۰۷ مطبوعہ دمشق۔ کتاب المغازی جلد ۲ صفحہ ۴۲۶-۴۲۷ مطبوعہ مصر

[۲] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۳۹-۱۲۹، ۱۸۲، ۲۶۴، ۲۸۰۔ منتخب کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۷۳
ابن قتیبہ: عیون الاخبار: جلد ۱ صفحہ ۳۱۵

اس کتاب میں یہی روایت ابوسلمہ[۱] سے اور اس سے ملتی جلتی روایت ہشام بن عروہ[۲] سے اور اختصار کے ساتھ خلیفہ ابوبکر کے پوتے قاسم بن محمد سے نقل کی گئی ہے۔ ہشام نے اپنی روایت اپنے باپ سے اور قاسم بن محمد نے عائشہ[۳] سے نقل کی ہے۔

یہ حدیث مسابقہ ہے اور ہمیں اس میں مقابلے کے وقت کا کوئی اتا پتا نہیں چلتا لیکن مقابلے کے مقام کے بارے میں تصریح کی گئی ہے کہ یہ "بیدار" میں انجام پایا لیکن جہاں تک حدیث تیمم وافک کا تعلق ہے ابن سعد کاتب واقدی کے کہنے کے مطابق یہ غزوۂ مریسیع کے موقع پر وقوع پذیر ہوئی۔ وہ کہتا ہے:

"اس غزوہ میں عائشہ کا ہار گم ہو گیا اور اس بنا پر سپاہیوں کی روانگی روک دی گئی۔ پھر آیۂ تیمم نازل ہوئی اور اسید بن حضیر نے کہا: اے آلِ ابی بکر یہ تمہاری پہلی برکت نہیں ہے۔"

اسی غزوے کے دوران اہل افک نے بی بی عائشہ کے بارے میں باتیں بنائیں لیکن خدا نے ان کی عفت اور پاکدامنی کی تائید میں آیات نازل فرمائیں۔[۴]

مکتب خلفاء کی صحاح میں حدیث تیمم اس شکل میں بیان کی گئی ہے:

حدیث تیمم

بخاری نے کتاب تیمم میں عبدالرحمٰن بن قاسم سے اور اس نے اپنے باپ سے اور اس نے زوجۂ رسولؐ ام المومنین بی بی عائشہ نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں ایک سفر میں رسول اکرمؐ کے ہمراہ تھی حتیٰ کہ ہم بیداء یا ذات الجیش[۵] پہنچے۔ وہاں میرا ہار گر گیا۔

ا تا ۳ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۳۹، ۱۲۹، ۱۸۲، ۲۶۴، ۲۸۰۔ منتخب کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۷۳۔ ابن قتیبہ: عیون الاخبار جلد ۱ صفحہ ۳۱۵

۴ طبقات ابن سعد: جلد ۲ صفحہ ۶۵ مطبوعہ بیروت

۵ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۸، ۴۹۔ جلد ۲ صفحہ ۱۹۴۔ جلد ۳ صفحہ ۴۸ اور جلد ۴ صفحہ ۱۲۲ ذات الجیش، مدینہ سے ایک منزل کے فاصلے پر تھا۔

آنحضرتؐ اور آپ کے اصحاب ہار تلاش کرنے کے لیے صحرا میں رُکے رہے۔ اس مقام پر پانی دستیاب نہیں تھا اور مسلمان سپاہی جو پانی نہ ہونے کی وجہ سے مشکل میں مبتلا تھے، ابوبکر کے پاس آئے اور کہنے لگے: کیا آپ نہیں دیکھتے کہ عائشہ کیا کر رہی ہیں؟ انہوں نے رسول اللہؐ اور دوسرے لوگوں کو ایسی جگہ روک رکھا ہے جہاں پانی نہیں ہے۔ اس وقت جب رسول اکرمؐ اپنا سر میرے گھٹنے پر رکھ کر سو رہے تھے ابوبکر میرے پاس آئے اور کہنے لگے: تم نے رسول اکرمؐ کو اور دوسرے لوگوں کو روانگی سے روک رکھا ہے۔ حالانکہ نہ تو اس سرزمین میں پانی دستیاب ہے اور نہ ہی لوگوں کے پاس پانی ہے۔

عائشہ کہتی ہیں: ابوبکر مجھ پر غصہ ہوئے اور بہتیری باتیں کیں۔ ساتھ ہی وہ مجھے میرے پہلو میں مار بھی رہے تھے اور میں اپنی جگہ سے ہل جل نہیں سکتی تھی کیونکہ رسول اکرمؐ نے اپنا سر میرے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد آنحضرتؐ نیند سے بیدار ہوئے اور چونکہ لوگوں کے پاس فریضۂ شرعی کی انجام دہی کے لیے پانی نہیں تھا اس لیے خدا نے آیۂ تیمم نازل فرمائی اور لوگوں نے تیمم کیا۔ اُسَید بن حضیر نے جو انصار کے سرداروں میں سے ہیں کہا:

اے آلِ ابی بکر! یہ تمہاری پہلی برکت نہیں ہے۔ عائشہ کہتی ہیں: جب اس اونٹ کو جس پر میں سوار تھی ہانکا گیا تو مجھے ہار اس کے نیچے سے مل گیا۔ [1]

مسند احمد بن حنبل میں عبداللہ بن زبیر سے بی بی عائشہ کی زبانی نقل کیا گیا ہے کہ وہ کہتی ہیں: میں ایک سفر میں رسول اکرمؐ کے ہمراہ تھی چلتے چلتے ہم

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التیمم جلد ۱ صفحہ ۴۸ - ۴۹ اور باب مناقب ابی بکر جلد ۲ صفحہ ۱۹۴ اور سورۂ مائدہ کی تفسیر جلد ۳ صفحہ ۴۸ اور جلد ۴ صفحہ ۱۲۲۔ صحیح مسلم، باب التیمم جلد ۱ صفحہ ۱۹۱ - ۱۹۲۔ سنن نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۶۳ مطبوعہ ۱۳۴۸ھ۔ موطا مالک جلد ۱ صفحہ ۵۳-۵۴ حدیث ۸۹۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۷۹۔ ابوعوانہ جلد ۱ صفحہ ۳۰۲

تربان[1] کی سرزمین میں پہنچے جو شہر مدینہ سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ اس سرزمین میں پانی ناپید تھا..... حدیث کے آخر میں کہا گیا ہے کہ ابوبکر نے عائشہ سے کہا: "بیٹی میں تمہیں اتنا پُربرکت نہیں سمجھتا تھا۔ چونکہ تم نے مسلمانوں کو روانہ نہ ہونے دیا اور اس بیابان میں روکے رکھا اس لیے خدا نے کتنی بڑی برکت اور راحت بخشی ہے اور تیمم کا حکم ان پر نازل فرمایا ہے۔[2]

حدیث کی چھان بین اور تحقیق

حدیث تیمم میں ہم نے دیکھا کہ رسولِ اکرمؐ نے لوگوں کو ایک لق ودق صحرا میں روکے رکھا جبکہ ان کے پاس پانی نہ تھا۔ اسلام کے سپاہی اور جو جانور ان کے ساتھ تھے وہ مشکل میں مبتلا ہو گئے اور صبح تک پانی کی نایابی کی اذیت برداشت کرتے رہے۔ یہ سب کچھ آنحضرتؐ کی زوجہ ام المومنین عائشہ کے ہار کی تلاش کے سلسلے میں ہوا جو سنگِ جزع کا بنا ہوا تھا۔ آنحضرتؐ نے اپنے سپاہیوں کو خشک بیابان میں روکے رکھا تاکہ آپ کی بیوی کا گم شدہ گلوبند مل جائے۔ مسلمانوں نے اپنی تکلیف کی شکایت ابوبکر سے کی۔ ابوبکر نے اپنی بیٹی کے پاس جا کر اسے سرزنش کی اور کہا کہ مسلمان ہر سفر میں تمہاری وجہ سے بیحد تکلیف اٹھاتے ہیں لیکن جب مسلمان اپنی نماز کے سلسلے میں پریشان تھے تو خدا نے آیۂ تیمم نازل فرمائی اور مسلمانوں نے پہلی مرتبہ تیمم کے ساتھ نماز پڑھی۔ اس موقع پر ام المومنین کے والد نے ان سے کہا: بیٹی! مجھے علم نہ تھا کہ تم اتنی مبارک اور سراپا خیر و برکت ہو۔ خدا نے اس وجہ سے کہ تم نے مسلمانوں کو کوچ کرنے سے باز رکھا ہے اور ان کے یہاں رُکے رہنے کا باعث بنی ہو ان پر خیر نازل

---

[1] تربان ذات الجیش ملل اور سیالہ کے درمیان راستے پر واقع ایک سرزمین ہے جس میں پانی وافر مقدار میں موجود ہے اور پر قوت بھی ہے۔ رسول اکرمؐ نے جنگ بدر کے موقع پر اس سرزمین پر پڑاؤ ڈالا تھا (معجم البلدان جلد ا صفحہ ۸۳۳)۔

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۷۲ - ۲۷۳ مطبوعہ بولاق مصر

فرمائی ہے۔ علاوہ ازیں اُسید بن حضیر نے کہا: اے آل ابی بکر! یہ تمہاری پہلی خیر و برکت نہیں ہے اور پھر مہربان خدا نے ہار کو ضائع بھی نہیں ہونے دیا بلکہ وہ صبح کے وقت اونٹ کے نیچے سے مل گیا۔

یہ واقعہ رسول اکرمؐ کی اپنی زوجہ بی بی عائشہ سے بے پناہ محبت اور بے پناہ لگاؤ کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خدائے اسلام بھی اس پیار اور محبت کی جانب نگاہ رکھتا ہے اور اس کی خاطر مسلمانوں پر قانونی برکتیں نازل فرماتا ہے۔

اس واقعہ کے مختلف پہلوؤں کی مختصر سی چھان بین سے پتا چلتا ہے کہ یہ حدیث غزوۂ مُریسیع یا غزوۂ بنی مصطلق کے واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ اس غزوہ میں انصار و مہاجرین کے درمیان پانی کی وجہ سے جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور عبداللہ بن اُبّی سلول منافق نے اس سلسلے میں جو خطرناک باتیں کی تھیں اور خانہ جنگی کا جو احتمال موجود تھا اس کی بنا پر رسولِ اکرمؐ نے مدینہ کی جانب فوری طور پر کوچ کرنے کا حکم صادر فرمایا تھا جس کے نتیجے میں سپاہی فقط تھوڑی دیر کے لیے سونے، کھانا کھانے اور نماز پڑھنے کے لیے رکتے تھے اور باقی سارا وقت مدینہ کی جانب سفر کرنے میں گزار دیتے تھے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر نقل کی گئی حدیث میں ام المومنین کی زبانی یا ان کے نام سے وضع کر کے کہا گیا ہے یہ ضروری تھا کہ تیمم کا حکم اتنا مشہور ہو کہ کسی سے مخفی نہ رہے کیونکہ اس جنگ میں لشکرِ اسلام کے تمام افراد پانی کی نایابی سے دوچار تھے اور انہیں تیمم کی ضرورت تھی۔ آیۂ تیمم بھی اسی مناسبت سے نازل ہوئی اور تمام سپاہیوں نے اس کے مطابق عمل کیا اور اسے آسمان سے نازل ہونے والی خیر و برکت اور سہولت کے طور پر بخوشی قبول کیا۔ اور جو لوگ اس برکت اور سہولت کے وجود میں آنے کا موجب تھے انہیں مبارکباد دی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ تیمم کے حکم اور آیت کے نزول کی شکل اور عمومیت کو مدنظر رکھتے ہوئے تیمم کا مسئلہ مثال کے طور پر خلیفہ دوم عمر بن الخطاب جیسے شخص سے مخفی نہیں رہنا چاہیے تھا اور یہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ ان جیسا شخص اس عمومی مسئلہ سے بے خبر ہو جو خود ان کے سامنے وقوع پذیر ہوا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ سبھی اس واقعہ کے بارے میں

جانتے ہوں اور دیکھ چکے ہوں لیکن خلیفہ دوم نہ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں اور نہ ہی انہوں نے اسے دیکھا ہو جیسا کہ ذیل میں — صحیح مسلم کی روایت میں کہا گیا ہے:

ایک شخص خلیفہ عمر کے دورِ حکومت میں ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں جنب ہو گیا تھا اور مجھے پانی نہیں ملا۔ اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ خلیفہ عمر نے جواب دیا تمہیں نماز نہیں پڑھنی چاہیے تھی۔ عمارؓ نے جو وہاں موجود تھے کہا: اے امیرالمومنین! کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک جنگی سفر میں جب میں اور آپ جنب ہو گئے تھے اور ہمیں پانی نہیں ملا تھا تو اس دن آپ نے نماز نہیں پڑھی تھی اور میں نے مٹی پر لوٹنے کے بعد نماز پڑھ لی تھی اور پھر جب ہم رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور سارا واقعہ آنحضرتؐ کو سنایا تھا تو آنحضرتؐ نے فرمایا تھا: "اے عمر! تمہارے لیے مناسب نہ تھا کہ نماز ترک کر دیتے اور اے عمارؓ! تمہیں حیوانوں کی طرح مٹی میں لوٹنا نہیں چاہیے تھا بلکہ تمہارے لیے فقط اتنا کرنا کافی تھا کہ ہاتھ زمین پر مارتے، ان پر پھونک مارتے اور ان کے ساتھ چہرے اور بازوؤں پہ جوڑ تک مسح کرتے..."[1]

اور یہ عام حکم جب سب مسلمانوں کے سامنے نازل ہوا دوسرے صحابہ سے کس طرح مخفی رہا جیسا کہ عمران بن حصین نقل کرتا ہے:

رسولِ اکرمؐ نے ایک صحابی کو دیکھا جو دوسروں سے الگ ہو گیا تھا اور نماز نہیں پڑھ رہا تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اے فلاں! تم دوسروں کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھ رہے۔ اس نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! میں جنب ہو گیا ہوں اور مجھے پانی نہیں ملا۔ آپ نے فرمایا: تمہیں مٹی پر تیمم کر لینا چاہیے تھا کیونکہ وہی تمہارے لیے کافی ہے۔[2]

---

[1] مسند طیالسی، حدیث ۶۳۸۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۶۵-۳۱۹۔ صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۹۳۔ سنن نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۷۰۔ کنزالعمال جلد ۵ صفحہ ۱۴۲، حدیث ۲۹۲۶۔ مسند ابی عوانہ جلد ۱ صفحہ ۳۰۶۔ سنن ابوداؤد جلد ۱ صفحہ ۸۸ مطبوعہ محی الدین عبدالحمید، مصر۔

[2] سنن نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۷۱۔

علاوہ ازیں ہم سابقہ حدیث اور اس حدیث میں کیونکر مطابقت پیدا کر سکتے ہیں جو عروہ نے ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل کی ہے اور نسائی نے اپنی کتاب میں درج کی ہے؟ وہ کہتے ہیں:

رسولِ اکرمؐ نے اُسید بن حضیر اور چند دوسرے اشخاص کو عائشہ کا ہار تلاش کرنے بھیجا جو ام المومنین ایک منزل پر راستے میں گرا آئی تھیں۔ ان اشخاص کو یہ کام انجام دینے میں کافی وقت لگ گیا اور دریں اثنا نماز کا وقت ہو گیا۔ اتفاق سے وہ وضو سے نہیں تھے اور وضو کرنے کے لیے انہیں پانی بھی دستیاب نہ ہو سکا۔ مجبوراً انہوں نے بے وضو نماز ادا کی۔ بعد میں انہوں نے یہ واقعہ رسول اکرمؐ کے گوش گزار کیا اور اسی وجہ سے اللہ نے آیۂ تیمم نازل فرمائی۔ اسید بن حضیر نے کہا: اے عائشہ! خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ خدا کی قسم آپ کو کبھی کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا جس سے آپ کراہت کرتی ہوں مگر یہ کہ خدا نے آپ کے لیے اور مسلمانوں کے لیے اس میں خیر و برکت قرار دی۔[1]

صحیح بخاری میں یہ حدیث یوں نقل کی گئی ہے: "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو روانہ کیا۔۔۔"

ہم ام المومنین کی اس حدیث اور ان کی پہلی حدیث میں کیونکر مطابقت پیدا کر سکتے ہیں جبکہ دونوں حدیثوں کے درمیان بہت زیادہ اختلاف موجود ہے؟ پہلی حدیث کہتی ہے کہ رسول اکرمؐ نے ایک جنگی سفر کے دوران ایک ایسی سرزمین پر پڑاؤ ڈالا جہاں پانی دستیاب نہ تھا اور خود مسلمانوں کے پاس بھی پانی نہ تھا لہٰذا جو تکلیف انہیں پیش آئی اس کا شکوہ انہوں نے ابوبکر سے کیا۔ صبح کے وقت بھی آیت کے نزول کے بعد سب نے تیمم کیا اور پہلی مرتبہ تیمم کے ساتھ نماز پڑھی۔ روانگی کے وقت ام المومنین کا ہار بھی ان کے اونٹ کے نیچے سے مل گیا۔ تاہم دوسری حدیث کہتی ہے کہ:

رسول اکرمؐ نے ایک یا زیادہ آدمیوں کو اپنی بیوی کا ہار تلاش کرنے کے لیے

---

[1] سنن نسائی جلد ۱ صفحہ ۱۷۲ پہلا ایڈیشن ۱۳۴۸ھ۔ صحیح بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۹ - جلد ۲ صفحہ ۲۰۵ اور جلد ۳ صفحہ ۱۶۹ - صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۹۲ - مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۵۷۔

بھیجا جسے وہ سفر کے دوران کسی منزل پر گرا آئی تھیں۔ جن لوگوں کو آنحضرتؐ نے ہار تلاش کرنے بھیجا تھا انہیں سفر کے دوران پانی دستیاب نہ ہوا اور انہوں نے بغیر وضو کیے نماز ادا کی کیونکہ اس وقت آیۂ تیمم نازل نہیں ہوئی تھی اور ان لوگوں کو اس مسئلے کے بارے میں حکم کا کوئی علم نہ تھا۔ بعد میں جب وہ مدینہ واپس ہوئے اور یہ واقعہ رسول اکرمؐ کے گوش گزار کیا تو آیۂ تیمم نازل ہوئی۔

ہم نہیں جانتے کہ اگر ہم صحاح ستہ میں موجود روایات کے مجموعے کو صحیح سمجھیں تو ان دو حدیثوں کے درمیان کس طرح مطابقت پیدا کریں۔

❋

علاوہ ازیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ زیر بحث دو احادیث اور اس روایت کے درمیان مطابقت پیدا کی جائے جو ابن سعد نے طبقات میں میمون بن سنباذ اسلع کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے نقل کی ہے کیونکہ حدیث کا راوی ربیع کہتا ہے: میرے باپ نے میرے دادا کے حوالے سے مجھ سے حدیث بیان کی کہ ایک مسلمان نے جسے اسلع کہا جاتا تھا نقل کیا کہ: میں رسول اللہؐ کی خدمت کرتا تھا اور آنحضرتؐ کے لیے سواری کا انتظام کرتا تھا۔ ایک رات رسول اکرمؐ نے فرمایا: اے اسلع اٹھو اور ہماری سواری کا جانور تیار کرو۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! میں جنابت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ آپ نے تھوڑی دیر سکوت فرمایا۔ پھر جبرئیل نازل ہوئے اور آیۂ صعید یعنی آیۂ تیمم لائے جس میں لفظ صعید (= خاک) آیا ہے۔ [1] تب رسول اکرمؐ نے مجھے بلایا اور بتایا کہ میں کس طرح مسح کروں (اور تیمم کروں)۔ میں نے یہ کام انجام دیا اور پھر آنحضرتؐ کے لیے سواری کا جانور تیار کیا۔ جب ہم پانی کے پاس پہنچے تو آنحضرتؐ نے فرمایا: اے اسلع اٹھو اور غسل کرو۔ [2]

---

[1] سورۂ نساء۔ آیت ۴۳۔ [2] طبقات الکبریٰ جلد ۷ صفحہ ۶۵-۶۶ مطبوعہ بیروت۔ یہ قصہ استیعاب، اسد الغابہ اور الاصابہ میں لفظی تغیر کے ساتھ اسلع کے حالات زندگی کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں متقی نے اسے کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۱۴۵ میں حدیث ۲۹۶۱ میں بیان کیا ہے۔

اسی طرح ہم ام المومنین کی احادیث اور اس حدیث کے مابین کیسے مطابقت پیدا کرسکتے ہیں جو ابن جریر طبری نے آیہ وَلَاجُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ (سورۂ نساء۔ آیت ۴۳) کی تفسیر میں نقل کی ہے؟ ابن جریر یزید بن ابی خبیب سے نقل کرتا ہے کہ چند انصار کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے۔ بعض اوقات جب وہ جنابت کی حالت میں ہوتے تھے اور انہیں پانی بھی میسر نہیں ہوتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ پانی حاصل کرنے اور غسل کرنے کے لیے گھروں سے نکلیں تو وہ مجبور ہو جاتے تھے کیونکہ وہ جنابت کی حالت میں مسجد النبیؐ میں سے نہیں گزر سکتے تھے اور ان کے گھروں سے باہر آنے کے لیے کوئی دوسرا راستا بھی نہ تھا۔ اس بنا پر اللہ نے آیہ تیمم نازل فرمائی۔ [۱]

اسی طرح ابن منذر اور ابن ابی حاتمؒ مجاہد سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے آیہ وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْعَلٰی سَفَرٍ.... (سورۂ نساء۔ آیت ۴۳) کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ آیت ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی جو بیمار تھا۔ وہ نہ اٹھ کر وضو کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کے پاس کوئی خدمتگار تھا جو اس کے لیے وضو کا سامان تیار کرتا۔ یہ شخص رسول اکرمؐ کی خدمت میں پہنچا اور اپنے حالات بیان کیے۔ اس پر خدا نے آیہ تیمم نازل فرمائی۔ [۲]

نیز ابن جریر نے ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: رسول اکرمؐ کے اصحاب ایک جنگ میں زخمی ہو گئے۔ زخمیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بعد میں ان میں سے کچھ جنابت میں مبتلا ہو گئے۔ اس صورتِ حال کی اطلاع رسولِ اکرمؐ کو دی گئی۔ پھر ساری کی ساری سورۂ مبارکہ وَاِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْعَلٰی سَفَرٍ... نازل ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ ان تمام مختلف اور متفاوت روایات کی ایک دوسری کے ساتھ کس طرح تطبیق کی جا سکتی ہے اور ان سب کو کس طرح درست مانا جا سکتا ہے؟

بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو روایات ام المومنین بی بی عائشہ سے نقل ہوئی ہیں اور ان سے منسوب کی گئی ہیں اور جن میں آیہ تیمم کے نزول کی داستان

---

[۱] و [۲] سیوطی: درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۶۶

موجود ہے ان کی پوری پوری تشہیر کی گئی حتیٰ کہ مستشرقین نے بھی اپنا ہاتھ ان تک بڑھایا اور ان پر توجہ دی اور ضخیم کتاب "دائرۃ المعارف اسلام" کے مادہ تیمم میں ان سے استناد کیا ہے۔ [1]

مسئلے کی حقیقت

اگر ہم سرزمین حجاز کی طبیعی ساخت پر نظر ڈالیں اور اس میں پانی کی شدید کمی کا علم رکھتے ہوں ـــــ جیسا کہ میں نے اس مقدس سرزمین میں متعدد بار سفر کر کے مشاہدہ کیا ہے ـــــ اور یہ بھی جانتے ہوں کہ نماز بعثت نبوی کے ساتھ ہی بلا فاصلہ واجب قرار دیگئی تھی تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ تیمم کے قانون کا اجراء اتنی لمبی مدت (تقریباً سترہ سال) کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہو اور اس کے بارے میں حکم ہجرت کے پانچویں یا چھٹے سال میں نازل ہوا ہو۔ بلاشبہ مسلمانوں کو کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جو پانی کی جگہ لے تاکہ پانی نہ ملنے کی صورت میں وہ اسے وضو یا غسل کے لیے استعمال کر سکیں۔ یہ ضرورت ابتدائے اسلام سے ہجرت کے چھٹے سال تک یقیناً سیکڑوں بلکہ ہزاروں مرتبہ پیش آئی ہوگی اور جب کبھی اس مشکل میں مبتلا ہونے کے بعد کوئی مسلمان رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوگا آنحضرتؐ نے خدا کا قانون اس کے سامنے بیان کر دیا ہوگا۔ یہ تو تھا حجاز کی طبیعی بناوٹ کا مسئلہ۔ اب اگر ہم فقط قرآن مجید سے رجوع کریں تو معاملہ جو کچھ زیر بحث روایات میں کہا گیا ہے اس سے مختلف نظر آتا ہے۔ قرآن میں تیمم کا حکم وضو اور غسل کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے بدل کے طور پر آیا ہے:

(۱) سورۂ نساء میں آیہ ۴۳:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا۔

SHORTER ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM PP 588 – 589.

[1] مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۱۵۸۔

اے ایمان والو! تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ اور جب تک تم جو کچھ کہتے ہو اسے سمجھ نہ پاؤ نماز نہ پڑھو اور جنابت کی حالت میں مسجد میں نماز کے لیے نہ آؤ مگر یہ کہ تم وہاں سے گزر جاؤ اور یا یہ کہ تم نے غسل کر لیا ہو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو ..... یا تم نے اپنی بیویوں سے صحبت کی ہو اور تمہیں پانی میسر نہ ہو تو پاک مٹی پر تیمم کر لو اور (اس کا طریقہ یہ ہے کہ) اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔ بیشک خدا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

۲- سورۂ مائدہ میں (آیت ۶) :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ مِنْهُ ....

اے ایمان والو! اگر تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنے چہرے اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا اور ٹخنوں تک پاؤں کا مسح کر لیا کرو اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو طہارت (غسل) کر لو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو ..... یا عورتوں سے ہم بستری کی ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو یعنی اس کے ساتھ اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ وضو اور اس کے بدل کے طور پر تیمم و غسل اور غسل کے بدل کے طور پر تیمم کے بارے میں حکم ایک ساتھ دیا گیا ہے اور یہ حکم مسلسل طور پر ایک آیت میں بیک وقت نازل ہوا ہے اور یہ واقعہ لازمی طور پر جو کچھ ام المومنین بی بی عائشہ نے فرمایا ہے اس سے اور ان کی رسول اکرمؐ سے شادی سے بہت پہلے کا ہے۔ حکمت بھی ایسی صورتِ حال کا تقاضا کرتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں نماز کا حکم عین رسول اکرمؐ کی بعثت اور رسالت کی ابتدا میں دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ جبرئیل نے

وضو کی تعلیم دی۔[1] لہٰذا یہ ضروری ہے کہ غسل اور تیمم کا حکم بھی اس کے ساتھ ہی دیا گیا ہو۔

بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تین حکم شاید عام مسلمانوں کی نگاہوں سے دُور نازل ہوئے کیونکہ درحقیقت ان دونوں دو یا تین اشخاص کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی وجود نہ تھا لہٰذا اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوں جنہیں تیمم کے وضو اور غسل کے ساتھ مربوط ہونے کا علم نہ ہو اور انہوں نے مذکورہ بالا آیت نہ سنی ہو۔ اور جب کبھی ان میں سے کوئی شخص پانی کے فقدان کی مشکل میں گرفتار ہوتا یا اسے کوئی اور مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اپنے حالات بیان کرتا۔ آنحضرتؐ بھی یا تو اسے تیمم کرنے کی عملی تعلیم دیتے اور یا اس بارے میں آیہ شریفہ پڑھ کر اسے سنا دیتے۔ انہیں حالات میں مسئلے کی حقیقت کچھ لوگوں سے پوشیدہ رہی یا یہ کہ کچھ اشخاص اسے بھول گئے۔

یہ تجزیہ مسئلے کے حل کا وہ راستہ ہے جو ہماری سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ حکم جو بے حد ضروری تھا ہجرت کے پانچویں یا چھٹے سال تک نازل نہیں ہوا اور اس وقت نافذ کیا گیا جب رسول اکرمؐ اپنی بیوی کا ہار تلاش کرنے کے لیے کافی دیر تک اپنے اہل لشکر کے ساتھ ایک بیابان میں رکے رہے فطرت اور معمول کے برخلاف معلوم ہوتا ہے اور آنحضرتؐ کے خلق کے اعلیٰ معیار سے مناسبت نہیں رکھتا۔

اسلامی متون میں یہ جعلی روایات پھیلانے کا نتیجہ

اسلامی متون میں جعلی روایات پھیلانے کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جو لوگ اس قسم کی احادیث پر اعتقاد رکھتے ہیں ان کی نظر میں خدا کے رسولؐ اور برگزیدہ بندے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بلند وبالا شخصیت ایک عام انسان کی سطح سے بھی گر جاتی ہے اور اس کے علاوہ

---

[1] اعلام الوریٰ صفحہ ۴۸، تحقیق علی اکبر غفاری۔ بحار الانوار جلد ۱۸ صفحہ ۱۷۹، حدیث ۱۰، اور صفحہ ۱۸۴۔ حدیث ۱۴ اور صفحہ ۱۹۴ حدیث ۳۰ اور صفحہ ۱۹۶، حدیث ۳۰۔

یزید بن معاویہ جیسے ہوا پرست اور شہوت ران حکمرانوں اور خلیفاؤں پر اعتراض اور تنقید کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ درحقیقت یہ احادیث وضع کرنے سے دو مقاصد حاصل ہوئے ہیں۔ اول یہ کہ رسول اکرمؐ ایک معمولی آدمی کی سطح سے بھی نیچے آ گئے ہیں اور دوم یہ کہ مطلق العنان حکمرانوں اور بے تقویٰ خلیفاؤں کے اعمال کی توجیہہ ہو گئی ہے۔

تاریخ کو مسلمان حکمرانوں سے وہ داستانیں یاد ہیں جنہیں دہراتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ مورخین نے کہا ہے کہ:

جب معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کے لیے مسلمانوں سے بیعت لینا چاہی تو اس نے بصرہ کے والی زیاد بن ابیہ کو اس کے بارے میں ایک خط لکھا۔ زیاد نے جواب میں کہا کہ: جب یزید کتوں اور بندروں سے کھیلتا ہے، رنگا رنگ لباس پہنتا ہے، شراب کے نشہ میں رہتا ہے اور ڈھولک کی تاپ پر ناچتا ہے تو اس تجویز کے مقابلے میں لوگ ہمیں کیا کہیں گے؟ اور پھر اس صورت میں کہ ان کے درمیان حسینؑ بن علیؑ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر جیسے اشخاص موجود ہیں۔ لہٰذا اسے حکم دیجیے کہ ایک یا دو سال تک بظاہر ان جیسے طور طریقے اختیار کرے۔ پھر شاید ہم اس بارے میں لوگوں کو بیوقوف بنانے کے قابل ہو سکیں۔

جب معاویہ کو زیاد کا خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ اس کا بیٹا یزید مسلمان غازیوں کے ہمراہ رومیوں کے خلاف جہاد کے لیے موسم گرما کی جنگ [۱] میں شرکت کرے لیکن یزید نے اپنے آپ کو بیمار ظاہر کیا اور راستے سے آرام کرنے کے بہانے دیر مرّان [۲] چلا گیا

---

[۱] مسلمان فوجی مسلسل کئی سال تک گرمیوں کے موسم میں رومیوں پر حملے کرتے رہے اسی لیے انہیں صایفہ کہا جاتا تھا۔

[۲] اسلامی شہروں کے نواح میں واقع عیسائیوں کی خانقاہیں فسق و فجور اور شراب خوری کے بدترین اڈے تھے اور اموی اور عباسی ادوار کے روشن خیال لوگ عیش و عشرت کے وسائل سے استفادہ کرنے کے لیے ان جگہوں کا رخ کرتے تھے جو دراصل عبادت کے لیے تھیں۔ یزید نے بھی اسی وجہ سے دیر مرّان میں پناہ لی تھی جو سرسبز و شاداب جگہ تھی۔ دیکھیے: الدیارات از شابستی اور معجم البلدان از یاقوت حموی۔

جہاں اپنی محبوبہ ام کلثوم کے ساتھ شراب خوری میں مشغول ہو گیا۔ اس جنگ میں اسلام کا لشکر چیچک کے مرض میں مبتلا ہو گیا لیکن جب یہ ناگوار خبر یزید کو دیرمرّان میں ملی تو اس نے یہ دو شعر پڑھے:

جب میں دیرمران میں نرم گدّوں پر ٹیک لگائے ہوئے ہوں اور
ام کلثوم میرے پہلو میں ہے
اور صبح کے وقت شراب پی رہا ہوں
تو مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ لشکر "فدقدونہ" میں بخار اور چیچک میں
مبتلا ہو گیا ہے۔ [1]

اگر یزید یا اس کے باپ کے بارے میں یہ اور ایسی اور داستانیں مسلمانوں میں پھیل جاتیں تو معاویہ کا یزید کے لیے بیعت لینے کا منصوبہ دھرا رہ جاتا اور امویوں کا نام تاریخ اسلام سے محو ہو جاتا۔

کیا معاویہ کے مقصد کی پیشرفت کے لیے کوئی علاج تلاش کیا جا سکتا تھا؟ کیا کوئی ایسا راستا موجود تھا جس پر چلکر یزید اور اس جیسے دوسرے لوگ رسول اکرمؐ کے خلیفہ کی حیثیت سے حکومت حاصل کر سکتے؟ معاویہ نے یہ راستا دریافت کر لیا تھا۔

اگر یزید جنگی سفر میں اپنی محبوبہ کو اپنے ہمراہ لے گیا اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دیرمُرّان میں اس کے ساتھ داد عیش دینے لگا تو اس کی نظیر رسول اکرمؐ سے نقل کی جا سکتی ہے۔ آنحضرتؐ بھی تو اپنی بیوی کو ایک جنگی سفر میں اپنے ہمراہ لے گئے تھے اور سفر کے دوران اہل لشکر کو آگے بھیج دیا تھا تاکہ اس کے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ کریں اور تفریح میں مشغول ہوں یا یہ کہ آنحضرتؐ نے اپنی بیوی کا ہار تلاش کرنے کے لیے لشکر اسلام کو ایک بے آب و گیاہ بیابان میں روک لیا تھا اور خود بے فکری کے ساتھ اسکی ران پر سر رکھ کر سو گئے تھے۔ خدا نے نہ صرف یہ کہ انہیں سرزنش نہیں کی تھی بلکہ ان کا اور انکی بیوی کا اور اس بیوی کے لیے انکی محبت کا لحاظ کرتے ہوئے آیۂ شریفہ تیمم نازل فرمائی تھی۔

---

[1] معجم البلدان جلد ۲ صفحہ ۵۳۴ مادہ "دیرمرّان"۔

پس اگر اس قسم کی احادیث کو صحیح فرض کر لیا جائے تو اس پیغمبرؐ کے خلیفہ یزید پر اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ وہ بھی لشکر اسلام کو چھوڑ کر چلا گیا تھا اور بے فکر ہو کر دیر مرّان میں اپنی محبوبہ کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگا تھا۔

ایسی احادیث کے وضع کرنے کا زمانہ

ان تمام دلائل کی بنا پر ہم ان جعلی احادیث کی تیاری اور اشاعت کے لیے معاویہ کا زمانہ مناسب سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ معاویہ نے قسم کھائی تھی کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کے مقدس نام کو دفن کر دے گا۔ لہٰذا ایک طرف اس کی بنی ہاشم سے اور رسول اکرمؐ کی ذات بابرکات سے دشمنی اور دوسری طرف اس کا اموی حکومت اور یزید کی خلافت برقرار رکھنے کا منصوبہ ایسے عوامل تھے جنہوں نے اسے اپنے نمک خوار کارکنوں کی مدد سے یہ جھوٹی روایات گھڑنے پر آمادہ کیا۔

یہودی اور عیسائی مستشرقین اسلام کے خلاف جو مواد چاہتے تھے وہ انہیں ایسی روایات میں مل گیا جو کہ بدقسمتی سے خلفاء کے مکتب کی کتابوں میں بکثرت موجود ہیں۔ لہٰذا انھوں نے یہ روایات پیغمبر اسلامؐ کے تعارف کے طور پر تجزیہ اور تحلیل کے اوزار استعمال کر کے اپنی کتابوں اور تحقیقی مقالوں میں درج کیں اور اسلام اس کے پیغمبرؐ اور اس کے احکام اور قوانین کے تعارف کے طور پر پیش کر دیں اور کمال تاسف سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں بہت کامیاب رہے

برطانوی مستشرق منٹگمری واٹ نے اعتراف کیا ہے کہ:

> "مغربی مصنفین بنیادی طور پر مستعد اور آمادہ تھے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں بدترین اعتقادات رکھیں اور جب کبھی کسی عمل کی قابل اعتراض تفسیر اور تعبیر ممکن ہو اسے ایک حقیقت اور واقفیت کے طور پر قبول کر لیں۔"[۱]

۱۔ـ

چونکہ مغربی اسلام شناسوں کو ایسی احادیث اور روایات اہل بیتؑ کے مکتب کی کتابوں میں نہیں ملیں اس لیے انہوں نے اسلام کے متعلق معلومات فقط اور فقط خلفاء کے مکتب کی کتابوں سے حاصل کیں اور انہیں پیش کر دیا۔[1] ان کے مشرقی شاگرد بھی دانستہ یا نادانستہ اسی راستے پر چلے اور انہیں کی پیروی کی۔

ان روایات پر اعتقاد رکھنے والوں کے خیالات پر ان کا اثر

درس کے خاتمے پر ہم ایک مرتبہ پھر اس بات کو دہراتے ہیں کہ ایسی روایات انھیں درست ماننے والوں کو ایک خاص انداز فکر دیتی ہیں اور نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے درمیان وہابیت جیسے انحرافی مکاتب کی اشاعت کا راستا ہموار کرتی ہیں اور اس سے بھی بدتر صورت یہ ہے کہ بہائیوں (مرزائیوں) اور انہیں جیسے دوسرے اسلام دشمن گروہوں کو انکی خواہش کے مطابق مواد ایسی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اسلام کا تعارف خلفاءٔ کے مکتب میں موجود احادیث، روایات اور متون سے کراتے ہیں۔[2]

ان دو گروہوں کے علاوہ یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ روشن فکر اشخاص اور مشرقی اسلام شناس بھی جو اپنے مغربی استادوں اور رہنماؤں کے طور طریقوں پر چلتے ہیں اسی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں۔ یہ لوگ تحقیق اور غیر جانبداری کے تمام دعووں کے باوجود اسلام کی شناخت

---

[1] اسی انگریز اسکالر نے رسول اکرمؐ کی سوانح عمری لکھنے کے لیے فقط تاریخ طبری، سیرۃ ابن ہشام، مغازی واقدی، طبقات ابن سعد، صحیح بخاری، مسند احمد بن حنبل، اسد الغابہ اور الاصابہ یعنی فقط خلفاء کے مکتب کی کتابوں سے رجوع کیا ہے اور مکتب اہل بیتؑ کی کسی ایک کتاب سے بھی رجوع نہیں کیا۔ (مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۱۱)

[2] مثلاً دیکھیے: سید عباس علوی: بیان حقائق صفحہ ۲۲۰-۲۲۱ جس میں اس نے "باب" کے توبہ نامہ کی توجیہہ کرتے ہوئے غرانیق کے بارے میں روایات کو مستند قرار دیا ہے۔

کے لیے اکثر یا تقریباً سو فی صد خلفاء کے مکتب کی کتابوں سے رجوع کرتے ہیں اور اسلام کو پہچاننے اور اسے پیش کرنے کے لیے مکتب اہلبیتؑ کی کتابوں کی جانب توجہ نہیں دیتے اور ائمہ اہلبیتؑ کی احادیث و روایات سے کوئی استفادہ نہیں کرتے جبکہ رسول اکرمؐ نے مکرر فرمایا ہے کہ جو لوگ اسلام کے طلبگار ہوں انہیں چاہیے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد آپ کے اہلبیتؑ اور عترت کا دامن تھامیں۔

رسول اکرمؐ نے غدیر خم کے دن فرمایا تھا:

اَنَا تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ اَوَّلُهُمَا کِتَابُ اللّٰهِ فِیْهِ الْهُدٰی وَالنُّوْرُ فَخُذُوْا بِکِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتَمْسِکُوْا بِهِ فَحَثَّ عَلٰی کِتَابِ اللّٰهِ وَرَغَّبَ فِیْهِ ثُمَّ قَالَ وَاَهْلُ بَیْتِیْ اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ اُذَکِّرُکُمُ اللّٰهَ فِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ[۱]

اور حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ کے دن ایک خطبے کے دوران فرمایا تھا:

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَّا اِنْ اَخَذْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوْا: کِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ۔[۲]

اور ابو سعید خدری کی نقل کے مطابق فرمایا تھا:

اِنِّیْ اُوْشِكُ اَنْ اُدْعٰی فَاُجِیْبَ وَاِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ: کِتَابَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَعِتْرَتِیْ. کِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَّمْدُوْدٌ مِّنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ وَاِنَّ اللَّطِیْفَ الْخَبِیْرَ اَخْبَرَنِیْ اَنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ فَانْظُرُوْنِیْ بِمَ تَخْلُفُوْنِیْ فِیْهِمَا۔[۳]

مشرقی اسلام شناس مکتب اہل بیتؑ کی تاریخ، تفسیر اور حدیث کی فقط ان کتابوں کی جانب توجہ دیتے ہیں جن پر اہل مغرب نے توجہ دی ہے۔ مثلاً تاریخ اسلام پر شیعہ علماء

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۱۲۲-۱۲۳ مطبوعہ محمد علی صبیح و اولادہ قاہرہ۔ سنن دارمی جلد ۲ صفحہ ۴۳۲۔ المستدرک علی الصحیحین جلد ۳ صفحہ ۱۰۹۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۶۶-۳۷۱۔

[۲] سنن ترمذی جلد ۵ صفحہ ۶۶۲، حدیث ۳۷۸۶۔

[۳] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۴-۱۷-۲۶-۵۹۔

کی تالیف شدہ کتابوں میں سے جن جن پر یورپینوں نے نگاہ ڈالی ہے (جیسے کہ تاریخ یعقوبی اور وقعتہ صفین) وہ مشرق کے اسلامی علمی اداروں میں بھی موردِ توجہ قرار پاتی ہیں اور یہ امر واضح ہے کہ اتنی تھوڑی سی کتابوں کی مدد سے مکتب اہلبیت ؑ سے حاصل کیے گئے خالص اسلام کے تمام پہلوؤں کو شناخت کرنا اور انہیں پیش کرنا ممکن نہیں۔ وہ شیخ مفید، سید مرتضیٰ، شیخ طوسی اور انہیں جیسے دوسرے علماء (رضوان اللہ علیہم) کی لکھی ہوئی تاریخ اور حدیث کی کتابوں سے اسلام کی شناخت، اس کی تاریخ اور اس کے احکام سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے بہت کم استفادہ کرتے ہیں حالانکہ وہ اپنے اپنے زمانے میں سارے اسلامی معاشرے میں اعلیٰ ترین علمی مدارج پر فائز رہے ہیں اور اس کے علاوہ ان کی تحریں تقریباً دس صدیاں قدیم ہیں۔ پس چونکہ وہ اہلبیت ؑ کے مکتب کے پیرو ہیں اس لیے یورپی مستشرقین نے ان کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کیا ہے اور یورپینوں کی بے توجہی کے باعث مشرق میں بھی دینی علمی مراکز کے باہر لوگ اب تک ان سے ناواقف ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ائمہ اہلبیت ؑ اور ان کے پیروؤں کے علوم و معارف سے دوری مشرق اور مغرب کے تمام اسلام شناسوں کی تحریروں میں اسلام کی تحریف کا بہت بڑا عنصر بن گئی ہے۔

وَالْحَقُّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ.

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ

پندرھواں درس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔

ان عناصر کی وضاحت کرتے ہوئے جن کی بنا پر اسلام تحریف کا شکار ہوا چند بنیادی عناصر ہمارے سامنے آئے جو مندرجہ ذیل تھے :

۱۔ رسول اکرمؐ کی احادیث لکھنے اور نشر کرنے پر پابندی۔
۲۔ آنحضرتؐ کو محض قرآن بیان کرنے والا کہہ کر آپ کی شخصیت کو گھٹانا۔
۳۔ اسلام کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں حدیث سازی۔

حدیث سازی کا عنصر جو درحقیقت تحریف کا سب سے زیادہ طاقتور عنصر شمار ہوتا ہے گوناگوں شکلوں میں ظاہر ہوا۔ اس سلسلے میں ہم نے دیکھا کہ اموی عہد کے شروع میں کچھ لوگ صحابی رسولؐ کے لقب کے ساتھ حدیثیں گھڑنے میں مصروف ہو گئے اور اموی حکومت جو بظاہر اسلامی تھی اس کام کی بانی اور اس کی محرک تھی۔

حدیث سازی میں اہلِ کتاب کے علماء کی شرکت

اب ہم تحریف کے اس عامل کے ایک اور حصے کی طرف آتے ہیں جو حدیث سازی کے کام میں اہل کتاب کے علماء کی شرکت اور یہودیت اور عیسائیت کی جعلسازی اور جھوٹ سے لبریز تحریف شدہ تعلیمات کے ساتھ اسلام کی توضیح اور تشریح سے عبارت ہے۔

جزیرہ نمائے عرب میں یعنی اس معاشرے میں جس میں رسول اکرمؐ مبعوث ہوئے علم و دانش کی سطح بے حد پست تھی۔ قرآن مجید میں اس معاشرے کے بارے میں جو وضاحتیں موجود ہیں ان سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ قرآن مجید ایک جگہ زمانۂ جاہلیت کے عرب معاشرے کو "کھلی گمراہی" [۱] میں مبتلا قرار دیتا ہے اور دوسری جگہ فرماتا ہے کہ: "اعراب (صحرانشین) کفر اور نفاق کے معاملے میں سب سے زیادہ سخت ہیں۔" [۲] اس معاشرے میں موجود علم و دانش کا مجموعہ اشعار، خطابت، علم نسب اور لڑائیوں، خونریزیوں، قتل و غارت اور ان پر فخر کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

ایک دن مسجد نبوی میں لوگ کسی شخص کے گرد جمع تھے۔ جب رسول اکرمؐ مسجد میں داخل ہوئے اور لوگوں کا یہ جمگھٹا دیکھا تو پوچھا کہ یہ کون شخص ہے جس کے آس پاس لوگ جمع ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ علامہ ہے۔ آنحضرتؐ نے دریافت فرمایا کہ وہ کیا ہوتا ہے؟ لوگوں نے کہا: اَعْلَمُ النَّاسِ بِاَنْسَابِ الْعَرَبِ وَوَقَایِعِهَا وَاَیَّامِ الْجَاهِلِیَّةِ وَالْاَشْعَارِ الْعَرَبِیَّةِ یعنی یہ شخص عربوں کے نسب، تاریخی واقعات، زمانۂ جاہلیت کے معرکوں اور رزمیہ اشعار کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا: یہ ایک ایسا علم ہے کہ جو شخص اسے نہیں جانتا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور جو جانتا ہے اسے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ [۳]

جو کچھ اس حدیث میں کہا گیا ہے وہ عربوں کے علمی اثاثے کی نشاندہی کرتا ہے یعنی انساب، تاریخی واقعات، جنگوں سے واقفیت اور شعر و ادب۔ جہانتک علم انساب کا تعلق ہے حیوانوں اور بالخصوص گھوڑوں کی جانب بھی توجہ دی جاتی تھی اور بعد میں اس علم پر کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں سے ایک رسالہ "انساب الخیل" کے نام سے ہے جو ہشام کلبی نے لکھا ہے۔ شعر میں بھی مختلف انواع مورد توجہ تھے مثلاً غزل، رزم اور بزم میں پڑھے جانے والے اشعار، تفاخر اور ہجو۔

---

[۱] سورۂ جمعہ۔ آیت ۲ [۲] سورۂ توبہ۔ آیت ۹۷

[۳] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۳۲۔ منتخب کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۵۵۔

اسلام کے آنے کے بعد جب اسلامی معاشرے کا میل جول اس زمانے کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ تمدنوں یعنی رومی تمدّن اور ایرانی تمدّن اور بعد میں ہندی تمدّن سے ہوا تو معاشرے کی فضا ہی بدل گئی۔ مدینہ جو پہلے ایک عربی شہر یا زیادہ سے زیادہ جزیرۃ العرب کا پایہ تخت تھا۔ اس زمانے کی دنیا کے ایک اہم ترین شہر میں تبدیل ہو گیا۔ دنیا کے عظیم ترین شہروں سے علماء اور سیاسی نمائندے اس شہر میں آتے تھے۔ اس شہر سے والی، حاکم اور قاضی ایران، شام اور اسلامی افریقہ کے دُور دراز مقامات کو جاتے تھے۔ عربوں اور رومیوں اور عربوں اور ایرانیوں کے درمیان میل جول قائم ہو گیا تھا اور بعض اوقات ان کے آپس میں شادی بیاہ بھی ہو جاتے تھے۔ درحقیقت عرب قوم نے جو دنیا کی عام تاریخ سے دور اور متمدن دنیا کی علمی پیشرفت سے الگ تھلگ تھی اچانک تاریخ میں قدم رکھا اور دنیا کی متمدن قوموں پر اقتدار حاصل کر لیا۔ تاہم عرب، روم اور ایران کے درمیان علمی سطح کا اختلاف ایک ایسا حقیقی مسئلہ تھا جس سے کسی طرح بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس بنا پر جو سوالات شہروں میں رہنے والوں کو پیش آتے تھے صحرا نشینوں کا ان سے بہت کم واسطہ پڑتا تھا۔ درحقیقت ایک عرب صحرا نشین کی فکری پرواز اتنی تھی کہ اپنے اونٹ کے متعدد نام رکھے یا اپنی تلوار کو مختلف ناموں سے پکارے یا جنگ اور اپنے حلیفوں کے بارے میں شعر کہے۔ اس کی فکری اوڑان زیادہ سے زیادہ اتنی تھی لیکن شہروں میں رہنے والوں اور بالخصوص اس زمانے کے شام اور ایران کے متمدن شہریوں کے بہت سے دوسرے مسائل تھے جو اصولاً عربوں کی جاہلی تہذیب میں پیش نہیں آتے تھے اور ان کا کوئی حل تلاش نہیں کیا جاتا تھا۔ شہروں میں رہنے والے پوچھتے تھے: یہ آسمان کیسے قائم ہے؟ زمین کس طرح پیدا ہوئی؟ کیا اس دنیا کی کوئی ابتدا یا انتہا ہے؟ موت کے بعد ہمارا کیا بنے گا اور ہم کیا دیکھیں گے؟ ایسا شخص ہو جائے تو وہ اس قسم کے سوال کرے گا: اس آیت کے کیا معنی ہیں؟ حضرت نوحؑ کی کشتی کیا تھی، کہاں تھی اور بالآخر کہاں رُکی؟ قوم عاد کون لوگ تھے؟ ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کون تھے اور ان کے حالاتِ زندگی کیا تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یہ ضرورت بڑی شدّت سے محسوس کی گئی۔ روز افزوں میل جول سے سوالات

اور الجھنیں بڑھتی گئیں لیکن اس مشکل کا کوئی حل نہ تھا جبکہ رسولِ اکرمؐ بھی معاشرے میں موجود نہ تھے اور ان کے ارشادات بھی نقل نہیں کیے جاتے تھے۔ سلمانؓ، ابوذرؓ، عمارؓ، مقدادؓ اور ابن مسعودؓ جیسے ممتاز اور اسلام شناس صحابہ علٰحدہ ہوگئے تھے۔ خاندانِ رسولؐ کے افراد بھی رسمی طور پر جوابدہ نہ تھے اور امام علی علیہ السلام جو رسولِ اکرمؐ کے شہرِ علم کا دروازہ ہیں اور جن کے بارے میں آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ: اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔[1] خانہ نشین تھے یا صحرا میں کھجوروں کے باغ لگاتے تھے یا کھیتی باڑی کرتے تھے ___ ابوہریرہ جیسا شخص ___ جو اکثر حدیث وضع کرنے سے بھی خوف نہیں کھاتا تھا اور جب اس سے پوچھا جاتا تھا کہ یہ حدیث تم کہاں سے لائے ہو تو وہ بے دھڑک کہہ دیتا تھا کہ میں نے اپنی جیب سے نکالی ہے[2] ___ اتنا صاحبِ علم نہیں تھا کہ ان مشکلات کو بطورِ احسن حل کر دیتا۔ مثلاً اس نے کہا ہے اور اس کا یہ قول معتبر ترین کتابوں میں بھی نقل ہوا ہے کہ اگر مکھی کھانے میں گر جائے اور کھانا اس کے ایک پر سے آلودہ ہو جائے تو مکھی کو کھانے میں ڈبو دینا چاہیے کیونکہ مکھی کا ایک پر بیماری کا موجب اور ایک پر شفا کا ذریعہ ہوتا ہے[3] یا وہ ایک اور حدیث میں کہتا ہے کہ خدا نے جبرئیلؑ کو رسولِؐ کے پاس بھیجا اور پیغام دیا کہ ابوبکر سے کہیے کہ ہم اس سے راضی ہیں، کیا وہ بھی ہم سے راضی ہے۔[4]

ایسی باتیں سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتی تھیں اور مسائل باقی رہتے تھے۔ ایک ایسی حکومت جو مخالفوں یا موافقوں کی جانب سے پیش کیے گئے مسائل کا جواب دینے سے عاجز رہتی قائم نہیں رہ سکتی تھی لہٰذا اس مسئلے کو حل کرنے کی تدبیر کی گئی اور ایک نیا دروازہ کھل گیا جو بدقسمتی سے اب تک کھلا ہے۔ یعنی علمی مشکلات کو حل کرنے

---

[1] المستدرک علی الصحیحین جلد ۳ صفحہ ۱۲۷۔ تاریخ بغداد جلد ۲ صفحہ ۳۷۷ اور جلد ۱۱ صفحہ ۴۸-۵۰

[2] صحیح بخاری، کتاب نفقات، باب ۲۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۵۲، ۲۹۹۔

[3] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ۱۷ اور کتاب الطب، باب ۴۸۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۰۳، ۲۴۶، ۲۶۳، ۳۴۰ اور ۳۵۵۔

[4] تاریخ بغداد جلد ۲ صفحہ ۱۰۶۔

قرآن کی تفسیر کرنے اور اسلام کے احکام بیان کرنے کے لیے یہودی اور عیسائی علماء کی خدمات سرکاری طور پر حاصل کی گئیں۔ ان یہودی اور عیسائی علماء نے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اسلامی معاشرے کی علمی رہنمائی کرنے والے عملے میں جگہ پائی اور فتویٰ کی مسند پر بیٹھ گئے یا نماز جمعہ کے خطبوں سے پہلے عام تقریریں بیان کرنے پر مامور کیے گئے یا قرآن مجید کی تفسیر بیان کرنے اور شاگردوں کو تربیت دینے لگ گئے۔

قصّاص (قصّہ گو)

"قصّاص" (= قصہ گو) کی اصطلاح علم حدیث سے مربوط ہے اور یہ حدیث نقل کرنے کا ایک خاص علم ہے۔ ایک نقل کے معتبر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کا راوی یا ناقل جو روایت نقل کرے اس کا سلسلہ سند قطعی، واضح اور صریح طور پر بیان کرے مثلاً کہے کہ:

حَدَّثَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ جُبَیْرٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ عَبْدُاللّٰہِ بْنُ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ ۔ یا یوں کہیے: حَدَّثَنِیْ سُوَیْدُ بْنُ غَفْلَۃَ عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ ۔ یا یہ کہیے: حَدَّثَنِیْ سُوَیْدُ بْنُ غَفْلَۃَ عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ ۔

یعنی میرے لیے فلاں نے حدیث نقل کی اور فلاں سے اور اس نے علی بن ابیطالبؑ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ طریقہ صحیح اور ضعیف احادیث میں امتیاز کرنے کے لیے علمِ حدیث میں معمول ہے۔ راوی اور ناقل اپنی حدیث کے متن کے علاوہ سند بھی جانچ پڑتال کے لیے پیش کرتا ہے لیکن گزشتہ ادوار کے جو واقعات قرآن مجید میں نقل کیے گئے ہیں ان کی سند نقل کرنا ضروری نہیں۔ ان قصوں کی سند خود قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ ۔ (سورۂ یوسف۔ آیت ۳)

(اے رسولؐ!) ہم تم سے ایک نہایت عمدہ قصہ بیان کرتے ہیں

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۶۲)

(اے رسولؐ!) یہ سب یقیناً سچے واقعات ہیں۔

اسی دلیل سے جو اشخاص رسول اکرمؐ تک پہنچنے والی کوئی سند پیش کیے بغیر گزشتہ واقعات اور انبیاءؑ کی تاریخ اور خلقت وغیرہ کی باتیں کرتے تھے اور ظاہراً طور پر ان کی باتیں قرآن مجید میں بیان کی گئی داستانوں سے ایک قسم کی شباہت رکھتی تھیں وہ "قصاص" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ بلاشبہ آج کل 'قصہ گو' کے معنی 'افسانہ گو' کے لیے جاتے ہیں اور وہ ایک اچھا نام نہیں ہے لیکن اسلام کے اس زمانے کے محاورے میں اس کے یہ معنی تھے کہ یہ شخص تاریخ انبیاء اور ایسے ہی دوسرے مضامین قرآن مجید کی طرح سند نقل کیے بغیر بیان کرتا ہے۔

تمیم داری: دنیائے اسلام کا ترجمان

تمیم داری وہ پہلا شخص تھا جس نے دنیائے اسلام میں قصہ گوئی کی بنیاد رکھی۔ معتبر کتابوں میں لکھا ہے کہ:

لَمْ يَكُنْ يُقَصُّ عَلىٰ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا اَبِىْ بَكْرٍ وَكَانَ اَوَّلُ مَنْ قَصَّ تَمِيْمَ الدَّارِيّ وَاسْتَاْذَنَ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ اَنْ يَّقُصَّ عَلَى النَّاسِ قَائِمًا فَاَذِنَ لَهٗ عُمَرُ۔ [1]

یعنی رسول اکرمؐ کے زمانے میں قصہ گوئی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ابوبکر کے زمانے میں بھی اس کا وجود ناپید تھا۔ وہ پہلا شخص جس نے یہ کام شروع کیا تمیم داری تھا۔ اس نے لوگوں کے سامنے خلیفہ عمر بن خطاب سے قصے سنانے کی اجازت مانگی اور خلیفہ عمر نے اسے اجازت دیدی۔

تمیم داری کے اسلام قبول کرنے سے پہلے کے حالات

ان حضرات کی تصریح کے مطابق جنہوں نے رسول اکرمؐ کے حالات زندگی لکھے ہیں

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۴۹ حدیث سائب بن یزید۔ منتخب کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۵۵۔ اور ۵۶۔ تاریخ ابن عساکر جلد ۱ صفحہ ۴۸۰۔ اصابہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۶، شمارہ ۸۳۷۔ اسد الغابہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۶، شمارہ ۵۱۵

تمیم داری یعنی تمیم بن اوس بن خارجہ جس کی کنیت ابو رقیہ تھی " كَانَ نَصْرَانِيًّا وَقَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَاَسْلَمَ "[۱] نصرانی تھا اور ہجرت کے نویں سال میں یعنی رسول اکرم کی زندگی کے آخری سال میں مدینہ آیا اور مسلمان ہو گیا۔ بلاشبہ وہ کوئی معمولی نصرانی نہ تھا بلکہ کہا گیا ہے کہ " كَانَ رَاهِبَ اَهْلِ فِلَسْطِيْنَ وَعَابِدَ اَهْلِ فِلَسْطِيْنَ " وہ اہل فلسطین کا راہب اور وہاں کے لوگوں کا عابد شمار کیا جاتا تھا۔[۲] یعنی وہ عام سا مسیحی نہ تھا بلکہ فلسطین کے لوگوں کا راہب اور نامی گرامی عابد مانا جاتا تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ " مِنْ عُلَمَاءِ اَهْلِ الْكِتَابَيْنِ "[۳] یعنی وہ تورات اور انجیل کے علماء میں سے تھا۔

تمیم داری جاہلیت کے زمانے میں راہب ہونے کے علاوہ تجارت بھی کیا کرتا تھا۔ بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ تمیم داری اور عدی بن بدّاء (جو عمرو بن عاص کا رشتہ دار تھا) قبیلۂ بنی سہم کے ایک آدمی کے ساتھ تجارتی سفر پہ گئے۔ وہ شخص راستے میں ایک ایسے مقام پہ فوت ہو گیا جہاں کوئی مسلمان نہ تھا اور اس کا مال تمیم اور عدی کے ہاتھ آیا۔ انہوں نے وہ مال واپسی پر اس کے پسماندگان کو دیدیا۔ سہمی مرد نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اپنی چیزوں کی تفصیل لکھ کر ان کے اندر رکھ دی تھی لیکن اس کے دونوں ساتھیوں کو اس بات کا پتا نہ چلا۔ اس کے پاس چاندی کا ایک پیالہ بھی تھا جس پر طلا کاری کی ہوئی تھی اور یہ پیالہ اس کی چیزوں میں سے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ قیمتی تھا۔ بلاشبہ اس نے اپنے مال کی جو تفصیل لکھی تھی اس میں اس پیالے کا اندراج بھی موجود تھا۔ تمیم اور عدی نے یہ پیالہ بیچ ڈالا اور اس کی جو قیمت وصول ہوئی ـــــ جو کہ پانچ سو درہم تھی ـــــ وہ آپس میں آدھی آدھی بانٹ لی اور اپنے متوفی مسلمان شریک سفر کا باقیماندہ مال تجارت اس کے گھر والوں کو لوٹا دیا۔ ان لوگوں کو اپنے باپ کی چیزوں میں اس کی کل ملکیت کی فہرست مل گئی اور اس میں مطلا پیالے

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۸ صفحہ ۲۰۴۔ الاصابہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۶ شمارہ ۸۳۷۔ اسد الغابہ جلد ۱ صفحہ ۲۸۶ شمارہ ۵۳۷

[۲] اصابہ جلد ۱ صفحہ ۱۸۶، ترجمہ شمارہ ۸۳۷

[۳] ابن حجر: تہذیب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۵۱۱ پہلا ایڈیشن۔ حیدر آباد دکن

اور اس کی قیمت کا ذکر بھی موجود تھا۔ انہوں نے اپنے باپ کے دونوں ساتھیوں سے رجوع کیا اور ان سے پیالے کا مطالبہ کیا۔ ان دونوں نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہمیں کسی ایسی چیز کا کوئی علم نہیں ہے۔ معاملہ رسول اکرمؐ کے پاس لے جایا گیا۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ نماز کے بعد یہ دونوں اشخاص مسجد میں منبر کے نزدیک خدا کی قسم کھائیں کہ ہم نے خیانت نہیں کی اور جو کچھ تھا وہ لے آئے ہیں۔ ان دونوں نے قسم کھا لی۔ بعد میں پیالہ کسی شخص کے پاس سے مل گیا اور اس نے اقرار کیا کہ میں نے یہ تمیم داری سے خریدا ہے۔ تمیم داری سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: ہاں یہ درست ہے لیکن ہم نے یہ پیالہ اس سہمی مرد سے خرید لیا تھا۔ اس وقت میں یہ بات آپ کو بتانا بھول گیا۔ اس موقع پر سورۂ مائدہ کی آیات شریفہ ۱۰۶ اور ۱۰۷ نازل ہوئیں:

یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَیْنِکُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَکُمُ الْمَوْتُ ...... إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِینَ. فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰ أَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا إِثْمًا ..... إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِینَ.

اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کے سر پر موت آ کھڑی ہو اور وہ وصیت کرنا چاہے تو شہادت کے لیے دو عادل مسلمان کافی ہیں اور اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں موت کا سامنا ہو (اور کوئی مسلمان اس وقت موجود نہ ہو جو گواہی دے سکے) تو دو غیر مسلم یہ کام کر سکتے ہیں اور اگر تمہیں ان کی شہادت پر شک ہو تو انہیں نماز کے بعد روک لو تا کہ وہ اپنے فعل کے درست ہونے کے بارے میں خدا کی قسم کھائیں۔ ۔ ۔ ۔ پھر اگر اطلاع ہو جائے کہ ان دو غیر مسلم گواہوں نے شہادت کے سلسلے میں گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو دو دوسرے آدمی (جو میت کے قرابتدار ہوں) ان کی جگہ کھڑے ہو جائیں اور قسم کھائیں کہ ہماری گواہی پہلے دو گروہوں کی نسبت زیادہ سچی ہے اور ہم نے حق سے تجاوز نہیں کیا۔ اگر ایسا کیا ہو تو اس وقت ہم ظالم ہیں۔

ان آیات میں دیے گئے حکم کے مطابق سہمی مرد کے دو پسماندگان اور اعزہ نے رسول اکرمؐ کے منبر کے پاس کھڑے ہو کر قسم کھائی کہ ہم درست کہہ رہے ہیں اور پیالہ

میراث میں شامل تھا اور یہ دونوں آدمی جھوٹ بول رہے ہیں۔ تب رسول اکرمؐ نے حکم دیا کہ پیالہ یا اس کی قیمت سہمی مرد کے ورثا کو دی جائے۔[1]

تمیم داری کا نصرانیت کے زمانے کی پاکدامنی کا ریکارڈ ایسا ہے۔ اسکی زندگی کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے: "وہ تورات اور انجیل کا عالم، مسیحی راہب اور بہت بڑا سمندری تاجر تھا" جو تجارت کے سلسلے میں بعض اوقات چوری کے گناہ کا مرتکب بھی ہو جاتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد رسول اکرمؐ نے تمیم داری کو جو نصرانی تھا فرمایا: اسلام قبول کر لو کیونکہ اسلام تمام پہلے گناہوں کو ڈھانپ لیتا ہے یعنی جونہی ایک شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے اسلام کا قبول کرنا اس کی ہر سابقہ آلودگی کو مٹا دیتا ہے۔ تمیم داری اس موقع پر ایمان لے آیا۔ یوں تمیم داری نے ہجرت کے نویں سال میں اسلام قبول کیا۔

دوسرے خلیفہ کے زمانے میں

دوسرے خلیفہ عمرؓ بن الخطابؓ کے عہد خلافت میں سابق نصرانی عالم تمیم داری کو جس نے ایک سال سے زیادہ عرصے کے لیے رسول اکرمؐ کا زمانہ نہیں دیکھا تھا اجازت مل گئی کہ سلمانؓ، ابوذرؓ، مقدادؓ، حذیفہؓ اور خزیمہ جیسے صحابہ اور دوسرے مسلمانوں کے سامنے تقریریں کرے۔ وہ ہفتے میں ایک دن خطیب اور مقرر کی حیثیت سے نماز جمعہ سے پہلے مدینہ کے عام مسلمانوں کے سامنے تقریر کیا کرتا تھا اور بلا شبہ مسلمانوں کو بیٹھنا پڑتا تھا اور وہ بیٹھتے تھے اور اس کی باتیں سنتے تھے۔ خلیفہ عثمان کے دورِ خلافت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الوصایا جلد ۴ صفحہ ۱۳-۱۴، مطبوعہ عبدالحمید۔ فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۳۸-۳۴۰۔ سنن ترمذی جلد ۵ صفحہ ۲۵۸-۲۵۹، حدیث ۳۰۵۹ اور ۳۰۶۰۔ سنن ابوداؤد جلد ۳ صفحہ ۳۰۷ حدیث ۳۶۰۶۔ تاریخ ابن عساکر جلد ۱۰ صفحہ ۴۷۰ اور ۴۷۳۔ تہذیب ابن عساکر جلد ۳ صفحہ ۳۵۸۔

میں اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ یہ کام ہفتے میں دو مرتبہ انجام دیا کرے۔[1]

خلیفہ ثانی عمر بن الخطاب تمیم داری کا بہت احترام کرتے تھے اور اسے "خَیْرُ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ"[2] (= مدینہ کا بہترین شخص) کہا کرتے تھے اور یہ عین اس زمانے کی بات ہے جب امیر المومنین امام علیؑ اور دوسرے ممتاز صحابہ موجود تھے۔ بعد میں جب خلیفہ ثانی کے فرمان کے مطابق لوگ مختلف طبقوں میں تقسیم ہو گئے تو تمیم داری نے اہل بدر کے پہلو میں جگہ پائی جن کا شمار رسول اکرمؐ کے محترم ترین صحابہ میں ہوتا تھا اور جو سب سے زیادہ وظیفہ پاتے تھے۔ بدری رسول اکرمؐ کے صحابہ کا پہلا دستہ تھے جس میں شامل مہاجرین پانچ ہزار درہم اور انصار چار ہزار درہم پاتے تھے۔ اس کے بعد کے دستے میں وہ لوگ شامل تھے جو جنگ احد میں شریک ہوئے تھے۔ ان کے بعد بالترتیب جنگ خندق، جنگ خیبر اور صلحنامۂ حدیبیہ میں شرکت کرنے والوں کا نمبر آتا تھا۔ آخری گروہ ان لوگوں کا تھا جو رسول اکرمؐ کے بعد مسلمان ہوئے تھے اور بیت المال سے دو سو درہم وظیفہ پاتے تھے۔

اس زمانے میں خلیفہ نے تمیم داری کو اہل بدر سے ملحق کر دیا۔ اس نے اسلام کے پیشرؤوں اور بزرگوں کے پہلو میں جگہ پائی اور بیت المال سے اس کا پانچ ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا گیا۔[3] علاوہ ازیں جب جناب خلیفہ ثانی نے حکم دیا کہ ماہ رمضان کی نافلہ اور مستحب نمازیں (تراویح) باجماعت پڑھی جائیں (۱۴ ہجری) تو دو آدمیوں کو امام جماعت مقرر کیا گیا جن میں سے ایک سابق نصرانی راہب اور عالم تمیم داری تھا جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا۔ وہ ایک ایسا لباس پہن کر جو اس نے ایک ہزار درہم میں خریدا تھا بڑی شان و شوکت کے ساتھ نماز جماعت کے لیے پہنچا اور مسلمانوں کی امامت کرائی۔[4]

---

[1] تاریخ ابن عساکر جلد ۳ صفحہ ۳۶۰۔ ذہبی: سیر اعلام النبلاء جلد ۲ صفحہ ۴۴۸ مطبوعہ لبنان

[2] اصابہ جلد ۳ صفحہ ۳۷۴ مطبوعہ ۱۳۵۸ھ قاہرہ اور ذہبی کی روایت میں "خیر المومنین" کہا گیا ہے۔ دیکھیے سیر اعلام النبلاء جلد ۲ صفحہ ۴۴۶ مطبوعہ بیروت ۱۴۰۱ھ۔

[3] فتوح البلدان صفحہ ۵۵۶، مطبوعہ مصر۔ تحقیق صلاح الدین المنجد۔

[4] تاریخ ابن عساکر جلد ۱۰ صفحہ ۴۷۹ اور تہذیب ابن عساکر جلد ۳ صفحہ ۳۶۰۔ ابن حبان: کتاب الثقات جلد ۳ صفحہ ۴ مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ سیر اعلام النبلاء جلد ۲ صفحہ ۴۴۷۔

تمیم داری خلیفہ عثمان کی خلافت اور حکومت کے خاتمے تک مدینہ میں رہا لیکن ان کے قتل ہو جانے کے بعد شام بھاگ گیا اور ۴۰ھ تک یعنی امام امیر المومنین علیہ السلام کی شہادت کے سال تک وہیں قیام پذیر تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ شام میں فوت ہوا اور اس کی قبر فلسطین کے علاقے میں بیت جبرین کے مقام پر واقع ہے۔

خلفائ کے مکتب میں نفوذ

یہ نصرانی عالم اور راہب تحریف شدہ تورات اور انجیل پر پورا پورا عبور رکھتا تھا۔ چونکہ وہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا اور رسول اکرمؐ کے زیر تربیت نہیں رہا تھا اس لیے یہ بات اس کے لیے مشکل تھی کہ اس نے جو تعلیمات حاصل کر رکھی تھیں ان میں تبدیلی لا سکے۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس شخص کا اس زمانے میں کتنا اثر و رسوخ تھا۔ علمائے رجال کا یہ قول قابل توجہ ہے کہ **ابوہریرہؓ** (جس نے ۵۳۷۴ حدیثیں نقل کی ہیں) **انس بن مالکؓ** (جس نے ۲۲۸۶ حدیثیں روایت کی ہیں) **عبداللہ بن عباسؓ** (جس نے ۱۶۶۰ حدیثیں نقل کی ہیں) اور بہت سے تابعین اسی تمیم داری کے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے اور انہوں نے اس سے حدیثیں نقل کی ہیں۔

حدیث جساسہ اور دجال

تمیم داری سے نقل کی گئی حدیثوں میں جو سب سے زیادہ مشہور ہے وہ اس تعلیم کی نشاندہی کرتی ہے جس کا وہ حامل ہے اور جسے وہ نئے نئے قائم شدہ اسلامی معاشرے میں پھیلانا چاہتا ہے۔ وہ حدیث جو دجال کے بارے میں ہے اور حدیثِ "جساسہ" کے نام سے مشہور ہے، یوں نقل کی گئی ہے:

فاطمہ بنت قیس کہتی ہیں:

رسول اکرمؐ کے منادی کی آواز کانوں تک پہنچی جو کہہ رہا تھا: اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ (نماز جماعت کے لیے آؤ) میں گھر سے نکلی اور مسجد میں آنحضرتؐ کیساتھ نماز ادا کی میں عورتوں کی پہلی صف میں بیٹھی تھی۔ نماز کے بعد آنحضرتؐ منبر پہ بیٹھے۔ درآنحالیکہ آپ ہنس رہے

تھے اور آپ نے فرمایا: ہر شخص اپنی جگہ پر بیٹھا رہے۔ پھر آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ تمہیں اس اجتماع میں کیوں بلایا گیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: خدا اور اس کا رسول ص بہتر جانتے ہیں۔ آنحضرت ص نے فرمایا: میں نے تمہیں اس لیے جمع کیا ہے کہ تمیم داری جو پہلے نصرانی تھا آیا ہے اور اس نے بیعت کی ہے اور اسلام قبول کر لیا ہے اور میرے سامنے ایک حدیث نقل کی ہے جو اس کے مطابق ہے جو میں تمہیں بتاتا رہا ہوں اور وہ حدیث مسیح دجال کے بارے میں ہے۔

اس نے میرے سامنے نقل کیا ہے کہ:

میں اور لخم و جذام کے قبیلوں کے تیس افراد ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ سمندر میں طوفان آگیا۔ ہم پورے ایک مہینے تک موجوں کے رحم و کرم پر رہے اور پھر وہ ہمیں بہا کر ایک جزیرے کی طرف لے گئیں۔ وہاں ہم کشتی میں سے ساحل پر اتر گئے۔ جزیرے میں ہم نے ایک عجیب الخلقت حیوان کو دیکھا جس کے بدن پر بے حد بال تھے۔ یہاں تک کہ بالوں کی زیادتی کی وجہ سے اس کے سر اور دم میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ ہم اس حیوان کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ تم کیا ہو؟ اس نے جواب دیا میں جساسہ ہوں[1]۔ ہم نے کہا: جساسہ کیا ہوتا ہے؟ اس نے جواب دیا: تم مجھ سے کچھ نہ پوچھو اور اس خانقاہ میں چلے جاؤ۔ کیونکہ جو شخص اس خانقاہ میں ہے اسے تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے اور وہ تمہارے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ ہم اس کی یہ باتیں سنکر خوفزدہ ہو گئے اور سوچنے لگے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ایک شیطان ہو جس نے یہ شکل اختیار کر رکھی ہو۔ پس ہم جلدی سے خانقاہ کی طرف چل دیے۔ خانقاہ میں ہم نے ایک آدمی کو دیکھا جس سے زیادہ گرانڈیل آدمی ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن اس کے ہاتھ اور پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ہم نے اس سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا: میرے متعلق تو تمہیں پتا چل ہی جائے گا، پہلے تم بتاؤ کہ تم کون لوگ ہو؟ ہم نے کہا: ہم عرب ہیں۔ پھر ہم نے کشتی کی داستان اور جو کچھ ہم پر گزری تھی سب

---

[1] جساسہ سے مراد وہ شخص ہے جو بہت جاسوسی کرتا ہو۔

کہہ سنائی۔ پھر اس نے ہم سے کچھ سوال کیے۔ اس نے پوچھا: نخل بیسان[1] کس حال میں ہے؟ طبریہ[2] کی جھیل میں پانی ہے یا نہیں؟ چشمہ زغر[3] کس حالت میں ہے؟ .... پھر اس نے کہا: نبیؐ امیؐ کے بارے میں بتاؤ۔ ہم نے جواب دیا: انہوں نے مکہ میں ظہور فرمایا اور اب یثرب میں رہتے ہیں۔ اس نے پوچھا: کیا عربوں نے ان کے خلاف جنگ کی؟ ہم نے جواب دیا: ہاں۔ اس نے کہا: ان جنگوں کا کیا نتیجہ نکلا؟ ہم نے جواب دیا: کبھی یہ غالب آئے اور کبھی انہوں نے فتح پائی ہے۔ اس نے کہا: بلاشبہ ان کے لیے مصلحت اور بھلائی اسی میں ہے کہ اس پیغمبرؐ کی اطاعت کریں۔ پھر کہنے لگا: اب میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ میں مسیح (دجال) ہوں اور عنقریب مجھے خروج کی اجازت ملنے والی ہے۔ میں زمین پر چل نکلوں گا اور فقط چالیس دن میں مکہ اور طیبہ (مدینہ) کے علاوہ ہر جگہ پہنچوں گا۔ یہ دونوں شہر مجھ پر حرام ہیں اور ہر اس راستے پر جو ان کی جانب جاتا ہے ایک فرشتہ تلوار لیے کھڑا ہوتا ہے جو مجھے ان کی طرف جانے سے روکتا ہے۔

پھر رسول اکرمؐ نے اپنا عصا منبر پہ مارتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: یہ طیبہ ہے۔ بعد ازاں آپ نے فرمایا: کیا میں نے یہ بات تمہیں نہیں بتائی تھی؟ لوگوں نے جواب دیا: جی ہاں، آپ نے بتائی تھی۔ پھر آپ نے فرمایا: اسی وجہ سے تمیم داری کی حدیث میرے لیے دلچسپ اور تعجب انگیز تھی کیونکہ جو کچھ میں خود تمہیں بتا چکا تھا اس کے ساتھ مطابقت رکھتی تھی[4]۔

حدیث کی چھان بین

ہم اس بارے میں بحث نہیں کرتے کہ ایک سمندر مسلسل ایک مہینے تک کس طرح

---

[1] شام کا ایک گاؤں [2] شام میں ایک چھوٹی سی جھیل [3] شام کا ایک علاقہ۔
[4] صحیح مسلم جلد ۸ صفحہ ۲۰۳-۲۰۵ قدیم ایڈیشن مصر، کتاب الفتن، باب ۲۴ حدیث ۱۱۹ اور جدید ایڈیشن جلد ۴ صفحہ ۲۲۶۱-۲۲۶۳۔ مسند طیالسی صفحہ ۲۲۸-۲۲۹ حدیث ۱۶۴۶۔ مسند احمد بن حنبل صفحہ ۳۷۳-۳۷۴-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۷-۴۱۹۔ سنن ترمذی کتاب الفتن باب ۶۶۔ سنن ابن ماجہ، حدیث ۴۰۷۴۔

طوفانی رہ سکتا ہے ؟ اصولاً یہ سمندر بحیرۂ روم کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا اور کیا اس سمندر میں جس میں ہزارہا سال سے انسانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے کوئی ایسا نامعلوم جزیرہ بھی ہے جس میں دجال مقید ہو اور جساسہ معلومات جمع کرنے میں مشغول ہو ؟ اور اگر اس زمانے میں ممکن تھا کہ لوگ یقین کرلیں کہ ایسا جزیرہ وجود رکھتا ہے تو حالیہ صدیوں میں کیا صورت ہے ؟ کیا آجکل بھی یہ غیر معقول بات قابل قبول ہے ؟

علاوہ ازیں جساسہ نام کا وہ حیوان کہاں پیدا ہوتا ہے جس کے سر اور دم میں تمیز کرنا ممکن نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ فصیح عربی میں گفتگو اور استدلال کرتا ہو ؟ کیا بنیادی طور پر یہ بات معقول بھی ہے یا نہیں ؟ اور پھر دجال نے جو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور جسے عنقریب خروج کی اجازت ملنے والی تھی اپنا کام گزشتہ چودہ سو سال میں کیوں شروع نہیں کیا ؟ اس زمانے میں اس روایت کے گھڑنے والے کے لیے یہ کہنا ممکن تھا کہ دجال نے خروج کی اجازت لے لی ہے کیونکہ اسے آئندہ زمانے کی کوئی خبر نہ تھی لیکن آج صدیاں گزر جانے کے بعد ہم جانتے ہیں کہ یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے ۔

ہم ان اور انہیں جیسے دوسرے سوالات اور جوابات کو قاری کی فہم و فراست پر چھوڑتے ہیں اور فقط اتنا پوچھتے ہیں کہ : یہ جو روایت میں کہا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اسے تمیم داری سے سنا اور قبول کیا اور پھر اسے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے رسمی اجتماع میں بڑی خوشی کے ساتھ بیان کیا ۔ اس سے اسلام میں کتنی بڑی پریشانی اور غلط فہمی پیدا ہوتی ہے ؟ ایک پڑھا لکھا اور سمجھدار مسلمان اس روایت کو پڑھنے کے بعد اپنے پیغمبرؐ کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا ؟ جو غیر مسلم اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں وہ کیا کہیں گے اور اس پیغمبرؐ پر کس طرح ایمان لائیں گے جو ایسی خرافات اور جھوٹی روایات نقل کرتا ہو ؟

ایک اور سوال جو ہم پوچھنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا صدیاں گزر جانے کے باوجود کوئی ایسا مسلمان نہیں پیدا ہوا جو اس حدیث کے متعلق اور اس بارے میں شک کرے کہ رسول اکرمؐ نے ایسی بات منبر پہ بیٹھ کر کہی ہو ؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے کیونکہ یہ حدیث صحیح مسلم میں نقل کی گئی ہے اور جو کچھ صحیح مسلم اور صحیح بخاری

ہیں نقل کیا جائے۔ اس میں شک و شبہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن بہر صورت حدیث کے متن کے جھوٹا اور جعلی ہونے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ پس خرابی کہاں سے پیدا ہوئی ہے یا اسے کہاں تلاش کیا جائے؟ مصر کے عظیم عالم اور مصلح سید محمد رشید رضا[1] نے اس سلسلے میں تحقیق کی ہے اور اس مسئلے کا ایک حل پیش کیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ حدیث کی راوی فاطمہ بنت قیس نے غلطی کھائی ہے یا سچی بات نہیں کی یا بے حقیقت خیالات کا شکار ہو گئی ہے کیونکہ وہ رسول اکرمؐ کی صحابیہ ہیں اور صحابیوں کا پورا پورا احترام کرنا ضروری ہے۔ صحیح مسلم کے راویوں اور خود مسلم سے بھی کوئی جھوٹ یا خطا منسوب نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا یہ حدیث یقیناً رسول اکرمؐ تک پہنچتی ہے اور اسے نقل کرنے میں راوی کسی غلطی یا گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے لیکن یہ حدیث کسی صورت میں بھی موجودہ زمانے کے علم اور معلومات کے مطابق قابل قبول نہیں ہے۔ رشید رضا اس مسئلے کا حل یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے تمیم داری کی باتیں نقل کرنے میں غلطی کھائی یعنی آپ تمیم داری کے خرافات پر مبنی اور جھوٹے قصے کے چنگل میں گرفتار ہو گئے اور اس کے غلط ہونے کا احساس کیے بغیر آپ نے اسے لوگوں کے سامنے بیان کر دیا۔ شیخ محمد عبدہٗ کی عبارت یوں ہے:

اَلنَّبِیُّ مَا کَانَ یَعْلَمُ الْغَیْبَ فَھُوَ کَسَائِرِ الْبَشَرِ یَحْمِلُ کَلَامَ النَّاسِ عَلَی الصِّدْقِ اِذَا لَمْ تَحُفْ بِهٖ شُبْهَةٌ۔[2]

یعنی رسول اکرمؐ غیب نہیں جانتے۔ وہ دوسرے انسانوں کی طرح ہیں اور اگر لوگوں کی باتوں میں شبہ موجود نہ ہو تو انہیں سچائی پر محمول کرتے ہوئے ان کا یقین کر لیتے ہیں۔

---

[1] محمد عبدہٗ کے مشہور شاگرد جو ۱۳۵۴ھ میں فوت ہوئے اور جنہوں نے مجلہ المنار جاری کیا اور تفسیر المنار لکھی۔ ان کے سوانح حیات کے لیے دیکھیے زرکلی: الاعلام جلد ۶ صفحہ ۳۹۰-۳۹۱ (تیسرا ایڈیشن)

[2] مجلہ المنار جلد ۱۹ صفحہ ۹۹۔ مطبوعہ مصر۔

دراصل رسول اکرمؐ نے تمیم داری کی باتوں سے دھوکا کھایا اور یہ جانے بغیر کہ وہ بے حقیقت ہیں انہیں بڑی خوشی کے ساتھ لوگوں کے سامنے دہرایا اور انھیں ان کی تعلیم دی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصولاً ایسی احادیث، حدیث کی کتابوں میں کیسے در آئیں؟ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تمیم داری پر اعتراض کریں کہ اس نے خرافات سے پُر یہ قصہ کیوں بیان کیا اور کیوں ایسی باتیں کہیں بلکہ ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ قصہ، قصہ ناموں میں کیوں نہ گیا اور "جامع احادیث صحیح" کہلانے والی کتابوں میں کیسے گھس آیا؟

جن اشخاص کو گزشتہ مباحث ذہن نشین ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکام وقت کے احکام کے مطابق ہجرت سے لے کر سو سال تک احادیث نہیں لکھی گئیں اور پہلی مرتبہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں روایات نے تحریری شکل اختیار کی۔ ممکن ہے کہ تمیم داری نے ایک ایسی داستان نقل کی ہو جو اس زمانے کے لوگوں کے لیے دلچسپ اور ہیجان انگیز ہو اور مسلمانوں نے بھی وہ داستان سنی ہو۔ بعد میں کچھ وقت گزر جانے کے بعد کسی مسلمان کو غلط فہمی ہوئی ہو اور اس نے خیال کیا ہو کہ اس نے یہ داستان حدیث کی شکل میں رسول اکرمؐ سے سنی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یوں یہ روایت فاطمہ بنت قیس یا دوسرے راوی عامر شعبی کے ذریعے نقل کی گئی ہو اور حدیث کی کتابوں میں داخل ہو گئی ہو اور درحقیقت رسول اکرمؐ نے ایسی کوئی بات نہ کہی ہو اور آنحضرتؐ کے ارشادات سننے کے لیے ایسا کوئی اجتماع مسجد میں نہ ہوا ہو۔

علم الحدیث یا علم درایۃ الحدیث میں روایات کی مختلف انواع میں سے ایک نوع کو "رِوَایَۃُ الْکِبَارِ عَنِ الصِّغَارِ" کہا گیا ہے جو اس چیز سے عبارت ہے کہ بڑا چھوٹے سے نقل کرے مثلاً جب ایک صحابی ایک تابعی سے حدیث نقل کرے کیونکہ صحابی رسول اکرمؐ کی مصاحبت کی بنا پر راویوں کے سلسلے میں آگے ہونے کی وجہ سے تابعی سے بڑا شمار ہوتا ہے جسے یہ مراتب حاصل نہیں ہوتے اور اسی لیے اس کی نقل "بڑے کا چھوٹے سے روایت کرنا" سمجھی جاتی ہے۔ اس حدیث کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ چونکہ اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی یعنی تمیم داری

سے نقل کیا ہے لہٰذا یہ "رِوَایَۃُ الْکِبَارِ عَنِ الصِّغَارِ" ہے۔ [1]

مغرب کے اسلام شناس اور حدیث جساسہ

اسلام کے خلاف معرکوں میں عیسائیوں نے جن تہمتوں کو بہت زیادہ ہوا دی، ان میں سے ایک یہ تھی کہ رسول اکرمؐ نے اپنے ارشادات اور اسلام کے بنیادی معارف اور احکام عیسائیوں اور یہودیوں سے حاصل کیے ہیں۔ شروع میں عیسائی صدیوں تک اس تہمت کی تکرار ان مشابہتوں سے استناد کر کے کرتے رہے جو موجودہ تورات اور انجیل کے کچھ مطالب اور قرآن مجید کے درمیان موجود ہیں۔ بعد میں استعماری ضرورتوں کے تحت یورپ کے استعمارگر ممالک میں خاور شناسی اور اسلام شناسی کے علم کو لازم سمجھا گیا اور یہ علم بڑے وسیع پیمانے پر وجود میں آ گیا۔ مغرب کے اسلام شناس اپنی تحریروں میں اسلام پر جو تہمتیں لگاتے تھے ان میں سے ایک تہمت سب سے زیادہ رائج تھی اور انگلستان، فرانس اور ہالینڈ وغیرہ کی مستعمرات کی وزارتوں کے وظیفہ خوار اسلام شناس تحقیق کے پردے میں ہر روز کسی نہ کسی شکل میں اس تہمت کی تکرار کرتے تھے۔

ان مقدمات کو زیر نظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمیم داری کی حدیث اس قسم کے جھوٹ منتشر کرنے اور تہمتیں لگانے کے لیے کتنی مکمل دلیل ہو گی۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مغرب کے اسلام شناسوں نے اس سلسلے کی اہم ترین کتاب 'دائرۃ المعارف اسلام' میں دجال کے بارے میں بحث اور خود تمیم داری کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں اس حدیث کی جانب اشارہ کیا ہے اور اس امر کی تصریح بھی کی ہے کہ وہ شام کے عیسائیوں کی عبادات کے بارے میں رسولِ اکرمؐ کو بتا سکتا تھا۔ دینی مسائل کے بارے میں اس قسم کی جو معلومات تمیم داری نے آنحضرتؐ کو مہیا کیں ان میں 'دجال' آخر الزماں اور جساسہ کی داستان بھی شامل تھی اور آنحضرتؐ نے بھی یہ باتیں برضا و رغبت سن کر قبول

---

[1] صحیح مسلم بہ شرح نووی میں اسی حدیث کی شرح ملاحظہ کریں۔

کیں اور مسلمانوں کو ایک علمی تحفے کے طور پر سکھائیں اور ان کے درمیان پھیلائیں۔[1]

پروفیسر لیفی دلاویدا جو عربی زبان اور سامی لغات کا استاد اور تاریخ اسلام کا متخصص ہے دائرۃ المعارف اسلام کے مادہ "تمیم داری" میں لکھتا ہے:

"بیشتر شامی عربوں کی طرح تمیم داری عیسائی تھا۔ لہٰذا وہ آنحضرتؐ کو شامیوں کی عبادات سے آگاہ کر سکتا تھا جن میں سے ایک یہ تھی کہ مسجد میں چراغ جلایا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ تمیم داری پہلا شخص تھا جس نے دینی قصے نقل کیے اور قیام ساعت (قیامت) دجال کی پیدائش اور جساسہ کا قصہ بھی انہیں قصوں میں سے ایک تھا۔ تمیم داری نے یہ قصے آنحضرتؐ کو سنائے اور انہوں نے لوگوں کے درمیان منتشر کیے۔[2]

قبل ازیں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بنی امیہ کے زمانے میں کس طرح رسول اکرمؐ کی شخصیت کو توڑنے پھوڑنے کی کوششیں کی گئیں۔ بدقسمتی سے ان کوششوں کے نتیجے میں جو احادیث خلفاء کے مکتب کی معتبر کتابوں میں داخل ہو گئیں وہ اس امر کا باعث بنیں کہ نئے خیالات کے حامل معاصر محقق رشید رضا اس مسئلے کا حل یہ سمجھتے ہیں کہ کہا جائے کہ رسول اکرمؐ غلطی کے مرتکب ہوتے۔

تمیم داری کے بارے میں مزید معلومات

روح بن زنباع کہتا ہے: میں تمیم داری کے پاس گیا اور دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کو کھلانے کے لیے جو صاف کر رہا ہے حالانکہ اس کے کئی نوکر اور ملازم موجود ہیں میں نے اس سے کہا: تمہیں یہ کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارے پاس نوکر اور غلام ہیں۔ کیا ان میں کوئی ایسا نہیں جو یہ کام کر سکے؟ تمیم داری نے جواب دیا:

---

[1] دائرۃ المعارف اسلام کے پہلے ایڈیشن میں مادہ دجال میں ونسنک کے مقالے سے اور مادہ تمیم داری میں لیفی دلاویدا کے مقالے سے اور خلاصہ دائرۃ المعارف SHORTER ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM P 67. میں مادہ دجال کی طرف رجوع کریں۔

[2] دیکھیے دائرۃ المعارف کا عربی ترجمہ جلد ۵ صفحہ ۴۸۱۔

کیوں نہیں ؟ لیکن میں نے رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ :

مَا مِنِ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يُنَقِّي لِفَرَسِهٖ شَعِيْرًا ثُمَّ يُعَلِّقُهٗ عَلَيْهِ اِلَّا كُتِبَ لَهٗ بِكُلِّ حَبَّةٍ حَسَنَةٌ۔ [1]

یعنی کوئی مسلمان اپنے گھوڑے کے لیے جَو صاف نہیں کرتا اور اس کے گلے میں نہیں لٹکاتا مگر یہ کہ اس کے نامۂ اعمال میں جَو کے ہر دانے کے عوض ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔

یہ جعلی حدیث تمیم داری سے نقل کی گئی روایات کا ایک نمونہ ہے جس میں ارشاداتِ رسولؐ اور معارفِ اسلام اس حد تک نیچے گر جاتے ہیں کہ گھوڑے کو جَو کھلانے کے لیے ہر جَو کے دانے کے عوض ایک نیکی کا ثواب ملتا ہے۔

تمیم داری کے مکارانہ کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے معاویہ کے زمانے میں رسول اکرمؐ کا تملیک نامہ پیش کیا جس کے مطابق آنحضرتؐ نے شام کے کچھ آباد دیہات اسے جاگیر کے طور پر دیدیے تھے۔

اس موضوع پر تمیم داری نے رسول اکرمؐ کا جو خط پیش کیا اس کا مضمون یوں تھا:

هٰذَا مَا اَعْطٰى مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِتَمِيْمِ الدَّارِيِّ وَاَصْحَابِهٖ. اِنِّيْ اَعْطَيْتُكُمْ بَيْتَ عَيْنُوْنَ وَحَبْرُوْنَ وَالْمَرْطُوْمَ وَبَيْتَ اِبْرَاهِيْمَ بِذِمَّتِهِمْ وَجَمِيْعِ مَا فِيْهِمْ عَطِيَّةً بَتٌّ وَنَفَّذْتُ وَسَلَّمْتُ ذٰلِكَ لَهُمْ وَلِاَعْقَابِهِمْ بَعْدَهُمْ اَبَدَ الْاٰبِدِيْنَ فَمَنْ اٰذَاهُمْ فِيْهِ اٰذَى اللّٰهَ. شَهِدَ اَبُوْبَكْرِ ابْنُ اَبِيْ قُحَافَةَ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيُّ بْنُ اَبِيْ طَالِبٍ. [2]

یعنی یہ ہے وہ جو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمیم داری اور اس کے ساتھیوں کو عطا کیا ہے۔ میں نے بیت عینون، جبرون، مرطوم

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۰۳

[2] تاریخ ابن عساکر جلد ۱ صفحہ ۳۶۹ معجم البلدان جلد ۲ صفحہ ۲۱۲-۲۱۳- تہذیب ابن عساکر جلد ۳ صفحہ ۳۵۴-۳۵۵ مطبوعہ بیروت سنہ ۱۳۹۹ھ- سیر اعلام النبلاء جلد ۲ صفحہ ۳۱۷ مطبوعہ مصر

اور بیت ابراہیم اور جتنے درخت، حیوان اور انسان وغیرہ ان دیہات
میں ہیں تمہیں عطا کیے۔ یہ عطیہ قطعی اور ناقابل فسخ ہے۔ میں نے یہ
دیہات ہمیشہ کے لیے تمیم داری اور ان کے متعلقین کے اختیار میں
دیدیے ہیں۔ جس نے اس بارے ان کو تکلیف دی، اس نے خدا کو
تکلیف دی۔ اس معاملے میں ابوبکر بن ابی قحافہ، عمر، عثمان اور علی
ابن ابی طالب گواہ ہیں۔

اس خط کے جعلی ہونے کے بارے میں بکثرت دلائل موجود ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو خط رسول اکرمؐ خود لکھتے یعنی لکھواتے تھے ان میں اپنے نام کے بعد درود و سلام نہیں لکھواتے تھے۔ بلاشبہ اگر دوسرے لوگ آپ کے نام کوئی چیز لکھ بھیجتے تھے تو آپ کے اسم مبارک کے بعد آپ پر صلوات اور سلام بھیجتے تھے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کوئی آباد زمین اس شکل میں یعنی اس میں موجود تمام انسانوں اور حیوانوں سمیت کسی کو بطور جاگیر نہیں دیتے تھے بلکہ بنجر زمین بخشتے تھے تاکہ لوگ انہیں آباد کریں یا انہیں چراگاہیں بنا کر وہاں مویشی پالیں۔

ایک اور دلیل یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے ان دیہات میں جو کچھ موجود تھا (یعنی انسان، حیوان اور تمام مال و دولت) وہ تمیم داری اور اس کے ساتھیوں کو بخش دیا یعنی ان جگہوں کے باشندوں کو ان کے غلام اور کنیزیں بنا دیا اور وہ بھی روز قیامت تک اور پھر فرمایا کہ جو کوئی انہیں یعنی تمیم داری اور اس کے متعلقین کو تکلیف دیتا ہے وہ خدا کو تکلیف دیتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ اس بخشش کے گواہ وہی حضرات ہیں جو بعد میں بالترتیب حاکم بنے۔ یعنی انہوں نے بعینہٖ اسی ترتیب سے اس خط پر دستخط کیے۔ یہ ترتیب بجائے خود اس خط کے جعلی ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں جو بہت سے خطوط لکھے گئے۔ ان کے نیچے قلمبند کی گئی شہادتوں میں کوئی نمونہ ایسا نہیں ملتا جس میں اس ترتیب کی رعایت کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ یہ خط معاویہ کے زمانے میں وضع کیا گیا ہے۔ تمیم داری نے اس خط کے ذریعے مذکورہ بالا آباد

علاقے جو بیت المقدس کے ارد گرد اور شام و فلسطین میں واقع تھے معاویہ کی حکومت سے حاصل کر لیے اور وہاں منتقل ہو گیا۔ اس نے اپنی باقیماندہ زندگی وہیں گزار دی اور وہیں فوت ہوا اور وہیں دفن ہوا۔

خلاصہ

تمیم داری اپنے اسلام لانے سے پہلے کے ریکارڈ اور اسلام لانے کے بعد اپنے طور طریقوں کے باوجود اسلامی حکومت کا سرکاری خطیب تھا۔ جیسے کہ پہلے ذکر آچکا ہے وہ دوسرے اور تیسرے خلیفہ کے زمانے میں سرکاری طور پر اس کام پر مامور تھا کہ نماز جمعہ سے پہلے تقریر کیا کرے اور ان تقریروں کے دوران وہ قصے سنایا کرتا تھا۔

جب امیرالمومنین امام علی علیہ السلام نے عنانِ حکومت سنبھالی تو آپ نے جو کام سب سے پہلے انجام دیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ نے قصہ گوؤں کو مسجدوں سے نکال دیا۔[1]

جس طرح بہت سے اور لوگ امیرالمومنین علیہ السلام کی عادلانہ حکومت سے بھاگ کر معاویہ کے پاس پہنچے تھے اسی طرح ان قصہ گوؤں نے بھی اس کی پناہ لی۔ یوں قصہ گوؤں کی داستان —— گو ہمیشہ کے لیے نہیں —— اختتام کو پہنچی اور یہ بات پہلی دفعہ وقتی طور پر امیرالمومنین امام علی علیہ السلام کے ہاتھوں اسلامی تاریخ کے صفحات سے مٹ گیا۔ تاہم بعد میں آنے والے حکام کے زمانے میں قصہ گوئی کو دوبارہ زندگی ملی اور اسے ایک مرتبہ پھر رسمی طور پر رائج کر دیا گیا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے عہد میں قصہ گوؤں کی زندگی کا پہلا دور ختم ہوا لیکن جب ان کے کام کو دوبارہ زندگی ملی تو بلاشبہ اسلامی افکار پر ان کا اثر و نفوذ باقی رہا اور وہی صورت پیدا ہوئی جو ہم تمیم داری کی گھڑی ہوئی روایات کے سلسلے میں دیکھ چکے ہیں۔

---

[1] منتخب کنزالعمال جلد ۴ صفحہ ۵۶۔ تہذیب التہذیب جلد ۷ صفحہ ۱۵۷-۱۵۸۔ فروع کافی جلد ۷ صفحہ ۲۶۳ وسائل الشیعہ جلد ۳ صفحہ ۵۱۵۔ الوافی جلد ۳ صفحہ ۴۷۔ فجر الاسلام صفحہ ۱۹۲۔

اس کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: "رسول اکرمؐ نے اس سے روایت نقل کی ہے اور ابن عباس، انس بن مالک، ابو ہریرہ اور عبد اللہ بن عمر اور بہت سے تابعین نے اس سے حدیث پڑھی اور نقل کی"۔[۱]

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ رسول اکرمؐ نے تمیم داری سے کوئی حدیث نقل کی ہو ـــ اور اس نقل کا نمونہ بھی ہم دیکھ چکے ہیں ـــ قطعی طور پر سفید جھوٹ ہے لیکن ابو ہریرہ، انس بن مالک اور عبد اللہ بن عمر جیسے بعض صحابہ نے اور تابعین نے جو اسلام کو تمیم داری جیسے لوگوں کی زبان سے سیکھنا چاہتے تھے اس نو مسلم عیسائی عالم اور راہب کی باتیں سنیں اور انہیں روایت کی شکل میں آنے والی نسلوں کے لیے نقل کر دیا۔ یوں روایات کے سلسلے نے جسے حدیث شناسی کے علم میں "اسرائیلیات" کہا جاتا ہے (یعنی بنی اسرائیل کی داستانیں جو تورات، انجیل اور تلمود جیسی تحریف شدہ کتابوں میں لکھی ہیں) عالم اسلامی میں قدم رکھا اور مستقل طور پر یہاں رہ گئیں اور اسلامی تفسیر، حدیث اور تاریخ کا نام پایا۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ تورات میں بارہا اس خدا کا ذکر آتا ہے جو راستے پر چلتا ہے اور دیکھا جاتا ہے اور مثلاً آدم سے باتیں کرتا ہے یا یعقوب کے ساتھ رات کی ابتدا سے صبح تک کشتی لڑتا ہے؟ اور کیا ایسا نہیں ہے کہ تورات میں ایسے پیغمبروں کا ذکر آتا ہے جو مختلف اقسام کے گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور جن کا دامن شراب نوشی، زنا اور دوسرے گناہوں سے آلودہ ہوتا ہے۔ بلا شبہ ایسی تمام باتوں نے جو درحقیقت صحیح تورات اور انجیل میں موجود آسمانی حقائق کی تحریف ہیں ایسے لوگوں کے ذریعے اسلام میں قدم رکھا اور خلفاء کے مکتب کی مختلف کتابوں کو پر کر دیا۔

یوں جن راستوں سے اسلام میں تحریف کی گئی ان میں سے ایک اس قسم کے لوگ تھے۔
ہمیں بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمیم داری، وہب بن منبہ اور سب سے بڑھ کر کعب الاحبار[۲] کی کہی ہوئی باتوں نے نہ صرف یہ کہ خلافت کے مکتب کی تاریخ، حدیث

---

[۱] سیر اعلام النبلاء جلد ۲ صفحہ ۴۴۳ مطبوعہ بیروت۔ تہذیب تاریخ ابن عساکر جلد ۳ صفحہ ۳۴۴ مطبوعہ بیروت
[۲] کعب کے حالاتِ زندگی اور اسکی عظیم تخریبی کارروائیوں کا مطالعہ آئندہ درس میں کیا جائیگا۔

اور تفسیر کی کتابوں میں نفوذ کیا بلکہ وہاں سے اہلِ بیتؑ کے مکتب کی حدیث، تاریخ
اور تفسیر کی کچھ کتابوں میں بھی قدم رکھا اور یوں اہلِ بیتِ رسولؐ کے صاف و شفاف
علوم کی کچھ کتابیں آلودہ ہوگئی ہیں۔ اہلِ بیتؑ کے مکتب میں علوم کی بنیاد تحقیق
پر ہے لہذا فقہی احادیث کے بارے میں ہر پہلو سے بڑی دقیق تحقیقات کی جاتی ہیں
لیکن تاریخی، اخلاقی یا تفسیری روایات میں کافی تحقیقات نہیں کی گئیں لہذا بعض
اوقات ان کتابوں میں کہیں کہیں اسلام کے دشمنوں کی گھڑی ہوئی روایات دیکھنے
میں آجاتی ہیں۔

ہمارے لیے حقیقی اسلام یعنی اس اسلام تک پہنچنے کے لیے جو رسول اکرمؐ لائے
تھے اس کے علاوہ کوئی چارا نہیں کہ ہم صرف آنحضرتؐ اور اہلبیتؑ (جو آپ کے علم
کے وارث ہیں) کے علوم سے فائدہ اٹھائیں۔ خود آنحضرتؐ نے بارہا مختلف صورتوں
میں فرمایا ہے:

اِنِّی تَارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِی مَا اِنْ تَمَسَّکْتُم
بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِی اَبَدًا۔ [۱]

یعنی میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں: خدا
کی کتاب اور میرے اہلبیتؑ۔ اگر تم ان دونوں کو تھامے رہو گے
تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ

---

[۱] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۴، ۱۷، ۲۶، ۵۹، کتاب فضائل القرآن جلد ۲ صفحہ ۴۳۲۔ المستدرک جلد ۳ صفحہ ۱۰۹۔ شرح الجامع الصغیر للمناوی جلد ۳ صفحہ ۱۵۔ جلد ۵ صفحہ ۶۶۲۔ ۶۶۳، حدیث ۳۷۸۶۔ ۳۷۸۸۔

سولھواں درس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الۡیَھُوۡدَ ...(مائدہ۔ ۸۲)

وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَھُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمۡ ...(بقرہ۔ ۱۲۰)

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے برسر اقتدار طبقہ نے رسول اکرم کے ارشادات اور حقیقی اسلام کے معارف کی خالی جگہ کو اہل کتاب کی تعلیمات سے پُر کرنے کی کوشش کی اور یہی وجہ ہوئی کہ یہودی اور عیسائی علماء اسلامی معاشروں میں قرآن کی تفسیر اور معارف بیان کرنے کی کرسی پر براجمان ہوگئے۔ قبل ازیں ہم نے مسیحی عالم تمیم داری کے اسلامی معاشرے میں نفوذ کے بارے میں بحث کی ہے۔ اب ہم اہل کتاب کے ایک اور عالم کی شخصیت اور سرگرمیوں کی چھان بین کرتے ہیں۔ وہ کعب الاحبار کے نام سے مشہور تھا اور یہودیوں کا بہت بڑا عالم شمار ہوتا تھا۔

کعب الاحبار:

اس شخص کا نام "کعب بن ماتع" کنیت "ابو اسحاق" اور لقب "کعب الاحبار" تھا۔ بعض اوقات اسے کعب الحبر بھی کہا جاتا تھا لیکن اس کا مشہور ترین نام اس کا لقب یعنی "کعب الاحبار" ہی تھا۔

احبار "حبر" کی جمع ہے۔ حبر یہودی عالم کو کہتے ہیں اور بعض اوقات یہ لفظ عیسائی عالم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہودی اسے اس لیے کعب الاحبار کہتے تھے کہ وہ تمام

مقدس کتابیں جوان یہودی علماء کے پاس ہونی چاہئیں سبھی اس کے پاس موجود تھیں یا اس لیے کہ وہ ان کا سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا تھا یا کم از کم اس کا شمار عظیم ترین علماء میں ہوتا تھا۔

مؤرخین نے کعب کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اہل کتاب کے بڑے علماء میں شامل تھا اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ یمن کے یہودیوں کے احبار میں سے تھا۔[1] اس نے خلیفہ ابو بکر کے زمانے میں اسلام قبول کیا تھا[2] اور خلیفہ عمر کے عہد میں مدینہ آیا۔

جو روایات موجود ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ کعب الاحبار اس لیے مدینہ آیا تھا کہ وہاں سے بیت المقدس جائے اور وہاں سکونت اختیار کرے۔ عیسائی اپنے اقتدار کے زمانے میں یہودیوں کو تکلیفیں دیتے تھے اس لیے یہودی بیت المقدس میں ___ جو ان کے لیے بھی مقدس سرزمین تھی ___ آرام سے نہیں رہ سکتے تھے لیکن اسلام کی آمد اور اس سرزمین سے عیسائیوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد کعب الاحبار چاہتا تھا کہ یہودیوں کی موعود سرزمین یعنی شام اور بیت المقدس جائے اور وہاں رہے۔

تاریخ دمشق کا مؤلف ابن عساکر لکھتا ہے: عمر بن خطاب نے کعب سے کہا: اب جبکہ تم نے اسلام قبول کر لیا ہے، تم مدینہ میں کیوں نہیں رہ جاتے جہاں رسول اکرمؐ نے ہجرت فرمائی اور دفن ہوئے؟ کعب نے کہا: میں نے خدا کی نازل شدہ کتاب میں پڑھا ہے کہ شام کی زمین کو خدا کے خزانے کا نام دیا گیا ہے جس خزانے میں اس کے بندے جمع ہیں۔

کعب ہمیشہ تورات کو کتاب خدا کہتا تھا (حالانکہ اس وقت تورات میں تحریف ہو چکی تھی اور وہ خالص آسمانی کتاب نہیں رہی تھی)۔ وہ جب بھی فقط کتاب خدا کہتا تھا (اس کی نقل کردہ روایات میں یہ لفظ اکثر استعمال ہوا ہے) اس سے اس کی مراد تورات

---

[1] ابن سعد: طبقات جلد ۷، ق ۲ صفحہ ۱۵۶۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۵۲ مطبوعہ ہندوستان۔

[2] ابن سعد: طبقات جلد ۷، ق ۲ صفحہ ۱۵۶۔ تہذیب التہذیب جلد ۸ صفحہ ۴۳۸۔ اصابہ جلد ۳ صفحہ ۲۹۸

ہوتی تھی۔

خلیفہ ثانی نے اصرار کیا کہ کعب مدینہ میں رہ جائے۔ کعب بھی خلیفہ عثمان کے زمانے تک مدینہ میں سکونت پذیر رہا۔ خلیفہ عثمان نے بارہ سال حکومت کی۔ انہوں نے پہلے چھ سالوں میں پہلی دو حکومتوں کے طور طریقوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی لہٰذا کوئی شکایت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ تاہم اپنی خلافت کے باقی چھ برسوں میں انھوں نے تمام کام بنی امیہ اور اپنے رشتہ داروں کو سونپ کر حالات کو بدل کر رکھ دیا۔ اس زمانے میں کعب مدینہ سے ہجرت کر کے شام چلا گیا اور معاویہ سے وابستہ ہو گیا۔ اسی دوران میں اس نے ۱۰۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ مؤرخین نے اس کی وفات کا سال ۳۵ھ لکھا ہے۔[۱]

کعب الاحبار نے پوری کوشش کی تھی کہ اسرائیلی روایات مسلمانوں کے درمیان پھیلائے۔ پس اسرائیلی روایات' اہل کتاب کے قبلہ بیت المقدس کی تعریف اور بالخصوص یہودیوں کے بارے میں جو کچھ کتابوں میں موجود ہے وہ اسی کے توسط سے نشر ہوا ہے۔ تفسیر' حدیث' سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں کعب کی جو روایات موجود ہیں وہ اس قول کی صداقت پر گواہ ہیں۔

ابن عساکر اپنی تاریخ میں کعب الاحبار سے نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا:

اَحَبُّ الْبِلَادِ اِلَی اللّٰہِ الشَّامُ وَاَحَبُّ الشَّامِ اِلَی اللّٰہِ الْقُدُسُ.

یعنی خدا تعالیٰ کے نزدیک روئے زمین پر محبوب ترین بہر زمین شام ہے اور شام میں اللہ کے نزدیک محبوب ترین مقام قدس ہے[۲] اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کو شام اور قدس مکہ مدینہ سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔

اس نے یہ بھی کہا ہے:

تِسْعَۃُ اَعْشَارِ الْخَیْرِ بِالشَّامِ وَجُزْئُہٗ فِیْ سَائِرِ الْاَرْضِیْنَ.[۳]

---

[۱] شذرات الذہب جلد ۱ صفحہ ۴۰ دوسرا ایڈیشن مطبوعہ بیروت
[۲] ابن عساکر: تاریخ مدینۃ دمشق جلد ۱ صفحہ ۱۱۰ مطبوعہ دمشق
[۳] ابن عساکر: تاریخ مدینۃ دمشق جلد ۱ صفحہ ۱۴۷

یعنی اللہ نے خیر و برکت کے دس میں سے نو حصے شام کو اور فقط ایک باقی ساری دنیا کو عطا کیا ہے۔

اس نے یہ بھی کہا ہے کہ:

خَمْسُ مَدَائِنَ مِنْ مُّدُنِ الْجَنَّةِ : بَيْتُ الْمُقَدَّسِ وَحِمْص وَدِمَشْق وَجَبْرِيْن وَظِفَارُ الْيَمَنِ .[1]

یعنی پانچ شہر بہشت کے شہروں میں سے ہیں: بیت المقدس، حمص، دمشق، ظفار الیمن (وہ سرزمین جس میں کعب مدینہ ہجرت کرنے اور شام جانے سے پہلے رہتا تھا) اور جبرین (جو بیت المقدس کے نزدیک واقع ایک آبادی کا نام ہے)۔

علاوہ ازیں وہ کہتا ہے کہ:

اَرْبَعَةُ اَجْبُلٍ : جَبَلُ الْخَلِيْلِ وَلُبْنَانَ وَالطُّوْرِ وَالْجُوْدِيِّ يَكُوْنُ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لُؤْلُؤَةً بَيْضَاءَ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ يَرْجِعْنَ اِلٰى بَيْتِ الْمُقَدَّسِ حَتّٰى يُجْعَلَ فِيْ زَوَايَاهُ وَيَضَعُ الْجَبَّارُ جَلَّ جَلَالُهُ عَلَيْهَا كُرْسِيَّهُ حَتّٰى يَقْضِيَ بَيْنَ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ . وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ .[2]

یعنی چار پہاڑ: کوہ خلیل ـــ جو بیت المقدس کے نزدیک واقع ہے اور جس میں حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی قبر ہے ـــ کوہِ لبنان، کوہِ طور اور کوہِ جودی میں سے ہر ایک قیامت کے دن آسمان اور زمین کے درمیان چمکتے ہوئے موتیوں کی مانند ہو گا۔ اس دن یہ چاروں پہاڑ بیت المقدس کی جانب لوٹیں گے اور اس کے چاروں کونوں میں قائم کر دیے جائیں گے اور خدائے جبار اپنی کرسی ان پر رکھے گا تاکہ وہاں سے اہل بہشت اور اہل دوزخ کے درمیان فیصلے دے۔ پھر وہ اپنے قول کی دلیل کے طور پر آخر میں قرآن مجید کی آیۂ شریفہ نقل کرتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: "اور (تم فرشتوں کو دیکھو گے

---

[1] ابن عساکر: تاریخ مدینۃ دمشق جلد ۱ صفحہ ۲۱۱-۲۱۲ [2] ابن عساکر: تاریخ مدینۃ دمشق جلد ۲ صفحہ ۱۲۲ درمنثور جلد ۵ صفحہ ۳۴۴

کہ عرش کے اردگرد طواف کر رہے ہوں گے اور اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ." [1] یعنی درحقیقت وہ کہنا چاہتا ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے، وہ اس آیت کی تفسیر ہے۔

یہ جو ہم کہتے ہیں کہ یہ چیزیں اسلام کی معتبر کتابوں میں نفوذ کر گئیں وہ اسی حدیث میں دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ابن عساکر کی عظیم تاریخ اور مشہور تفسیر "درمنثور" دونوں میں موجود ہے۔

یہ چند نمونے ہیں جن سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کے عقائد کعب کے ذریعے کس شکل میں مسلمانوں میں رواج پا گئے۔

بیت المقدس قابل احترام ہے۔ خدا اپنے عرش یا کرسی کو ـــــ جو مادی بھی ہیں ـــــ وہاں رکھتا ہے۔ چار پہاڑ جو یہودیوں کے نزدیک زیادہ مقدس ہیں اور بیت المقدس کی سرزمین خدا کی کرسی کے چار پائے اور اسے بچھانے کی جگہ ہیں۔

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ [2] قیامت کے دن اہل شام سے خطاب کیا جائے گا کہ پروردگار تمہاری اسی طرح حفاظت کرے گا جیسے ایک جنگجو شخص اپنے ترکش میں موجود تیروں کی حفاظت کرتا ہے اور ان کا خیال رکھتا ہے کیونکہ شام اسکی محبوب ترین سرزمین ہے اور وہاں رہنے والے اسکے محبوب ترین بندے ہیں۔

وہ مزید کہتا ہے: جو کوئی شام میں وارد ہوتا ہے وہ خدا کی عنایت اور رحمت کا مورد قرار پاتا ہے اور جو کوئی وہاں سے چلا جاتا ہے وہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ نیز یہ کہ فتنوں اور خطروں سے مسلمانوں کی پناہ گاہ شہر دمشق ہے اور دجال سے بچاؤ کی جگہ نہر ابو فطرس (فلسطین میں رملہ کے نزدیک ایک مقام) ہے اور یاجوج ماجوج سے محفوظ رہنے کا مقام کوہ طور ہے۔ [3]

---

[1] سورۂ زمر۔ آیت ۷۵ [2] تاریخ ابن عساکر جلد ۱ صفحہ ۱۱۰
[3] تاریخ ابن عساکر جلد ۱ صفحہ ۲۳۲

کعب ایک اور روایت میں کہتا ہے :

اِنَّ الْکَعْبَۃَ تَسْجُدُ لِبَیْتِ الْمُقَدَّسِ فِیْ کُلِّ غَدَاۃٍ .

خانہ کعبہ ہر روز صبح کے وقت بیت المقدس کو سجدہ کرتا ہے۔[۱]

یہ کہنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ یہ روایت امام محمد باقر علیہ السلام کے سامنے پڑھی گئی اور کہا گیا کہ : کعب نے درست کہا ہے۔ امام ؑ نے فرمایا: تو نے جھوٹ بولا ہے اور کعب نے بھی تیری طرح جھوٹ بولا ہے۔[۲]

ایک اور روایت میں کعب نے کہا ہے :

لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یُزَفَّ الْبَیْتُ الْحَرَامُ اِلَی الْبَیْتِ الْمُقَدَّسِ[۳]

قیامت برپا نہیں ہو گی مگر یہ کہ بیت الحرام کو بیت المقدس کے پاس لیجایا جائے۔ پھر ان دونوں مقدس گھروں کو ان کے مکینوں سمیت بہشت میں وارد کیا جائے گا اور قیامت کے دن لوگوں کا حساب کتاب بیت المقدس میں انجام پائے گا۔

آپ دیکھیں گے کہ ان عبارات میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے مقدسات مثلاً کعبہ یہودیوں کے مقدسات مثلاً بیت المقدس کو سجدہ کرتا ہے یا بہشت میں داخل ہونے کے لیے اس کے پاس جاتا ہے۔ کیا ان کلمات سے اس عقیدے کی تلقین اور تبلیغ نہیں ہوتی کہ بالآخر اسلام یہودیت کے آگے اپنا سر جھکا دیتا ہے ؟ انہیں روایات کی بنیاد پر ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ کعب نے ان کلمات کے درمیان مسلمانوں میں یہودیت اور اس کی تعلیمات کا پرچار کیا ہے اور اس کی قدروں کو اعلیٰ اسلامی قدروں کے عنوان سے پیش کیا ہے۔

کعب کے شاگرد

علاوہ اس کے کہ کعب الاحبار کی یہ کوشش تھی کہ اپنی تقاریر کے ذریعے یہودیوں

---

[۱] تفسیر در منثور جلد ا صفحہ ۱۳۶

[۲] فروع کافی، کتاب الحج باب فضل النظر الی الکعبۃ، حدیث ا جلد ۴ صفحہ ۲۴۰

[۳] تفسیر در منثور جلد ا صفحہ ۱۳۶ - ۱۳۷

کی تحریف شدہ تعلیمات کو اسلامی معاشرے میں رائج کرے۔ اس نے کچھ ایسے شاگردوں کی پرورش بھی کی جو یہودیت کے پرچار میں اس کی مدد کرسکیں۔ اس دھوکہ باز یہودی نے ایسے اشخاص کی فکری تربیت کرنے کے علاوہ انہیں عالم اور دانشمند کی حیثیت سے معاشرے سے متعارف کرایا۔ وہ مختلف طریقوں سے کوشش کرتا تھا کہ اسکے شاگردوں کو شہرت حاصل ہو۔ کعب کے شاگردوں میں سے ایک عبداللہ بن عمرو بن عاص تھا۔ ایک دن کعب نے عبداللہ سے کوئی سوال پوچھا اور اس نے اس کا جواب دیا۔ اس پر کعب نے کہا: "أَنْتَ أَفْقَهُ الْعَرَبِ" یعنی تم تمام عربوں سے زیادہ صاحب علم اور صاحب بصیرت ہو۔

مکہ میں کعب سے کوئی سوال کیا گیا۔ اس نے کہا: اس کا جواب عبداللہ بن عمرو بن عاص سے جاکر پوچھو۔ جب عبداللہ سے وہ سوال پوچھا گیا اور اس نے اس کا جواب دیا تو کعب نے کہا: "صَدَقَ الرَّجُلُ، عَالِمٌ وَاللهِ" یعنی اس نے ٹھیک کہا ہے۔ خدا کی قسم وہ ایک عالم شخص ہے۔ [1]

کعب الاحبار کا ایک اور شاگرد مکتب خلافت کا مشہور راوی ابو ہریرہ دوسی ہے جس نے بہت زیادہ روایات نقل کی ہیں۔ کعب کی کوشش تھی کہ وہ اس شخص کو جس نے معاویہ کے زمانے میں اور اس کے بعد اہمیت پائی خاص تعلیمات دے اور اسے یہودی طرزِ فکر سے سرشار کردے۔ طبری تینوں روایتوں میں بتاتا ہے کہ کعب نے ابو ہریرہ کو تعلیم دیتے ہوئے کس طرح یہودیوں کے علوم سکھائے۔ [2]

ان کثیر روایات کے علاوہ جو ابو ہریرہ نے کعب الاحبار کا نام لیے بغیر نقل کی ہیں بہت سی روایات ایسی ہیں جس میں اس نے واضح طور پر کعب کا نام لیا ہے [3] یہی وجہ ہے کہ علمائے رجال ابو ہریرہ کو کعب الاحبار کا شاگرد اور تربیت یافتہ

---

[1] تاریخ طبری جلد ۱ صفحہ ۴۰۲۔ دوسرا ایڈیشن۔ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم

[2] تاریخ طبری جلد ۱ صفحہ ۲۶۵-۲۶۶۔ تفسیر طبری جلد ۲ صفحہ ۲۳-۵۵ مطبوعہ بولاق

[3] مثلاً دیکھیے تاریخ طبری جلد ۱ صفحہ ۱۱۵۔ اصابہ جلد ۳ صفحہ ۲۹۹

سمجھتے ہیں۔[1]

جیسا کہ ہم نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کے بارے میں دیکھا ہے، ابوہریرہ کے متعلق بھی کعب الاحبار کی یہ کوشش تھی کہ اسے ایک عالم کی حیثیت سے شہرت اور اعتبار ہو جائے۔ ایک دن کعب نے کافی دیر تک ابوہریرہ سے گفتگو کرنے کے بعد کہا:

مَا رَاَیْتُ اَحَدًا لَمْ یَقْرَءِ التَّوْرَاۃَ اَعْلَمَ بِمَا فِیْھَا مِنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ.

یعنی میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس نے تورات نہ پڑھی ہو لیکن اس کے مطالب ابوہریرہ کی طرح جانتا ہو۔[2]

کعب کا سرکاری عہدہ داروں میں نفوذ

یہ یہودی عالم اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ارباب اقتدار کو متاثر کرے۔ وہ یہ کام بڑی ہوشیاری سے کرتا تھا اور یہاں بھی تحریف شدہ یہودی تعلیمات رائج کرنے کی کوشش کرتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ نظام خلافت میں نفوذ حاصل کرنے اور خلیفہ کی نظرِ عنایت اپنی جانب مبذول کرانے میں لگا رہتا تھا۔

ایک ملاقات میں اس نے خلیفہ عمر بن خطاب سے کہا:

اِنَّا لَنَجِدُكَ فِیْ كِتَابِ اللّٰهِ عَلٰى بَابٍ مِّنْ اَبْوَابِ جَهَنَّمَ تَمْنَعُ النَّاسَ اَنْ یَّقَعُوْا فِیْهَا فَاِذَا مِتَّ لَمْ یَزَالُوْا یَقْتَحِمُوْنَ فِیْهَا اِلٰى یَوْمِ الْقِیَامَةِ.

یعنی میں نے آپ کے بارے میں خدا کی کتاب میں لکھا دیکھا ہے (اور بلاشبہ خدا کی کتاب سے اس کی مراد تورات ہے) کہ آپ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہیں اور لوگوں کو اس کے اندر جانے سے روک رہے ہیں لیکن جب آپ فوت ہو جائیں گے تو لوگ قیامت کے روز تک مسلسل دوزخ میں وارد ہوتے رہیں گے۔[3]

---

[1] اصابہ جلد ۳ صفحہ ۲۹۸ اور تہذیب التہذیب آخری جلد ابوہریرہ کی سوانح حیات۔ البدایۃ والنہایۃ جلد ۸ صفحہ ۱۰۳

[2] ذہبی: تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۳۶۔ اصابہ جلد ۴ صفحہ ۲۰۶۔ ابوہریرہ کی سوانح حیات شمارہ ۱۱۹۰، باب الکنٰی

[3] طبقات الکبریٰ جلد ۳ صفحہ ۲۴۰ مطبوعہ یورپ اور جلد ۳ صفحہ ۳۳۲ مطبوعہ بیروت۔

یوں کہیے کہ رسول اکرمؐ کو بھی یہ فضیلت حاصل نہیں کہ وہ جب تک زندہ ہیں دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہیں اور لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روک رہے ہیں۔ خلیفہ ابوبکر کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے اور خلیفہ عمر کے بعد بھی کسی کو یہ فضیلت نہیں ملی اور فقط عمر بن خطاب ہی ہیں جنہوں نے برے کاموں کی پاداش میں دوزخ میں جانے والوں کا راستہ روک رکھا ہے اور جب وہ فوت ہو جائیں گے تو دوزخ میں جانے کے لیے کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی۔

اسی طرح جب خلیفہ عمر بن خطاب ابولؤلؤ فیروز کے ہاتھوں زخمی ہوئے تو کعب نے کہا: لَئِنْ سَاَلَ عُمَرُ رَبَّهٗ لَيُبْقِيَنَّهُ اللّٰهُ یعنی اگر عمر خدا سے درخواست کریں کہ وہ انہیں باقی رکھے تو پروردگار حتمی طور پر ان کی عمر بڑھا دے گا۔[۱] بلاشبہ یہاں بھی کعب نے حسب معمول تورات کی جانب رجوع کیا اور اس میں ایک داستان نقل کی۔

روایات کے مطالعہ سے بعض اوقات یہ پتا چلتا ہے کہ ارباب اقتدار بھی چاہتے تھے کہ کعب مسلمانوں کے درمیان پہچانا جائے اور معتبر گردانا جائے اور لوگ اس کی باتوں پر یقین کریں اور اس کی جانب رجوع کریں۔

خلفاء کے مکتب کی معتبر تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ عمر نے کعب سے پوچھا کہ اس آیۂ شریفہ میں عدن سے کیا مراد ہے؟

رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ (سورۂ غافر۔ آیت ۸-۹)

کعب الاحبار نے فوراً کہا: قُصُوْرٌ مِّنْ ذَهَبٍ فِي الْجَنَّةِ يَسْكُنُهَا النَّبِيُّوْنَ وَ الصِّدِّيْقُوْنَ وَاَئِمَّةُ الْعَدْلِ یعنی بہشت میں سونے کے بنے ہوئے محلات ہیں جو پیغمبروں، صدیقین اور عادل پیشواؤں کی جائے سکونت ہیں۔ اس کے بعد اس نے وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ کی تفسیر بیان کرنا شروع کی اور کہا: اس آیت میں سیأت سے مراد عذاب ہے کیونکہ خدا ایسے لوگوں کو عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔[۲]

---

[۱] طبقات الکبریٰ جلد ۳ صفحہ ۲۵۷ مطبوعہ یورپ اور جلد ۳ صفحہ ۳۵۴ مطبوعہ بیروت

[۲] تفسیر قرطبی جلد ۱۵ صفحہ ۲۹۵۔ تفسیر در منثور جلد ۵ صفحہ ۳۴۷

جیساکہ آپ جانتے ہیں اس یہودی عالم کے الفاظ تفسیر قرآن کی شکل میں مکتب خلفاء کی کتب تفسیر میں شامل ہو گئے ہیں۔ مثلاً سیوطی اور قرطبی کی تفاسیر میں یہ کلمات سورۂ غافر کی آٹھویں اور نویں آیت کی تفسیر میں آئے ہیں۔

ایک اور موقع پر خلیفہ ثانی نے کعب سے پوچھا کہ خانۂ خدا (کعبہ) کی اصل کیا ہے؟ اس نے اس کا بڑا مفصل جواب دیا اور کہا: کعبہ در اصل ایک سرخ یاقوت تھا جو حضرت آدمؑ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کا درمیانی حصہ کھوکھلا اور خالی تھا وغیرہ وغیرہ۔[1]

خلیفہ عمر کی موجودگی میں عربوں کی شعر گوئی کا ذکر چھڑ گیا۔ خلیفہ نے کعب سے پوچھا: کیا تم نے تورات میں شعر کا کوئی نام و نشان نہیں پایا؟ کعب نے جواب دیا: کیوں نہیں۔ میں نے تورات میں دیکھا ہے کہ اسماعیل کے فرزندوں کا ایک گروہ ہے جن کے سینوں میں ان کی انجیل ہے اور وہ حکمت کی باتیں کرتے ہیں اور ایسی مثالیں دیتے ہیں کہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ عربوں کے علاوہ کوئی اور ہو سکتے ہیں۔[2]

کعب الاحبار نے تورات کو اتنی مرتبہ خدا کی کتاب کہہ دیا کہ اس زمانے کے جو مسلمان اس سے ملاقات کرتے تھے وہ بھی تورات کو خدا کی کتاب ہی کہتے تھے۔

ایک دن معاویہ نے اس سے پوچھا: کیا تمہیں خدا کی کتاب میں دریائے نیل کے بارے میں بھی کوئی چیز ملی ہے؟

کعب نے جواب دیا: جی ہاں۔ قسم ہے اس کی جس نے موسیٰ کی خاطر سمندر میں شگاف کر دیا میں نے خدا کی کتاب میں دیکھا ہے کہ پروردگار ہر سال دو مرتبہ نیل کو وحی کرتا ہے کہ: پروردگار تجھے حکم دیتا ہے کہ تو جاری ہو جا اور یہ حکم ملنے پر وہ جاری ہو جاتا ہے پھر اسے وحی ہوتی ہے کہ واپس لوٹ جا اور نیل واپس لوٹ جاتا ہے۔[3]

ابن عباس نقل کرتے ہیں کہ: ایک دن جب میں معاویہ کے پاس تھا، اس نے سورۂ کہف کی ۸۶ ویں آیت ایک خاص شکل میں پڑھی اور میں نے اس پر اعتراض کیا۔

---

[1] درمنثور جلد ۱ صفحہ ۱۳۲ [2] ابن رشیق: العمدہ صفحہ ۲۵ مطبوعہ مصر
[3] النجوم الزھراۃ فی ملوک مصر و قاہرہ جلد ۱ صفحہ ۳۳

معاویہ نے آیت کے بارے میں عبداللہ بن عمرو عاص سے پوچھا اور اس نے معاویہ کے نظریے کی تائید کی۔ میں نے جواب میں کہا: قرآن ہمارے گھر میں نازل ہوا ہے یعنی عبداللہ بن عمرو بن عاص جیسے اشخاص نہیں بلکہ ہم اس بات کے مستحق ہیں کہ اس کے متعلق کچھ کہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسئلے کے حل کے لیے معاویہ نے جسے ان دنوں سارے عالم اسلام کی حکومت حاصل تھی کسی آدمی کو کعب کے پاس بھیجا تاکہ اس کی رائے پر انحصار کرتے ہوئے اختلاف ختم کر دیا جائے۔[1] نیز معاویہ کعب کی تعریف میں کہہ رہا تھا: اَلَا اِنَّ کَعْبَ الْاَحْبَارِ اَحَدُ الْعُلَمَآءِ یعنی یہ جان لو کہ کعب الاحبار علماء میں سے ایک عالم ہے[2] اور اس قول کی اہمیت اس وقت تھی جب کعب کے ساتھ فقط دو دوسرے اشخاص کا نام لیا جاتا تھا۔

انہیں مقدمات کی بنا پر کعب، عمر بن خطاب کے دور خلافت میں اور بعد میں علوم و معارف کا بہت بڑا سرچشمہ بن گیا تھا۔ وہ اپنے خاص طریقے سے مسلمانوں کو یہودیت کی تعلیمات کے نزدیک لا رہا تھا۔ اسی کے ذریعے یہودیت کی محرف تعلیمات اسلام کی تفسیر، تاریخ، سیرت اور حدیث کی کتابوں میں جگہ پا رہی تھیں اور اسلامی طرز فکر اور مسلمانوں کی صحیح جہاں بینی کو تبدیل کر رہی تھیں اور اسے یہودیت میں موجود خرافات سے آلودہ کر رہی تھیں۔

جو چیز زیادہ قابل افسوس ہے وہ یہ ہے کہ یہودیوں کی یہ خرافات حدیث کی معتبر کتابوں میں داخل ہو گئی ہیں اور انہوں نے تاریخ طبری، تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر، تفسیر درمنثور اور انہیں جیسی دوسری اہم کتابوں کو پُر کر دیا ہے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ کعب الاحبار جیسے یہودیوں کی تعلیمات مکتب خلافت کی تفسیر سے مکتب اہلبیتؑ کی بعض تفسیر کی کتابوں میں بھی در آئی ہیں[3] اور جس حد تک ان خرافات نے ایسی کتابوں میں نفوذ کیا ہے اسی حد تک اہلبیتؑ کے معارف کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

---

[1] تفسیر درمنثور جلد ۴ صفحہ ۲۴۸ [2] طبقات الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۳۵۸ مطبوعہ بیروت۔

[3] تفسیر ابوالفتوح رازی اور تفسیر گازر میں بلاشبہ کعب الاحبار کی کچھ ایسی احادیث نقل کی گئی ہیں جو اسلام کے اصولوں کے منافی نہیں ہیں۔

کعب الاحبار کے مقابلے میں اسلام کے محافظ

یہاں اس نکتے کی چھان بین ضروری ہے کہ امام علیؑ جیسے اسلام کے محافظوں اور خدمت گزاروں نے کعب کے مقابلے میں کیا حیثیت اختیار فرمائی اور کس طرح اس شخص کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے جو علوم و معارف کے پیاسے مسلمانوں کے درمیان یہودیت کی تعلیمات پھیلا رہا تھا۔ جو واقعہ ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں اس سے پتا چلتا ہے کہ امامؑ کے کعب الاحبار کی تحریفات سے مقابلے کی کیا کیفیت تھی اور اس سلسلے میں آپ نے کیا حیثیت اختیار فرمائی:

ایک دن خلیفہ عمر کے عہد میں خلیفہ کی موجودگی میں ایک مجلس تشکیل دی گئی جس میں امام علیؑ بھی تشریف فرما تھے۔ کعب بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ خلیفہ نے اس سے سوال کیا: اے کعب! کیا تم نے پوری تورات حفظ کر رکھی ہے؟ کعب نے جواب دیا: نہیں، لیکن اس کا بہت سا حصہ مجھے یاد ہے۔ ایک شخص نے خلیفہ سے کہا: اے امیرالمومنین! اس سے پوچھیے کہ عرش کو خلق کرنے سے پہلے خدا کہاں تھا؟ نیز بعد میں اس نے جس پانی پر اپنے عرش کو رکھا اسے اس نے کس چیز سے پیدا کیا؟

خلیفہ عمر نے کہا: اے کعب! کیا تمہیں ان باتوں کی کچھ خبر ہے؟ کعب نے جواب دیا: ہاں اے امیرالمومنین! میں نے اصل حکیم[1] میں دیکھا ہے کہ عرش کی تخلیق سے پہلے پروردگار قدیم اور ازلی تھا اور بیت المقدس کی چٹان پر رہتا تھا اور یہ چٹان بھی ہوا پر تھی۔ جب خدا نے عرش کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے منہ کا لعاب پھینکا اور اس لعاب سے گہرے سمندر میں پرشور لہریں پیدا ہوئیں۔ اس موقع پر خدا نے بیت المقدس کی اس چٹان کے کچھ حصے سے جو اس کے نیچے تھی اپنا عرش خلق فرمایا اور اس پر بیٹھ گیا اور چٹان کا جو حصہ باقی بچ رہا اس سے اس نے بیت المقدس کا معبد خلق کیا۔۔۔۔

---

[1] اصل حکیم سے کعب کی مراد تورات ہے۔ یہ صفت قرآن مجید کی صفات میں سے ہے جسے کعب نے محرف تورات کے لیے استعمال کیا ہے۔

امیرالمومنین امام علی علیہ السلام اس حالت میں کہ اپنے کپڑوں کو جھٹک رہے تھے اور ایسے کلمات ادا کر رہے تھے جو خدا کی بزرگی پر دلالت کرتے ہیں (مثلاً جَلَّ الْخَالِقُ، جَلَّ اللّٰہُ یا اَللّٰہُ اَکْبَرُ) اپنی جگہ سے اٹھے تاکہ اعتراض کے طور پر مجلس سے چلے جائیں۔ یہ عربوں کی ایک رسم ہے کہ جب کسی چیز سے بیزاری کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو اپنا لباس جھٹکتے ہیں گویا کہنا چاہتے ہیں کہ میں یہ باتیں برداشت نہیں کرسکتا۔[1]

خلیفہ عمر نے جب یہ صورت حال دیکھی تو قسم دی کہ اپنی جگہ واپس آجائیں اور زیر بحث مسئلے پر غور کریں۔ امام علیہ السلام اپنی جگہ واپس آگئے اور کعب کو مخاطب کر کے فرمایا: تمہارے اصحاب غلط راستے پر چلے۔ انہوں نے خدا کی کتابوں میں تحریف کی اور اس سے جھوٹی باتیں منسوب کیں۔ اے کعب وائے ہو تم پر، اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ چٹان اور ہوا خدا کے ساتھ رہی ہیں تو وہ بھی خدا کی طرح قدیم اور ازلی ہو جائیں گی۔

پس قدیم موجودات کی تعداد تین ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں خدا اس سے برتر ہے کہ اس کا کوئی ایسا مکان ہو جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے اور وہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ ملحد کہتے ہیں اور جاہل خیال کرتے ہیں۔ اے کعب وائے ہو تم پر، وہ ذات جس کے لعاب دہن سے تمہارے قول کے مطابق بڑے بڑے سمندر وجود میں آتے ہیں اس سے کہیں بڑی ہے کہ بیت المقدس کی چٹان پر بیٹھے۔[2]......

حدیث مفصل ہے اور اس بات کا پتا دیتی ہے کہ امام علیہ السلام ان گمراہ کن سرگرمیوں، تحریفوں اور بدعتوں کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ یہ جو آپ سنتے ہیں کہ امامؑ کھجور کے درختوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے اس کی وجہ درحقیقت یہ تھی کہ اگر آپ لوگوں کے درمیان رہتے تو آپ کی جان خطرے میں ہوتی اور ممکن تھا کہ اسلام کو کوئی فائدہ پہنچائے بغیر آپ قتل کر دیے جاتے۔

---

[1] فَعَظَّمَ عَلِیٌّ رَبَّهُ وَ قَامَ عَلٰی قَدَمَیْهِ وَنَفَضَ ثِیَابَهُ فَاَقْسَمَ عَلَیْهِ عُمَرُ اَنْ یَّعُوْدَ اِلٰی مَجْلِسِهِ وَ یَغُوْصَ فِی الْحَدِیْثِ۔

[2] نزهة الناظر وتنبیه الخاطر، جو مجموعۂ ورام کے نام سے مشہور ہے صفحہ ۲۳۵-۲۳۶۔

کعب الاحبار کیوں موردِ توجہ قرار پایا؟

اب اس مسئلے کی چھان بین ضروری ہے کہ معاویہ جیسے خلفاء نے کس وجہ سے اس بات کی کوشش کی کہ کعب الاحبار کو اسلامی معاشرے سے متعارف کرایا جائے اور وہ موردِ توجہ قرار پائے اور اسے اسلامی معاشرے میں ایک عالم کی حیثیت سے بلند مرتبہ حاصل ہو۔

پہلا شخص جس نے کعب الاحبار کی جانب توجہ دی اور اسے مدینہ میں رہنے پر مجبور کیا اور اس سے ایک عظیم عالم اور مرجع علمی کی حیثیت سے سوالات کیے وہ خلیفہ ثانی عمر تھے البتہ یہ بات کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا، پوری طرح واضح نہیں ہے لیکن انکے حالات زندگی کے مطالعے سے پتا چلتا ہے وہ گزشتہ زمانے میں یہودیت اور تورات سے واقفیت اور دلچسپی رکھتے تھے اور اس کتاب کو سراہتے تھے۔

جابر نقل کرتے ہیں کہ ایک دن عمر بن خطاب ایک چھوٹی سی کتاب لیکر جو تورات کا ایک حصہ تھی، رسول اکرمؐ کے پاس آئے۔ آنحضرتؐ تشریف فرما تھے۔ عمر نے کہا: یا رسول اللہؐ! یہ کتابچہ تورات کا ایک حصہ ہے اور میں یہ آپ کے لیے لایا ہوں۔ رسول اکرمؐ یہ سن کر خاموش رہے۔ عمر نے اپنی بات جاری رکھی اور چاہتے تھے کہ تورات پڑھیں۔ وہ خوش تھے کہ انھیں علم میسر آگیا ہے اور اسی خوشی کے عالم میں اسے پڑھ کر آنحضرتؐ کو سنانا چاہتے تھے۔ درحقیقت ان کی خواہش تھی کہ رسول اکرمؐ اس کی تصدیق کریں اور اسے پڑھنے کے بارے میں ان کی حوصلہ افزائی کریں لیکن اس کے برعکس آنحضرتؐ نے کوفت محسوس کی اور ہر لحظہ آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا گیا۔ تاہم عمر اس کی جانب متوجہ نہ تھے۔ وہ تورات ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے اور کسی دوسری بات کی طرف دھیان دیے بغیر چاہتے تھے کہ اسے پڑھ کر آنحضرتؐ کو سنائیں۔ ابوبکر بھی وہاں موجود تھے اور صورتِ حال کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں خوف پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس فعل کی مذمت یا اس کی یاداش میں عذاب کے بارے میں کوئی آیت نازل ہو جائے۔ لہٰذا انہوں نے عمر کو ڈانٹتے ہوئے کہا: ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ مَا تَرَىٰ بِوَجْهِ رَسُولِ اللّٰهِ یعنی تمہارا سوگ منایا جائے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ غصے اور کوفت کے مارے رسول اللہ کے چہرے کا رنگ کیسا ہو گیا ہے؟

یہ سن کر عمر نے سر اٹھایا اور رسول اکرمؐ کی جانب دیکھا۔ آنحضرتؐ کے چہرۂ مبارک پر خفگی کے آثار دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو گئے اور کہا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ یعنی میں خدا اور اس کے رسولؐ کے غضب سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: اے ابن خطاب! کیا تمہیں اپنے دین کے بارے میں کوئی شک و شبہ یا کوئی الجھن ہے؟

اس کے بعد فرمایا: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ جِئْتُکُمْ بِھَا بَیْضَآءَ نَقِیَّةً! لَا تَسْاَلُوْھُمْ عَنْ شَیْءٍ فَاِنَّھُمْ لَنْ یَّھْدُوْکُمْ وَقَدْ ضَلُّوْا... فَاِنَّہٗ لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ مَا حَلَّ لَہٗ اِلَّا اَنْ یَّتَّبِعَنِیْ۔

یعنی میں اس کی قسم کھاتا ہوں جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے کہ میں ایک پاک اور واضح شریعت لایا ہوں۔ پھر فرمایا: اہل کتاب سے کسی چیز کے بارے میں سوال نہ کرو (اپنے دین کے مسائل ان سے نہ پوچھو) وہ ہرگز تمہاری ہدایت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ گمراہ ہیں۔ اگر موسیٰؑ زندہ ہوتے اور تمہارے درمیان رہ رہے ہوتے تو ان کے لیے جائز نہ ہوتا بجز اس کے کہ میری متابعت کریں۔[1]

اس حدیث سے جو مختلف طریقوں سے معتبر کتابوں میں نقل کی گئی ہے ہمیں کیا پتا چلتا ہے؟ کیا اس کا مطلب اس کے علاوہ کچھ ہے کہ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خلیفۂ ثانی تورات سے دلبستگی رکھتے تھے اور اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لہٰذا یہ بات بے وقوع نہیں کہ اپنی بلا شرکت غیرے حکومت کے زمانے میں انہوں نے یہودی علماء اور تورات کی تعلیمات کی جانب توجہ دی۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ حقیقت کعب الاحبار کی شان بڑھانے اور اسے اسلامی معاشرے میں متعارف کرانے کی وجوہ میں سے ایک اہم وجہ ہے۔ تاہم بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اس معاملے میں کئی دیگر وجوہات بھی کارفرما رہی ہیں۔

ان میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ رسول اکرمؐ کے بعد جو لوگ برسر اقتدار آئے وہ

---

[1] سنن دارمی جلد ۱ صفحہ ۱۱۵ مطبوعہ دمشق۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۳۸۷ اور ۴۷۰

مبدا و معاد جیسے مسائل کو سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے تھے اور جو بزرگوار ان مسائل سے آگاہ تھے یعنی باب مدینۂ علم نبی امیرالمومنین علیہ السلام وہ معاشرے سے دور رہ کر کھجور کے درختوں کی کاشت اور دیکھ بھال کرنے پر مجبور تھے۔ اس مسئلے کا حل یہ تھا کہ تمیم داری اور کعب الاحبار جیسے لوگوں کو جن کے دماغ اور روحیں نصرانیت اور یہودیت سے سیراب تھیں اور جو کم از کم اپنی تحریف شدہ اور خرافات پر مبنی معلومات کے ذریعے علم و دانش کے طلبگاروں کے سوالوں کے جواب دے سکتے تھے اور جنہیں آگے بڑھانے سے خلافت کی طاقت کو بھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا تھا معاشرے سے روشناس کرایا جائے اور لوگ انہیں نظام حکومت کے ارکان میں سے ایک رکن کے طور پر قبول کریں۔

جو تاریخی واقعہ ہم نیچے نقل کر رہے ہیں وہ ہمارے قول کا ثبوت ہے:

ایک شخص کا نام صبیغ تمیمی تھا۔ اجناد مسلمین میں (یعنی صوبوں کے مراکز میں جہاں ساتھ ہی ساتھ اسلامی لشکر کی چھاؤنیاں تھیں) چل کھڑا ہوا۔ وہ دروازے پر جاتا اور سوال کرتا۔ اس کے سوالات قرآن مجید کے بارے میں تھے۔ یہ شخص شام، اسکندریہ اور کوفہ میں گھومتا پھرا اور مسلمانوں کو تلاش کرتا رہا جو مدینہ میں سکونت پذیر رہے تھے اور رسول اکرمؐ کی زیارت سے شرفیاب ہوئے تھے تاکہ اپنے سوالات کا جواب حاصل کر سکے۔

صبیغ نے رسول اکرمؐ کی زیارت نہیں کی تھی اور آپ کے ارشادات اپنے کانوں سے نہیں سنے تھے۔ اب وہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کی تفسیر سننے کے لیے شہر بہ شہر گھومتا حتیٰ کہ مصر جا پہنچا۔ مصر کے حاکم عمرو بن عاص کو اس کی داستان سے آگاہ کیا گیا۔ عمرو بن عاص نے اسے اسلام کے پایۂ تخت یعنی مدینہ بھیج دیا اور خلیفہ عمر کو ایک خط لکھا جس میں سارا قصہ بیان کر دیا۔ صبیغ مدینہ پہنچا۔ عمرو بن عاص کا قاصد بھی خط لیکر خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور خط انہیں پہنچایا۔ خلیفہ نے خط پڑھنے کے بعد قاصد سے پوچھا: وہ آدمی کہاں ہیں؟ قاصد نے جواب دیا وہ کجاوہ میں ہے۔ خلیفہ نے کہا: اگر وہ چلا گیا ہوگا تو میں اس کی وجہ سے تمہیں کڑی سزا دوں گا۔ ایک اور روایت کے مطابق ایک آدمی خلیفہ کے پاس آیا اور اسے اطلاع دی کہ میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی ہے جو قرآن کے مشکل نکات کے بارے میں پوچھ رہا تھا خلیفہ عمر نے کہا: بار الٰہا! تو مجھے اس پر مسلط کر۔

بہرصورت صبیغ تمیمی خلیفہ کے پاس آیا۔ جب وہ خلیفہ کے روبرو ہوا تو قرآن مجید اس کے ہاتھ میں تھا۔ جب اس شخص نے مسلمانوں کے خلیفہ کو دیکھا اور لازمی طور پر اسے اسلامی علوم کا مرکز سمجھا تو جو مسائل پیدا ہوئے تھے ان کی جانب توجہ دیے بغیر سوال کیا:

اے امیرالمومنین! وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا کیا ہے؟

خلیفہ عمر نے پوچھا: تم کون ہو؟

اس شخص نے جواب دیا: میں خدا کا بندہ صبیغ ہوں۔ خلیفہ نے کہا: میں بھی خدا کا بندہ عمر ہوں۔ پھر انہوں نے اپنی آستینیں چڑھا لیں اور اس شخص کو کھجور کے خوشے کی چھڑیوں سے پیٹنا شروع کر دیا جو ان کے (یعنی خلیفہ کے) حکم سے لائی گئی تھیں اور اس کے سر پر اتنی ضربیں لگائیں کہ وہ خون آلود ہو گیا یا ایک اور روایت کے مطابق اس کی پیٹھ پر اتنی تازہ چھڑیاں ماریں کہ جگہ جگہ سے کھال ادھڑ گئی۔ پھر انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ زخمی اور خون آلود شخص آزاد ہو گیا اور اس کے زخم بھرنے میں ایک عرصہ لگا۔ پھر خلیفہ عمر نے اسے دوبارہ اپنے پاس بلایا اور ایک مرتبہ پھر وہی عمل دہرایا گیا۔ جب اسے تیسری مرتبہ خلیفہ کے پاس لایا گیا تاکہ ایک بار پھر اسے تنبیہہ کی جائے تو اس نے کہا: اگر آپ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں تو ایک دفعہ مار ڈالیں اور اس تکلیف سے میری جان چھڑائیں اور اگر آپ میرا علاج کرنا چاہتے ہیں تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں شفایاب ہو چکا ہوں اور آئندہ ایسی باتیں نہیں کروں گا۔

خلیفہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو ایک ایسے اونٹ پر سوار کیا جائے جس پر کجاوہ نہ ہو بلکہ ایک ایسا تختہ کسا ہوا ہو کہ جس پر پوشش نہ ہو اور پھر اسے جلاوطن کر کے ابوموسیٰ اشعری کے پاس بصرہ بھیج دیا جائے' اور حاکم بصرا ابوموسیٰ اشعری کے نام ایک فرمان میں خلیفہ نے لکھا کہ اس شخص کے ساتھ کسی کا گفتگو کرنا یا مل بیٹھنا ممنوع ہے۔ علاوہ ازیں اسکا سالانہ وظیفہ جو سب مسلمانوں کو ملتا تھا بند کر دیا گیا۔

ابوعثمان نہدی کہتا ہے: جب کبھی یہ شخص ہمارے پاس آتا تھا ہم اگر سو آدمی بھی ہوتے تھے تو اٹھ کھڑے ہوتے اور خلیفہ عمر کے فرمان سے ڈرتے ہوئے بھاگ نکلتے تھے۔

آخرکار اس شخص کے لیے زندگی گزارنا محال ہو گیا۔ مجبوراً وہ ایک دن ابو موسیٰ کے پاس آیا اور اس کا دامن پکڑ لیا۔ ابو موسیٰ نے خلیفہ کو لکھا کہ اس شخص نے توبہ کر لی ہے اور اب سدھر گیا ہے .....

خلیفہ نے جواب میں لکھا: پس اب تم لوگوں کو اجازت دیدو کہ اس کے ساتھ نشست و برخاست کریں۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ شخص اپنی قوم کے سربرآوردہ اشخاص میں سے تھا لیکن اس کے بعد ذلیل ہو گیا اور اس کی عزت اور اعتبار جاتا رہا۔ [۱]

جو واقعہ اوپر بیان کیا گیا ہے عین اس کے بالمقابل ایک اور واقعہ تاریخ اسلام میں موجود ہے۔ اس واقعہ کا تعلق امام علیؑ کے دورِ حکومت سے ہے۔ ایک دن امام علیؑ منبر پر تشریف لے گئے اور خطبے کے دوران فرمایا: سَلُوْنِیْ ، فَوَاللّٰہِ لَا تَسْاَلُوْنِیْ عَنْ شَیْءٍ یَکُوْنُ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ اِلَّا حَدَّثْتُکُمْ بِہٖ ، وَسَلُوْنِیْ عَنْ کِتَابِ اللّٰہِ فَوَاللّٰہِ مَا مِنْ اٰیَۃٍ .....

یعنی مجھ سے سوال کرو اور خدا کی قسم تم مجھ سے روزِ قیامت تک رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں نہیں پوچھو گے۔ مگر یہ کہ میں تمہیں بتاؤں گا اور تم خدا کی کتاب قرآن کے بارے میں مجھ سے سوال کرو اور میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کوئی آیت نہیں مگر یہ کہ میں جانتا ہوں کہ وہ رات میں اتری یا دن میں اور پہاڑ پر نازل ہوئی یا صحرا میں .....

راوی کہتا ہے: ابن الکوا ر میرے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھ کر کہا: یا امیر المومنین! ذاریات کیا ہیں؟ یہ شخص یعنی ابن الکوار خوارج کا ایک سردار تھا اور امیر المومنین علیہ السلام کے دشمنوں میں سے تھا۔ ابن عباس جو اس اجتماع میں موجود تھے کہتے ہیں: ابن الکوا وہی سوال پوچھنا چاہتا تھا جو صبیغ نے خلیفہ عمر سے پوچھا تھا۔ یہ سوال پوچھ کر وہ امام امیر المومنینؑ کو ذلیل کرنا چاہتا تھا۔

---

[۱] سنن دارمی، دو حدیثیں جلد ۱ صفحہ ۵۴۔ ۵۵۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۲۳۲۔ اتقان جلد ۲ صفحہ ۴۔ تفسیر قرطبی جلد ۱۸ صفحہ ۲۹ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۸۷ھ۔ تاریخ ابن عساکر، مخطوط جلد ۸ ق ۱ صفحہ ۱۱۷۔ ۱۱۸

حضرت امامؑ نے فرمایا: وائے ہو تم پر۔ تمہیں چاہیے کہ سمجھنے کے لیے سوال کرو نہ کہ دوسروں کو ایذا دینے اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لیے۔ پھر فرمایا:
الذاریات وہ ہوائیں ہیں جو گندم اور جَو کی کٹائی کے وقت چلتی ہیں۔
اس کے فوراً بعد ابن الکوا نے پوچھا: "الجاریات یسرا" کیا ہیں؟
امامؑ نے فرمایا: کشتیاں ہیں جو پانی پر چلتی ہیں۔ پھر اس نے پوچھا: "المقسمات امراً" کیا ہیں؟ حضرت نے فرمایا: فرشتے ہیں۔[1]

جب صورت یہ ہو کہ امیر المومنین علی علیہ السلام جو قرآن کی ہر چیز سے واقف ہیں معاشرے میں موجود نہ ہوں اور مدینہ سے باہر کھیتوں میں کھجور کے درخت لگا رہے ہوں، نخلستان آباد کر رہے ہوں اور کاریزیں کھود رہے ہوں اور صحابۂ رسولؐ کو بھی احادیث نقل کرنے سے منع کر دیا گیا ہو اور حکام اور برسر اقتدار اشخاص ضروری علمی استعداد نہ رکھتے ہوں تو لازمی طور پر کعب الاحبار، تمیم داری اور وہب بن منبہ جیسے اشخاص میدان میں آجائیں گے۔

خلاصہ

وہ عوامل جو یہودی اور عیسائی علماء کے اسلامی معاشرے میں نفوذ کا سبب اور شہرت پانے کا موجب بنے ان میں سے چند یہ تھے:

۱۔ جن لوگوں کے ذریعے کعب وغیرہ اسلامی معاشرے میں متعارف ہوئے وہ اہل کتاب کی تعلیمات سے واقف تھے اور انہیں عزت اور استعجاب کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اصولاً اسلام سے پہلے کے عرب یہودیوں اور عیسائیوں کا احترام کرتے تھے اور انہیں اہل کتاب اور تہذیب و تمدن کے مالک سمجھتے تھے۔ کچھ حکام میں اس ذہنیت کا باقی رہنا اس امر کا موجب ہوا کہ تمیم داری اور کعب الاحبار بھی اسی طرح عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور علماء اور مرجع علمی کی حیثیت

---

[1] فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۱ مطبوعہ مصر۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۲۳۱ مطبوعہ مصر۔ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۳۵۷ حدیث ۱۸۵۸ مطبوعہ ہند۔ تفسیر طبری جلد ۲۶ صفحہ ۱۱۹ مطبوعہ مصر، آفسٹ بیروت

سے مورد توجہ قرار پائیں۔

۲۔ برسرِاقتدار حضرات کے نزدیک یہ بات قرین مصلحت تھی کہ رسول اکرمؐ کے علوم جو صحابہ کے پاس موجود تھے یا امام امیرالمومنین علیہ السلام جو ان تمام علوم کے حامل تھے لوگوں کے سامنے نہ آنے پائیں تاکہ ان حضرات کی حکومت جاری رہ سکے۔

۳۔ اربابِ اقتدار خود کوئی علمی مہارت اور استعداد نہیں رکھتے تھے اور رسول اکرمؐ کے بعد جو مسائل پیدا ہوئے ان کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔

انہیں وجوہ کی بنا پر کعب، تمیم داری اور وہب جیسے لوگ اسلامی معاشرے میں در آئے اور ان لوگوں کی موجودگی اسلام میں تحریف کا ایک بہت بڑا عامل بن گئی۔ وہ صحیح اسلام کے مختلف پہلوؤں میں تخریب کرنے اور جعلی روایات سے بھرا ہوا دین پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ لوگ جو تاریخ اسلام میں "قصاصین" کے نام سے مشہور ہیں اسلام کی تحریف کے خفیہ عوامل کا ایک حصہ ہیں۔ میں نے تاریخ، تفسیر، سیرت اور علم الرجال کی دسیوں کتابوں کا مطالعہ کر کے ان لوگوں کی کارگزاریوں اور تخریبی عمل کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت حاصل کی ہے۔

کعب الاحبار کی کارگزاریوں کے نتیجے میں اسلام کی تاریخ اور تفسیر خاص طور سے آلودہ ہو گئی ہے۔ اس نے تمام چیزوں مثلاً خدا، قیامت، حشر، نشر، آسمان کی تخلیق، زمین، عرش، کعبہ، بیت المقدس، سلیمانؑ، داؤدؑ، دوسرے نبیوں اور فرشتوں کے بارے میں باتیں کی ہیں اور اس کی ان باتوں نے اسلام کی تفسیر، تاریخ اور سیرت کی شکل اختیار کر لی ہے۔

لہٰذا جو اسلام رسول اکرمؐ کے اہل بیتؑ کی معرفت نہ آیا ہو وہ انہیں جیسے مآخذ اور مصادر سے حاصل کیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بھی یہودی، عیسائی اور کمیونسٹ اسلام شناس اسلام کو پہچاننے اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے انہیں منابع سے رجوع کرتے ہیں۔ اگر ان کی کوئی غرض نہ ہو — جیسی کہ بالخصوص پہلے رہی ہے — تو وہ ان منابع کے ذریعے اسلام تک نہیں پہنچ سکتے بلکہ ٹھیک اسلام کی ضد یعنی اس اسلام تک پہنچتے ہیں جس میں تحریف اور تخریب کاری کی گئی ہے۔ اگر

ہم اپنے دین، قانون اور راہ ورسم کو پہچاننے کے لیے یورپی اور مغربی منابع سے رجوع کریں تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ کیا ہم کعب اور اسی جیسے دوسرے اشخاص کے افکار اور اقوال کے ثمرات کے علاوہ کوئی چیز پا سکیں گے؟ قطعاً نہیں۔ البتہ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں ہدایت کے دو بنیادی اور اصلی منابع یعنی قرآن اور اہلبیتؑ سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ
وَالصَّلٰوةُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ

سترھواں درس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِیۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَہَالَۃٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِیۡنَ۔

پچھلے درسوں میں ہم نے مکتب خلفاء میں نفوذ کر جانے والے خطرناک عناصر کی ایک صنف کی روایات کی چھان بین کی تھی۔ یہ روایات ان یہودیوں اور عیسائیوں نے نقل کی تھیں جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے اور جنہوں نے اس مکتب میں کافی اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔

اب ہم ان عناصر کی ایک اور صنف کی روایات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ وہ روایات ہیں جن کے ذریعے زنادقہ نے مکتب خلفاء کی کتابوں میں تخریب کاری کی ہے۔ ان عناصر کا ایک واضح نمونہ عبدالکریم ابن ابی العوجا ہے۔ اس نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ جو مذاکرات کیے اور آپ نے اس کے ساتھ جو رویہ اختیار فرمایا[1] اس کی بدولت آپ کے اصحاب اور شیعہ اسے اچھی طرح پہچان گئے اور وہ ان کی نظروں میں ذلیل ہو گیا۔ یوں مکتب اہلبیتؑ میں اس کی تخریب کاری کا راستا مسدود ہو گیا۔ تاہم اس نے اپنے قتل کے حکم پر عملدرآمد کے موقع پر جو کچھ کہا اس سے مکتب خلفاء کے ساتھ اس صنف کے رابطے کا پتا چلتا ہے۔ اس نے خلیفہ کی جانب سے مقرر کیے گئے کوفہ کے والی کو مخاطب کر کے کہا:

---

[1] دیکھیے اصول کافی جلد۱ صفحہ ۷۴-۸۷، توحید صدوق صفحہ ۲۹۶-۲۹۷، احتجاج طبرسی جلد۲ صفحہ ۷۴-۷۶ مطبوعہ نجف اور بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۴۶۔

"تم مجھے قتل کر رہے ہو جب کہ میں نے تمہاری کتب حدیث میں چار ہزار احادیث داخل کر دی ہیں"

بلاشبہ یہ بات مکتب خلفاء کے نمائندے سے کہی گئی جس نے اسے قتل کرا دیا اور یوں اسلام کو اس کے ہاتھوں جو نقصان پہنچ رہا تھا اس کا خاتمہ کر دیا۔[1]

ہم نے خمسون و مائۃ صحابی مختلق نامی کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس زندیق کے چند شر کائے کار اور مکتب خلفاء میں ان کی تخریب کاریوں کی جانب اشارہ کیا ہے۔

زنادقہ کا ایک اور خطرناک نمونہ سیف بن عمر تمیمی[2] ہے۔ اس شخص سے مکتب خلفاء کی کتابوں میں عہد نبویؐ کے آخری ایام سقیفہ بنی ساعدہ، اہل ردّہ کی جنگوں اور فارس و روم میں اسلامی فتوحات سے لیکر جنگ جمل تک کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں۔

اس کی تخریب کاری کی صورت یہ تھی کہ اس نے سیکڑوں صحابیوں، تابعیوں، راویوں، جنگوں، علاقوں، قصیدوں، شعروں، خطوں اور روایتوں کے بارے ایسے جھوٹ گھڑے جن کا قطعاً کوئی وجود نہ تھا۔ انشاء اللہ ہم آئندہ مباحث میں سیف کی ان من گھڑت چیزوں کے اعداد و شمار بالترتیب بیان کریں گے۔ پہلے ہم سیف کے ساختہ ان لوگوں کے اعداد و شمار آج تک تاریخ اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں، مندرجہ ذیل پانچ حصوں میں بیان کرتے ہیں۔

پہلا حصہ : سیف کے ساختہ صحابہ

دوسرا حصہ : سیف کے ساختہ عبداللہ ابن سبا اور سبائی

---

[1] تاریخ طبری مطبوعہ یورپ جلد ۳ صفحہ ۳۷۶ - البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۳ - تاریخ ابن اثیر جلد ۵ صفحہ ۳۸ - ۳۹ حوادث سال ۱۵۵ھ - مطبوعہ دار الکتب۔

[2] اس کی تخریب کاریوں کا تذکرہ اس کے دوسرے ہم خیال لوگوں کی تخریب کاریوں کے ذکر کے ساتھ کتاب خمسون و مائۃ صحابی مختلق کی پہلی جلد میں ملاحظہ فرمائیں۔

تیسرا حصہ : سیف کے ساختہ راویان حدیث
چوتھا حصہ : سیف کے ساختہ کافروں کے سپہ سالار
پانچواں حصہ : سیف کے ساختہ شعراء

پہلا حصہ

سیف کے گھڑے ہوئے صحابہ کے اعداد و شمار

اس حصے میں ہم پہلے ان صحابیوں کی فہرست بیان کرتے ہیں جو سیف نے خود اپنے قبیلے یعنی "قبیلہ تمیم" میں سے گھڑے ہیں :

۱۔ قعقاع بن عمرو بن تمیمی۔ سیف نے اس نام کا تعارف امام علی بن ابی طالبؑ کے ایک شیعہ کی حیثیت سے کرایا ہے۔
۲۔ عاصم بن عمرو بن مالک تمیمی
۳۔ اسود بن قطبہ ابن مالک تمیمی
۴۔ ابو مفزّر تمیمی
۵۔ نافع بن اسود تمیمی
۶۔ عفیف بن منذر تمیمی
۷۔ زیاد بن حنظلہ تمیمی، شیعہ علیؑ کی حیثیت سے
۸۔ حرملہ بن مریطہ تمیمی
۹۔ حرملہ بن سلمیٰ تمیمی
۱۰۔ ربیع بن مَطَر ابن ثلج تمیمی
۱۱۔ ربعی بن اِفکل تمیمی
۱۲۔ اُطّ بن ابی اُطّ تمیمی
۱۳۔ سعیر بن خفاف تمیمی
۱۴۔ عوف بن علاء حُبشمی تمیمی
۱۵۔ اوس بن حذیمہ تمیمی

۱۶- سہل بن منجاب تمیمی

۱۷- وکیع بن مالک تمیمی

۱۸- حصین بن نیار حنظلی تمیمی

۱۹- حارث بن ابی ہالہ تمیمی ۔ رسول اکرمؐ کے سوتیلے بیٹے اور ام المومنین بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے کی حیثیت سے

۲۰- زبیر بن ابی ہالہ تمیمی ۔ رسول اکرمؐ کے سوتیلے بیٹے اور ام المومنین بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے کی حیثیت سے

۲۱- طاہر بن ابی ہالہ تمیمی ۔ رسول اکرمؐ کے سوتیلے بیٹے اور ام المومنین بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے کی حیثیت سے

۲۲- زر بن عبداللہ فقیمی تمیمی

۲۳- اسود بن ربیعہ تمیمی

یہاں تک سیف نے ان تمام صحابہ کو اپنے قبیلے یعنی قبیلہ بنی تمیم سے بڑی شان و شوکت کے ساتھ گھڑا ہے ۔ باقیماندہ اشخاص کو جن کے نام نمبر ۲۴ سے شروع ہوتے ہیں اس نے عرب کے دوسرے قبیلوں میں سے گھڑا ہے اور عموماً انھیں مذکورہ بالا تمیمیوں سے گھٹیا اور ان کے پیروکار قرار دیا ہے ان لوگوں کے نام حسب ذیل ہیں :

ا- عرب قبائل کے نمائندے جو رسول اکرمؐ کی زیارت کے لیے آئے :

۲۴- عبدہ بن قرط تمیمی عنبری

۲۵- عبداللہ بن حکیم ضبّی

۲۶- حارث بن حکیم ضبّی

۲۷- حلیس بن زید ضبّی

۲۸- حرُ بن خضرامہ یا حارث ابن خضرامہ ضبّی

۲۹- کبیس بن ہوذہ سدوسی

ب - والی اور اہلکار جو رسول اکرمؐ یا خلیفہ ابو بکر کی جانب سے مقرر کیے گئے:

۳۰- عبید بن صخر ابن لوذان انصاری
۳۱- صخر بن لوذان انصاری
۳۲- عکاشہ بن ثور غوثی
۳۳- عبداللہ بن ثور غوثی
۳۴- عبیداللہ بن ثور غوثی

ج - قاصد جو رسول اکرمؐ یا خلیفہ ابو بکر کی جانب سے بھیجے گئے:

۳۵- وبرۃ بن یحنس خزاعی
۳۶- اقرع بن عبداللہ حمیری
۳۷- جریر بن عبداللہ حمیری
۳۸- صلصل بن شرجیل
۳۹- عمرو بن محجوب عامری
۴۰- عمرو بن الخفاجی العامری
۴۱-
۴۲- عوف ورکانی
۴۳- عویف زرقانی
۴۴- قحیف بن سلیک حالکی
۴۵- عمرو بن حکم قضاعی قینی
۴۶- امرؤ القیس - بنی عبداللہ سے

د- ہم نام صحابہ

سیف نے اپنے من گھڑت صحابہ کے وہی نام رکھے جو رسول اکرمؐ کے بعض حقیقی صحابہ کے تھے - ہم نے انہیں "ہم نام صحابہ" کا نام دیا ہے:

۴۷- خزیمہ بن ثابت انصاری (خزیمۃ بن ثابت انصاری ذوالشہادتین کے علاوہ)

۴۸۔ سماک بن خرشہ انصاری (ابودجانہ انصاری کے علاوہ)

ﮦ۔ انصار سے تعلق رکھنے والے صحابہ:

۴۹۔ ابو بصیرہ انصاری

۵۰۔ حاجب بن زید یا یزید انصاری اشہلی

۵۱۔ سہل بن مالک (کعب بن مالک انصاری خزرجی)

۵۲۔ اسعد بن یَرْبُوع انصاری

و۔ مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے صحابہ:

۵۳۔ عبداللہ بن حفص بن غانم قرشی

۵۴۔ ابو حبیش بن ذو لحیہ عامری کلابی

۵۵۔ حارث بن مرہ جہنی

۵۶۔ سلمیٰ بنت حُذیفہ فزاریہ

ز۔ لشکر کے سپہ سالار

۵۷۔ بِشر بن عبداللہ ہلالی۔

۵۸۔ مالک بن ربیعہ بن خالد تیمی ـــــ تیم رباب

۵۹۔ ہزہاز بن عمرو عجلی

۶۰۔ حمیضہ بن نعمان بن حمیضہ بارقی

۶۱۔ جابر اسدی

۶۲۔ عثمان بن ربیعہ ثقفی

۶۳۔ سواد بن مالک تمیمی

۶۴۔ عمرو بن وبرہ (قبیلہ قضاعہ کا سردار)

۶۵۔ حمال بن مالک ابن حمال اسدی

۶۶۔ ربیل بن عمرو بن ربیعہ اسدی ربیال بن عمرو

۶۷۔ طلیحہ بن بلال قُرشی عبدری

۶۸۔ خلید بن مُنذر بن ساوی عبدی تمیمی

ح۔ وہ صحابہ جنہوں نے رسول اکرمؐ کا زمانہ دیکھا:

۶۹۔ قرقرہ یا قرفہ بن زاہر تیمی وائلی

۷۰۔ ابو نباتہ، نائل بن جعشم تمیمی اعرجی

۷۱۔ سعید بن عمیلہ فزاری

ط۔ عراق کی فوج کے سردار

۷۲۔ قریب بن ظفر عبدی

۷۳۔ عامر بن عبدالاسد یا عبدالاسود

۷۴۔ حارث بن یزید عامری ۔ دوسرا

ی۔ جنگ ردّہ میں اسلامی فوج کے سردار

۷۵۔ عبدالرحمٰن بن ابی عاص ثقفی

۷۶۔ عبیدہ بن سعد

۷۷۔ خصفہ تیمی

۷۸۔ یزید بن قینان (بنی مالک بن سعد زید مناۃ بن تمیم میں سے)

۷۹۔ صیحان بن صوحان عبدی

۸۰۔ عباد الناجی

۸۱۔ شخریت (بنی شخرات میں سے)

ک۔ خلیفہ ابوبکر سے ملاقات کرنے یا انہیں خط لکھنے کی بنا پر صحابی ہونا:

۸۲۔ شریک فزاری (وہ اپنی قوم کی جانب سے خلیفہ ابوبکر کے پاس گیا تھا)

۸۳۔ مسور بن عمرو (کیونکہ اس نے خلیفہ ابوبکر کے امان نامے پر گواہی دی تھی)

۸۴۔ معاویہ عذری (کیونکہ خلیفہ ابوبکر نے اسے خط لکھا تھا)

۸۵۔ ذویناق یا شہر ذویناق (کیونکہ خلیفہ ابوبکر نے اسے خط لکھا تھا)

۸۶۔ معاویہ ثقفی (سیف نے کہا ہے کہ وہ ہم پیمانوں میں سے تھا اور ایک فوج کا سردار تھا)

ل۔ خلیفہ ابوبکر کے زمانے میں جنگوں میں شریک ہونے کی بنا پر صحابی:

۸۷۔ سیف بن نعمان لخمی

۸۸- ثمامہ بن اوس بن ثابت بن لام طائی
۸۹- مہلهل بن زید خیل طائی
۹۰- عزال ہمدانی
۹۱- معاویہ بن انس سلمی
۹۲- جراد بن مالک بن نویرہ تمیمی

م - خلیفہ ابوبکر کی فوج کو کمک پہنچانے کی بنا پر صحابی ہونا

۹۳- عبد بن غوث حمیری

اب تک سیف کے ان ۹۳ من گھڑت صحابیوں کے حالات کا کتاب "خمسون و مائۃ صحابی مختلق" کے عربی متن کی دو جلدوں میں جائزہ لیا گیا ہے اور سیف نے ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو افسانے گھڑے ہیں وہ ان کے حالات زندگی میں درج کیے گئے ہیں اور ان کی چھان بین کی گئی ہے۔ کتاب کا عربی متن بغداد اور بیروت سے شائع ہو چکا ہے اور اس کے فارسی ترجمے کی پہلی اور دوسری جلد چھپ چکی ہے جبکہ تیسری جلد زیر طبع ہے۔ سیف کے من گھڑت صحابیوں کے بارے میں بحث یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جاری ہے اور ان میں سے جو لوگ باقی رہ گئے ہیں ان کا ذکر انشاء اللہ بعد میں شائع ہونے والی جلدوں میں کیا جائے گا۔

ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے سے یہ نام رسول اکرمؐ کے صحابیوں کے طور پر خلفاء کے مکتب کی معتبر کتابوں مثلاً تاریخ طبری، ابن اثیر اور تاریخ ابن خلدون میں اور صحابہ کے حالاتِ زندگی پر لکھی گئی کتابوں مثلاً استیعاب اور اصابہ میں نقل ہوتے رہے ہیں اور پھر فتوحات، معجزات، شعر اور حدیث کے بارے میں لکھی گئی خلفاء کے مکتب کی اہم کتابوں میں بھی درج کیے گئے ہیں۔ حالانکہ یہ سب کے سب اسی افترا پرداز زندیق سیف بن عمر کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ اس قول کا ثبوت کتاب "خمسون و مائۃ صحابی مختلق"[۱]

---

[۱] بیروت میں ۱۴۰۸ھ میں طبع شدہ عربی کتاب کی دوسری جلد کے صفحات ۲۷-۱۴۱ اور فارسی میں ترجمہ شدہ جلدوں میں تمہیدی بحثیں ملاحظہ کریں۔

کی دوسری جلد کی فصل "بحوث تمہیدیہ" میں پیش کیا گیا ہے اوران میں سے ہر ایک کے حالات کتاب کے متن میں الگ الگ درج کیے گئے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ بحث اور تحقیق کے شائقین پہلے اس بحث کو پڑھیں اور پھران میں سے ہر ایک کے حالات کا الگ الگ مطالعہ کریں۔

دوسرا حصہ
عبداللہ بن سبا اور سبائی

سوائے ان لوگوں کے جنہیں سیف نے صحابہ کہا ہے اور تذکرہ نویسوں نے انہیں صحابہ شمار کرتے ہوئے ان کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اس نے اور بھی بہت سی شخصیتیں گھڑی ہیں اوران کے متعلق داستانیں تحریر کی ہیں جن کا ایک نمونہ عبداللہ بن سبا اور سبائیوں کا افسانہ ہے۔ سیف نے اپنے دماغ سے عبداللہ ابن سبا کا نام گھڑا اور اسے جعلی پیرو بھی مہیا کیے اور پھراس کے اور اس کے پیروؤں کے بارے میں داستانیں تیار کیں جو ایک ہزار سے سے زیادہ عرصے سے اسلام کی علمی اور تاریخی کتابوں میں ثبت ہیں۔ سیف نے عبداللہ بن سبا اور سبائیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :

"عبداللہ بن سبا" یمن کا یہودی تھا۔ وہ خلیفہ عثمان کے زمانے میں بظاہر مسلمان ہوگیا لیکن خفیہ طور پر مسلمانوں کے خلاف مکر و فریب سے کام لیتا رہا۔ وہ بڑے بڑے اسلامی مراکز مثلاً شام، کوفہ، بصرہ اور مصر میں گھومتا پھرا اور تبلیغ کرتا رہا کہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح پیغمبر اسلامؐ بھی رجعت کریں گے اور جیسا کہ ہر پیغمبر کا ایک وصی ہوتا ہے اسی طرح حضرت محمدؐ کے وصی علیؑ ہیں اور جس طرح آنحضرتؐ خاتم انبیاء ہیں اسی طرح علیؑ خاتم اوصیاء ہیں۔ نیز یہ کہ عثمان نے اس وصی کا حق چھین لیا ہے اور اس پر ظلم کیا ہے لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ اٹھ کھڑے ہوں اور حق اس کے حقدار کو واپس دلائیں۔

سیف کہتا ہے : ان تبلیغات کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ مسلمان بھڑک اُٹھے اور مدینہ کی جانب

روانہ ہوگئے، انہوں نے خلیفہ عثمان کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور بالآخر وہ قتل ہوگئے۔ یہ سب کام سبائیوں کی زیرِ نگرانی اور رہنمائی میں انجام پایا۔

پھر وہ کہتا ہے: جب مسلمانوں نے حضرت علیؑ کی بیعت کر لی تو طلحہ و زبیر خلیفہ عثمان کے خون کا بدلہ لینے کے لیے بصرہ پہنچے۔ بصرہ پہنچ کر جنگ جمل کے دوران فوج کے ان سرداروں اور حضرت علیؑ میں مفاہمت ہونے لگی۔ سبائیوں نے جب یہ محسوس کیا کہ مفاہمت کے نتیجے میں وہ پکڑے جائیں گے تو انہوں نے راتوں رات فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو جنگ کی آگ بھڑکا دی جائے۔ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے طے کیا کہ ان کا ایک دستہ خفیہ طور پر حضرت علیؑ کے لشکر میں اور دوسرا طلحہ و زبیر کے لشکر میں بھیجا جائے جو رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان دونوں لشکروں کو ایک دوسرے سے لڑا دے اور یہ راز کسی پر کھلنے نہ پائے۔

سیف کہتا ہے: انہوں نے یہ خطرناک منصوبہ کامیابی سے انجام دیا اور وہ یوں کہ آدھی رات کے وقت جب دونوں لشکر صلح کی امید میں سو رہے تھے لشکر علیؑ میں شامل ان کے (یعنی سبائیوں کے) کچھ آدمیوں نے دوسرے لشکر پہ تیر پھینکے۔ دوسری طرف سے انہی کے کچھ آدمیوں نے جو دوسرے لشکر میں شامل ہوگئے تھے، حضرت علیؑ کے لشکر پر تیر برسائے۔ نتیجے کے طور پر دونوں لشکر ایک دوسرے سے خوفزدہ اور بدگمان ہوگئے اور یوں جنگ کا آغاز ہوگیا۔

پھر کہتا ہے: بصرہ کی جنگ نے جو جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے یہ تشکل اختیار کی، حالانکہ دونوں لشکروں کے سردار جنگ نہیں چاہتے تھے اور انہیں پتا ہی نہ چلا کہ دراصل جنگ برپا کرنے والا کون ہے۔

یہ افسانہ طراز سبائیوں کا قصہ یہیں ختم کر دیتا ہے اور پھر یہ نہیں بتاتا کہ ان کا حشر کیا ہوا۔

اس دروغ گو سیف نے جن بزرگوں کو سبائی قرار دیا، ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

۱ــــ ابوذر غفاری

ب ــــ عمار ابن یاسر

ج ــــ عبدالرحمٰن ابن عدیس

د ــــ صعصعہ ابن صوحان

ھ ــــ محمد ابن ابی حذیفہ

و ــــ محمد ابن ابی بکر (خلیفہ اول کے فرزند)

ز ــــ مالک اشتر

سیف کا خیال ہے کہ ان بزرگوں نے وصایت علیؑ کا عقیدہ " ابن سبا" سے لیا اور یہ کہ ان بزرگوں نے حضرت علیؑ سے یہ پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ ابن سبا ہمیں آپ کی وصایت کی جو دعوت دیتا ہے وہ دعوت صحیح ہے یا باطل ہے۔ سیف کہتا ہے: اس زمانے کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مسلمانوں نے ابن سبا کی دعوت قبول کی اور یوں اسلام میں سبائی فرقہ[1] وجود میں آ گیا۔

اس افسانے کی چھان بین کے سلسلے میں کتاب "عبداللہ ابن سبا و اساطیر آخری" کی دو جلدیں عربی زبان میں چھپ چکی ہیں اور اس کا ترجمہ فارسی، اردو، ترکی اور انگریزی زبانوں میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

تاہم ابھی بحث ختم نہیں ہوئی۔ مناسب ہوگا کہ قارئین جو یہ تحریر پڑھ رہے ہیں وہ "عبداللہ ابن سبا" کی جلدیں پڑھیں جن میں اس جھوٹے قصے کی چھان بین کی گئی ہے تاکہ وہ ابن سبا اور سبائیوں کے من گھڑت قصہ کی حقیقت کا ادراک کرسکیں۔

تیسرا حصہ

سیف کے گھڑے ہوئے راویانِ حدیث

کئی ایک صحابیوں کے نام گھڑنے اور سبائی فرقہ بنانے کے علاوہ جسکی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے۔ سیف نے ایک اور گروہ بھی وضع کرکے اپنی جعلی حدیثیں ان

---

[1] حالانکہ خود حضرت علی علیہ السلام کو اس بات کا کوئی علم نہیں تھا۔

لوگوں کے حوالے سے نقل کیں۔

ہم یہاں سیف کے اختراعی ان راویان حدیث کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جن کا تعارف ہم نے بعض کتابوں میں کرایا ہے۔ ہر راوی کے نام کے سامنے اس کتاب کے صفحہ کا نمبر دیا گیا ہے جس میں اس راوی کے بارے میں چھان بین کی گئی ہے۔

	سیف کے اختراعی راویان حدیث	ان روایتوں کی تعداد جو تاریخ طبری میں اس راوی سے روایت کی گئی ہے	جہاں کتاب عبداللہ بن سبا میں اس راوی کا ذکر کیا گیا ہے	جہاں کتاب ڈیڑھ سو ساختہ صحابی مختلق میں اس راوی کا ذکر کیا گیا ہے
۱	محمد بن عبداللہ بن سواد بن نویرہ	۲۱۶	۱/۱۷۶	۱/۹۳
۲	سہل بن یوسف	۱۲۶	-	۱/۹۵
۳	مہلب بن عقبہ	۶۷ یا ۷۶	۱/۲۰۳	۱/۹۳
۴	زیاد بن سرجس احمری	۵۳	۱/۱۹۵	۱/۱۴۱
۵	نضر بن سری	۲۹ یا ۲۴	۱/۲۰۳	۱/۱۳۹، ۲/۲۱۱-۲۱۴
۶	رُفیل اور اس کا بیٹا	۲۰	-	۱/۱۳۹
۷	مُستنیر بن یزید	۱۸	۲/۱۶۶	۱/۱۴۱
۸	ابن رفیل اپنے باپ سے	۱۸	۱/۲۰۳	-
۹	سعید بن ثابت بن جذع انصاری	۱۶	۲/۱۹	-
۱۰	عبداللہ بن سعید بن ثابت	۱۶	-	۱/۹۵، ۲/۱۸۷
۱۱	مبشر بن فضیل	۱۵	۱/۷۸	۱/۲۲۰
۱۲	خالد "مجہول"	۱۶	-	۱/۱۲۲
۱۳	عبادہ "مجہول"	۱۶	-	۱/۱۲۲
۱۴	رفیل	۱۴	۱/۲۰۳	-
۱۵	غصن بن قاسم	۱۳	۱/۲۰۱	۱/۱۰۷

۱۶	ابو عثمان "مجہول"	۱۰	-	۱۸۱/۱
۱۷	صعب بن عطیہ	۹	۱۵۵/۱	۹۳/۱
۱۸	ابو عثمان یزید بن اسید غسانی	۹	-	۱۰۴/۱
۱۹	عبد بن رحمان بن سیاہ احمری	۷	۴۱۷/۲	۹۸/۱
۲۰	عبیداللہ بن محفز	۶	-	۱۱۸/۱، ۱۴۱/۱، ۲۹۷/۲
۲۱	عروہ بن غزیہ دثینی	۶	۱۶۵/۲	۱۳۱/۲، ۱۴۷/۱
۲۲	عمرو بن ریان	۶	۱۸۷/۱	۱۳۲/۱
۲۳	ابو سفیان طلحہ بن عبدالرحمان	۵	۱۷۷/۱	-
۲۴	ابو زہرا قشیری	۵	۱۵۴/۲	-
۲۵	بنو کنانہ کا ایک آدمی	۵	-	-
۲۶	طاہر بن ابو ہالہ		-	۳۷۷/۱
۲۷	ضحاک بن قیس	۴	-	۲۳۲/۱
۲۸	حلحال بن زری	۴	-	۲۳۲/۱
۲۹	انس بن حلیس	۴	-	۲۳۰/۱
۳۰	مخلد بن قیس	۴	۲۶۸/۱	-
۳۱	سماک بن فلان ہجیمی	۳	-	۲۳۰/۱
۳۲	قیس بن زید نخعی	۳	-	۱۶۲/۱
۳۳	قیس بن یزید	۳	-	۲۳۲/۱
۳۴	ظفر بن دہی	۳	-	۱۱۱/۱
۳۵	مقطع بن ہیثم بن فجیع			
۳۶	عامر بکائی	۳	-	۹۸/۱
۳۷	ابن محراق	۳	۱۹۵/۱	۱۳۲/۱

۳۸	بحر بن فرات عجلی	۲	۴۱۷/۲	۲۲۱/۱
۳۹	بنو کنانہ کا ایک آدمی	۲	-	-
۴۰	عثمان بن سوید	۲	۱۵۵/۱	۳۴۵/۱
۴۱	حنظلہ بن زیاد	۲	-	۹۸/۱
۴۲	حماد بن فلاح برجمی	۲	-	۱۴۱/۱
۴۳	جریر ابن اشرس	۲	-	۱۶۲/۱
۴۴	بکر بن وائل کا ایک آدمی	۲	-	۱۹۱/۱
۴۵	عامر	۲	-	۲۳۴/۱
۴۶	خزیمہ بن شجرہ عقفانی	۲	-	۳۴۵/۱
۴۷	عبید بن صخر بن لوذان	۲	-	۳۷۸/۱
۴۸	ورقاء بن عبدالرحمن حنظلی	۲	-	۴۰۱/۱
۴۹	حبیب بن ربیعہ اسدی	۱	۲۶/۱	-
۵۰	عمار بن فلان اسدی	۲	۴۱۷/۲	-
۵۱	ابن شہید	۱		
۵۲	عمرو بن تمام	۱	۷۸/۱	-
۵۳	طیّ کا ایک آدمی	۱	-	۱۳۲/۱
۵۴	عبداللہ ابن مسلم عکلی	۱	-	۱۹۷/۱
۵۵	کرب بن ابو کرب عکلی	۱	-	۱۹۷/۱
۵۶	ابن ابو مکنف	۱	-	۹۳/۱
۵۷	بکر بن وائل	۱	-	۱۱۸/۱
۵۸	حمید بن ابو شجار	۱	-	۱۳۲/۱
۵۹	عصمت وائلی	۱	-	۱۳۲/۱
۶۰	عصمت بن حارث	۱	-	۱۳۲/۱
۶۱	ایک آدمی	۱	-	۱۳۹/۱

۶۲	بنی حارث کا ایک آدمی	۱	-	۱/۱۳۹
۶۳	بطان بن بشر	۱	-	۱/۱۴۱
۶۴	عروۃ بن ولید	۱	-	۱/۱۴۸
۶۵	ابو معبد عبسی	۱	-	۱/۱۴۸
۶۶	ابن صعصعہ یا صعصعہ	۱	-	۱/۱۶۲
۶۷	مخلد بن کثیر	۱	-	۱/۱۶۲
۶۸	فلان ہجیمی	۱	-	۱/۲۳۰
۶۹	کلیب بن حلحال	۱	-	۱/۲۳۲
۷۰	جریر بن یزید جعفی	۱	-	۱/۲۳۲
۷۱	حریث بن معلی	۱	-	۲/۱۶۸
۷۲	بنت کیسان ضبیہ		-	۲/۲۹۸

چوتھا حصہ

لشکر کفار کے سردار

سیف نے سیرت اور تاریخ اسلام کے لیے راوی اور صحابہ و تابعین پر مشتمل سبائی فرقہ گھڑنے کے علاوہ صدر اسلام کی لڑائیوں کے سلسلے میں ایرانی لشکر کے سرداروں کے نام بھی گھڑے ہیں، مثلاً:

سیف کے من گھڑت کافروں کے لشکر کے سردار	جہاں کتاب "خمسون ومائۃ صحابی مختلق" میں ان کا ذکر آیا ہے
۱۔ قارن ابن قریانس	۱/ ۱۴۹ اور ۲/۱۰۲
۲ فیرزان	۱/۱۳۷
۳ انوشجان (قباد)	۱/۲۷۶
۴ روزبہ اور روزمہر	۲/۱۰۸

پانچواں حصہ
سیف کے ساختہ شعراء

سیف نے ہر صنف میں بڑے بڑے نام وضع کیے ہیں ۔ یہ نام اور ان سے منسوب قصے مکتب خلفاء کی معتبر کتابوں میں درج کیے گئے ہیں ۔ ان میں کئی ایک شاعر اور ان سے منسوب قصیدے شامل ہیں، مثلاً مندرجہ ذیل شعراء :

	سیف کے من گھڑت اختراعی شعراء	جہاں کتاب عبداللہ بن سبا میں ان کا ذکر آیا ہے	جہاں کتاب خمسون و مائۃ صحابی مختلق میں ان کا ذکر آیا ہے
۱	عربی کا شاعر خطّیل	۲ / ۴۷	-
۲	عربی کا شاعر عمرو بن قاسم	-	۱ / ۳۳۰

چھٹا حصہ
سیف کے من گھڑت تابعین

سیف نے کئی ایک تابعین کے نام بھی گھڑے مثلاً :

	سیف کے گھڑے ہوئے تابعین	جہاں کتاب عبداللہ بن سبا میں ان کا ذکر آیا ہے	جہاں کتاب خمسون و مائۃ صحابی مختلق میں ان کا ذکر آیا ہے
۱	اسلامی لشکر کے سردار مثنیٰ کا بھائی معن شیبانی	۲ / ۱۰۲	-
۲	ابو لیلیٰ فدکی	-	۱ / ۱۵۸
۳	اُطّ بن سوید	-	۱ / ۲۳۱
۴	مکنف نامی غلام	-	۱ / ۳۹۳
۵	ہرمزان کا بیٹا قماذبان	۱ / ۲۹۴	۲ / ۹۶

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے سیف نے ان ناموں میں سے ہر ایک کے لیے ایک حیرت انگیز داستان بھی گھڑی ہے ۔ یہ داستانیں بھی خلفاء کے مکتب کی معتبر کتابوں

ہیں پھیلی ہوئی ہیں

یہاں تک ہم نے "موضوعات سیف" کے اعداد و شمار دیے ہیں۔ خدا نے مہلت دی تو آئندہ بحث میں ہم اس کی دوسری تخریب کاریوں کی تفصیل دیں گے۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ۔

●●●●●

اٹھارھواں درس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِیۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَهَالَۃٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِیۡنَ.

(سورۃ حجرات - آیت ۶)

پچھلی بحث میں ہم نے مختصراً ان اشخاص کے اعداد و شمار پر نگاہ ڈالی ہے جو سیف بن زندیق نے گھڑے اور جن کے نام اور قصے خلفار کے مکتب کی معتبر کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں موجودہ بحث میں ہم انشاء اللہ سیف کی دوسری تخریب کاریوں کا ذکر کریں گے جنہیں ہم نے مندرجہ ذیل چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلا حصہ: وہ سرزمینیں اور شہر جو سیف کے ذہن کی اپیج ہیں۔

دوسرا حصہ: تاریخی دن جن میں سے ہر ایک کے لیے اس نے الگ داستان اور افسانہ اختراع کیا ہے۔ انہیں عربی زبان میں "یوم" کہتے ہیں اور اس کی جمع "ایام" ہے۔

تیسرا حصہ: فرضی جنگیں جنہیں اس نے جنگ ہائے ردہ وفتوح کا نام دیا ہے۔

چوتھا حصہ: معجزہ سے ملتی جلتی خرافات جو سیف نے وضع کی ہیں۔

پانچواں حصہ: تاریخی واقعات کے رونما ہونے کے زمانے کے بارے میں سیف کی تحریفیں

چھٹا حصہ: اسلام کے مشہور اشخاص کے ناموں میں تحریف

پہلا حصہ

سرزمینیں اور شہر جو سیف نے گھڑے ہیں

سیف نے حجاز، عراق، ایران اور یمن میں مندرجہ ذیل سرزمینیں گھڑی ہیں :

ا۔ حجاز کی موضوع سرزمینیں

	سرزمین کا نام	جہاں کتاب عبداللہ بن سبا میں اس کا ذکر ہے	جہاں کتاب خمسون ومائۃ صحابی مختلق میں اس کا ذکر ہے
۱	ابرق الربذہ	۲/۱۶، ۴۷، ۴۸	-
۲	اخابث	۲/۷۵	-
۳	اعلاب	۲/۳۵	-
۴	قردودہ	۱/۳۰۳	-

ب۔ عراق کی موضوع سرزمینیں

	سرزمین کا نام	جہاں کتاب عبداللہ بن سبا میں اس کا ذکر ہے	جہاں کتاب خمسون ومائۃ صحابی مختلق میں اس کا ذکر ہے
۱	منیشیا ایک بڑا شہر جس کی سیف کے قول کے مطابق خالد نے اینٹ سے اینٹ بجادی۔	۲/۹۸	-
۲	انطاق	-	۱/۳۲۶
۳	بشر	-	۱/۲۲۲
۴	الثنی	-	۱/۱۴۹، ۲۲۲
۵	حصید	-	۱/۱۵۴
۶	زمیل	۲/۱۰۸	-
۷	دومۃ الجندل	-	۱/۲۷۶
۸	قدیس	۱/۳۰۳	-
۹	مرج مسلح	۲/۲۸۹	-
۱۰	مصیتخ بھراء	-	۱/۱۱۸

	سرزمین کا نام	جہاں کتاب عبداللہ بن سبا میں اس کا ذکر ہے	جہاں کتاب خمسون ومائۃ صحابی مختلق میں اس کا ذکر ہے
۱۱	مصیّخ بنی برشار	-	۱/ ۱۱۸
۱۲	مقر	-	۱/ ۲۷۶
۱۳	نہرا ُطّ	-	۱/ ۳۳۱
۱۴	ولجہ	۱/ ۲۲۷	-
۱۵	ہوافی	-	۱/ ۲۸۹

ج۔ شام کی موضوع سرزمین

۱	حمقتان	۱/ ۳۰۳، ۲/ ۱۹	-

د۔ ایران کی موضوع سرزمینیں

۱	افریدون	-	۱/ ۲۳۱
۲	ثنیۃ الرکاب	۱/ ۲۲۷	-
۳	ثنیہ عسل	-	۱/ ۲۱۹
۴	دُلُوث	-	۱/ ۳۵۱
۵	طاووس	-	۱/ ۳۰۲
۶	دایہ خرد	-	۱/ ۲۱۹

ھ۔ یمن کی موضوع سرزمینیں

۱	جیروت	۲/ ۴۱۸	۲/ ۳۵۶
۲	ریاضہ	۲/ ۴۱۸	۲/ ۳۵۶
۳	ذات خیم	۲/ ۴۱۸	۲/ ۳۵۶
۴	صبرات	۲/ ۴۱۸	۲/ ۳۵۶
۵	ظہر الشحر	۲/ ۴۱۸	۲/ ۳۵۶
۶	اللبان	۲/ ۴۱۸	۲/ ۳۵۶
۷	مُرّ	۲/ ۴۱۸	۲/ ۳۵۶
۸	ینعب	۲/ ۴۱۸	۲/ ۳۵۶

یہ جگہیں اور گزشتہ باب کی سب باتیں سیف کی اختراع ہیں اور انہیں گھڑ کر اس نے ہر ایک کے بارے میں ایک داستان بھی بیان کی ہے اور ان کا ذکر خلفاء کے مکتب کی علم جغرافیہ پر لکھی گئی اہم کتابوں مثلاً معجم البلدان، مراصد الاطلاع اور الروض المعطار میں آیا ہے۔ ان کتابوں کے مؤلفین نے سیف کی من گھڑت روایتوں کو سند قرار دے کر ان شہروں، سرزمینوں اور دریاؤں کو اسلامی مقامات میں شمار کیا ہے اور ان کی تفصیل بھی سیف کی روایتوں سے لی ہے۔

دوسرا حصہ

سیف کے گھڑے ہوئے ایام

عربی زبان میں تاریخ کے اہم واقعات کو "یوم" کہا جاتا ہے خواہ اس واقعہ کے رونما ہونے کی مدت ایک دن سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو مثلاً جنگِ "جمل" اور جنگ "صفین" کے لیے "یوم الجمل" اور "یوم صفین" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

سیف نے بہت سے تاریخی دن گھڑے اور وہ مکتب خلفاء کی معتبر کتب تاریخ میں ثبت ہو گئے مثلاً "یوم الاباقر"۔ "یوم ارماث"۔ "یوم اغواث"۔ "یوم عماس"۔ "یوم الجراثیم" اور "یوم النخیب"

ذیل میں ہم سیف کے من گھڑت ایک "یوم" کا افسانہ بیان کرتے ہیں:

سیف اپنی ایک موضوع روایت میں کہتا ہے کہ جنگ قادسیہ میں سعد بن ابی وقاص نے عاصم بن عمرو کو اشیائے خورد و نوش حاصل کرنے کے لیے دریائے فرات کی نچلی جانب بھیجا۔ عاصم سبزہ زاروں اور کھیتوں میں ان چیزوں کی تلاش میں لگ گیا۔ ایک جنگل کے پاس اس کی ملاقات ایک آدمی سے ہو گئی اور اس نے اس سے درخواست کی کہ وہ اسے اس جگہ لے چلے جہاں گائیں اور بھیڑ بکریاں مل سکتی ہوں۔ اس آدمی نے قسم کھا کر کہا کہ مجھے کسی ایسی جگہ کا علم نہیں، حالانکہ وہ ایک گلے کا گڈریا تھا جسے اس نے اسی جنگل میں پناہ دے رکھی تھی۔ اسی اثنا میں اچانک ایک گائے نے سبزہ زار سے آواز دی اور فصیح عربی میں کہا: "کَذَبَ وَاللّٰہِ، وَھَا نَحْنُ اُولَآءِ" (خدا کی قسم یہ شخص جھوٹ بولا،

رہا ہے اور اس وقت ہم یہاں موجود ہیں)۔ یہ سن کر عاصم جنگل میں داخل ہوا اور گایوں کے لشکر کو ہانک کر لشکر گاہ میں لے آیا۔ سعد بن ابی وقاص نے وہ لشکر والوں میں تقسیم کر دیں اور وہ دن تاریخ میں "یوم الاباقر" (گایوں کا دن) کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ہم نے سیف کے چند من گھڑت "ایام" کی چھان بین کتاب "عبداللہ بن سبا" کی پہلی جلد کے صفحات ۲۹۵ - ۳۱۰ پر کی ہے [۱] اور بالخصوص "گایوں کے دن" کے افسانے کو جو سیف نے اپنے خود ساختہ راویوں سے روایت کیا ہے اور جس کا ہیرو عاصم بھی سیف کے اختراعی صحابیوں میں سے ہے کتاب خمسون و مائۃ صحابی مختلق کے پہلے جزو میں جانچ پڑتال کے بعد بے بنیاد ثابت کیا ہے۔

تیسرا حصہ

رِدّہ اور فتوح کے سلسلے میں سیف کی وضع کردہ جنگیں

سیف نے جو چیزیں گھڑی ہیں ان کا ایک اور نمونہ وہ جنگیں ہیں جو اسلام میں ہرگز وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ سیف نے یہ جنگیں گھڑ کر جنہیں اس نے صحابہ ارتداد اور فتوحات اسلامی کا نام دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ سیف نے بے رحمانہ قتل و غارت کے سیکڑوں افسانے گھڑ کر ان دشمنان اسلام کے ہاتھوں میں ایک کاری ہتھیار دیدیا ہے جو اپنا تعارف اسلام شناس اور مستشرق کے نام سے کراتے ہیں۔

ان افسانوں کا ایک مختصر جائزہ

سیف اس مقصد کے تحت کہ لوگوں کے ذہن اس کی ارتداد کی جنگوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد کے حالات یوں بیان کرتا ہے:

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد حجاز کی سرزمین کفر و الحاد کی جانب مائل ہو گئی اور قبیلۂ قریش اور قبیلۂ ثقیف کے علاوہ باقی تمام قبیلوں کے عوام اور خواص سب کے سب مرتد

---

[۱] مطبوعہ سپہر، تہران ۱۴۰۱ھ

ہوگئے اور دین اسلام سے منہ موڑ بیٹھے۔ پھر سیف نے مرتدوں کے خلاف لڑی گئی جنگیں گھڑیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔۔۔۔۔۔ جنگ ابرق
۲۔۔۔۔۔۔ ذی القصہ پر لشکر کشی
۳۔۔۔۔۔۔ قبیلۂ طے کا ارتداد اور ان کے خلاف جنگ
۴۔۔۔۔۔۔ ام زمل کا ارتداد اور ان کے خلاف جنگ
۵۔۔۔۔۔۔ مہرہ کے لوگوں کا ارتداد
۶۔۔۔۔۔۔ عمان کے لوگوں کا ارتداد
۷۔۔۔۔۔۔ یمن کی پہلی جنگ
۸۔۔۔۔۔۔ ارتداد اور جنگ اخابث
۹۔۔۔۔۔۔ یمن کی دوسری جنگ

جو جنگیں اس نے فتوحات اسلامی کے نام سے گھڑیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔۔۔۔۔۔ جنگ سلاسل یا فتح ابلہ
۲۔۔۔۔۔۔ جنگ مدار
۳۔۔۔۔۔۔ فتح ولجہ
۴۔۔۔۔۔۔ فتح الیس
۵۔۔۔۔۔۔ فتح امغیشیا
۶۔۔۔۔۔۔ فتح فرات بادقلی
۷۔۔۔۔۔۔ جنگ حصید
۸۔۔۔۔۔۔ جنگ مصیخ
۹۔۔۔۔۔۔ جنگ ثنی
۱۰۔۔۔۔۔۔ جنگ زمیل
۱۱۔۔۔۔۔۔ جنگ فراض

جنگ اخابث کا جائزہ

اب ہم سیف کی گھڑی ہوئی جنگوں میں سے ایک جنگ، جنگ اخابث پر نظر ڈالتے ہیں:
سیف اپنی روایتوں میں جو اس نے ارتداد کی جنگوں کے بارے میں گھڑی ہیں یوں کہتا ہے: "رسول اکرمؐ کے بعد سب سے پہلی شورش تہامہ کے مقام پر سرزمین اعلاب کے دو مرتد قبائل عک اور اشعر یین کے درمیان ہوئی۔ وہ لوگ ساحل سمندر پر واقع ایک راستے پر جمع ہو گئے۔ طاہر بن ابی ہالہ نے جو رسول اکرمؐ کے زمانے سے اس علاقے کا حاکم تھا ان قبائل کے مسلمانوں کو ساتھ لیکر جو مرتد نہیں ہوئے تھے، اس قبیلے کے مرتدوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے بڑی سخت جنگ کے بعد مرتدین کو شکست دیدی۔ طاہر نے اس قدر خونریزی کی کہ راستے لاشوں سے پاٹ دیے جس سے علاقے میں ہر طرف تعفن پھیل گیا۔ اسی بنا پر اس علاقے کا نام اخابث[1] پڑ گیا۔ طاہر نے اس بارے میں ایک شعر کہا اور خلیفہ ابوبکر کو خط لکھا۔"

سیف نے طاہر بن ابی ہالہ کو ام المومنین بی بی خدیجہؓ کا فرزند رسول اکرمؐ کا سوتیلا بیٹا اور آنحضرتؐ کی جانب سے مقرر کردہ والی کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ لہٰذا تذکرہ نویسوں نے طاہر کو صحابہ میں شمار کر کے اس کی سوانح عمری تحریر کی ہے۔ جغرافیہ نویسوں نے بھی "اخابث" کی سرزمین کو اسلامی علاقہ قرار دیا ہے اور اسلام کے مورخین مثلاً طبری اور ابن اثیر نے اخابث کی سرزمین کو اہل ردّہ سے ہونیوالی جنگوں میں شامل کیا ہے۔ حالانکہ طاہر بن ابی ہالہ رسول اکرمؐ کا سوتیلا بیٹا تھا، نہ اخابث نام کی کوئی سرزمین تھی نہ اخابث نام کی کوئی جنگ ہوئی تھی اور نہ ہی ان راویوں کا کوئی وجود تھا جن سے سیف نے طاہر کے بارے میں روایت نقل کی ہے۔

ارتداد کے سلسلے میں سیف کی گھڑی ہوئی جنگوں کا ایک نمونہ تھا۔ اب ہم ذیل میں اس کی ان من گھڑت جنگوں کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں جسے اس نے فتوحات اسلامی کا نام دیا ہے۔

---

[1] اَخَابِث خَبِیث کی جمع ہے جس کے معنی پلید کے ہیں۔

الیس کی جنگ اور امغیشیا کی فتح

سیف روایت کرتا ہے کہ خالد نے جنگ الیس میں خدا سے عہد کیا تھا کہ اگر میں نے فتح پائی تو دشمن کے ایک فرد کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا اور ان کے خون کی ندی بہا دونگا۔ جب اس نے فتح پائی تو اس نے حکم دیا کہ دشمن کو قتل نہ کیا جائے۔ اسلامی لشکری کفار کے سپاہیوں کا ایک ایک دستہ قیدی بنا کر لانے لگے۔ خالد نے حکم دیا کہ اس سرزمین پر بہنے والی نہر کے پانی کا رخ تبدیل کر دیا جائے اور اسلامی لشکر کے ایک گروہ کو اس کام پر مامور کیا کہ قیدیوں کو سوکھی نہر کے کنارے پر لیجا کر ان کی گردنیں اڑا دیں تاکہ ان کے خون سے ان کی نہر جاری ہو جائے اور خالد کی قسم پوری ہو جائے۔ یہ کام تین دن تک جاری رہا مسلمان سپاہی دور اور نزدیک ہر طرف سے لوگوں کو پکڑ کر لاتے تھے اور نہر کے کنارے کھڑا کر کے ان کی گردنیں اڑا دیتے تھے لیکن خون کی نہر جاری نہ ہوئی۔ قعقاع اور اس کے ساتھیوں نے کہا: اے خالد! اگر تم تمام انسانوں کی گردنیں اڑا دو تب بھی خون کی نہر جاری نہ ہوگی بلکہ خون خشک ہو جائے گا اس لیے نہر کے پانی کا رخ بحال کر دو تاکہ خون کی نہر جاری ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور تین دن تک نہر میں خون والا پانی بہتا رہا اور خالد کی قسم پوری ہو گئی۔

اس معرکے میں قتل ہونیوالے اکثر لوگوں کا تعلق امغیشیا سے تھا۔ ان کے مقتولین کی تعداد ستر ہزار تک جا پہنچی۔ پھر خالد نے امغیشیا پر حملہ کیا اور حکم دیا کہ اس شہر کو تباہ کر دیا جائے۔ سیف کہتا ہے کہ امغیشیا ایک بہت بڑا شہر تھا اور الیس اور حیرہ اس کے اطراف میں واقع تھے۔

سیف نے یہ افسانہ گھڑا اور یہ مکتب خلفاء کی اہم کتب تاریخ میں شامل ہو گیا ورنہ نہ تو امغیشیا نام کا کوئی شہر تھا، نہ قعقاع نام کا کوئی صحابی تھا، نہ خالد نے کوئی قسم کھائی تھی اور نہ ہی اسلامی سپاہ نے یوں بے رحمی سے قتل عام کیا تھا۔ [1]

---

[1] کتاب "عبداللہ بن سبا" کے فارسی متن کے دوسرے جزو کے صفحات ۹۶ - ۹۹ پر فصل "فتح الیس و امغیشیا" ملاحظہ فرمائیں۔

سیف نے یہ سب باتیں گھڑ کر اسلام کو بربریت اور قتل عام کا دین ظاہر کیا ہے۔ ان جنگوں میں ہونیوالی جو خونریزیاں اس نے گھڑی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جنگ الثنی میں ۳۰ ہزار آدمی مارے گئے۔
۲۔ جنگ الیس میں ۷۰ ہزار آدمی مارے گئے۔
۳۔ جنگ فراض میں ایک لاکھ آدمی مارے گئے (یہ ان کے علاوہ ہیں جو ڈوب کر مرے)
۴۔ جنگ فحل میں ۷۰ ہزار آدمی مارے گئے۔
۵۔ جنگ جلولا میں ایک لاکھ آدمی مارے گئے۔
۶۔ جنگ نہاوند میں ایک لاکھ آدمی مارے گئے۔

اسی طرح اس نے دوسری جنگوں میں کام آنے والوں کی تعداد لاکھوں بتائی ہے۔ یہ سب اعداد و شمار سیف کے شیطانی دماغ کی اختراع ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

ہم نے مختصر طور پر ان جنگوں کے کچھ جانچ پڑتال کتاب "عبداللہ بن سبا" (فارسی) کی دوسری جلد کے پہلے حصے میں کی ہے۔

چوتھا حصہ

معجزے سے ملتی جلتی خرافات جو سیف نے گھڑیں

سیف کی اختراعات کی ایک اور قسم وہ خرافات ہیں جو اس نے معجزات اور کرامات کے نام سے گھڑی ہیں اور وہ اسلام کی تاریخ میں داخل ہو گئی ہیں مثلاً وہ فتح شوشش کے سلسلے میں کہتا ہے:

مسلمانوں نے شہر شوش کا محاصرہ کر لیا اور کئی بار جنگ کی لیکن ہر مرتبہ اہل شوش نے انہیں زک پہنچائی۔ آخر کار راہب اور پادری شہر کے برج پر آئے اور انہوں نے باواز بلند کہا: اے اہل عرب! ہمیں علماء سے خبر ملی ہے کہ شوش کا شہر دجال کے ہاتھوں فتح ہو گا۔ مسلمانوں نے اس بات کی کوئی پروا نہ کی اور ایک بار پھر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ راہبوں نے انھیں مخاطب کر کے پھر وہی بات دہرائی۔ آخر کار

صاف بن صیاد[1] مسلمانوں کی صفوں میں سے آگے اور شہر کے دروازے تک جا پہنچا۔ اس نے دروازے کو ٹھوکر ماری اور گالی کے طور پر کہا: "انفتح بظار" یعنی اے دروازے کے قفل اور زنجیرو جو مادہ حیوانوں کی آلتِ جنسی کی مانند ہو کھل جاؤ۔ اچانک دروازے کی زنجیریں ایک دوسری سے الگ ہو گئیں۔ قفل ٹوٹ کر زمین پر گر پڑے۔ دروازہ کھل گیا اور اہالیان شہر نے ہتھیار ڈال دیے۔[2]

"حمص" کی فتح کے موقع پر مسلمانوں کی تکبیر سے شہر کے درو دیوار ٹوٹ پھوٹ کو گر پڑے اور یوں مسلمانوں نے شہر فتح کر لیا۔

"حیرہ" کی فتح کے موقع پر خالد نے مہلک زہر پی لیا لیکن اس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ایران کے شہر "دارا لجبرد" کی فتح کے موقع پر خلیفہ عمر نے مسلمانوں کے سپہ سالار "ساریہ" کو مدینہ سے آواز دی:

"پہاڑ میں پناہ لو" ان لوگوں نے خلیفہ کی آواز سن لی اور پہاڑ میں پناہ لی اور یوں دشمن کے محاصرے سے بچ نکلے۔

جنگِ "قادسیہ" میں ایک گائے نے عربی زبان میں عاصم سے گفتگو کی۔ ان کے علاوہ اور بہت سے افسانے ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر "عبد اللہ بن سبا" (فارسی) کی دوسری جلد میں سیف کی خرافی داستانوں کے ذیل میں کیا گیا ہے۔

سیف نے ان داستانوں کے ذریعے اسلامی اعتقادات کو خرافات کے ساتھ گڈمڈ کر دیا۔

---

[1] خلفاء کے مکتب کی حدیث کی کتابوں میں صاف بن صیاد کو بطور رجال متعارف کرایا گیا ہے۔

[2] عبد اللہ بن سبا جلد ۲ صفحہ ۱۵۶

پانچواں حصہ

تاریخی واقعات کے وقوع پذیر ہونیکے وقت کے بارے میں سیف کی تحریف

سیف کی تخریب کاریوں کی ایک اور صورت یہ ہے کہ اس نے تاریخ اسلامی کے واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے وقت میں تحریف کردی ہے مثلاً:

ا: فتحِ "ابلہ" کا زمانہ خلیفہ عمر کا دور خلافت ہے لیکن سیف نے کہا ہے کہ یہ فتح خلیفہ ابوبکر کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔

ب: جنگِ "یرموک" ۱۵ھ میں ہوئی لیکن سیف کا کہنا ہے کہ یہ جنگ ۱۳ھ میں ہوئی ہے۔

ج: فتحِ جزیرہ کی تاریخ ۱۹ھ میں ہے لیکن بقول سیف ۱۷ھ ہے۔

د: جنگ خراسان ۲۳ھ میں ہوئی لیکن سیف نے اس کا سال ۱۸ھ بتایا ہے۔

ایسے ہی کئی اور واقعات ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کتاب "عبداللہ بن سبا" کی پہلی جلد کے صفحہ ۳۱۹ پر "بازیگری ہای سیف در زمان وقوع حوادث تاریخی" کے عنوان کے تحت کیا گیا ہے اور یہ تخریب کاری تاریخی واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے وقت کے بارے میں نوشت وخواند کی کسی غلطی کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ جان بوجھ کر تخریب کاری کے مقصد سے کی گئی ہے۔ مثلاً فتح ابلہ کے قصے میں نہ صرف یہ کہ اس واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے وقت میں تحریف کی گئی ہے بلکہ اصلی قصے میں بھی تحریف کی گئی ہے کیونکہ اس نے کہا ہے: "ابلہ میں مشرکین نے پانی کے پاس پڑاؤ ڈالا تھا اور خالد کا لشکر ایک ایسی جگہ اترا تھا جہاں پانی نہیں تھا تاہم خدا نے بادل بھیج دیا اور وہ خالد کے لشکر کی پشت پر برسا۔ فتح پانے کے بعد خالد نے غنائم جنگ کا خمس جس میں ایک ہاتھی بھی شامل تھا ایک خط کے ساتھ خلیفہ ابوبکر کے پاس مدینہ بھیج دیا۔ مدینہ کی عورتوں نے جب ہاتھی کو دیکھا تو حیران رہ گئیں اور کہنے لگیں: "کیا یہ بھی خدا کی کوئی مخلوق ہے؟"

سیف کی روایت کے برعکس، ابلہ خلیفہ عمر کے زمانے میں فتح ہوا اور لشکر کا امیر عتبہ بن غزوان تھا پس اس بارے میں سیف نے جو داستانیں بیان کی ہیں وہ سب جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

چھٹا حصہ

ناموں میں تحریف

ناموں میں جو تحریف کی گئی ہے اس کی چار قسمیں ہیں:

پہلی قسم:

سیف نے ناموں میں جو الٹ پھیر کیا ہے اس کی پہلی قسم یہ ہے کہ اس نے تاریخ اسلام کے مشہور لوگوں کے نام تبدیل کر دیے ہیں مثلاً

ا۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے قاتل عبدالرحمٰن ابن ملجم کا نام خالد بن ملجم میں تبدیل کر دیا ہے۔

ب۔ معاویہ بن ابوسفیان کا نام معاویہ بن رافع میں تبدیل کر دیا ہے۔

ج۔ عمرو بن عاص کا نام عمرو بن رفاعہ میں تبدیل کر دیا ہے۔

یہ تحریف بھی سہواً نہیں بلکہ عمداً کی گئی ہے کیونکہ معاویہ بن ابوسفیان اور عمرو بن عاص کے نام ایک حدیث میں آئے تھے اور رسول اکرمؐ نے ان دونوں پر لعنت بھیجی تھی۔ سیف نے اس حدیث میں معاویہ بن ابوسفیان اور عمرو بن عاص کو "معاویہ بن رافع" اور "عمرو بن رفاعہ" میں تبدیل کر دیا تاکہ آنحضرتؐ کی لعنت معاویہ بن ابوسفیان اور عمرو بن عاص کی بجائے معاویہ بن رافع اور عمرو بن رفاعہ کے شامل ہو کیونکہ ایسے آدمیوں کا تاریخ میں قطعاً کوئی وجود نہیں اور یہ دو نام سیف کی حدیثوں کے علاوہ اور کہیں نہیں آئے۔

دوسری قسم:

سیف کی اختراعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے بعض مشہور اسلامی شخصیتوں کی ہم نام فرضی شخصیتیں گھڑ ڈالیں مثلاً:

ا۔ خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین کے مماثل ایک اور خزیمہ بن ثابت کا نام گھڑ لیا۔

ب۔ سماک بن خرشہ المعروف بہ ابودجانہ کے مترادف ایک اور سماک بن خرشہ کا نام گھڑ لیا۔

ج۔ وبرہ بن یحنس کلبی کے مقابلے میں وبرہ بن یحنس خزاعی کا نام گھڑ لیا۔

ان ناموں میں سے ہر نام کے لیے اس نے ایک افسانہ تراشا ہے اور ہم نے ان افسانوں کی جانچ پڑتال کی ہے۔ [1]

تیسری قسم :

سیف نے جو تحریفیں کی ہیں ان کی ایک اور قسم یہ ہے کہ اس نے نام الٹا دیے ہیں۔ مثلاً باپ کو بیٹے کا اور بیٹے کو باپ کا نام دیدیا ہے جیسے کہ :

ا۔ عبدالمسیح بن عمرو کو عمرو بن عبدالمسیح میں تبدیل کر دیا ہے اور

ب۔ باذان بن شہر کو شہر بن باذان میں مبدل کر دیا ہے۔

چوتھی قسم :

بعض اوقات اس نے اسلام کی بعض معروف شخصیتوں کے بیٹوں، بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کے نام گھڑ لیے ہیں مثلاً :

ام المومنین بی بی خدیجہؓ کے تین بیٹوں کے مندرجہ ذیل نام گھڑ کر انہیں رسول اکرمؐ کے سوتیلے بیٹے بتایا ہے۔

۱ ـــــ طاہر بن ابی ہالہ

۲ ـــــ زبیر بن ابی ہالہ

۳ ـــــ حارث بن ابی ہالہ

جن کی شناخت اور تشخیص بجائے خود بہت مشکل تھی۔

اب تک ہم نے سیف کی قسم قسم کی تخریب کاریوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قسم کی تخریب کاری کی ایک جھلک تھی۔ آئندہ بحث میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ اس کم نصیب سیف کی روایتیں مکتب خلافت کی کتابوں میں کیسے در آئیں اور انکی تشہیر کیونکر ہوئی۔

---

[1] "عبداللہ بن سبا" جلد ۲ صفحہ ۲۰۳ - ۲۰۵ فارسی ترجمہ سے رجوع فرمائیں۔ نیز انکے بارے میں تفصیل "کتاب" "خمسون ومائۃ صحابی مختلق" جلد دوم میں دیکھیں۔

انیسواں درس

بسم اللہ الرحمن الرحیم
یا ایھا الذین امنوا ان جاءکم فاسق بنبا فتبینوا ان تصیبوا
قوما بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین۔ (سورہ حجرات۔ آیت ۶)

اس بحث کے پہلے حصے میں ہم مکتب خلافت کی ان اہم کتابوں کے نام گنوائیں گے جن میں اس زندیق کی روایات نے راہ پائی ہے اور دوسرے حصے میں ان روایات کے پھیلاؤ کی وجوہات کا پتا چلائیں گے۔

پہلا حصہ

وہ کتابیں جن میں سیف کی روایات آئی ہیں

سیف کی دروغ بافی اور افسانہ سازی کے مختلف نمونے ہم گزشتہ درس میں دیکھ ہی چکے ہیں لیکن مقام تاسف یہ ہے کہ اچھی شہرت نہ رکھنے کے باوجود سیف کی روایتیں مکتب خلافت کی کتابوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس مکتب کے جید علماء نے سیف کے افسانوں اور حدیثوں کو اس کی تمام ریزہ کاریوں کے ساتھ اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

ہم بحث کے اس حصے میں اس تلخ اور حیرت انگیز حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ان علماء کی فہرست پیش کر رہے ہیں جنہوں نے سیف سے احادیث نقل کی ہیں اور ان کتابوں کے نام بھی لکھ رہے ہیں جن میں یہ احادیث شامل کی گئی ہیں۔

ا۔ وہ علماء جنہوں نے رسول اکرمؐ کے صحابہ کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اور سیف سے اختراعی اصحاب کا ذکر بھی آنحضرتؐ کے حقیقی صحابہ کے طور پر کیا ہے انکے نام یہ ہیں:

	مؤلف	ہجری سن وفات	نام کتاب
۱	البغوی	۳۱۷	معجم الصحابۃ
۲	ابن قانع	۳۵۱	ایضاً
۳	ابن علی بن السکن	۳۵۳	حروف الصحابۃ
۴	ابن شاہین	۳۸۵	معجم الصحابۃ
۵	ابن مندہ	۳۹۵	اسماء الصحابۃ
۶	ابونعیم	۴۳۰	معرفۃ الصحابۃ
۷	ابن عبدالبر	۴۶۳	الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب
۸	عبدالرحمٰن بن مندہ	۴۷۰	التاریخ
۹	ابن فتحون	۵۱۹	التذییل علی الاستیعاب
۱۰	ابوموسیٰ	۵۸۱	التذییل علی اسماء الاصحاب
۱۱	ابن اثیر	۶۳۰	اسدالغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ
۱۲	الصاغانی	۶۵۰	درالصحابۃ فی بیان مواضع وفیات الصحابۃ
۱۳	الذہبی	۷۴۸	تجرید اسماء الصحابۃ
۱۴	ابن حجر	۸۵۲	الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ

ب۔ مندرجہ ذیل علماء نے حقیقی سپہ سالاروں اور فاتحوں کے ساتھ ساتھ سیف کے خیالی جنگجوؤں کے حالات زندگی بھی لکھے ہیں:

۱۵	ابوزکریا	۳۳۴	طبقات اہل موصل
۱۶	ابوالشیخ	۳۶۹	تاریخ اصبہان
۱۷	حمزۃ بن یوسف	۴۲۷	تاریخ جرجان
۱۸	ابونعیم	۴۳۰	تاریخ اصبہان

	مؤلف	ہجری سن وفات	نام کتاب
۱۹	ابوبکر خطیب	۴۶۳	تاریخ بغداد
۲۰	ابن عساکر	۵۷۱	تاریخ مدینۃ دمشق
۲۱	ابن بدران	۱۳۴۶	تہذیب تاریخ دمشق

ج۔ سیف کے وضعی شعراء کا تعارف مندرجہ ذیل کتاب میں کرایا گیا ہے:

۲۲	مرزبانی	۳۸۴	معجم الشعراء

د۔ جو کتابیں ناموں کے تلفظ میں غلطیاں دور کرنے کے لیے تالیف کی گئی ہیں ان میں سے جن جن میں سیف کے خیالی سورماؤں کے نام آئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۲۳	دارقطنی	۳۸۵	المختلف
۲۴	ابوبکر خطیب	۴۶۳	الموضح
۲۵	ابن ماکولا	۴۸۷	الاکمال
۲۶	رشاطی	۵۴۲	المؤتلف
۲۷	ابن الدباغ	۵۴۶	مشتبہ الاسماء

ہ۔ سیف کی بعض مخلوقات کا نسب نامہ جیسا کہ اس نے خود گھڑا ہے اور تصور کیا ہے مندرجہ ذیل کتابوں میں آیا ہے:

۲۸	ابن حزم	۴۵۶	الجمہرۃ فی النسب
۲۹	سمعانی	۵۶۲	الانساب
۳۰	مقدسی	۶۲۰	الاستبصار
۳۱	ابن اثیر	۶۳۰	اللباب

و۔ سیف کے خیالی اور من گھڑت راویوں میں سے بعض کے حالات زندگی مندرجہ ذیل کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں:

۳۲	رازی	۳۲۷	الجرح والتعدیل
۳۳	ذہبی	۷۴۸	میزان الاعتدال
۳۴	ابن حجر	۸۵۲	لسان المیزان

ز۔ سیف نے خیالی مقامات کی شرح ان کتابوں میں دی گئی ہے :

	مؤلف	ہجری سن وفات	نام کتاب
۳۵	ابن الفقیہہ	۳۴۰	البلدان
۳۶	حموی	۶۲۶	معجم البلدان
۳۷	حموی	۶۲۶	المشترک لفظاً والمفترق صقعاً
۳۸	عبدالمومن	۷۳۹	مراصد الاطلاع
۳۹	حمیری [1]	۹۰۰	الروض المعطار

ح۔ سیف کی کتاب فتوح وردّہ جو سراسر افسانہ ہے مندرجہ ذیل اہم اور معتبر تاریخی کتب سے منعکس ہوئی ہے :

۴۰	ابن خیاط	۲۴۰	تاریخ خلیفہ
۴۱	بلاذری	۲۷۹	فتوح البلدان
۴۲	طبری	۳۱۰	تاریخ طبری
۴۳	ابن اثیر	۶۳۰	تاریخ ابن اثیر
۴۴	ذہبی	۷۴۸	تاریخ الاسلام
۴۵	ابن کثیر	۷۷۱	تاریخ ابن کثیر
۴۶	ابن خلدون	۸۰۸	تاریخ ابن خلدون
۴۷	سیوطی	۹۱۱	تاریخ الخلفاء

ط۔ سیف کے وہ افسانے جو خاص مواقع سے وابستہ ہیں ان کتابوں میں داخل ہوگئے ہیں جو بالخصوص اس موضوع پر تالیف کی گئی ہیں مثلاً :

۴۸	ابن کلبی	۲۰۴	انساب الخیل

---

[1] مؤلف نے مدینہ منورہ کے کتابخانہ شیخ الاسلام میں موجود اس کتاب کے قلمی نسخے سے استفادہ کیا ہے اور حال ہی میں یہ کتاب چھپ گئی ہے۔

	مؤلف	ہجری سن وفات	نام کتاب
۴۹	ابن اعرابی	۲۳۱	اسمار الخیل
۵۰	العسکری	۳۹۵	الاوائل
۵۱	غندجانی	۴۲۸	اسمار خیل العرب
۵۲	ابونعیم	۴۳۰	دلائل النبوۃ
۵۳	بلقینی	۸۰۵	امرا الخیل
۵۴	قلقشندی	۸۲۱	نہایۃ الارب

ی - عربی ادبیات کی جن کتابوں نے ان افسانوں سے وافر حصہ لیا ہے وہ یہ ہیں :

	مؤلف	ہجری سن وفات	نام کتاب
۵۵	اصبہانی	۳۵۶	الاغانی
۵۶	ابن بدرون	۵۶۰	ابن عبدون کے قصیدے کی شرح
۵۷	ابن ابی الحدید	۶۵۵	شرح نہج البلاغہ
۵۸	المقریزی	۸۴۸	الخطط

ک - لغت کی کتابیں بھی سیف کے افسانوں سے بے بہرہ نہیں رہیں مثلاً :

	مؤلف	ہجری سن وفات	نام کتاب
۵۹	ابن منظور	۷۱۱	لسان العرب
۶۰	زبیدی	۱۲۰۵	تاج العروس

ل - اور بالآخر جہاں کہیں آپ دیکھیں گے اس مکار لومڑی کا اثر پائیں گے حتٰی کہ حدیث کی کتابوں میں بھی مثلاً :

	مؤلف	ہجری سن وفات	نام کتاب
۶۱	ترمذی	۲۷۹	سنن ترمذی جو صحیح ترمذی کے نام سے مشہور ہے
۶۲	ابن مندہ	۴۲۷	التاریخ المستخرج من کتب الناس فی الحدیث
۶۳	النجیرمی	۴۵۱	اصول مسموعات
۶۴	الیحصبی	۵۴۴	الالماع

	مؤلف	ہجری سن وفات	نام کتاب
۶۵	متقی ہندی	۹۷۵	کنز العمال
۶۶	ابن حجر	۸۲۵	فتح الباری

۳۔ ان سب چیزوں کے بعد یہ قدرتی امر ہے کہ بعض اوقات سیف کا نام ان کتابوں میں جو ایسے لوگوں کو پہچاننے کے لیے تالیف کی گئی ہیں دروغ گویوں اور روایت سازوں کے زمرے میں جگہ پائے مثلاً:

۶۷	عقیلی	۳۲۲	الضعفاء
۶۸	ابن جوزی	۵۹۷	الموضوعات
۶۹	سیوطی	۹۱۱	اللئالی المصنوعة

دوسرا حصہ

سیف کی جعلسازیوں کے پھیلاؤ کی وجوہات

مکتب خلافت کی ان اہم کتابوں کے کوائف بیان کرنے کے بعد جن میں سیف کی روایتیں داخل ہو گئی ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس زندیق کی روایتوں کی خلفاء کے مکتب کی معتبر کتابوں تک رسائی کی وجہ کیا تھی؟

یہاں ہم اس مکتب کے دو ممتاز علماء کے اقوال نقل کرتے ہیں:

۱۔ مکتب خلافت کا جلیل القدر فقیہ اور اس مکتب کے مفسرین اور مورخین کا امام "ابن جریر طبری" اپنی تاریخ کی کتاب میں ـــ جسے اسلام کی تاریخ کی اہم ترین دستاویز سمجھا گیا ہے ـــ ہجرت کے تیسویں سال کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اس سال میں ابوذرؓ اور معاویہ کے درمیان جو کچھ ہوا اس کے بعد معاویہ نے انہیں شام سے مدینہ بھیج دیا۔ اگرچہ اس بارے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں لیکن ان میں سے اکثر باتوں کا نقل کرنا میں پسند نہیں کرتا۔ تاہم جن لوگوں نے اس معاملے میں

معاویہ کے لیے عذر خواہی کرنا چاہی ہے۔ انہوں نے ایک داستان نقل کی ہے جو "سری" [1] نے میرے لیے لکھی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ شعیب نے اسے سیف سے روایت کیا ہے کہ۔۔۔"

اس کے بعد طبری نے سیف کی باقی روایت کو جو اس نے ابوذرؓ اور معاویہ کی داستان کے سلسلے میں نقل کی ہے۔ اپنی تاریخ میں ثبت کر دیا ہے۔

اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ "ابن السودار" نے ابوذرؓ کو اکسایا کہ وہ معاویہ اور عثمان کے خلاف شورش برپا کریں ("ابن السوداء" سے مراد عبداللہ بن سبا ہے جسے سیف نے گھڑا اور اس کا تعارف ایک یہودی کے طور پر کرایا جس نے بظاہر اسلام قبول کر لیا اور سبائیوں کا گروہ تشکیل دیا۔ سیف نے اسے "ابن السودار" کا لقب دیا سیف نے اپنی اس روایت میں اور کئی دوسری روایتوں میں ابوذرؓ جیسے بزرگوار صحابی کو ابن سبا کا پیرو اور سبائیوں کے گروہ کا ایک فرد قرار دیا ہے۔

لہٰذا گو طبری کو ایسی بہت سی روایات دستیاب تھیں جن میں معاویہ اور ابوذرؓ کے مابین روئیداد بیان کی گئی ہے لیکن چونکہ وہ اسے اچھی نہیں لگیں اس لیے اس نے انہیں اپنی تاریخ میں درج نہیں کیا۔ اس کے باوجود اس نے ساری کی ساری روایات کو نظرانداز نہیں کیا۔ بلکہ ان سب میں سے سیف کی روایت کو چن لیا کیونکہ وہ معاویہ کی جانب سے عذر خواہی کرنے والوں کی دستاویز تھی اور اسے اس کے مفادات کی دیکھ بھال کرنے والوں نے روایت کیا تھا۔ حالانکہ اس روایت میں رسول اکرمؐ کے جلیل القدر صحابی ابوذرؓ کی بے حد توہین کی گئی ہے، ان کا مرتبہ گھٹایا گیا ہے، ان کی دینداری کا مذاق اڑایا گیا ہے، انھیں بے عقل اور احمق ٹھہرایا گیا ہے، ان پر ناروا تہمتیں لگائی گئی ہیں اور انھیں عبداللہ بن سبا کا پیرو قرار دیا گیا ہے۔

چونکہ اس روایت میں معاویہ کو حق بجانب ٹھہرایا گیا ہے اور اس کا عذر قابل قبول قرار دیا گیا ہے اس لیے تاریخ نویسوں کے پیشوا طبریؔ نے خلیفہ، حاکم اور دولتمند معاویہ کی حرمت کی نگہداشت کی خاطر رسول اکرمؐ کے تہی دست صحابی کی شخصیت اور احترام کو قربان کر دیا اور اس کا کوئی لحاظ روا نہیں رکھا۔

---

[1] طبری، سیف کی بیشتر روایات "سری" سے نقل کرتا ہے۔

ب۔ مکتب خلافت کا ایک اور جلیل القدر اور ممتاز عالم ابن اثیر اپنی "تاریخ کامل" میں یوں کہتا ہے:

"اس سال میں ابوذرؓ کی داستان اور معاویہ کا انھیں شام سے مدینہ بھجوا دینے کا واقعہ پیش آیا۔ اس طرزِ عمل کی توجیہہ کے سلسلے میں بہت سی باتیں لکھی گئی ہیں اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ: معاویہ نے انہیں برا بھلا کہا اور قتل کر دینے کی دھمکی دی۔ پھر انہیں بے کجاوہ اونٹ پر سوار کر کے شام سے مدینہ بھیج دیا اور ان کی مدینہ سے جلاوطنی ایسی ناگوار اور تکلیف دہ حالت میں انجام پائی کہ اس کا بیان کرنا مناسب نہیں۔"

اگرچہ ابن اثیر نے یہاں اپنے امامِ مؤرخین کی پیروی کی ہے اور معاویہ اور ابوذرؓ کی باہمی آویزش کا قصہ بیان نہیں کیا بلکہ سیف کا وہی جھوٹا افسانہ دہرایا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے طبری کے مقابلے میں زیادہ انصاف سے کام لیا ہے کیونکہ اس نے ابوذرؓ کے شام سے مدینہ بھیجے جانے اور اس کے علاوہ ان کی مدینہ سے جلاوطنی کی کیفیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ انہیں جیسے دوسرے مؤرخین نے بھی طبری کی پیروی کی ہے اور زندیق سیف کی خود ساختہ دروغ بافیوں کو اپنی مشہور کتابوں میں جگہ دی ہے اور چونکہ سیف نے ایسی روایات گھڑی ہیں جن میں رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد سے لیکر جنگ جمل تک (یعنی ۱۱ھ کے اوائل سے ۳۶ھ تک) کے واقعات بیان کیے گئے ہیں اور اس نے ارتداد کی جنگوں سے لیکر اسلامی فتوحات تک کے واقعات اور خلافت کے نظم ونسق کی داستانوں اور صحابہ تابعین اور دوسرے مسلمانوں کی باہمی آویزشوں کو اپنی روایتوں میں حقیقت کے برعکس ظاہر کیا ہے لہٰذا نتیجے کے طور پر اس زندیق کی روایتوں نے اس تاریخی مدت کے واقعات کے بارے میں خلفاء کے مکتب میں ایک خاص اندازِ فکر تشکیل دیا ہے۔

دوسرے راویوں (مثلاً نصرانی الاصل تمیم داری اور یہودی الاصل کعب الاحبار جن کی جانب پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے) کی روایات بھی خلفاء کے مکتب کا انداز فکر تشکیل دیتی ہیں لہٰذا مطالب کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ بحثوں کا خلاصہ کیا جائے۔ یہ کام انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بحث میں کیا جائے گا۔

بیسواں درس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
یَاۤ اَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِیۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَہَالَۃٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِیۡنَ.

(سورہ حجرات آیت ۶)

اب تک ہم نے ان روایات میں سے چند ایک کا ذکر کیا ہے جو دربار خلافت کے لیے وضع کی گئیں اور اسلام میں داخل ہوگئیں۔ یہ روایات وضع کرنے سے اسلام میں خلفاء کے مکتب اور اہل تسنن کے مذہب کی بنیاد پڑی۔

بعض اوقات مکتب اہلبیت کے علماء کے ان کتابوں پر اعتماد کرنے کے نتیجے میں ان کی روایتیں مکتب اہل بیت کی اہم کتابوں میں بھی در آئیں اور تشویش کا موجب بن گئیں۔ اب ہم ان کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

مکتب اہلبیت کی کتابوں میں مکتب خلافت کی روایات کے نمونے

(۱) پہلا نام جس کے بارے میں کتاب "خمسون ومائۃ صحابی مختلق" میں مؤلف نے ستّر سے زائد صفحات پر بحث کی ہے، قعقاع بن عمرو تمیمی کا ہے جسے سیف وضّاع نے موضوع کیا (شاید دوسرے زنادقہ نے بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹایا)۔ بہرحال اس نام اور اس سے وابستہ افسانے وضع کرنے والوں نے اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ وہ رسول اکرمؐ کے ان صحابہ میں سے تھا جو آنحضرتؐ کے بعد امام علیؑ

کے گرد جمع ہو گئے تھے اور آپ کے خاص شیعہ بن گئے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ امام علیؑ اور آپ کے خاص اصحاب کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلانا چاہیں پھیلائیں اور اس نام کے تحت جو افسانے تراشے ہیں انہیں نشر کریں۔

مثلاً یہ کہ امام علیؑ کو دھوکا دیا گیا حتیٰ کہ جنگ جمل برپا ہو گئی اور اس کے بعد آپ اس جنگ اور اس میں بہائے جانے والے خون کی وجہ سے پشیمان ہوئے اور ندامت کا اظہار بھی فرمایا۔

علاوہ ازیں انہوں نے مالک اشتر اور امام علیؑ کے دوسرے اصحاب کے بارے میں اس نام کے تحت غلط باتیں کہیں اور جو جھوٹ وضع کیے تھے وہ ان سے منسوب کر دیے

بارہ صدیوں سے زیادہ مدت گزر چکی ہے کہ یہ باتیں خلفاء کے مکتب کی تاریخ اسلام پر لکھی گئی کتابوں میں درج ہیں اور مشہور ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ شیخ طوسیؒ نے اپنی کتاب "رجال" میں امام علی علیہ السلام کے اصحاب کے نام گنواتے ہوئے اس کا ذکر کیا ہے اور ان کے بعد آنے والے دوسرے علمائے رجال نے مثلاً اردبیلی (ت: ۱۱۰۱ھ) نے "جامع الرواۃ" میں اور قہپائی نے (جو ۱۰۱۶ھ میں گزرے ہیں) "مجمع الرجال" میں شیخ طوسی کا یہی قول ان کی کتاب "رجال" سے اپنی تالیفات میں نقل کیا ہے اور مامقانی نے اپنی کتاب "تنقیح المقال" میں اس کے حالات زندگی لکھتے ہوئے شیخ طوسیؒ کا قول نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے: اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ: "اس لیے قادسیہ وغیرہ کی جنگوں میں قعقاع کا بڑا اثر تھا۔ وہ بہادر اور با اثر لوگوں میں سے تھا۔ وہ کوفہ کے باسیوں میں تھا۔ امام علیؑ کی جنگوں (جنگ جمل وغیرہ) میں وہ ان کے ساتھ تھا۔" امامؑ نے اسے طلحہ و زبیر کے پاس بھیجا۔ اس نے ان سے بڑی اچھی گفتگو کی۔ یہاں تک کہ لوگ صلح کے قریب ہو گئے۔ خلیفہ ابوبکر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ: "کسی لشکر میں قعقاع کی آواز ایک ہزار سورماؤں سے بہتر ہے"۔

یہ باتیں مامقانی نے "اسد الغابہ" سے نقل کی ہیں۔ نیز علامہ شوشتری نے بھی "قاموس الرجال" میں وہ روایات "اسد الغابہ" سے لی ہیں اور جب ہم "اسد الغابہ" سے رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ابن اثیر نے ابن عبد البر کی "استیعاب" سے نقل کیا ہے اور جب "استیعاب"

سے رجوع کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ابن عبد البر نے سیف بن عمر سے نقل کیا ہے۔ لہذا علمائے رجال کو قعقاع کے حالاتِ زندگی کے بارے میں سوائے زندیق سیف بن عمر کی روایات کے جن کا ذکر خلفاء کے مکتب میں نفوذ کرنے والے عناصر کی تیسری صنف کے سلسلے میں کیا گیا ہے کوئی اور دستاویز نہیں ملی۔

۲۔ شیخ طوسیؒ نے اپنی کتاب "تبیان" میں آیاتِ افک کی تفسیر میں ایک افسانہ نقل کیا ہے جو ام المومنین بی بی عائشہ سے روایت کیا گیا ہے اور بعد میں آنے والے علماء مثلاً شیخ طبرسی (ت: ۵۴۸ھ) نے "مجمع البیان" میں اور ابوالفتح رازی (ت: ۵۵۴ھ) نے "تفسیر روض الجنان" میں ان بزرگوار سے نقل کیا ہے اور گازر (جو ۲۲ھ میں گزرے ہیں) نے "روض الجنان" سے تفسیر "جلاء الاذہان" میں نقل کیا ہے اور انکے بعد ملا فتح اللہ کاشانی (ت: ۹۸۸ھ) نے اپنی تفسیر "منہج الصادقین" میں یہ مطلب تفسیر گازر سے اور ان دوسرے بزرگوں نے نقل کیا ہے جن کے نام اوپر لیے گئے ہیں اور یہ افسانہ اس کے باوجود نقل کیا گیا ہے کہ ماریہ قبطیہ اور ان کی افک سے نسبت سے بریت کے بارے میں آیات نازل ہوئی ہیں جس کی تفصیل موجودہ کتاب کے مؤلف نے "احادیث ام المومنین عائشہ"[1] کی دوسری جلد میں بیان کی ہیں اور سید ہاشم بحرانی (ت: ۱۱۰۷ھ یا ۱۱۰۹ھ) کی تالیف کردہ تفسیر "البرہان" میں بھی دونوں روایات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ طوسی رضوان اللہ علیہ اور ان کے بعد آنے والے علماء نے فقہی احادیث قبول کرنے کے لیے جو معیارات استعمال کیے ہیں وہ محولہ دو روایات کو قبول کرتے وقت کام میں نہیں لائے گئے اور انہوں نے ان روایات کو کسی قید یا شرط کے بغیر قبول کر کے اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے۔ نیز یہ کہ "ماریہ" پر افک کی داستان کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا جن کی بریت کے بارے میں آیات نازل ہوئی ہیں۔

۳۔ ملا احمد نراقی (ت: ۱۲۴۵ھ) نے اپنی کتاب "معراج السعادہ" میں رسول اکرمؐ کے بارے میں یوں لکھا ہے:

---

[1] یہ کتاب ابھی نہیں چھپی۔

خدا کے شوق اور محبت کی آگ آپ کے سینۂ مبارک میں اتنی روشن تھی کہ کبھی کبھی اس پر پانی نہ ڈالا جاتا تو آپ کا دل جل جاتا۔ وہاں سے وہ آپ کے مبارک جسم میں سرایت کر جاتی اور آپ کے وجود کے اجزاء ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے۔ آپ کا حصّۂ تجرد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اگر مادیت کی خار و خس آپ کے دامن کو نہ لگتے تو آپ اچانک مادی دنیا کو خیرباد کہہ دیتے اور طائر روح عالم قدس کی جانب پرواز کر جاتا۔ اسی وجہ سے آپ نے متعدد عورتوں سے شادی کی اور اپنے نفس کو ان کے ساتھ مشغول فرما لیا تاکہ آپ ہمیشہ دنیا کی جانب متوجہ رہیں اور زیادتی شوق سے آپکی مقدس روح مفارقت نہ کر جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب کبھی آپ پر شدید استغراق کی کیفیت طاری ہو جاتی اور آپ بادۂ محبت سے سرشار ہوتے تھے تو بی بی عائشہ کی ران پر اپنا دست مبارک مارتے اور فرماتے:

كَلِّمِيْنِيْ يَا حُمَيْرَا ! اَشْغِلِيْنِيْ يَا حُمَيْرَا !

(اے عائشہ! مجھ سے باتیں کرو اور مجھے دنیا میں مشغول کرو)۔

یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ کی بعض ازواج جو رضائے الٰہی سے آپ کی زوجیت میں آئی تھیں نہایت شقی تھیں تاکہ شقاوت کی کثرت کی بنا پہ ان کی دنیویت غالب رہے اور وہ آنحضرتؐ کے حصّۂ قدسیہ کا مقابلہ کر سکیں اور آپ کی روح کو دنیا کی طرف مائل کر سکیں۔ پس جب وہ رسول اکرمؐ کو اپنی طرف مشغول کرتیں تو آپ اس دنیا سے التفات فرماتے تھے"[1] اور انہوں نے یہ بات اپنے والد بزرگوار مولیٰ مہدی نراقی (ت: ۱۲۰۹ھ) کی کتاب "جامع السادات" سے نقل فرمائی ہے[2] اور مولیٰ مہدی نراقی نے یہ بات غزالی (ت: ۵۰۵ھ) کی کتاب "احیاء علوم الدین" سے نقل فرمائی ہے۔

غزالی نے "شھوۃ الفرج" کے باب میں یوں کہا ہے:

---

[1] معراج السعادۃ، انتشارات علمیہ اسلامیہ، تہران، سال ۱۳۴۸ شمسی صفحہ ۲۴۰۔

[2] جامع السعادات، تحقیق شیخ مظفرؒ مطبوعہ نجف جلد ۲ صفحہ ۱۱ فصل "الشھوۃ الجنسیۃ"

مرحوم حاج محمد حسن، حاج محمد معصوم نے جو "جامع السعادات" کے مؤلف کے معاصر تھے کتاب جامع السعادات" سے استفادہ کیا اور اپنی کتاب کا نام "کشف الغطاء عن وجوہ مراسم الاہتداء" رکھا۔ دیکھیے "الذریعہ" جلد ۱۸ صفحہ ۴۵

"وَقَدْ كَانَ اسْتِغْرَاقُهُ بِحُبِّ اللّٰهِ تَعَالٰى بَحَيْثُ كَانَ يَجِدُ احْتِرَاقَهُ فِيْهِ اِلٰى حَدٍّ كَانَ يَخْشٰى مِنْهُ فِيْ بَعْضِ الْاَحْوَالِ اَنْ يَّسْرِىَ ذٰلِكَ اِلٰى قَالَبِهٖ فَيهْدِمُهُ فَلِذٰلِكَ كَانَ يَضْرِبُ بِيَدِهٖ عَلٰى فَخِذِ عَائِشَةَ اَحْيَانًا وَّيَقُوْلُ : كَلِّمِيْنِيْ .... [1]

اور غزالی وہ شخص ہے جس نے کہا تھا کہ:

"اگر کہا جائے کہ یزید پر اس وجہ سے لعنت کرنا جائز ہے کہ وہ حسینؑ کا قاتل تھا یا اس نے قتل کا حکم دیا تھا تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوئی اور یزید پہ لعنت کرنا تو درکنار یہ کہنا بھی جائز نہیں ہے کہ یزید نے انہیں قتل کیا یا ان کے قتل کا حکم دیا...."

اور پھر کہتا ہے:

"اگر پوچھا جائے کہ کیا یہ کہنا جائز ہے کہ حسینؑ کے قاتل پر خدا کی لعنت ہو یا یہ کہ جس نے حسینؑ کے قتل کا حکم دیا اس پر خدا کی لعنت ہو تو ہم جواب میں کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ کہا جائے کہ اگر حسین کا قاتل توبہ کیے بغیر مرا ہے تو اس پر خدا کی لعنت ہو لیکن چونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ حسینؑ کا قاتل توبہ کرنے کے بعد مرا ہو......" [2]

یہ ہے خلفاء کے مکتب کے اہل عرفان کے امام کی معرفت!

۴۔ سید علی بن طاوس (ت : ۶۶۴ھ) کتاب "المجتنیٰ من الدعاء المجتنیٰ" میں [3] یہ فصل دعا اور اس حدیث شریف پر مشتمل ہے جو ابن اثیر نے اپنی تاریخ کے تیسرے جزو میں اہل بحرین کے ارتداد کی داستان کے سلسلے میں نقل کی ہے۔

اس جنگ میں اہل ہجر کا ایک راہب مسلمانوں کے ساتھ تھا جو اسلام لے آیا۔

---

[1] احیاء علوم الدین، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت (جلد ۳ صفحہ ۱۰۱) فی کتاب "کسر الشہوتین"۔

[2] احیاء علوم الدین جلد ۳ صفحہ ۱۲۵

[3] المجتنیٰ مع الدعوات کے ذیل میں، ایران، لیتھوگرافی سال ۱۳۲۳ھ صفحہ ۳۹

جب اس سے اسلام قبول کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا: "جب میں نے تین چیزیں دیکھیں تو میرے دل میں خوف پیدا ہوا کہ اگر ان کے بعد بھی میں ایمان نہیں لاؤں گا تو خدا مجھے حیوان کی شکل میں مسخ کر دے گا۔" وہ تین چیزیں یہ ہیں:

۱ شور بیابان میں (مسلمانوں کے لشکر کے لیے) پانی کا ظاہر ہونا۔

۲ (مسلمانوں کے لشکر کے لیے) سمندر کی لہروں کا ساکن ہو جانا (تاکہ وہ لہروں پر چل سکیں)۔

۳ صبح کے وقت میں نے فضا میں (فرشتوں کو) یہ دعا پڑھتے ہوئے سنا:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ، لَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ، وَالْبَدِیْعُ لَیْسَ قَبْلَکَ شَیْءٌ، وَالدَّائِمُ غَیْرُ الْغَافِلِ، وَالْحَیُّ لَا یَمُوْتُ، وَخَالِقُ مَا یُرٰی وَمَا لَا یُرٰی ..."

ابن اثیر (ت: ۶۳۰ھ) نے اپنی تاریخ کا یہ حصہ تاریخ طبری (ت: ۳۱۰ھ) سے نقل کیا ہے اور طبری نے یہ افسانہ اسی زندیق سیف بن عمر سے روایت کیا ہے۔

سیف نے اس افسانے میں خلیفہ کے اہل لشکر کے لیے چند معجزے گھڑے ہیں مثلاً یہ کہ شور زمین میں لشکر کے لیے پانی کا ایک تالاب ظاہر ہو گیا اور جب ان کی پانی کی ضرورت پوری ہو گئی تو وہ تالاب غائب ہو گیا اور یہ کہ وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو اپنے چوپایوں سمیت سمندر پر چلنے لگے اور سمندر کی لہریں ان کے پاؤوں کے نیچے ریت کی طرح نرم ہو گئیں اور یہ کہ راہب نے آسمان میں ان فرشتوں کی دعا سنی جو لشکر کی مدد کے لیے بھیجے گئے تھے۔ [1]

❋

گزشتہ مثالوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ اہلبیت ؑ کے مکتب کے اکابر علماء کے خلفاء کے مکتب کی سیرت اور تاریخ کی کتابوں پر اعتماد کرنے کی وجہ سے کیسے کیسے افسانے خلفاءؑ کے مکتب کی کتابوں سے ان کی اپنی اہم کتابوں میں داخل ہو گئے ہیں اور ان کی تحریروں پر بعض اوقات

---

[1] کتاب "عبداللہ بن سبا" (چوتھا ایڈیشن، مطبوعہ کوکب، تہران ۱۴۰۲ھ) کی پہلی جلد کے صفحہ ۲۲۶ پر علاء حضرمی کی داستان کی فصل یا بحرین کے لوگوں کے ارتداد کی فصل ملاحظہ فرمائیں۔

جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کی وجہ یہی ہے اور کوئی نہیں سمجھ پایا کہ جو افسانے اعتراضات کا موجب بنے ہیں وہ خلفاء کے مکتب کی کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں۔ یہ حقیقت اس آخری مثال سے واضح ہو جائے گی جو درج ذیل ہے:

۵۔ مجلسی کبیر کی کتاب "بحار الانوار" پر بے حد تنقید کی گئی ہے۔ اس کے جو حصے تنقید کا نشانہ بنے ہیں ان میں وہ افسانے بھی شامل ہیں جو ۲۶۴ صفحات پر محیط سیرتِ رسول کا جزو ہیں اور حالیہ ایڈیشن کی پندرھویں جلد (صفحات ۲۶-۱۰۴ اور ۲۹۹-۳۲۹ اور ۳۷۱-۳۸۴) اور سولھویں جلد (صفحات ۲۰-۷۷) میں چھپے ہیں۔ یہ افسانے "الف لیلہ و لیلہ" کے افسانوں یا ان میں سے بیشتر کے ساتھ مماثلت رکھتے ہیں۔

ان میں سے ایک افسانہ وہ ہے جو رسول اکرم کی آفرینش کے آغاز کے ذکر کی مناسبت سے کتاب کی ۱۵ ویں جلد کے صفحہ ۳۰ پر بیان کیا گیا ہے اور اس کی نص یوں ہے:

"پھر خدا نے ایک ایسے فرشتے کو پیدا کیا جو طاقت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور اس فرشتے کو زمین کے نیچے ٹھہرایا گیا جب کہ اس کے پاؤں کسی چیز پر ٹکے ہوئے نہ تھے۔"

پھر خدا نے ایک بہت بڑی چٹان پیدا کی اور اسے اس فرشتے کے پاؤں کے نیچے رکھا لیکن وہ چٹان کسی چیز پر نہ ٹکی تھی۔ پھر خدا نے ایک بہت بڑا بیل پیدا کیا جس کے جسم کی بڑائی اور آنکھوں کی چمک کی وجہ سے کسی کو اسے دیکھنے کی طاقت نہ تھی یہاں تک کہ اگر سمندر اس کی ناک کے ایک سوراخ میں رکھے جاتے تو وہ ایک وسیع بیابان کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا دانہ نظر آتے۔ اس بیل نے اس چٹان کے نیچے آ کر اسے اپنی پشت اور دو سینگوں پر اٹھا لیا۔ اس بیل کا نام "لہوتا" تھا لیکن بیل کے پاؤں کسی چیز پر ٹکے ہوئے نہیں تھے۔ لہٰذا اللہ نے "بھموت" نام کی ایک بڑی مچھلی پیدا کی۔ مچھلی نے اپنے آپ کو بیل کے چاروں ہاتھ پاؤں کے نیچے رکھ دیا اور بیل مچھلی کی پشت پر ٹک گیا۔

یوں ساری زمین فرشتے کے کندھے پر اور وہ فرشتہ چٹان پر اور وہ چٹان بیل کی پشت پر اور وہ بیل مچھلی کی پشت پر اور وہ مچھلی پانی پر اور پانی ہوا کے دوش پر اور ہوا اندھیرے کے ہیولے پر ٹکی ہوئی ہے۔

یہ افسانے مرحوم مجلسی نے کہاں سے لیے ہیں؟ یہ سارے کے سارے افسانے انہوں نے "ابوالحسن احمد ابن عبداللہ البکری الاشعری" کی کتاب "الانوار فی مولد النبی المختار" کی سات جلدوں سے نقل فرمائے ہیں۔

اسے "البکری" اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ پہلے خلیفہ ابوبکر کی نسل میں سے تھا۔[1]

مرحوم شیخ حُر عاملی (ت: ۱۱۰۴ھ) نے اپنے قلم سے اس کتاب کا ایک نسخہ تیار کرکے اسے شیخ حسین بن عبدالوہاب کی کتاب "عیون المعجزات" کے آخر میں اس کے ساتھ ملحق کر دیا ہے۔[2]

علامہ مجلسی نے اپنی کتاب کی ۳۴ ویں جلد کے صفحات ۲۵۹ - ۴۰۰ پر امیرالمومنین علیؑ کی سیرت کے سلسلے میں بھی ابوالحسن البکری کی "مقتل" سے نقل کیا ہے[3] اور بی بی فاطمہ زہراؑ کی سیرت کے سلسلے میں بھی کتاب کے حالیہ ایڈیشن کی ۴۳ ویں جلد میں البکری کی کتاب "مصباح الانوار"[4] سے نقل کیا ہے۔[5]

علامہ مجلسی نے "بحار الانوار" میں سیرت کے ابواب میں خلفاء کے مکتب کی اس قسم کی کتابوں سے بہت کچھ نقل فرمایا ہے اور اس مکتب کی سیرت اور تاریخ کی کتابوں پر اعتماد

---

[1] دیکھیے الذریعہ جلد ۲ صفحہ ۴۰۹ - ۴۱۱ "الانوار فی مولد النبی المختار" کی شرح میں اور اس کا صفحہ ۴۴۰ - "الانوار المحمدیہ" کی شرح میں اور جلد ۲۳ صفحہ ۲۷۷ "مولد النبیؐ" کی شرح میں اور کشف الظنون جلد ۱ صفحہ ۱۶۷ اور مرحوم ربانی شیرازی کی تحریر الذریعہ کے حاشیہ میں جلد ۱۵ صفحہ ۲۶

[2] دیکھیے الذریعہ جلد ۱۵ صفحہ ۳۸۳ - ۳۸۵ کتاب عیون المعجزات کی شرح میں۔

[3] دیکھیے الذریعہ جلد ۲۲ صفحہ ۳۰ ابوالحسن البکری کی تالیف "مقتل امیرالمومنین" کی شرح میں۔

[4] دیکھیے الذریعہ جلد ۲۱ صفحہ ۱۰۲ "مصباح الانوار" کی شرح میں۔

[5] اگرچہ "مقتل امیرالمومنین" اور "مصباح الانوار" دونوں ہی ابوالحسن البکری کی تالیف ہیں لیکن چونکہ دونوں کتابوں کا اسلوب پہلی کتاب سے مختلف ہے اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں کتابوں کا مؤلف ایک شخص نہیں ہے۔

کرکے بہت سے بے بنیاد افسانے نقل کیے ہیں جن پر بے حد تنقید کی گئی ہے حالانکہ اسی "بحار" کے فقہ کے ابواب میں انہوں نے تمام جلیل القدر شیعہ علماء کی طرح اہلبیت ؑ کے مکتب کی معتبر کتابوں سے احادیث نقل کی ہیں اور اسی وجہ سے ان ابواب پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔

جن لوگوں نے ایسے افسانوں پر تنقید کی ہے انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ افسانے خلفاء کے مکتب کی کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں۔ لہٰذا جو کچھ یہاں تک بیان کیا گیا ہے اس کے پیش نظر عقلمند لوگ اب ہم پر نکتہ چینی نہ کریں۔

آپ امر خلافت میں بحث اور تحقیق کرتے ہیں اور اپنے مباحث میں ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جو خلفاء کے مکتب کی انہیں کتابوں میں نقل کی گئی ہیں کیونکہ مناظرے میں ضروری ہے کہ اس چیز سے استدلال کیا جائے جس کا مدمقابل اقرار کرے اور اس کا معتقد اور معترف ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دوسرے فریق کی کتابوں سے رجوع نہ کیا جائے اور ان کے مندرجات کو بطور شہادت پیش نہ کیا جائے۔

یہ مسئلہ بحث اور تحقیق کرنے والوں کی مناظرات کی تمام کتابوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ ان لوگوں کی کتابوں کی جانب رجوع کرتے ہیں اور جو ان کی رائے اور اعتقاد کے مخالف ہوتے ہیں اور ان کے معتقدات کو جنہیں وہ قبول کرتے ہیں لیکن جو چیز بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مناظر جو چیز مدمقابل کی کتابوں سے سند کے طور پر نقل کرے اس کی صحت اور درستی کے بارے میں اسے مکمل اطمینان ہو۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ مفیدؒ نے اپنی کتاب "جمل" میں سیف بن عمر سے کچھ روایات نقل کی ہیں جن میں سے پہلی یوں ہے:

سیف بن عمر نے محمد بن عبداللہ بن سواد سے اور اس نے ... سے روایت کی ہے کہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد پانچ دن تک غافقی بن حرب عکی کے علاوہ شہر مدینہ کا کوئی حاکم اور والی نہ تھا۔ لوگ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھے جو ان کی خلافت کی پیشکش قبول کرلے لیکن انہیں کوئی ایسا آدمی نہیں ملتا تھا۔

مصریوں نے حضرت علی علیہ السلام کو تلاش کرنا شروع کیا۔ آپ ان سے پوشیدہ

ہو گئے اور مدینہ کی دیواروں کے پیچھے پناہ گزین ہو گئے ۔ آخر کار انہوں نے آپ کو پالیا اور خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے کے بارے میں اپنی تجویز آپ کے سامنے رکھی ۔ تاہم آپ نے یہ تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ [۱]

فقط اس روایت میں مندرجہ ذیل باتیں کہی گئی ہیں :

۱۔ اس روایت کی سند محمد بن عبد اللہ بن سواد بن نویرہ ہے جس کے متعلق ہم کتاب "رواۃ مختلقون" میں دستاویزی شہادت سے ثابت کر چکے ہیں کہ اس نام کے کسی آدمی کا کوئی وجود نہ تھا اور وہ سیف کے من گھڑت راویوں میں سے ہے ۔

۲۔ اس روایت میں "غافقی بن حرب عکی" نامی ایک شخص کی شہر مدینہ پر پانچ دن کی حکومت کا ذکر ہے ۔ ہم نے اس شخص کے بارے میں تحقیق کی اسکا ذکر سیف کی پانچ روایتوں میں ان لوگوں کے ساتھ آیا ہے جو مصر سے حضرت عثمان کا مقابلہ کرنے کے لیے آئے تھے ۔ تاریخ طبری میں لکھا ہے [۲] کہ غافقی ان لوگوں کا سردار تھا ۔ تاریخ طبری میں مندرج سیف کی روایتوں کے علاوہ ہمیں اس کا نام و نشان کسی روایت یا کتاب میں نہیں ملا ۔ اس بنا پر ہم اسے من گھڑت امرار اور حکام میں شمار کرتے ہیں ۔"

اس روایت میں کہا گیا ہے کہ پانچ دن تک غافقی کے علاوہ مدینہ کا کوئی والی اور حاکم نہ تھا ! اس بات کا جھوٹ ہونا اسی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ جھوٹے اور جعلی حدیثیں گھڑنے والے سیف کی روایات کے علاوہ کہیں بھی "غافقی" کا نام نہیں آیا ۔ اس کے باوجود اس غرض سے کہ معاملہ زیادہ واضح ہو جائے ہم نے تاریخ وغیرہ کی کتابوں سے رجوع کیا تاکہ دیکھیں کہ خلیفہ عثمان کے قتل ہونے کے بعد وہ شہر مدینہ کے بارے میں کیا بتاتی ہیں ۔

---

[۱] شیخ مفیدؒ کی کتاب "الجمل" مطبوعہ حیدریہ نجف اشرف سال ۱۳۶۸ھ ہجری (صفحہ ۴۷-۴۸) مذکورہ بالا روایت مصر میں چھاپی گئی ۔ تاریخ طبری کے پہلے ایڈیشن (جلد ۵ صفحہ ۱۰۳، ۱۵۵ اور ۱۵۶) میں آئی ہے ۔

[۲] یہ روایت یورپ میں طبع شدہ تاریخ طبری جلد ۱ صفحہ ۲۹۵۴ - ۲۹۶۲، ۳۰۱۷ اور ۳۰۷۳ میں آئی ہے ۔

ان کتابوں میں اس بارے میں یہ لکھا ہے :

جس دن خلیفہ عثمان قتل ہوئے اسی دن حضرت علی بن ابی طالبؑ کی بیعت عمل میں آئی[۱] اس بات کی تفصیل تاریخ طبری اور سیف کے علاوہ دوسروں کی نقل کردہ روایات میں آئی ہے۔

خلیفہ عثمان، جمعہ کے روز ۱۸ ذی الحجہ کو وفات رسولؐ کے ۲۵ سال بعد قتل ہوئے۔

اسی طرح طبری "امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کی خلافت اور جن لوگوں نے ان سے بیعت کی اور ان کی بیعت کے زمانے کے بارے میں روایت" کے عنوان کے تحت یوں لکھتا ہے :

محمد بن حنفیہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا : جب عثمان قتل ہوئے میں اپنے والد بزرگوار علیؑ کے پاس تھا۔ رسول اکرمؐ کے اصحاب ان کے پاس آئے اور ان سے کہا :

"یہ شخص ــــ اشارہ خلیفہ عثمان کی طرف تھا ــــ قتل ہوگیا ہے اور لوگوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ان کا کوئی امام اور رہبر ہو اور اس وقت ہمیں اسلام میں سبقت اور قرابتداری کے لحاظ سے آپ کے علاوہ اس امت کی امامت اور رہنمائی کے لیے کوئی شخص موزوں نظر نہیں آتا۔ ہم اس وقت تک آپ کا دامن نہیں چھوڑیں گے جب تک آپ کے ہاتھ پر بیعت نہ کریں گے۔

میرے والد بزرگوار نے جواب دیا : یہ کام مسجد میں انجام پانا چاہیے کیونکہ میری بیعت خفیہ طور پر نہیں کی جانی چاہیے۔

محمد بن حنفیہ کہتے ہیں : "میرے والد مسجد میں (مسجد النبیؐ میں) داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پیچھے مہاجرین اور انصار بھی آگئے اور ان کی بیعت کی اور ان کے بعد عام لوگوں نے بھی میرے والد کی بیعت کی۔"

طبری نے "ابو بشیر عابدی" سے بھی نقل کیا ہے کہ اس نے کہا : میں عثمان کے قتل

---

[۱] مسعودی : مروج الذہب مطبوعہ دار الاندلس بیروت سال ۱۳۸۵ھ جلد ۲ صفحہ ۳۴۹ "بیان خلافت امیر المومنین علی ابن طالب کرم اللہ وجہہ" میں۔

ہونے کے وقت مدینہ میں تھا جب مہاجرین اور انصار ـــــ جن کے درمیان طلحہ وزبیر بھی دکھائی دیتے تھے ـــــ علیؑ کی خدمت میں آئے اور کہا: ہم اس لیے آئے ہیں تاکہ آپ کی بیعت کریں .... (آخر تک)

طبری تیسری روایت میں لکھتا ہے:

عثمان ۱۸ ذی الحجہ کو سنیچر کے روز قتل ہوئے اور لوگ بیعت کے لیے علیؑ کے اردگرد جمع ہوگئے ...... (آخر تک)

اس موازنے کا نتیجہ یہ ہے کہ:

۱۔ سیف کی روایت کی سند میں محمد بن عبداللہ بن سواد بن نویرہ کا نام آیا ہے جو اس کے دماغ کی پیداوار ہے۔

۲۔ روایات کے متن میں کہا گیا ہے کہ "غافقی بن حرب عکی" نامی ایک شخص نے مدینہ پر پانچ دن حکومت کی۔ یہ شخص بھی سیف کے من گھڑت امراء اور حکام میں سے ہے۔

۳۔ خلیفہ عثمان کے قتل ہونے کے بعد پانچ دن تو کجا ایک ساعت کے لیے بھی امامؑ کے علاوہ کسی نے مدینہ پر حکومت نہیں کی۔

۴۔ مہاجرین والانصار نے اس وقت تک امام علی علیہ السلام کا دامن نہیں چھوڑا جبتک اسی دن جس دن خلیفہ عثمان قتل ہوئے آپ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرلی۔

یہ بات کہ مہاجرین اور انصار نے امام علی علیہ السلام کا دامن اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرلی اور یہ بھی کہ خلیفہ عثمان کے قتل کے بعد امام علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی شخص ایک ساعت کے لیے بھی مدینہ کا حاکم نہیں رہا۔ شیخ مفیدؒ جیسے عظیم عالم سے پوشیدہ نہ تھی لیکن چونکہ معاویہ کے وقت سے لیکر شیخ بزرگوار کے زمانے تک اسلامی معاشروں میں مشہور کردیا گیا تھا کہ حضرت علیؑ خلیفہ عثمان کے قاتل تھے اور انہوں نے لوگوں سے زبردستی بیعت لی تھی اور اسی بہانے معاویہ نے مسلمانوں کی تمام مسجدوں میں نماز جمعہ کے خطبوں میں امام علی علیہ السلام پر لعنت واجب کردی تھی اس لیے شیخ مفید نے چاہا کہ خلفاء کے مکتب کی روایات سے دلیل پیش کریں کہ امام علی علیہ السلام نے لوگوں سے زبردستی بیعت نہیں لی تھی اور جو

روایات طبری جیسے مؤرخین نے اپنی تاریخ میں درج کی ہیں انہیں گواہ ٹھہرائیں۔ اسی بنا پر انہوں نے یہ روایت نقل کی تاکہ ان لوگوں پر جو اس روایت کو مانتے ہیں یہ بات ثابت کر دیں کہ امام علی علیہ السلام خلیفہ عثمان کے قتل میں شریک نہیں تھے اور کئی دن تک انہوں نے اس بات کو منظور نہیں کیا کہ ان کے ہاتھ پر بطور خلیفہ بیعت کی جائے۔

ان چند مثالوں سے جو ہم نے اب تک دی ہیں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہل البیت علیہم السلام کے مکتب کے علماء فقہی بحثوں میں حدیث نقل کرتے وقت جس مکمل احتیاط سے کام لیتے ہیں اتنی احتیاط دوسری بحثوں میں نہیں برتتے جس کے نتیجے میں وہ خلفاء کے مکتب کی بعض کتابوں پر اعتماد کرتے ہوئے ایسی چیزیں ان میں سے نقل کرتے ہیں جو پریشانی، اعتراض اور تنقید کا موجب بنتی ہیں۔ ان منقولات میں کچھ ایسی حدیثیں اور داستانیں ہیں جو زنادقہ کے ہاں سے خلفاء کے مکتب کی کتابوں میں داخل ہو گئیں اور جن پر ہم پیشتر بحث کر چکے ہیں۔

بلاشبہ اس پریشانی کا علاج یہ ہے کہ علمی مراکز کے علماء اور محققین دوسرے اسلامی علوم کو بھی اتنی ہی اہمیت دیں جتنی وہ اب تک علم فقہ کو دیتے چلے آئے ہیں، جیسا کہ گزشتہ زمانوں میں علمی مراکز کے بزرگوں نے مختلف موضوعات پر تالیف اور تدریس کا کام انجام دیا ہے۔ مثلاً شیخ مفید (ت: ۴۱۳ھ) نے کتاب "الجمل" اور سید مرتضیٰ (ت: ۴۳۶ھ) نے "تنزیہ الانبیا" اور شیخ طوسی (ت: ۴۶۰ھ) نے "تلخیص الشافی" اور علامہ حلی (ت: ۷۲۶ھ) نے اکیس کتابیں علم امامت کے بارے میں تالیف فرمائی ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب مرجع عصر اور علمی مرکز کے سربراہ دوسرے اسلامی علوم کی جانب توجہ دیں گے اور اس سلسلے میں تالیف و تدریس کا بیڑہ اٹھائیں گے تو مرکزی سرگرمیاں بھی اسی قسم کی ہوں گی۔

ہمارے آجکل کے علمی مراکز کو پہلے کی مانند جامع ہونا چاہیے اور عظیم فکری قوتوں کو ایک علم پر مرکوز کرنے سے اجتناب برتنا چاہیے۔ علاوہ ازیں ہر مرکز میں علماء کے ایسے گروہ تشکیل دیے جانے چاہییں جو فقہ کے علاوہ دوسری احادیث کا مطالعہ کریں اور جس طرح اس کتاب میں بعض احادیث کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، ان

تمام احادیث کی مفصل چھان بین کریں اور ان میں سے ہر ایک کے مطالعہ کا نتیجہ علمی مراکز کے علمار کو مہیا کریں تاکہ دوسرے علمار بھی اس موضوع پر اسی طرح اظہار رائے کر سکیں جس طرح احکام سے متعلق احادیث کے بارے میں کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں فقہ کے علاوہ دوسری احادیث کے بارے میں کتاب جواہر اور جامع احادیث شیعہ جیسی کتابیں تالیف کی جائیں۔

لیکن صحیح کافی نام کی کتاب کی احادیث کے مطالعہ اور تحقیق کے عنوان سے اس کے مقدمہ میں لکھا گیا ہے کہ: "زندیق اور ملحد عبدالکریم بن ابی العوجا[۱] نے اپنے قتل کیے جانے کے وقت کہا: خدا کی قسم تم مجھے قتل کر رہے ہو لیکن یہ جان لو کہ میں نے چار ہزار حدیثیں خود گھڑ کر تمہارے درمیان پھیلا دی ہیں جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال ظاہر کرتی ہیں۔ خدا کی قسم میں نے تمہیں اس بات پر آمادہ کر دیا ہے کہ جس دن تمہیں روزہ رکھنا چاہیے اس دن افطار کرو اور جس دن افطار کرنا چاہیے اس دن روزہ رکھو ......" اور مزید کہا گیا ہے کہ ان احادیث کی تعداد اہل سنت کی کتابوں میں موجود نمونوں کے مقابلے میں اہل شیعہ کی حدیث کی کتابوں مثلاً کافی اور ابن بابویہ اور ابن طاؤس کی کتابوں میں زیادہ ہے۔[۲]

حالانکہ ابن ابی العوجا نے یہ بات امام صادق علیہ السلام کے ساتھ مناظروں کے دوران نہیں کہی تاکہ اسے شیعوں کی کتاب کے مقدمہ میں بطور شہادت پیش کیا جائے بلکہ اس نے یہ الفاظ خلیفہ کے والی سے کہے تھے اور اس کی مراد خلفار کے مکتب کی حدیث کی کتابیں تھیں اور جس کتاب میں اس نے جعلی حدیثیں شامل کی ہیں اسکی نشاندہی کی گئی

---

[۱] ابن ابی العوجا کے بارے میں بیشتر معلومات کے لیے اسی کتاب کے صفحات ۵۵۱ سے ۵۵۲ تک اور کتاب "یکصد و پنجاہ صحابی ساختگی" کی پہلی جلد کے صفحات ۵۹ سے ۶۳ تک (دوسرا ایڈیشن) ملاحظہ فرمائیں۔

[۲] دیکھئے مقدمہ صحیح الکافی صفحہ "د" اور بعد کے صفحات۔ مطبوعہ بیروت ۱۴۰۱ھ۔

ہے۔ ابن الجوزی (ت: ۵۹۷ھ) نے کتاب الموضوعات میں ابن ابی العوجا کے بارے میں کہا ہے: وہ حماد بن سلمہ کا ربیب (سوتیلا بیٹا) تھا اور اس نے اس کی کتابوں میں جعلی حدیثیں داخل کردیں۔[1]

اور یہی بات ذہبی (ت: ۷۴۸-۷۴۸) نے "میزان الاعتدال" میں اور ابن حجر (ت: ۸۵۲) نے کتاب "تہذیب" میں اس کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کہی ہے اور انہوں نے حماد بن سلمہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

"حماد بن سلمہ بن دینار الامام العلم ابو سلمہ المصری، کہتے ہیں کہ اس کے ایک شاگرد نے اس سے دس ہزار احادیث روایت کیں اور دوسرے شاگرد نے اس سے بھی زیادہ احادیث روایت کیں اور اس نے ۱۶۷ھ میں وفات پائی۔"

کیا یہ مناسب ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ ابن ابی العوجا نے خلفاء کے مکتب کے ایک سربرآوردہ محدث حماد کی کتاب میں دست درازی کی ہو۔ اس کا ذکر اس انداز سے اس کتاب کے مقدمہ میں کیا جائے جس کا نام "صحیح کافی" ہے اور بطور کلی یہ کہا جائے کہ اس جیسے زنادقہ کی روایات کتاب "کافی" اور ابن بابویہ اور ابن طاؤس کی کتابوں میں بھی داخل ہوگئی ہیں اور یہ کہکر ان کتابوں کا اعتبار غیر متخصص اشخاص کی نظروں میں گرادیا جائے۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ۔

اکیسواں درس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ
مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ۔
(سورۂ نحل۔ آیت ۴۴)

اس درس میں ہم جن مطالب کا مطالعہ کریں گے وہ مندرجہ ذیل دو حصوں پر مشتمل ہے:
ا۔ اسلام کے اولین منابع سے رجوع کرنے کی شرط
ب۔ قرآن مجید سے رجوع کرنے کی شرط

پہلا حصہ

اسلام کے اولین منابع سے رجوع کرنیکی شرط

گزشتہ درسوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے بعد یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ قرآن کی تفسیر کرنے، رسولؐ و اہلبیتِ رسولؐ کی سیرت پر قلم اٹھانے، انبیاء کے قصے لکھنے یا مبداٗ و معاد اور دوسرے اسلامی عقائد پر اظہار رائے کرنے کے لیے اسلام کے مبانیٔ اولیہ یعنی حدیث، تفسیر اور سیرت کی کتابوں سے رجوع کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ شرعی حکم دریافت کرنے کے لیے ان کتابوں سے رجوع کیا جاتا ہے اور جس کے لیے ضروری ہے کہ رجوع کرنے والا قرآن مجید کے زمانے کی عربی زبان اور معصومینؑ کی احادیث کی شناخت کے ساتھ ساتھ علم رجال، درایہ اور اصول فقہ میں مہارت رکھتا ہو۔ نیز یہ کہ اس نے کچھ عرصے تک ایک جامع الشرائط فقیہ کے زیر نظر رہ کر مذکورہ بالا علوم کی روشنی میں

شرعی احکام کے استنباط کے لیے قرآن مجید و سنت سے استفادہ کرنے کے طریقوں کے مطابق کام کیا ہو یعنی ایک مدت تک دینی مراکز میں فقہاء کے "درسِ خارج" میں حاضر رہا ہو۔

جس طرح ایک ایسا شخص جو مذکورہ بالا علوم میں تخصص نہ رکھتا ہو اور اس نے کسی فقیہ کی نگرانی میں کام نہ کیا ہو اسلام کے اولین منابع سے فقہی حکم کا استخراج نہیں کر سکتا اسی طرح ایک ایسا شخص جو ان علوم میں تخصص نہ رکھتا ہو اور اس نے کسی فقیہ سے تربیت حاصل نہ کی ہو اسلام کے عقائد، قرآن کی تفسیر اور رسول اکرمؐ اور ائمہ اہلبیتؑ کی سیرت کے بارے میں معلومات استخراج کر کے اسلامی معاشرے کی دسترس میں نہیں دے سکتا۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ فزکس اور کیمیا کے ماہر کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ طب کی ان کتابوں سے رجوع کرے جو طبی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں اور ان کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنا یا دوسرے مریضوں کا علاج کرے۔ اس کام کو دنیا کے تمام علماء، عقلاء اور علمی ادارے جان کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص مذکورہ بالا علوم میں تخصص نہ رکھتا ہو اس کا اسلامی منابع سے رجوع کرنا اور کوئی چیز لکھنا اور اپنی رائے کا اظہار کرنا بھی مسلمانوں کے عقیدے کے لیے خطرناک ہو گا۔

اسلام کے اولین منابع سے رجوع کرنے کی شرط یہ تھی اور قرآن مجید سے رجوع کرنے کی شرط حسب ذیل ہے۔

دوسرا حصہ

قرآن مجید سے رجوع کرنے کی شرط

قرآن مجید سے رجوع کرنے کی شرط کا مطالعہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل وضاحت ضروری ہے:

قرآن مجید کی آیات دو حصوں یعنی محکم اور متشابہ میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ محکم آیات بھی اصول عقائد اور دوسرے اسلامی احکام و معارف کے بارے میں ہیں:

وہ آیات جو اسلامی اصولِ عقائد کے بارے میں ہیں جیسے کہ: خالق کی توحید اور

واضح قوانین پروردگار کی توحید۔

اور وہ آیات جو معاد، حساب کتاب اور ثواب و عقاب کے بارے میں ہیں۔

اور وہ آیات جو حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت خاتمؐ تک رسولوں کو بھیجنے اور انکی اطاعت واجب ہونے کے بارے میں ہیں۔

یہ تمام اصول عقائد ایسی محکم اور واضح آیات کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں کہ ہر وہ شخص جو عربی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہو اور ان کا مطلب سمجھنا چاہے وہ ان کا مطلب بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

اب ہم توحید کے بارے میں آیات کے چند نمونے بیان کرتے ہیں:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ [1]

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ [2]

لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۔ [3]

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ [4]

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۔ [5]

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۔ [6]

---

[1] سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۵۵ [2] سورۂ مومنون۔ آیت ۹۱ [3] سورۂ انبیاء۔ آیت ۲۲
[4] سورۂ احقاف۔ آیت ۴ [5] سورۂ رعد۔ آیت ۱۶ [6] سورۂ فرقان۔ آیت ۳

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔ [1]

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ [2]

ہر وہ شخص جو عربی زبان سے واقفیت رکھتا ہے ان آیات سے اور سیکڑوں دوسری آیات سے الوہیت اور ربوبیت کی توحید کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

اور معاد کے بارے میں آیات کے نمونے حسب ذیل ہیں:

وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۔ [3]

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۔ [4]

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ۔ [5]

وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ [6]

گزشتہ آیات سے اور دوسری سیکڑوں آیات سے، حشر، حساب کتاب ثواب کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

پیغمبروں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ:

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔ [7]

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ [8]

اور خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ [9]

---

[1] سورۂ فاتحہ۔ آیت ۲ — [2] سورۂ کہف۔ آیت ۱۴ — [3] سورۂ یٰسین۔ آیت ۳۲

[4] سورۂ یٰسین۔ آیت ۷۸ — [5] سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱۵ — [6] سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۲

[7] سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۱۳ — [8] سورۂ نساء۔ آیت ۶۴ — [9] سورۂ سبا۔ آیت ۲۸

آنحضرتؐ کی اطاعت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمَآ اٰتٰاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔[1]

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى ۔[2]

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔[3]

ان آیات کے مجموعے سے مطلب بالکل واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

☼

ایسی آیات جو اسلامی عقائد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں محکم آیات ہیں اور جو شخص عربی زبان سے واقف ہو وہ ان سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے

محولہ آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی محکم آیات اسلامی احکام، اخلاق اور معارف کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

ان میں وہ آیات شامل ہیں جن میں لفظ "امر" اور اس کے مشتقات کے ساتھ احکام دیے گئے ہیں مثلاً:

اَمَرَ رَبِّىْ بِالْقِسْطِ ۔[4]

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِى الْقُرْبٰى ۔[5]

یا جن میں لفظ "کتب" اور اس کے مشتقات آئے ہیں مثلاً:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَيْکُمُ الْقِصَاصُ ۔[6]

---

[1] سورۂ حشر۔ آیت ۷ [2] سورۂ نجم۔ آیت ۳-۴ [3] سورہ احزاب۔ آیت ۳۶

[4] سورۂ اعراف۔ آیت ۲۹ [5] سورۂ نحل۔ آیت ۹۰ [6] سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۷۸

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ . [1]

اور بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں صیغۂ فعل امر کے ساتھ حکم دیا گیا ہے مثلاً:

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ [2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ . [3]

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ . [4]

اور وہ بھی محکم آیات ہیں جن میں لفظ "حرّم" اور "نہی" اور ان کے مشتقات کے ساتھ بعض اعمال اور افعال سے منع فرمایا گیا ہے مثلاً:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ [5]

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ ... [6]

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [7]

اور بعض اوقات " لَا " ناہیہ اور صیغہ نہی کے ساتھ نہی کا حکم صادر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً:

لَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا   لَا تُسْرِفُوْا   لَا يَزْنِيْنَ

لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا .

یہ اور دوسری بہت سی آیات احکام اور دوسرے اسلامی معارف کے بارے میں محکم آیات ہیں۔

لیکن ایسی محکم قرآنی آیات جو حلال و حرام اور مباح، مستحب اور مکروہ کے بارے میں حکم دیتی ہیں اور وہ عام حکم بیان فرماتی ہیں مثلاً یہ کہ نماز قائم کرو، زکات دو، ماہ رمضان میں روزے رکھو، غیبت نہ کرو۔ یہ اور بہت سے دوسرے اسلامی احکام اور آداب ایسے ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں عام حکم آیا ہے لیکن ان کی کیفیت بیان نہیں کی گئی اور خدا

---

[1] سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۸۲ [2] سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۳ [3] سورۂ مائدہ۔ آیت ۱

[4] سورۂ انعام۔ آیت ۱۵۲ [5] سورۂ اعراف۔ آیت ۳۳ [6] سورۂ نساء۔ آیت ۲۳

[7] سورۂ حشر۔ آیت ۷

نے اس بارے میں فرمایا ہے کہ:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ.[۱]

اور ہم نے تم پر ذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہے تم ان سے صاف صاف بیان کر دو۔

لہٰذا ان محکم آیات پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم رسول اکرمؐ سے رجوع کریں کیونکہ آنحضرتؐ خدا کی جانب سے اس کام پر مامور ہوئے ہیں کہ قرآن کے احکام کی تفصیل ہمیں بتائیں، اور رسول اکرمؐ سے ان احکام کی تفصیل حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں کہ ہم اسلام کے اولین منابع سے رجوع کریں اور اسلام کے اولین منابع سے رجوع کرنے کے لیے وہی شرائط لازم ہیں جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اب تک ہم نے قرآن مجید کی محکم آیات کی دو اصناف کا ذکر کیا ہے۔ محکم آیات کی ان دو اصناف کے علاوہ متشابہ آیات ہیں اور ظاہر ہے کہ ان متشابہ آیات کو سمجھنے کے لیے قرآن و سنت کے ماہرین سے رجوع کرنا ضروری ہے ورنہ انسان پر خدا کے ارشاد کا اطلاق نہ ہو گا:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ.[۲]

جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ انہیں آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ ہیں تاکہ فساد برپا کریں اور اپنی خواہش کے مطابق ان کی تاویل کریں۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی بنا پر خالق اور واضع قوانین پروردگار کی توحید اور روز قیامت، حساب کتاب، ثواب اور عقاب کی معرفت اور حضرت خاتم النبیینؐ تک تمام

---

[۱] سورۂ نحل۔ آیت ۴۴ [۲] سورۂ آل عمران۔ آیت ۷

انبیائے کرام علیہم السلام کی اطاعت اور ان سے اسلام کا نظام حاصل کرنے کے وجوب کے بارے میں محکم آیات سے رجوع کرنا ہر اس شخص کے لیے ممکن اور آسان ہے جس کی زبان عربی ہو۔

لیکن محکم آیات پر عمل کرنے کے لیے جن میں عام احکام بیان کیے گئے ہیں یہ ضروری ہے کہ ہم ان احکام کی تفصیل اور کیفیت رسول اکرمؐ سے معلوم کریں تاکہ ان کے مطابق عمل انجام دے سکیں۔ اسی طرح عقائد کے سلسلے میں ہمیں چاہیے کہ خدا کی صفات اور انبیا و ائمہؑ کی صفات کی تفصیل اور حشر، جنت، جہنم، شفاعت اور حوض کوثر کی کیفیت کی تفصیل اور دوسرے اسلامی معارف مثلاً آسمانوں، زمین، فرشتوں، جنوں اور انسانوں کی تخلیق کی کیفیت کی تفصیل رسول اکرمؐ سے سیکھیں یعنی ہمیں چاہیے کہ اولین اسلامی منابع (حدیث اور سیرت کی کتابوں سے رجوع کریں۔ جن سے رجوع کرنے کے لیے ان شرائط کا پورا کرنا ضروری ہے جن کا درس کے شروع میں ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید سے رجوع کرنے کے لیے دوسری اہم شرط یہ ہے کہ رجوع کرنے والا واقعی قرآن مجید سے کوئی علم یا مطلب سیکھنا چاہتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خود کسی چیز پر اعتقاد رکھتا ہو اور قرآن مجید اور اولین اسلامی منابع کی جانب اس لیے رجوع کرے تاکہ اپنی خواہش کے مطابق سند حاصل کر سکے۔ ایسا شخص قرآن مجید اور حدیث کی تاویل اپنی رائے کے مطابق کرتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص سرمایہ دارانہ یا اشتراکی نظام پر یقین رکھتا ہو یا ڈارون، فرائڈ یا سارٹر وغیرہ کے نظریات کا بے حد گرویدہ ہو گیا ہو اور اپنے اعتقاد پر شہادت حاصل کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے رجوع کرے اور پھر بعض آیات یا احادیث کی اپنی رائے کے مطابق تاویل کرے۔ ایسے شخص نے یہ نہیں چاہا کہ قرآن یا حدیث سے کوئی چیز حاصل کرے بلکہ یہ چاہا ہے کہ اپنی رائے قرآن اور حدیث پر مسلط کر دے۔ علماء نے اس فعل کو "تفسیر بالرائے" کا نام دیا ہے۔

اس عمل سے جو نقصان پہنچتا ہے اسے سمجھنے کے لیے اب ہم قرآن مجید کی "تفسیر بالرائے" کی مذمت اور ممانعت کے بارے میں چند احادیث نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم بعض مفسرین کی جانب سے کی گئی "تفسیر بالرائے" کے اور اس کے علاوہ

ان لوگوں کی تفسیر کے چند نمونے پیش کریں گے جو عربی سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔

تفسیر بالرائے کی ممانعت کے بارے میں چند روایات

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے اپنے اجداد سے اور انہوں نے امیرالمومنینؑ سے اور انہوں نے رسول اکرمؐ سے روایت فرمائی ہے کہ خدائے عز وجل نے فرمایا:

"جو شخص میرے کلام کی تفسیر اپنی رائے کے مطابق کرے وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔"[1]

ترمذی نے اپنی "صحیح" میں رسول اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے بات کرتا ہے وہ اپنی جگہ کا انتخاب دوزخ میں کرتا ہے۔"[2] نیز بحارالانوار، صحیح ترمذی اور سنن ابوداؤد میں رسول اکرمؐ سے روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "جو شخص خدا کی کتاب میں اپنی رائے سے کوئی چیز کہے اور درست کہے وہ خطا کرتا ہے۔"[3]

---

[1] بحارالانوار، کتاب القرآن، باب تفسیر بالرائے جلد ۹۲ صفحہ ۱۰۷ عیون الاخبار جلد ۱ صفحہ ۱۱۶ اور شیخ صدوق کی کتاب توحید باب اول صفحہ ۳۷۔ امالی صدوق صفحہ ۵ پر یوں روایت کی گئی ہے: عَنِ الرِّضَا عَنْ اٰبَآئِهٖ عَنْ اَمِیْرِالْمُؤْمِنِیْنَ عَلَیْهِمُ السَّلَامُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ : قَالَ اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ : مَا اٰمَنَ بِیْ مَنْ فَسَّرَ بِرَاْیِهٖ کَلَامِیْ ...

[2] صحیح ترمذی، کتاب تفسیر، باب مَاجَاءَ فِی الَّذِیْ یُفَسِّرُ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِهٖ جلد ۱۱ صفحہ ۶۷
قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ :
مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِرَاْیِهٖ فَلْیَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ ۔

[3] صحیح ترمذی کتاب تفسیر باب مَاجَاءَ فِی الَّذِیْ یُفَسِّرُ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِهٖ جلد ۱۱ صفحہ ۶۸ ۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، باب الکلام فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ جلد ۳ صفحہ ۳۲۰ ۔ بحارالانوار، جلد ۹۲ صفحہ ۱۱۱ بحوالہ منیۃ المرید : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ : مَنْ قَالَ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ بِرَاْیِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَاَ ۔

اور بحارالانوار میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے بھی روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنے سے پرہیز کرو تاوقتیکہ اسے علماء سے نہ سمجھ لو" ۱؎

رسول اکرمؐ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اپنے بعد مجھے اپنی امت سے تین خصلتوں کا خوف ہے: یہ کہ وہ قرآن کے اصلی معانی کے خلاف کچھ معانی اور کریں۔ عالم کی لغزش کی ٹوہ میں رہیں اور انہیں اتنی دولت حاصل ہو جائے کہ وہ باغی اور سرکش ہو جائیں۔ میں تمہیں نجات کا راستہ بتاتا ہوں:

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کی محکم آیات پر عمل کرو اور اسکی متشابہات پر ایمان لاؤ اور عالم کی لغزش کو تلاش نہ کرو اور اسکی لغزش سے واپسی کا انتظار کرو اور اور مال سے نجات کا راستا نعمت پر شکر کرنا اور اس کا حق ادا کرنا ہے۔ ۲؎

اور رسول اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

۱؎ بحارالانوار جلد ۹۲ صفحہ ۱۰۷۔ شیخ صدوق کی کتاب توحید باب ۳۶ میں اسطرح روایت کی گئی ہے:

قَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَیْهِ السَّلَامُ اِیَّاكَ اَنْ تُفَسِّرَ الْقُرْآنَ بِرَأْیِكَ حَتّٰی تُفَقِّهَهُ عَنِ الْعُلَمَاءِ.

۲؎ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ:

اِنَّمَا اَتَخَوَّفُ عَلٰی اُمَّتِیْ مِنْ بَعْدِیْ ثَلَاثَ خِلَالٍ: اَنْ یَتَاَوَّلُوا الْقُرْآنَ عَلٰی غَیْرِ تَاْوِیْلِهٖ، وَیَتَّبِعُوْا زَلَّةَ الْعَالِمِ، اَوْ یَظْهَرَ فِیْهِمُ الْمَالُ حَتّٰی یَطْغَوْا وَیَبْطِرُوْا، وَسَاُنَبِّئُكُمُ الْمَخْرَجَ مِنْ ذٰلِكَ: اَمَّا الْقُرْآنَ فَاعْمَلُوْا بِمُحْكَمِهٖ وَاٰمِنُوْا بِمُتَشَابِهِهٖ وَاَمَّا الْعَالِمَ فَانْتَظِرُوْا فَیْئَتَهٗ وَلَا تَتَّبِعُوْا زَلَّتَهٗ. وَاَمَّا الْمَالَ فَاِنَّ الْمَخْرَجَ مِنْهُ شُكْرُ النِّعْمَةِ وَاَدَاءُ حَقِّهٖ.

بحارالانوار کتاب القرآن باب تفسیر القرآن بالرای وتغیرہ الحدیث ۵ جلد ۹۲ صفحہ ۱۰۸۔
آمالی الصدوق جلد ا صفحہ ۷۸

”مجھے اپنے بعد اپنی امت کے اس شخص کے بارے میں سب سے زیادہ فکر ہے جو قرآن کے اصلی معنی کے خلاف اس کے معنی کرے۔“

ایک اور روایت میں جن تین چیزوں کے متعلق آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ مجھے اپنی امت کے بارے میں ان سے بہت زیادہ خوف ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

”منافق کا مباحثے میں قرآن سے استدلال کرنا۔“ [۱]

اور بالخصوص غیر عالم لوگوں کے قرآن مجید کی تاویل کرنے کے بارے میں آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: ”جو شخص علم نہ رکھتے ہوئے قرآن کے بارے میں کوئی بات کہے وہ اپنے لیے جہنم میں جگہ تیار کرتا ہے۔“ [۲]

آنحضرتؐ نے ایک اور روایت میں فرمایا ہے: ”جو شخص علم نہ رکھتے ہوئے قرآن کے بارے میں کوئی چیز کہے وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے منہ میں آگ کی لگام ہوگی۔“ [۳]

---

[۱] قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَآلِہٖ:
أَكْثَرَ مَا أَخَافُ عَلَىٰ أُمَّتِيْ مِنْ بَعْدِيْ: رَجُلٌ يَتَأَوَّلُ الْقُرْآنَ يَضَعُهُ فِيْ غَيْرِ مَوَاضِعِهِ. (بحار الانوار، کتاب القرآن باب تَفسِيْرُ الْقُرْآنِ بِالرَّأْيِ وَتَغْيِيْرُهُ، جلد ۱۹۲ صفحہ ۱۲۲ بحوالہ منیۃ المرید)

[۲] قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَآلِہٖ:
أَشَدُّ مَا يُتَخَوَّفُ عَلَىٰ أُمَّتِيْ ثَلَاثٌ: زَلَّةُ عَالِمٍ أَوْ جِدَالُ مُنَافِقٍ بِالْقُرْآنِ...
بحار الانوار، کتاب القرآن باب تفسیرُ القرآنِ بِالرَّأْيِ وتغییرُہٗ، فضائل صدوق جلد ۱ صفحہ ۷۸

[۳] قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَآلِہٖ:
مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.
جامع ترمذی، الکتاب التفسیر، باب ما جاء فی الذی یفسر القرآن برأیہ جلد ۱۱ صفحہ ۶۷، مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۳۳، بحار الانوار کتاب القرآن باب تفسیر القرآن بالرأی تغییرہ
قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَآلِہٖ، مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُلْجَمًا بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ.

بائیسواں درس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ
اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ.
(سورۃ زُمَر۔ آیت ۹)

گزشتہ درس میں ہم نے اسلام کے اولین منابع سے رجوع کرنے کی شرط بیان کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ قرآن مجید میں محکم اور متشابہ دونوں طرح کی آیات موجود ہیں محکم آیات وہ ہیں جن میں خالق، توحید، معاد، انبیاء کی بعثت اور ان کی اطاعت واجب ہونے کے ثبوت کے بارے میں فرمایا گیا ہے اور جنہیں ہر وہ شخص جس کی زبان عربی ہو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ نیز نماز، روزے، زکات اور سود کے بارے میں عام احکام اکثر و بیشتر محکم آیات میں آئے ہیں لیکن ان پر عمل کرنے کے لیے ان احکام کے تفصیلی بیان کرنیکی ضرورت ہے جو اسلام کے اولین منابع یعنی رسول اکرمؐ کی سیرت اور احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ نیز دوسرے اسلامی عقائد اور معارف مثلاً خدا کی صفات اور آسمانوں، زمین، فرشتوں، جنوں اور انسانوں کی تخلیق کی تفصیل کے بارے میں معلومات بھی انہیں اولین منابع سے حاصل کرنی چاہییں اور متشابہ آیات کی تاویل بھی وحی سے انہیں اولین منابع کے وسیلے سے معلوم کرنی چاہیے۔

پس وہی شرائط جو اسلام کے دوسرے اولین منابع سے رجوع کرنے کے لیے لازم ہیں وہ قرآن مجید سے رجوع کرنے کے لیے بھی لازم ہیں اور اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص قرآن مجید اور اسلام کے دوسرے اولین منابع سے رجوع کرے وہ ایسے طرز فکر

اور عقیدے کا حامل نہ ہو کہ اپنے مقصد کے لیے دلیل تلاش کرنے کے لیے ان سے رجوع کرے کیونکہ اس صورت میں وہ تفسیر بالرائے کرے گا اور بہر حال اس کے لیے عربی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے ورنہ وہ بعض اوقات قرآن مجید کی مضحکہ خیز تفسیریں کرے گا۔

اب ہم تفسیر بالرائے اور عربی زبان سے ناواقف لوگوں کی کی ہوئی تفسیر کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

ا : ایک صاحب نے جنہوں نے اپنا تعارف "اندیشۂ قرن" کے نام سے کرایا' آیۂ "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ" [1] کو "وَلَا تَقِفْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ" پڑھا اور اس کے معنی یہ کیے کہ: "اگر تم علم نہیں رکھتے تو بھی کھڑے نہ رہ جاؤ۔ جاؤ علم حاصل کرو۔"

ب : میں نے ایک اور مفسر کو سنا جو "وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ" [2] کی تفسیر میں کہہ رہے تھے: دیکھیے اسلام میں عورت کا مقام کتنا بلند ہے کہ خدا نے قرآن میں عورتوں کے رحم کا نام — یعنی اس جگہ کا نام جس میں وہ انسانیت کا گرانبہا موتی رکھتی ہیں — اپنے نام کے ساتھ ساتھ لیا ہے اور فرمایا ہے: "خدا کو اور عورتوں کے رحم کو"

ج : میں نے ایک اور مشہور مفسر کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: اگر قرآن کی تفسیر میں ہمیں کوئی ایسے معنی سمجھ میں آئیں جو گزشتہ لوگوں نے بتائے ہوں تو ہماری کہی ہوئی بات نہیں مانی جاتی۔ اس تمہید کے بعد انہوں نے خاص تفصیل سے کہا:
حضرت علیؑ نے "وَالذَّارِيَاتِ ذَرْوًا ......" [3] کی تفسیر میں ایک رائے کا اظہار کیا تھا لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس آیت میں خدا نے عالم ذرہ (ایٹم) کے

---

[1] سورۂ اسراء۔ آیت ۳۶۔ یہ بات ان صاحب نے ایک تقریر میں کہی جسے ریڈیو تہران نے نشر کیا۔
[2] سورۂ نساء۔ آیت ۴۔ یہ قول میں نے ایک کیسٹ پر سنا جس میں ان کی تفسیر کا درس ریکارڈ کیا گیا تھا۔
[3] انہوں نے یہ بات ایک تفسیری درس میں کہی جسے ریڈیو ایران نے ساری دنیا میں نشر کیا۔

بارے میں خبر دی ہے۔ "والحاملات وقراً" میں بھی بجلی (الیکٹرسٹی) کے بار کی ترسیل کا بیان ہے۔

د : ایک اور مشہور مفسر نے لکھا ہے:

"قرآن فقط ضمنی طور پر اور بالواسطہ اثر کے ساتھ ہی بشریت کی وحدت کے عامل کی حیثیت سے عالمی ریاست اور انسانی تہذیب و تمدن تشکیل دینا نہیں چاہتا بلکہ قوموں کے اختلاف، تفرقے اور مخاصمت کے خلاف معرکہ آرائی کو پسند کرتا ہے اور اس پر زور دیتا ہے۔ اس نکتے کی گہرائی تک مشرق اور مغرب کے حالیہ محققین اور مفسرین قرآن میں سے کوئی بھی نہیں پہنچ سکا۔" [1]

"وہ رسول اکرمؐ اور مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ اگر کچھ لوگ ایسے ہوں جو اپنا قانون دوسروں سے الگ کرنا چاہتے ہوں تو تم ہرگز ان میں سے نہیں ہو۔" [2]

وہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی یہ کہہ کر تحقیر اور تکفیر نہیں کرتا کہ تم احمق یا طل پر ہو اور دوزخی ہو اور نہ ہی انہیں مٹ جانے اور شکست کھانے کے لیے مقابلے پر بلاتا ہے۔ اس کے برعکس اس نے پیغمبر آخر الزمانؐ کو اہل کتاب سمیت تمام انسانوں کے لیے بھیجا اور "مُصَدِّقاً لِّمَا"... کہہ کر اس کا تعارف ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے والے اور ان کی حفاظت کرنے والے کے طور پر کرایا۔ وہ ان پر نکتہ چینی اور ان کی گمراہی اور بدنیتی کی اصلاح کی خواہش کے ضمن میں انہیں یک رنگی اور ہم آہنگی کی دعوت دیتا ہے۔ پھر تمام اعتراضات اور اختلافات کو نظر انداز کر کے ایک بنیادی مطلب اور اصول پر اکتفا کرتا ہے اور کہتا ہے: تم ایسے کلمے اور شعار کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے

---

[1] نقش پیامبران در تمدن جہان (دوسرا ایڈیشن)۔ اس کتاب کا مقدمہ (صفحہ ۲۶ سے ۳۱ تک) ملاحظہ فرمائیں۔

[2] ___ ایضاً ___ صفحہ ۲۹۔ انہوں نے یہ مطلب سورہ انعام کی ۱۵۹ ویں آیت اور سورۂ انعام کی ۳۱ ویں اور ۳۲ ویں آیت سے اخذ کیا ہے جو مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

[اور جس کی جانب توجہ دینے سے اختلافات کے تمام اسباب ختم ہو جائیں گے] - ہم ایک دائرہ بنالیں اور عہد کریں کہ خدا کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں گے اور اپنے آپ کو ایک دوسرے کا پروردگار اور سردار نہ سمجھیں گے۔ [1]

وہ اہل کتاب سے کہتا ہے: اگر تم پر اعتراض ہے تو اس بات پر ہے کہ تم اپنی کتاب پر عمل نہیں کرتے اور اگر تم اس پر عمل کرو تو تمہیں آسمان اور زمین سے خدا کی کثیر نعمتیں میسر آئیں گی۔ [2]

اگر قرآن اہل کتاب کو توحید کے پرچم تلے آنے کی دعوت دیتا ہے اور مسلمانوں کو بھی وصیت کرتا ہے کہ تم اس بات پر اصرار نہ کرو کہ اہل کتاب تمہاری امت کا جزو بن جائیں اور تمہارے آگے سر تسلیم خم کر دیں بلکہ خدا نے ہر قوم کے لیے راہ و رسم مقرر کی ہے اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن وہ چاہتا ہے کہ ہر ایک کو اس چیز سے آزمائے جو اس نے اسے دی ہے۔ پس اگر تم صحیح کہتے ہو تو خدمات اور خیرات کے بارے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرو اور تمہارے درمیان جو اختلافات ہیں ان کے متعلق خدا اس دن فیصلہ کرے گا جس دن تم اس کے پاس جمع ہو گے۔ [3]

جو اہل کتاب یا مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ خدا کی مخلوق ہیں اور عذاب سے محفوظ رہیں گے وہ ان کے اس اجارہ داری اور بلاوجہ افتخار کے دعوے پر سخت تنقید کرتا ہے اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ خدا اور بہشت کسی کی خواہش کے پابند نہیں ہیں۔ جو شخص برے کام کرتا ہے وہ ان کا برا انجام دیکھے گا اور خدا کے مقابلے میں اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور جو عورت یا مرد اچھے کام انجام دے گا اور مومن ہو گا وہ بہشت میں داخل ہو گا۔ [4]

---

[1] نقش پیامبران در تمدن جہان صفحہ ۲۹ یہاں سورۂ آل عمران کی ۶۴ ویں آیت سے استشہاد کیا گیا ہے۔ [2] ایضاً صفحہ ۳۰ یہاں سورۂ مائدہ کی ۷۲ ویں آیت سے استشہاد کیا گیا ہے۔ [3] ایضاً صفحہ ۳۱ [4] ایضاً صفحہ ۳۱۔ آخر مطلب کو سورۂ نساء کی ۱۲۳ ویں آیت کی تشریح قرار دیا گیا ہے۔

انہوں نے اسی مطلب کو دہراتے ہوئے کہا: "یہاں جو دقیق نکتہ ہے اور جسے دہرانا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ: اے لوگو اور اے اہل کتاب میرے پرچم تلے آجاؤ بلکہ آپ نے فرمایا کہ خدا کے پرچم نیچے جمع ہو جاؤ اور جس پیغمبر کے طریقے کے مطابق تمہارا جی چاہے خدا کی بندگی کرو۔ فقط پیغمبروں کے کلمۂ واحد کو متفرق اور مخصوص نہ کرو۔ مکتب کی بڑائی اور حقانیت کی نشانی بھی یہی ہے ورنہ پیغمبر اسلامؐ بھی بہت سے دوسرے مدعیوں کی مانند ہو جاتے۔ ایسے بہت سے اشخاص ہیں جنہوں نے دنیا میں یگانگت اور وحدت کی دعوت دی ہے یا عالمی ریاست کے قیام کی جانب قدم اٹھایا ہے۔" [1]

انہوں نے اس سے پیشتر بھی فرمایا ہے اور کہا ہے:

"قرآن کی نظر میں اہل کتاب کے علاوہ بھی اگر کچھ لوگ خدا پرست ہوتے ہوئے اور آخرت پر اعتقاد رکھتے ہوئے صحیح راستے میں قدم اٹھائیں تو انہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔" [2]

ان تفسیروں کی جانچ پڑتال

کیا وجہ ہوئی کہ اس مفسر نے "وَلَا تَقْفُ" کو جو قرآن میں قاف کے جزم اور فار کے پیش کے ساتھ آیا ہے اور جس کا فعل ماضی (قفا) 'پیروی کی' کے معنوں میں ہے قاف کی زیر اور فار کے جزم کے ساتھ "وَلَا تَقِفْ" پڑھا جس کا ماضی (وقف) ہے اور اس نے اس کے معنی 'کھڑا ہوا' سمجھے؟ کیا اس کی اس کے علاوہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس کی زبان عربی نہ تھی؟

چونکہ اس دوسرے مفسر کی زبان بھی فارسی تھی اور فارسی میں لفظ ارحام بلبشتر

---

[1] نقش پیامبران در تمدن جہان صفحہ ۳۸

[2] ایضاً صفحہ ۳۱ اور ۳۲۔ اسے سورۂ نسار کی ۱۲۳ ویں آیت اور سورۂ مائدہ کی ۵۳ ویں آیت کی تشریح قرار دیا گیا ہے۔

عورتوں کے رحم کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "خویش" کے معنی میں کم استعمال ہوتا ہے اس لیے اس نے سمجھا کہ آیت میں اس لفظ کے معنی عورتوں کے رحم کے ہیں۔

اور ان مشہور مفسر کی زبان بھی چونکہ فارسی تھی اس لیے انہوں نے اس بات کی طرف توجہ نہیں دی کہ آجکل عربی میں جو لفظ 'ذرہ' ایٹم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ "ذرر" سے نکلا ہے اور "الذاریات" کا جو لفظ آیت میں استعمال ہوا ہے وہ "ذرو" سے نکلا ہے جیسا کہ خود آیت میں بھی فرمایا گیا ہے :

"الذاریات ذروا" علاوہ ازیں اگر ان کی زبان فارسی نہ ہوتی تو وہ سمجھ جاتے کہ جو تفسیر امام علی علیہ السلام نے فرمائی ہے (منتشر کرنے والی ہوائیں) وہ خود قرآن مجید کی سورۂ کہف کی ۴۵ ویں آیت میں آئی ہے : "فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيَاحُ" "ٹوٹ پھوٹ گیا اور ہوائیں اسے منتشر کر رہی ہیں۔

آخری مشہور مفسر کی زبان بھی چونکہ فارسی تھی اس لیے وہ بھی اپنی رائے سے متشابہاتِ قرآن کی تاویل کرنے میں مغالطہ کھا گئے۔ اگر ان کی زبان بھی عربی ہوتی اور وہ قرآن کی محکمات سے رجوع کرتے تو یوں مغالطے سے دوچار نہ ہوتے کہ کہتے :

"وہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی یہ کہہ کر تحقیر اور تکفیر نہیں کرتا کہ تم احمق باطل پر ہو اور دوزخی ہو اور نہ ہی انھیں مٹ جانے اور شکست کھانے کے لیے مقابلے پر بلاتا ہے"۔ کیونکہ ہم قرآن کی محکم آیات میں دیکھتے ہیں کہ اس نے بالخصوص عیسائیوں کو مٹ جانے اور شکست کھانے کے لیے مقابلے پر بلایا ہے اور فرمایا ہے :

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۔ [1]

یعنی کہدو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ اور ہم اپنی عورتوں کو بلائیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنی جانوں کو بلائیں اور تم اپنی جانوں کو بلاؤ۔ اس کے بعد ہم سب مل کر خدا کی بارگاہ میں گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔

---

[1] سورۂ آل عمران - آیت ۶۱

اور انھیں عیسائیوں کو کافر قرار دیا ہے اور ان کے کفر کی وجہ یوں بیان فرمائی ہے:
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ بْنُ مَرْيَمَ.[۱]
یعنی جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ مریمؑ کے بیٹے مسیحؑ خدا ہیں وہ ضرور کافر ہو گئے ہیں۔
قرآن اسی سورہ کی ۷۲ ویں آیت میں بھی اس تکفیر کو دہراتا ہے اور یہ عقیدہ جو قرآن کی نظر میں ان کے کفر کا سبب ہے اب تک ان سب میں موجود ہے۔
ایک اور آیت میں فرماتا ہے:
وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ بْنَ مَرْيَمَ ...[۲]
یعنی نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیحؑ خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ تو ان کی بات ہے اور (وہ بھی خود) ان ہی کے منہ سے۔ یہ لوگ بھی ان ہی کافروں کی سی باتیں بنانے لگے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ خدا ان کو غارت کرے۔ دیکھو تو کہاں سے کہاں بھٹکے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور زاہدوں کو اور مریمؑ کے بیٹے مسیحؑ کو اپنا پروردگار بنا ڈالا.....
نیز فرمایا ہے:
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ...[۳]
جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ خدا تین میں تیسرا ہے وہ یقیناً کافر ہو گئے ہیں۔ (یاد رکھو) خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں۔

---

[۱] سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۷ [۲] سورۂ توبہ۔ آیت ۳۰ [۳] سورۂ مائدہ۔ آیت ۷۳

ایک اور آیت میں ارشاد ہے :

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۔ [1]

یعنی اے اہل کتاب، ایمان لاؤ اس (کتاب) پر جو ہم نے نازل کی ہے۔ جب کہ وہ اس کی بھی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم تمہارے چہرے پیچھے کی طرف پھیر دیں اور تم پر لعنت کریں جیسے کہ ہم نے اصحاب سبت (سنیچر والوں) پر لعنت کی تھی۔

اب ہم سورۂ نسار کی یہ آیات نقل کرتے ہیں جو مطلب کو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ ارشاد ہوا ہے :

جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان تفرقہ ڈالنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پیغمبروں پر ایمان لائے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں کہ سب سے انکار کرنے اور سب پر ایمان لانے کے درمیانی راستے پر چلیں وہ لوگ حقیقتاً کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (آیات ۱۵۰-۱۵۱)

اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور انہوں نے ان کے درمیان (ایمان لانے کے بارے میں) کوئی تفریق نہیں کی خدا انہیں اس کا اجر دے گا اور خدا تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ (آیت ۱۵۲)

(اے رسولؐ!) اہل کتاب تم سے کہتے ہیں کہ تم ان کے لیے ایک کتاب آسمان سے نازل کراؤ۔ (آیت ۱۵۳ کا جزو)

ان کے اپنا عہد توڑنے کی وجہ سے اور خدا کی نشانیوں سے انکار کی وجہ سے .... (آیت ۱۵۵ کا جزو)

---

[1] سورۂ نسار۔ آیت ۴۷

اور ان کے کفر کی وجہ سے اور مریمؑ پر بہتان باندھنے کی وجہ سے اور یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے خدا کے رسول عیسٰی بن مریمؑ کو قتل کر دیا۔
(آیت ۱۵۶ اور ۱۵۷ کا جزو)

لیکن ان میں جو لوگ علم میں راسخ ہیں اور مومن ہیں وہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے (آسمانی کتابیں) اس پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکات دیتے ہیں اور خدا و یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ لوگ ہیں جنہیں ہم بہت بڑا اجر دیں گے۔ (آیت ۱۶۲)

(اے رسولؐ! ہم نے تم پر اسی طرح وحی کی ہے جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد آنے والے پیغمبروں پر کی تھی۔ (آیت ۱۶۳ کا جزو)

خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر۔ (آیت ۱۶۵ کا جزو)

لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ اس نے جو کچھ تم پر نازل فرمایا ہے خود اپنے علم سے نازل فرمایا ہے اور فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں اور فقط خدا کی گواہی کافی ہے۔ (آیت ۱۶۵ کا جزو)

جنہوں نے (تمہارا) انکار کیا اور (لوگوں کو) خدا کی راہ سے روکا وہ راہِ راست سے بھٹک گئے اور بہت دُور جا پڑے۔ (آیت ۱۶۷ کا جزو)

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کرتے رہے نہ تو خدا انہیں بخشے گا اور نہ ہی انہیں راہِ راست کی جانب ہدایت کرے گا بلکہ انہیں جہنم کا راستہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔ (آیات ۱۶۸-۱۶۹)

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک رسولؐ آئے ہیں۔ پس ایمان لاؤ اور یہی تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر انکار کرو گے تو سمجھ لو کہ جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے سب خدا کا ہے اور خدا بڑا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

(آیت ۱۷۰)

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور خدا کی شان میں سچ کے سوا کوئی دوسری بات نہ کہو۔ بلاشبہ مسیح عیسیٰؑ ابن مریمؑ خدا کے ایک پیغمبر اور اس کا ایک کلمہ ہیں جو اس نے مریمؑ پر القا کیا اور اس کی طرف سے ایک روح ہیں۔ پس خدا اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ (خدا) تین ہیں۔ (آیت ۱۷۱ کا جزو)

لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے خدا انہیں ان کا پورا پورا اجر دے گا بلکہ اپنے فضل و کرم سے کچھ زیادہ ہی دے گا۔ (آیت ۱۷۳ کا جزو)

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس دلیل (رسول اکرمؐ) آچکی اور ہم نے تمہارے پاس ایک بیان کرنے والا چمکتا ہوا نور (قرآن) بھیجا ہے۔ (آیت ۱۷۴)

پس جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور اس سے وابستہ رہے وہ انہیں اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرلے گا اور انھیں سیدھا راستا دکھائے گا۔ (آیت ۱۷۵)

ان تمام آیات میں جو سورۂ نساء میں آئی ہیں اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ مومن وہ ہے جو خدا اور خدا کے نبیوں پر ایمان رکھتا ہو۔ ایسے شخص کو قرآن مومن کا نام دیتا ہے اور فرماتا ہے: اگر ایک شخص خدا اور اس کے تمام پیغمبروں اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو تو خدا کی جانب سے اس کا اجر بہشت ہے۔ جو کچھ ان آیات میں فرمایا گیا ہے اس کی بنا پر اگر کوئی شخص خدا کے ایک نبی پر ایمان نہ لائے تو اگرچہ وہ نبیٔ آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک باقی سب نبیوں پر ایمان رکھتا ہو لیکن قرآن اسے کافر کہتا ہے اور اسے مسلمان نہیں سمجھتا اور مومن کا نام نہیں دیتا۔ لہٰذا جو آیت اسی سورے میں ان آیات سے پہلے آئی ہے

یعنی آیہ ۱۲۳: "... وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ ."

اور جس سے آخری مفسر نے استدلال فرمایا ہے اس میں مومن سے مراد وہی شخص ہے جو خدا اور تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتا ہو جس کی اس آیت کے بعد کی آیات میں تصریح کی گئی ہے اور اگر ایسا مومن عمل صالح انجام دے تو اس کی جزا بہشت ہے۔

گزشتہ آیات ساری کی ساری سورۂ نساء سے تھیں۔ قرآن مجید میں اور بھی بہت سی ایسی آیات ہیں جن میں اہل کتاب پر خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰؐ پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے لعنت کی گئی ہے مثلاً مندرجہ ذیل آیات:

"اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب آئی اور وہ اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تصدیق بھی کرتی ہے اور اس سے پہلے (اسکی امید پر) کافروں پر فتحیاب ہونے کی دعائیں مانگتے تھے۔ پس جب ان کے پاس وہ چیز جسے پہچانتے تھے آگئی تو انکار کرنے لگے۔ پس کافروں پر خدا کی لعنت ہے۔ کیا ہی برا ہے وہ کام جس کے مقابلے ہیں (اتنی بات پر) وہ لوگ اپنی جانیں بیچ بیٹھے ہیں کہ خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنی عنایت سے کتاب نازل کیا کرے۔ اس رشک سے جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے سب کا انکار کر بیٹھے۔ پس ان پر غضب پر غضب ٹوٹ پڑا اور کافروں کے لیے بڑی رسوائی کا عذاب ہے اور جب ان سے کہا گیا کہ جو (قرآن) خدا نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ تو کہنے لگے کہ ہم تو اسی کتابِ منزل پر ایمان لائے ہوئے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی تھی اور اس کتاب (قرآن) کو جو اس کے بعد آئی ہے نہیں مانتے حالانکہ وہ (قرآن) حق ہے اور اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تصدیق بھی کرتی ہے۔" (سورۂ بقرہ - آیات ۸۹ تا ۹۱)

"بے شک جو لوگ ہماری ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جنہیں ہم نے نازل کیا اس کے بعد چھپاتے ہیں جبکہ ہم کتاب (تورات) میں لوگوں کے

سامنے صاف صاف بیان کر چکے تو یہی لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔ مگر جن لوگوں نے (حق چھپانے سے) توبہ کی اور اپنی خرابی کی اصلاح کرلی اور (جو کتاب خدا میں ہے) صاف صاف بیان کردیا۔ پس ان کی توبہ میں قبول کرتا ہوں اور میں تو بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہوں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے ان پر خدا کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔" (سورۂ بقرہ - آیات ۱۵۹ تا ۱۶۱)

"بے شک جو لوگ ان باتوں کو جو خدا نے کتاب میں نازل کی ہیں چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت (دنیوی نفع) لے لیتے ہیں یہ لوگ بس انگاروں سے اپنے پیٹ بھرتے ہیں اور قیامت کے دن خدا ان سے بات تک نہیں کرے گا اور نہ انہیں (گناہوں سے) پاک کرے گا اور انہیں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہی لوگ وہ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی اور بخشش کے بدلے عذاب۔ پس وہ لوگ دوزخ کی آگ کو کیونکر برداشت کریں گے۔"

(سورۂ بقرہ - ایات ۱۷۴ - ۱۷۵)

جب ہم نے اہل کتاب پر، جو حضرت خاتم النبیینؐ پر ایمان نہیں لائے تھے، خدا کی جانب سے کی گئی تمام لعنتیں پڑھ لیں اور دیکھ لیا کہ قرآن پر اس شخص کو جو آنحضرتؐ پر ایمان نہیں لایا ـــــ خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہو یا کوئی اور ـــــ کافر کہتا ہے اور مومن نہیں سمجھتا تو اس کے بعد ہم سورۂ مائدہ کی اس آیت کے معنی سمجھ سکتے ہیں جس سے مفسر نے استناد کیا ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا وَ الصّٰبِئُوْنَ وَ النَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ. (سورۂ مائدہ - آیت ۶۹)

یعنی اس میں تو شک ہی نہیں کہ ایمان لانے والے ہوں یا یہودی، صابئی ہوں یا نصاریٰ جو خدا اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا ان پر البتہ نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ لوگ آزردہ خاطر ہوں گے۔

اسی مضمون کی ایک اور آیت سورۂ بقرہ میں بھی آتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. (سورہ بقرہ - آیت ۶۲)

یعنی بے شک ایمان والوں اور یہودیوں اور نصرانیوں اور صابئیوں میں سے جو کوئی خدا اور روز آخرت پر ایمان لائے اور اچھے اچھے کام کرتا رہے انہیں کے لیے ان کا اجر و ثواب ان کے خدا کے پاس ہے اور (قیامت میں) ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہو گا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

ان دو آیتوں میں خدا کیسے فرماتا ہے کہ:

خدا کے اس ارشاد ... : "جو ایمان لائے ہیں .... ان میں سے جو خدا پر ایمان لایا" کا مقصد کیا ہے؟

اس کی شرح یوں ہے کہ ایمان کا لفظ قرآن مجید میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے:

ا : ایمان اسلام کے ساتھ مترادف ہے ــــ اس صورت میں ایمان لانے کے معنی اسلام لانے کے ہیں اور ایسے ایمان میں مومن اور منافق دونوں شامل ہیں

ب : ایمان نفاق کے مقابلے میں ــــ کچھ مسلمان اس قسم کا ایمان رکھتے ہیں۔

یہ شرح بیان کرنے کے بعد ہم کہتے ہیں کہ: دونوں آیتوں کے شروع میں جو "إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں 'ایمان' پہلے معنوں میں آیا ہے یعنی وہ جو کہ ایمان لائے ہیں اور دونوں آیتوں کے آخر میں جو "مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں 'ایمان' نفاق کے مقابلے میں ہے۔ لہٰذا دونوں آیتوں کے معنی یوں ہیں:

"وہ جو اسلام لائے ہیں اور وہ جو یہود اور نصاریٰ اور صابئیوں میں سے ہیں ان میں سے جو کوئی خدا اور روزِ قیامت پر ایمان لائے اور نیک کام انجام دے اس کا بدلہ خدا کے پاس ہے . . ."

ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ قرآن حضرت خاتم الانبیاءؐ تک تمام انبیاء پر ایمان لانے کو خدا پر ایمان لانے کا لازمہ قرار دیتا ہے اور ایسے مومن کے بارے میں کہتا ہے کہ اگر وہ نیک کام انجام دے تو اس کے لیے کوئی خوف اور پریشانی نہیں اور اس کا اجر پروردگار کے پاس ہے۔

لہٰذا ان دونوں آیتوں میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ: جو شخص مسلمان ہو گیا ہو یا یہودی، نصرانی یا صابئی ہو اگر وہ خدا اور تمام پیغمبروں اور روزِ قیامت پر ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اسے کوئی خوف نہیں اور اس کی جزا خدا کے پاس ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دین میں اقربا پروری نہیں ہے اور ایسا نہیں ہے کہ جس شخص کا نام مسلمانوں جیسا ہو اور وہ منافق ہو وہ تو بہشت میں چلا جائے اور جس کسی کا تعلق یہود یا نصاریٰ یا صابئی قوموں سے ہو وہ بہشت میں داخل نہ ہو سکے۔

ایسا نہیں ہے بلکہ ان قوموں کا جو فرد خدا اور انبیاء اور روزِ قیامت پر ایمان لائے اور نیک کام انجام دے اسے کوئی خوف نہیں اور خدا اس کا بدلہ اسے عنایت فرمائے گا۔

کاش وہ شخص جو اپنے آپ کو اس صدی کا مفکر سمجھتا تھا تھوڑی سی فروتنی اختیار کرتا اور اس بات کو سمجھ لیتا کہ اس کی زبان عربی نہیں ہے اور عربی زبان سے واقف نہ ہونے کی بنا پر اسے قرآن کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہیے اور اگر اس میں فروتنی ہوتی تو وہ حوزہ علمیہ کے اہل علم حضرات میں سے کسی کی طرف رجوع کرتا تاکہ وہ اسے اس بارے میں قرآن کی صریح آیات پڑھاتا، مثلاً وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا یا حدیث رسولؐ: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ اسے پڑھاتا۔ وہ بیرس کا پڑھا ہوا ہی کیوں نہ ہوتا لیکن اس بارے میں اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ حوزہ علمیہ کے تعلیم یافتہ افراد سے رجوع کرتا۔

کاش وہ دوسرا مفسر جو عربی زبان سے ناآشنا تھا فروتنی اختیار کرتا اور پہلے حوزہ علمیہ میں تفسیر قرآن کے استادوں سے تفسیر قرآن سیکھتا تاکہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ کے معنی سمجھتا اور پھر طالب علموں کو تفسیر کا درس دیتا۔

کاش وہ دوسرا مشہور مفسر بھی فروتنی اختیار کرتا اور جب وہ عربوں کی زبان سے اسقدر ناواقف ہے کہ "ذرہ" کے درمیان جس کی "راء" پر شد ہے اور اس کی اصل "ذرر" ہے اور اس کا تیسرا حرف "راء" ہے اور "الذاریات" کے درمیان جو "ذرو" سے ہے اور جس کا تیسرا حرف "واو" ہے فرق نہیں کرسکتا لہ تو وہ یہ نہ کہتا کہ حضرت علیؑ کی اس آیت کی تفسیر کے بارے میں ایک رائے تھی لیکن میری رائے یوں ہے اور وہ اپنی تفسیر ریڈیو پر اور ساری دنیا میں نشر نہ کرتا۔ اگر یہ مشہور مفسر حضرت علیؑ کو خدا کی جانب سے منسوب معصوم امام نہیں بھی سمجھتا تھا تو یہ تو جانتا ہو گا کہ امام علیؑ رسول اکرمؐ کے صحابیوں میں سے تھے اور قرآن کے ہم عصر عرب تھے لہٰذا ان کا کہا قبول کرلیتا۔ کاش اس نے اس حقیقت کی طرف توجہ دی ہوتی اور فروتنی اختیار کی ہوتی اور اپنی رائے اور سمجھ کو امام علیؑ کی رائے سے برتر یا اس کے برابر نہ سمجھتا۔

کاش وہ آخری مشہور دینی مصنف فروتنی اختیار کرتا اور یہ نہ لکھتا کہ :

"قرآن فقط ضمنی طور پر اور بالواسطہ اثر کے ساتھ ہی بشریت کی وحدت کے عامل کی حیثیت سے عالمی ریاست اور انسانی تہذیب و تمدن تشکیل دینا نہیں چاہتا بلکہ قوموں کے اختلاف، تفرقے اور مخاصمت کے خلاف معرکہ آرائی کو پسند کرتا ہے اور اس پر زور دیتا ہے۔ نہ تو حالیہ مشرق اور مغرب کے محققین اس نکتے کی گہرائی تک پہنچتے ہیں اور نہ ہی مفسرین قرآن نے مسئلے کے اجتماعی اور انسانی پہلوؤں پر صحیح توجہ دی ہے۔" ؎۲

لہ اس تحریر میں علمی اصطلاحات کے ذریعے مطلب بیان نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتا

؎۲ کتاب "نقش پیامبران در تمدن جہان" کا مقدمہ صفحہ ۲۶

مجھے علم نہیں کہ جن مفسرین کے متعلق اس مشہور دینی مصنف نے کہا ہے کہ انہوں نے اس کے نظریے کی طرف توجہ نہیں دی آیا ان میں امام علیؑ بھی شامل ہیں جیسا کہ اس مشہور مفسر نے خیال ظاہر کیا ہے یا ان میں فقط شیخ طوسی اور طبرسی جیسے مفسرین شامل ہیں اور وہ فقط ایسے مفسرین کے متعلق سمجھتا تھا کہ انہوں نے اس کے نظریے کو نہیں سمجھا! مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں!

اگر یہ مصنف جمہوریت پر ایمان رکھتا ہے اور اس وجہ سے اس کا اعتقاد ہے کہ انسان کو اپنے عقائد کے انتخاب کے بارے میں آزاد ہونا چاہیے تو کاش وہ قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے نہ کرتا اور یہ نہ کہتا کہ: "یہ ضروری نہیں کہ یہود، نصاریٰ اور صابئین اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اگر وہ اپنے دین پر ہی رہیں اور تورات اور انجیل اور صابئین کی کتاب پر عمل کریں تو وہ بہشت میں جائیں گے۔"

اور یہ نہ کہتا کہ: "قرآن کی نظر میں اہل کتاب کے علاوہ اور لوگ بھی اگر وہ خدا پرست ہوں اور وہ آخرت پر اعتقاد رکھتے ہوں تو صحیح راستے پر چل رہے ہوتے ہیں اور انہیں کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔" ؎

کاش اس مصنف نے فروتنی اختیار کی ہوتی اور کہا ہوتا کہ جمہوریت کا نقطۂ نظر یہ ہے اور یہ نہ کہا ہوتا کہ قرآن کا نظریہ یہ ہے۔ کاش اس مشہور مصنف نے فروتنی اختیار کی ہوتی اور اس مضمون پر کتاب لکھی ہوتی یا تقریر کی ہوتی جس میں انہوں نے یورپ میں تخصص حاصل کیا ہے اور ان علوم کے بارے میں تحریر اور تقریر جو دینی علمی مراکز سے مخصوص ہیں ان لوگوں کے لیے رہنے دی ہوتی جو اس کے اہل ہیں۔

کاش جیسے کہ لوگ ہر کام کے لیے اس کے ماہر سے رجوع کرتے ہیں مثلاً مکان کی تعمیر کے سلسلے میں انجینئر کے پاس اور بیماروں کے علاج معالجے کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں اسی طرح قرآن مجید کی تفسیر اور اسلام کے عقائد اور احکام سمجھنے کے لیے بھی ان ماہرینِ خصوصی سے رجوع کرتے جنہوں نے اسلامی علمی مراکز میں تعلیم پائی ہے اور ان کے پاس نہ جاتے جو پیرس، لندن، واشنگٹن اور ماسکو سے پڑھ کر آئے ہیں۔

؎ نقش پیامبران در تمدن جہان صفحات ۳۱-۳۲

تیئسواں درس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَقَدۡ كَانَ فَرِيقٌ مِّنۡهُمۡ يَسۡمَعُونَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ
مِنۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُونَ۔ (سورہ بقرہ - آیت ۷۵)

گزشتہ بحثوں میں ہم نے دیکھا کہ کس طرح مختلف اقسام کی احادیث گھڑی گئیں اور تفسیر بالرائے کرکے قرآن میں معنوی تحریف کی گئی جس کے نتیجے میں شرع اسلام میں بدعتیں رونما ہوئیں اور معاشرے میں پھیل گئیں۔ علاوہ ازیں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ یہ من گھڑت باتیں ہر دور میں کتنے حیرت انگیز انداز میں پھیلیں۔

اب سوال ہماری اپنی حالت کا ہے کیونکہ ان تحریفوں اور تاویلوں پر کسی قسم کی تنقید یا اعتراض نہیں کیا جاسکتا اور اگر کوئی خدا کا بندہ ان حضرات کی ان غلطیوں کی نشاندہی کرنا چاہے جو انہوں نے عمداً یا سہواً کی ہوں تو اس پر ہر طرف سے تابڑ توڑ حملے شروع ہوجاتے ہیں۔ آخر یہ یک طرفہ آزادی کیوں اور کس وجہ سے دی جاتی ہے؟

اب میں ان حضرات سے عذرخواہی کے طور پہ جو میرے ان تحریفوں پر تنقید کرنے پر مجھ پر اعتراض کرتے ہیں، دو دلیلیں پیش کرتا ہوں:

پہلی:

میں اس بارے میں بہت سی روایات میں سے دو روایات رسول اکرمؐ سے نقل کرتا ہوں:

ا : قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِہٖ :

إِذَا ظَهَرَتِ الْبِدَعُ فِيْ أُمَّتِيْ فَعَلَى الْعَالِمِ اَنْ يُّظْهِرَ عِلْمَهٗ وَاِلَّا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۔

جب میری امت میں بدعتیں ظاہر ہوں تو عالم پر واجب ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے (بدعتوں کو روشن کرے) اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس پر خدا اور فرشتوں اور انسانوں کی لعنت ہو۔

ب : قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ اٰلِہٖ :

إِذَا رَاَيْتُمْ اَهْلَ الرَّيْبِ وَالْبِدَعِ مِنْ بَعْدِيْ فَاَظْهِرُوا الْبَرَاءَةَ مِنْهُمْ وَاَكْثِرُوْا مِنْ سَبِّهِمْ وَالْقَوْلِ فِيْهِمْ وَالْوَقِيْعَةِ وَبَاهِتُوْهُمْ كَيْ لَا يَطْمَعُوْا فِي الْفَسَادِ فِي الْإِسْلَامِ وَ يَحْذَرُهُمُ النَّاسُ وَلَا يَتَعَلَّمُوْنَ مِنْ بِدَعِهِمْ يَكْتُبُ اللهُ لَكُمْ بِذٰلِكَ الْحَسَنَاتِ وَيَرْفَعُ لَكُمْ بِهِ الدَّرَجَاتِ فِي الْاٰخِرَةِ۔[1]

جب تم شک ڈالنے والوں اور شبہ پیدا کرنے والوں اور دین میں بدعتیں کھڑی کرنے والوں کو دیکھو تو ان سے بیزاری کا اظہار کرو تاکہ وہ دین اسلام میں فساد پیدا کرنے کی خواہش نہ کریں اور لوگ ان سے پرہیز کریں اور ان کی بدعتیں نہ سیکھیں۔ اس کام کے بدلے میں خدا تمہارے لیے نیکیاں لکھتا ہے اور آخرت میں تمہارے درجے بلند کرے گا۔

دوسری :

ان تحریفوں کے مقابلے میں خاموشی کے نتیجے میں جو قرآن کی آیات کے معانی اور اسلامی معارف میں ہو رہی تھیں اور جن کے ہزاروں نسخے چھپ کر شائع ہو رہے تھے اور "تحریف اسلامی" جو یورپ سے بطور سوغات آئی تھیں اس کے بھی ہزاروں نسخے چھپ کر مسلمان جوانوں تک پہنچ رہے تھے۔

اور جو لوگ ان تحریفوں کی نشاندہی کرنا چاہتے تھے ان کے منہ بند کرنے اور

---

[1] ان دونوں احادیث کے مدارک "سفینۃ البحار" میں مادہ "بدع" میں آئے ہیں۔

ان پر تہمتیں دھرنے اور افترا باندھنے اور ان کی اس حد تک کردار کشی کرنے کے نتیجے میں کہ معاشرے میں ان کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہ رہے اور نوجوان ان سے متنفر ہو جائیں ۔ مثلاً ایک ہفتے میں ایک شہر میں کتاب "توحید" اشوری کے پانچ ہزار نسخے بک جائیں ۔

ان مطبوعات اور ان خاموشیوں اور اس کردار کشی کے نتیجے میں فرقان اور مجاہدین خلق جیسے گروہوں کو موقع ملا کہ قرآن کی آیات کے معانی میں تحریف کر کے اور اسلام میں بدعتیں پھیلا کر بے علم مسلمان جوانوں کو فریب دیں اور اپنی بدعتیں خالص اسلام کے نام سے ان کے ذہنوں میں داخل کریں اور انہیں ان کا معتقد بنائیں اور انہیں اس حد تک فریب دیں کہ وہ مسلمان علماء کو سیکڑوں دوسرے بوڑھے اور جوان مسلمانوں اور بچوں کے ساتھ مسجدوں اور محرابوں میں شہید کر دیں ۔

جو لوگ تائب ہو گئے تھے ان میں سے بعض کے ساتھ گفتگو کے دوران میں نے ان کے فریب کھانے کی کیفیت کی چھان بین کی تو پتا چلا کہ پہلے انہیں وہ کتابیں دی جاتی تھیں جو 'بحث ہای اسلامی' کے نام سے نشر ہوئی تھیں اور پھر انہیں دہشت گردی کے کیمپوں میں پہنچا دیا جاتا تھا ۔

فی الحال میں نے یہ دو دلیلیں اعتراض کرنے والے حضرات کی خدمت میں پیش کی ہیں اور کہتا ہوں کہ : إِنَّمَآ أَشْكُوا بَثِّي وَحُزْنِيٓ إِلَى اللّٰهِ ۔

ایک اور مصیبت

قَصَمَ ظَهْرِي اثْنَانِ : عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ وَجَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ کے مصداق ہمارا موجودہ معاشرہ ایک اور مصیبت میں بھی مبتلا ہے اور وہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے بعض لوگ اس خیال سے کہ وہ اہلبیتؑ کے مکتب کی خدمت کر رہے ہیں نقصان دہ کام انجام دیتے ہیں مثلاً کتاب مَشَارِقُ انوارِ الیقینِ فِي حَقَائِقِ کَشْفِ اَسْرارِ امیرِ المؤمنینؑ ـــــ جو جعلی روایات اور غلو پر مبنی احادیث سے پُر ہے اور جس کی روایات کی کوئی سند نہیں ـــــ کے ہزارہا نسخے بڑے شوق سے چھاپے اور نشر کیے جاتے ہیں حالانکہ علامہ مجلسی نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ :

لَا اِعْتِمَادَ عَلٰی مَا تَفَرَّدَ بِهٖ لِاشْتِمَالِهٖ عَلٰی مَا یُوْهِمُ الْخَلْطَ وَ الْخَبْطَ ۔ [۱]

علامہ مجلسی نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

اس کتاب میں جو روایات نقل کی گئی ہیں وہ قابل اعتماد نہیں ہیں کیونکہ یہ کتاب ایسے مطالب پر مشتمل ہے جو گڈمڈ کر دیے گئے ہیں۔

شیخ حر عاملی نے بھی اسکے متعلق یوں فرمایا ہے:

اِنَّ فِیْهِ اِفْرَاطٌ وَ رُبَّمَا نُسِبَ اِلَی الْغُلُوِّ ۔ [۲]

"اس کتاب میں افراط ہے اور اسے غلو سے نسبت دی گئی ہے۔"

علاوہ ازیں 'خطبہ البیان' نام کا ایک جعلی خطبہ ہے جو غلطیوں اور غلو سے پُر ہے اور جس کی کوئی سند نہیں۔ بظاہر اسے گھڑنے والا وہی شخص ہے جس نے خطبہ طتنجیہ گھڑا ہے اور سید کاظم رشتی اور ان کے مکتب کا تربیت یافتہ ہے۔ یہ خطبہ امام علی بن ابی طالبؑ سے منسوب کیا گیا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا اس خطبے کا فارسی ترجمہ کئی بار چھاپا گیا۔ اہل دانش پر واضح ہے کہ ایسی نشریات مکتب تشیع کے لیے کتنی نقصان دہ ہیں کیونکہ ایک طرف تو وہ غلط چیزیں سکھاتی ہیں اور کم علم رکھنے والے جوانوں میں غلو کا عقیدہ پھیلاتی ہیں اور دوسری طرف جو لوگ شیعوں کی تکفیر کرنا چاہتے ہیں انہیں شہادت مہیا کرتے ہیں۔

اس خطبے کے بارے میں مجھ سے سوال کیا گیا اور میں نے جواب میں لکھا:

"ناشر جس نیک نیتی سے اہل بیت علیہم السلام کے مکتب کی خدمت کرنا چاہتا ہے اس کے پیش نظر مناسب ہے کہ ایسی چیزیں چھاپنے سے پہلے قم، تہران یا خراسان کے علماء سے رجوع کیا جائے تاکہ وہ اسے چھاپنے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اس خطبے کو حضرت امیر المومنینؑ سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔"

یہ جواب شور و غل کا موجب بن گیا۔

---

[۱] و [۲] الذریعہ جلد ۲۱ صفحہ ۴۳

اسی طرح میں نے دوسرے ناشائستہ اعمال کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہا گیا کہ فلاں شخص شیعہ نہیں ہے۔ درحقیقت میری سمجھ میں نہیں آتا کہ علمار جو دین اسلام اور مکتب تشیع کے محافظ ہیں ایسے افعال اور تحریفوں اور بدعتوں کے مقابلے میں خاموش کیوں ہیں!

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ۔

●●●●●

چوبیسواں درس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.
فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدٰھُمُ اللّٰہُ وَاُولٰٓئِکَ ھُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ.
(سُورۂ زمر۔ آیت ۱۸)

اب ہم گزشتہ بحثوں کا خلاصہ ایک مقدمے، تین حصوں اور ایک خاتمے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

گزشتہ بحثوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا نے اپنی ربوبیت کے تقاضے کے مطابق اپنی تمام مخلوقات کی وجودی زندگی اس کی فطرت کی مناسبت سے مقرر اور مقدر فرمائی ہے اور تمام مخلوقات کی رہنمائی فرمائی ہے تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی وجودی زندگی کا مقررہ نظام جاری رکھیں اور اپنے وجود کے درجۂ کمال پر پہنچ جائیں۔ بعض مخلوقات مثلاً ستاروں اور کہکشاؤں سے لے کر ایٹم تک کی یہ ہدایت تسخیری ہے اور بعض دوسری مخلوقات مثلاً حیوانات کی ہدایت الہامی ہے اور ان کی ہدایت کو غریزۂ حیوانی کا نام دیا جاتا ہے اور جہاں تک تیسری قسم کی مخلوقات یعنی انسان کا تعلق ہے اس کی ہدایت خدا نے انبیاءؑ پر وحی کے ذریعے فرمائی ہے اور انبیاءؑ اپنے اقوال اور افعال کے وسیلے سے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

لیکن ہر پیغمبر کی وفات کے بعد اسی پیغمبر کی امت کے طاقتور لوگ اسکی شریعت میں جو چیز اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف دیکھتے ہیں اس میں بتدریج ردوبدل کرتے رہتے ہیں اور اس پر پردہ ڈالتے جاتے ہیں اور حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان نظامِ الٰہی

تک دسترس حاصل نہیں کرسکتا۔ اس صورت میں خدا ایک نیا پیغمبر بھیج کر شریعت کی تجدید فرماتا ہے۔ یہاں تک کہ جب نوبت خاتم النبیینؐ تک پہنچی تو حکمت اس امر کی مقتضی ہوئی کہ آنحضرتؐ کی شریعت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسان کی دسترس میں رہے اور آخری شریعت ہو حالانکہ انسان کی فطرت تغیر پذیر نہیں ہے اور رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ: "جو کچھ گزشتہ امتوں میں واقع ہوا وہ اس امت میں بھی واقع ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر گزشتہ امتوں میں کوئی شخص سوسمار کے بل میں گھسا ہو تو اس امت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔"

لہٰذا اس امت میں بھی طاقتور لوگوں نے اپنے پیغمبر کی شریعت میں تحریف کی اور اس کے احکام کو چھپایا۔ اس کے باوجود پروردگارِ عالم نے اس شریعت کو ہمیشہ کے لیے انسان کی دسترس میں دے رکھا ہے اور وہ اس شکل میں کہ:

گزشتہ امتوں میں احکام کی شرح اور تفصیل ان کی آسمانی کتابوں میں ہوتی تھی لہٰذا ان آسمانی کتابوں میں جو کچھ امت کے طاقتور لوگوں کی نفسانی خواہشات کے برخلاف ہوتا تھا وہ اس میں تحریف کرتے تھے اور اس پر پردہ ڈال دیتے تھے اور اس کے بعد انسان کے پاس کچھ نہیں رہتا تھا۔

علاوہ ازیں انبیائے کرامؑ کے اوصیاء کچھ مدت سے زیادہ لوگوں کے درمیان نہیں رہتے تھے اور ان کے بعد گزشتہ پیغمبر کی شریعت لوگوں کی دسترس سے نکل جاتی تھی لیکن اس امت میں خدا کی کتاب (قرآن) میں احکام کی تفصیل بیان نہیں فرمائی اور فرمایا ہے کہ:

وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔

لہٰذا اسلام کے احکام اور عقائد بیان کرنے اور ان کی تفصیل بتانے کی ذمہ داری رسول اکرمؐ کو سونپی گئی اور آنحضرتؐ نے یہ چیزیں اپنی سیرت اور حدیث (افعال اور اقوال) کے ذریعے بیان فرمائیں۔

اس کی حکمت کے ساتھ خدا نے تحریف اور پردہ پوشی سے قرآن کی حفاظت فرمائی اور قرآن میں یوں فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔

اس بارے میں اس امت کے طاقتور لوگوں نے یہ کہا کہ نصِ قرآن میں جو کچھ انکی

نفسانی خواہشات کے خلاف تھا اس کی تاویل اپنی مرضی کے مطابق کر لی اور تحریف اور پردہ پوشی کا کام رسول اکرمؐ کی سیرت اور حدیث کے متعلق انجام دیا۔ تاہم اس امت میں رسول اکرمؐ کے اوصیاء دنیا کے خاتمے تک شریعت کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں اور طاقتور لوگوں نے آنحضرتؐ کی سیرت اور حدیث میں جو تحریف کی ہے اور حقیقت کو چھپایا ہے اس کے مقابلے میں انہوں نے آنحضرتؐ کی صحیح سیرت اور ایسی احادیث امت میں نشر فرمائی ہیں جن میں کوئی تحریف نہیں کی گئی۔ یوں پروردگار عالم نے حضرت خاتم الانبیاءؐ کی شریعت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسان کی دسترس میں دیدیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ : کِتَابَ اللّٰہِ وَاَھْلَ بَیْتِیْ. مَااِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ . وَقَدْ اَنْبَاَنِیَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ اِنَّھُمَا لَا یَفْتَرِقَانِ حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ .

گزشتہ امتوں میں شریعت کی تحریف اور اس کے حقائق پر پردہ ڈالنے کے سلسلے میں جو کچھ ہوا وہ اس شریعت میں تین وسیلوں سے انجام پایا۔ ہم ان میں سے ہر وسیلے کو ایک حصے میں بیان کرتے ہیں۔

پہلا حصہ

۱ رسول اکرمؐ کی حدیث اور سیرت پر پردہ ڈالنا

ہم نے مقدمہ میں کہا ہے کہ حضرت خاتم الانبیاءؐ کی شریعت میں اسلام کے احکام اور عقائد کی شرح اور تفصیل آنحضرتؐ کے اقوال اور افعال میں بیان کی گئی ہے۔ اس امت کے طاقتور لوگوں نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ صحابہ کو آنحضرتؐ کی احادیث نشر کرنے سے منع کر دیا۔

رسول اکرمؐ کی احادیث نشر کرنے سے کیسے منع کیا گیا

۱ : کہا گیا کہ جو کچھ رسولؐ فرماتے ہیں اسے نہ لکھو کیونکہ وہ بھی دوسرے تمام انسانوں

کی طرح کبھی خوشی کی حالت میں کچھ کہتے ہیں اور کبھی غصے کے عالم میں کچھ کہتے ہیں۔

ب : جب رسول اکرمؐ بستر مرگ پر تھے تو آپ کو اپنی وصیت نہیں لکھنے دی گئی ــــ وہ وصیت جس کے بارے میں آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ: "اس کے لکھے جانے سے میری امت ہرگز گمراہ نہیں ہو گی"

ج : بعض صحابہ نے اس چیز کی مخالفت کی اور مدینہ سے باہر رسول اکرمؐ سے احادیث روایت کیں۔ اس پر خلیفۂ ثانی نے حکم دیا کہ انہیں مدینہ بلا لیا جائے اور وہاں انہیں اپنی نگرانی میں رکھا۔ ان میں ابوذر غفاری، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن حذیفہ، ابوالدرداء اور عقبہ بن عامر جیسے جلیل القدر صحابی شامل تھے۔

د : کئی ایک صحابہ نے اپنے طور پر رسول اکرمؐ کی احادیث لکھ لی تھیں۔ چنانچہ خلیفۂ ثانی منبر پر گئے اور لوگوں کو قسم دیکر کہا کہ جس کسی نے آنحضرتؐ کی حدیث لکھی ہو وہ لے آئے اور جب سبھی وہ احادیث لے آئے تو حکم دیا کہ انہیں جلا دیا جائے۔

ھ : حدیث اور روایت نشر کرنے کی ممانعت خلیفۂ ثالث کے زمانے تک برقرار تھی۔ انہوں نے منبر سے اعلان کیا کہ: "جو حدیث ابوبکر اور عمر کے زمانے میں روایت نہیں کی گئی وہ روایت نہ کی جائے۔"

و : خلیفۂ ثالث کے زمانے میں بعض اشخاص نے ان کی مخالفت کی مثلاً ابوذر نے جو مدینہ سے شام اور پھر ربذہ جلا وطن کیے گئے۔ جہاں انھوں نے غربت کے عالم میں جان جانِ آفرین کے سپرد کی۔

ز : عمار اور ابن مسعود کو سخت جسمانی سزا دی گئی اور برا بھلا کہا گیا۔

ح : معاویہ کے زمانے میں میثم تمار کی زبان کاٹ دی گئی اور رشید ہجری کے ہاتھ پاؤں قطع کر دیے گئے۔

ط : خلفاء کے مکتب میں حدیث لکھنے پر پابندی برقرار رہی حتیٰ کہ عمر بن عبدالعزیز نے (پہلی صدی ہجری کے آخر میں) حکم دیا کہ رسول اکرمؐ کی احادیث لکھی جائیں۔

یہ تھی فہرست اس امت کے طاقتور لوگوں کے چند کاموں کی جو انہوں نے رسول اکرمؐ کی حدیث اور سیرت پر پردہ ڈالنے کی خاطر انجام دیے۔

دوسرا حصہ

دوسرے وسیلے کے بیان میں

خلفاء کے مکتب کے مقتدر لوگوں نے اس بارے میں ایک اور وسیلے سے بھی کام لیا اور وہ اس چیز سے عبارت ہے کہ انہوں نے دوسروں کی شخصیت کو رسول اکرمؐ سے برتر قرار دیا اور آنحضرتؐ کی شخصیت کو ایک عام انسان سے بھی نیچے لے آئے۔

اب ہم ان روایتوں کے چند نمونے پیش کرتے ہیں جن کی رو سے رسول اکرمؐ کی شخصیت ایک عام انسان سے بھی کمتر دکھائی دیتی ہے:

ا : کسی ایک راویوں مثلاً بی بی عائشہ اور ابو ہریرہ دوسی سے روایت کیگئی ہے کہ رسول اکرمؐ بار بار مومنوں پر لعنت کرتے تھے لیکن ساتھ ہی فرماتے تھے: میں نے خدا سے درخواست کی ہے کہ میں جس مومن کو لعنت ملامت کروں یا اسے برا بھلا کہوں وہ میری اس لعنت کو اس لعنتی کے لیے برکت' پاکیزگی اور رحمت قرار دیدے۔

ب : انس بن مالک اور بی بی عائشہ سے روایت کی گئی ہے کہ ایک دفعہ جب رسول اکرمؐ ایک نخلستان کے پاس سے گزر رہے تھے تو لوگ کھجور کے درختوں پر زیرہ چھڑک رہے تھے۔ انہیں یہ کام کرتے دیکھ کر آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: اگر تم یہ کام نہ کرو تو کھجور کی فصل بہتر ہوگی۔ مسلمانوں نے آنحضرتؐ کے اس ارشاد کے مطابق عمل کیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال مدینہ میں کھجور کی فصل تباہ ہوگئی۔ جب یہ خبر رسول اکرمؐ کو پہنچائی گئی تو آپ نے فرمایا: "تم اپنے دنیاوی کام مجھ سے بہتر جانتے ہو"

ج : بی بی عائشہ اور ابو ہریرہ سے روایت کی گئی ہے کہ ایک دن رسول اکرمؐ نے ایک مسلمان کو مسجد میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا: اس پر خدا کی رحمت ہو۔ اس نے مجھے کچھ ایسی آیتیں یاد دلائی ہیں جنہیں میں بالکل بھول چکا تھا اور قرآن کے فلاں سورے سے انہیں حذف کر دیا تھا۔

د : ابو ہریرہ سے روایت کی گئی ہے کہ ایک دفعہ رسول اکرمؐ جنابت کی حالت میں محراب

عبادت میں نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ پھر انہیں اچانک یاد آیا کہ وہ جنابت کی حالت میں ہیں۔ انہوں نے مقتدیوں کو حکم دیا کہ وہ اسی حالت میں رہیں اور خود گھر تشریف لے گئے اور غسل جنابت کے بعد واپس آئے اور نماز جماعت کی امامت فرمائی۔

ھ : روایت کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ ایک دیوار کے پاس کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگے۔ ایک صحابی نے جو آپ کے ہمراہ تھا چاہا تھا کہ وہاں سے ہٹ جائے لیکن آنحضرتؐ نے اسے بلا لیا اور جب تک آپ حاجت سے فارغ نہیں ہو گئے وہ آپ کے پیچھے کھڑا رہا۔ [۱]

د : معوذ بن عفراء کی بیٹی سے روایت کی گئی ہے کہ اس نے کہا : رسول اکرمؐ میری شادی کی محفل میں تشریف لائے اور میرے لیے مخصوص جگہ پر میرے پہلو میں بیٹھ گئے (معاذ اللہ) اور لڑکیوں کا گانا سننے لگے جو ڈھولک بجا رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے آنحضرتؐ کی مدح میں ایک شعر پڑھا تو آپ نے فرمایا : نہیں۔ نہیں یہ نہیں! جو جو شعر تم اس سے پہلے پڑھ رہی تھیں وہی پڑھو۔ ایک اور روایت میں دلہن نے شادی کی محفل میں اپنے ہاتھوں سے رسول اکرمؐ کو شربت پیش کیا۔ (معاذ اللہ)

ذ : بی بی عائشہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا : میں اور رسول اکرم ایک چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے کہ ابوبکر آئے اور آنحضرتؐ سے گفتگو کی اور چلے گئے پھر عمر آئے اور چلے گئے۔ پھر عثمان نے آنے کی اجازت چاہی۔ رسول اکرمؐ اٹھے اور لباس بدن پر درست کیا اور پھر انہیں اندر آنے کی اجازت دی۔ ایک اور روایت

---

[۱] قبل ازیں ہم ان روایات کے وضعی ہونے کے بارے میں بحث کر چکے ہیں اور یہاں اس روایت کے جھوٹی ہونے کے ثبوت میں ابن اسحاق کی روایت کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی روایت میں کہتے ہیں : اپنی بعثت سے پہلے رسول اکرمؐ رفع حاجت کے لیے آبادی سے دور چلے جایا کرتے تھے اور گھاٹیوں کی اوٹ میں بیٹھتے تھے۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۵۳۔

میں ام المومنین کی زبانی کہا گیا ہے کہ: "آپ نے مجھے فرمایا کہ میں اپنا لباس درست کروں اور پھر انہیں آنے کی اجازت دی" ان کے چلے جانے کے بعد میں نے رسول اکرمؐ سے ان کے ساتھ دوسروں کے مقابلے میں مختلف سلوک کو نیکی حکمت کے بارے میں دریافت کیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: "کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں؟

ج : بی بی عائشہ سے روایت کی گئی ہے کہ یہودیوں نے رسول اکرمؐ پر جادو کر دیا اور اس جادو نے آنحضرتؐ پر اتنا اثر کیا کہ آپ سمجھتے تھے کہ میں نے اپنی کسی بیوی کے ساتھ ہم بستری کی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔

یہاں تک ہم نے وہ روایات پڑھیں جو رسول اکرمؐ کی ذات اقدس کو ایک عام انسان کی سطح سے بھی نیچے لے آتی ہیں۔ اب ہم ان روایات کا مطالعہ کریں گے جو قرآن مجید اور وحیٔ ربانی کو زک پہنچاتی ہیں۔

خلفاء کے مکتب کی متعدد روایتوں اور حدیث، تفسیر، سیرت اور تاریخ کی معتبر کتابوں میں بی بی عائشہ سے اور دوسروں سے روایت کی گئی ہے کہ: غارِ حرا میں وحی نازل ہونے کے وقت پہلی بار جبرئیل نے رسول اکرمؐ سے کہا: پڑھو۔ آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا: میں پڑھ نہیں سکتا۔ تب جبرئیل نے آنحضرتؐ کو اتنے زور سے بھینچا کہ آپ کو موت کا احساس ہونے لگا۔ جبرئیل نے دوبارہ کہا: پڑھو۔ آنحضرتؐ نے جواب دیا: میں پڑھ نہیں سکتا۔ جبرئیل نے آپ کو دوبارہ اسی طرح بھینچا۔ یہاں تک کہ روایت کی گئی ہے کہ آنحضرتؐ کے دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کاہن بن گئے ہیں اور جبرئیل ایک شیطان ہے جو آپ سے باتیں کر رہا ہے اور آپ نے چاہا کہ اپنے آپ کو پہاڑ سے نیچے گرا کر ہلاک کر لیں۔ بی بی خدیجہؑ نے آپ کو تسلی دی اور ورقہ بن نوفل نصرانی سے نزول وحی کا ذکر کیا۔ ورقہ نے انہیں اطمینان دلایا اور خوشخبری دی کہ یہ کہانت نہیں پیغمبری ہے۔

غرانیق کا افسانہ

اس سے بھی بدتر غرانیق کا افسانہ ہے جو خلفاء کے مکتب کی تفسیر، سیرت اور تاریخ

کی معتبر کتابوں میں متعدد روایتوں میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ کے لیے قریش کے ساتھ کشمکش ناقابل برداشت ہوگئی تھی اور آپ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی آیت نازل ہو جو ان لوگوں کے آپ کے قریب آنے کا موجب بنے اور وہ ہدایت پائیں۔ چنانچہ اس عالم میں کہ سورۂ والنجم آپ پر نازل ہوئی تھی اور آپ اسے پڑھ رہے تھے۔ جب آپ آیہ " اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى " پر پہنچے تو یہ دو جملے (تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى وَ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى) شیطان نے آپ پر القا کر دیے اور آنحضرتؐ نے سورے کی آیات کے ساتھ یہ دو جملے بھی پڑھے۔ پھر آنحضرتؐ نے سجدہ کیا اور مسلمانوں نے خدا کے نام کی خاطر اور مشرکین نے بتوں کے نام کی خاطر سجدہ کیا۔ جو مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے انہیں یہ خبر ملی کہ مشرکین مسلمان ہو گئے ہیں چنانچہ ان میں سے کئی ایک واپس مکہ آ گئے۔ جبرئیل رسول اکرمؐ پر نازل ہوئے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تو آنحضرتؐ غمگین ہو گئے تب خدا نے آیہ کریمہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ نازل فرما کر آپ کو تسلی دی۔

❁

اب تک ہم نے وہ روایات نقل کیں جو ان احادیث کو صحیح ماننے والوں کی نظروں میں رسول اکرمؐ کی شخصیت کو گراتی ہیں۔ اب ہم ان روایتوں کے نمونے پیش کر رہے ہیں جو آنحضرتؐ کی شخصیت کو گرانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی شخصیت کو بلند کرتی ہیں۔

بی بی عائشہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا: دو لڑکیاں گا رہی تھیں اور رسول اکرمؐ اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں ابوبکر آ گئے اور کہنے لگے: یہ شیطانی گانا بجانا رسول اکرمؐ کی موجودگی میں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: انھیں کچھ نہ کہو۔ یہ انکی عید کا دن ہے۔

بی بی عائشہ کی زبانی ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ عید کے دن چند حبشی مسجد نبوی میں ناچ رہے تھے۔ رسول اکرمؐ نے مجھ سے فرمایا: کیا تم ان کا ناچ دیکھنا چاہتی ہو؟ پھر آپ نے مجھے کندھے پر اٹھا لیا اور میں نے اپنا گال آپ کے گال پر رکھ دیا۔

آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: "ناچ جاری رکھو" حتی کہ میں تھک گئی۔ ایک اور روایت میں آپ کہتی ہیں: رسول اکرمؐ تھک چکے تھے اور کبھی ایک پاؤں پر زور ڈالتے تھے

اور کبھی دوسرے پر اور فرماتے جاتے تھے: عائشہ! کیا تمہارا جی نہیں بھرا؟ اور میں جواب میں کہتی تھی: نہیں۔

میں دیکھنا چاہتی تھی کہ آنحضرت ؐ کے نزدیک میری کیا قدر و منزلت ہے۔ دریں اثنا عمر مسجد میں داخل ہوئے اور انھیں دیکھتے ہی سارے کے سارے حبشی بھاگ کھڑے ہوئے۔

ایک اور روایت میں کہتی ہیں: جب وہ بھاگ گئے تو رسول اکرم ؐ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ انسانوں اور جنوں میں جو شیطان تھے وہ عمر کو دیکھ کر بھاگ گئے۔

روایت کی گئی ہے کہ جاہلیت کے دور میں رسول اکرم ؐ نے دسترخوان بچھایا جس میں گوشت تھا اور زید بن نفیل کو (جو خلیفہ عمر کا رشتہ دار تھا) کھانے کی دعوت دی۔ زید نے کہا: جو جانور تم بتوں کی خاطر ذبح کرتے ہو میں ان کا گوشت نہیں کھاتا۔

جو روایات رسول اکرم ؐ کی شخصیت کو گھٹاتی ہیں اور دوسروں کی شخصیت کو آپ سے بلند بتاتی ہیں ان میں وہ روایات بھی شامل ہیں جو خلیفہ عمر کے خدا کے ساتھ موافقت" یا "خلیفہ کا اپنی رائے میں خدا کے ساتھ اتفاق" کے بارے میں ہیں۔ خلیفہ کہتے ہیں: میں نے کئی مواقع پر اپنے پروردگار کے ساتھ موافقت کی۔

ا: رسول اکرم ؐ نے عبداللہ بن ابی منافق کی نماز جنازہ پڑھائی۔ میں اٹھا اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہا: کیا یہی وہ شخص نہیں تھا جس نے فلاں دن یہ یہ باتیں کہی تھیں؟ خدا کی قسم زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آنحضرت ؐ پر آیہ "وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا....."[1] نازل ہوئی

ب: میں نے رسول اکرم ؐ سے کہا: آپ حکم دیں کہ آپ کی بیویاں پردہ کیا کریں۔ تب آیت نازل ہوئی: "يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ."[2]

ج: میں نے رسول اکرم ؐ سے کہا: "لو اتخذنا من مقام ابراهيم مصلى" اس پر آیت نازل ہوئی: "وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى"[3]

---

[1] سورۂ توبہ۔ آیت ۸۴ [2] سورۂ احزاب۔ آیت ۵۹ [3] سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۵

د : میں نے رسول اکرمؐ کی بیویوں سے کہا: "عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ" اس پر آیت نازل ہوئی عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ ... [۱]

گزشتہ روایات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ جب کبھی رسول اکرمؐ اور خلیفہ عمر کے درمیان اختلاف ہوا خدا نے آیت نازل فرمائی اور آنحضرتؐ کو خلیفہ عمر کے کہنے کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا۔ پھر جو کچھ خلیفہ عمر نے کہا وہی خدا کا حکم بن گیا۔ ان روایات کا کچھ حصہ فقط خلیفہ عمر کے مناقب نشر کرنے کا پہلو رکھتا ہے مثلاً یہ کہ عمر سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا: جب سورۂ مومنون میں یہ آیت نازل ہوئی: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ [۲] میں نے کہا: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ. [۳] وحی نازل ہوئی اور گزشتہ آیات پر اس جملے کا اضافہ کر دیا گیا

خلفاء کے فضائل کے بارے میں احادیث کی تعداد بہت ہے۔ مثلاً روایت کی گئی ہے کہ:

ا : خدا تعالیٰ نے سچ کو عمر کی زبان پر قرار دیا ہے اور وہ سچی بات کہتے ہیں۔

ب : لوگ کسی چیز کے بارے میں بات نہیں کرتے تھے جس کے بارے میں عمر بھی بات کرتے مگر یہ کہ قرآن اسی شکل میں نازل ہوتا ہے جس شکل میں عمر نے بات کی ہوتی یا یہ کہ جب کبھی عمر اپنی رائے دیتے قرآن ان کی رائے کے مطابق نازل ہوتا۔

ایسی دسیوں روایات ابوبکر، ابوذر، ابوسعید خدری، ابوہریرہ اور دوسرے صحابہ سے نقل کی گئی ہیں اور بالخصوص امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: "قرآن میں عمر کی نظر اور رائے ہے۔"

اور یہ بھی فرمایا کہ:

سکون اور ایمان عمر کی زبان پر بولتے ہیں اور ایک اور روایت کے مطابق "عمر کی زبان اور قلب پر نازل ہوئے ہیں۔"

---

[۱] سورۂ تحریم - آیت ۵ [۲] سورہ مومنون آیت ۱۲ [۳] سورۂ مومنون - آیت ۱۴

یا یہ کہ آپ نے فرمایا: "ہم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اصحاب اپنی تمام کثرت کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ سکون عمر کی زبان پر بولتا ہے۔"

ان احادیث میں سے بعض خلفاء کے مکتب کی معتبر کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً رسول اکرمؐ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"گزشتہ امتوں میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جن سے فرشتے باتیں کرتے تھے اور اس امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر ہے۔"

اور فرمایا: "اگر میں تمہارے درمیان رسالت پر مبعوث نہ ہوا ہوتا تو عمر مبعوث ہوتے۔"

اور فرمایا: "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن الخطاب ہوتے۔"

اور فرمایا: "سورج کسی ایسے شخص پر طلوع نہیں ہوا جو عمر سے بہتر ہو۔"

آخری حدیث میں خلیفہ عمر کو انبیائے کرام سے بھی برتر قرار دیا گیا ہے۔ آخر یہ احادیث کس لیے گھڑی گئی ہیں؟

جب ۴۰ھ میں معاویہ نے مسند خلافت سنبھالی اور کچھ مدت گزرنے کے بعد اپنی حکومت مستحکم کرلی تو اسے یہ خیال ہوا کہ خلافت کو اپنی اولاد کے لیے بطور وراثت چھوڑ جائے۔ اس بارے میں پہلا شخص جو اس کے مدنظر تھا وہ اس کا بیٹا یزید تھا جس کے لیے مسلمانوں سے بیعت لینے کی خاطر وہ سخت بے چین تھا۔ اس مقصد کے حصول میں واحد رکاوٹ یہ تھی کہ یزید اپنے غیر اسلامی اخلاق کی وجہ سے مشہور ہو چکا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں: "ہم خاندان نبوت ہیں اور یزید ایک شرابی شخص ہے۔

مِثْلِیْ لَا یُبَایِعُ مِثْلَهٗ۔ [۱]

اس وقت کے دوسرے معروف مسلمانوں مثلاً عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور سعد بن ابی وقاص نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ اس مجبوری کا علاج کرنے کے لیے معاویہ نے ایک سوچے سمجھے پروگرام پر عمل شروع کیا اور وہ یہ تھا کہ ہر اس

---

[۱] مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا۔

موضوع پر جس کے بارے میں مسلمان یزید پر یا خود معاویہ پر نکتہ چینی کریں اور روایات گھڑی جائیں جن سے ثابت ہو کہ خود رسول اکرم ؐ کا کردار بھی ایسا ہی تھا تاکہ ان جعلی روایات کے ہوتے ہوئے یزید اور معاویہ پر نکتہ چینی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

معاویہ اور اس کے حاشیہ نشین مثلاً عمرو بن عاص، زیاد بن ابیہ، مغیرہ بن شعبہ، مروان بن حکم، ولید بن عتبہ اور دوسرے اموی حکام ـــــ جو خود بھی کم وبیش اسی درد میں مبتلا تھے جس میں یزید بن معاویہ مبتلا تھا ـــــ سب مل کر حکومت کی تمام قوتوں کو بروئے کار لے آئے اور ایک ایسی جماعت بھرتی کر لی جس نے روایتیں گھڑیں اور بیان کیں۔ ان لوگوں نے اپنی تمام قوت، مکر اور حیلے سے کام لیتے ہوئے یہ روایات تمام اسلامی ممالک میں یعنی ایران میں مسلمانوں کی دور ترین آبادی سے لیکر افریقہ، یمن، شامات اور عراق کے دور ترین مقامات تک پھیلا دیں۔ اس کام میں بیشتر آسانی سے ہوئی کیونکہ خلفاء کی حکومت کے زمانے میں رسول اکرم ؐ کی احادیث روایت کرنے سے روک دیا گیا تھا سوائے ان کے جنہیں حکومت اپنے سیاسی نقطہ نگاہ سے مفید سمجھتی تھی اور معاویہ کی حکومت کے زمانے میں معاملہ زیادہ سخت ہو گیا تھا کیونکہ جعلی احادیث اس عجیب خلاء کو اسلامی ممالک میں پر کر رہی تھیں۔

ان احادیث کے آسانی سے نشر ہونے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ جو لوگ حکومت کی سیاست کے خلاف تھے وہ سب شہر مدینہ میں سکونت پذیر تھے اور ان کی بلاد اسلامی تک دسترس نہ تھی۔ فقط حکومت کی انتظامیہ اسلامی ممالک کے تمام شہروں اور دیہاتوں میں کسی مدمقابل کے بغیر اپنے پروگرام پر عمل کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ حکومت وقت نے مذکورہ بالا مقصد سے بھی اونچے مقاصد حاصل کر لیے جو مندرجہ ذیل سے عبارت تھے:

ا: یہ کہ خلافت کے مقام کو رسالت کے مقام سے بلند تر کر کے دکھایا جائے۔

ب: یہ کہ مسلمان خلیفہ کی اطاعت کو دین سمجھیں۔

معاویہ کے زمانے کی حکومت یہ دو عجیب مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی کیونکہ معاویہ کے زمانے کے بعد ہی یزید کی حکومت یہ کر سکی کہ خانہ کعبہ پر ان مسلمانوں کے ہاتھوں منجنیقوں سے گولے پھنکوائے اور اسے جلوائے جو اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور مدینۂ رسول میں جو کچھ تھا اسے تین دن کے

لیے خلافت کے لشکر کے لیے مباح قرار دیدے اور کربلا میں فرزندانِ رسولؐ کا قتل عام کرے اور آنحضرتؐ کی بیٹیوں کو قیدی بنا کر فرزندانِ رسولؐ کے کٹے ہوئے سروں کے ساتھ مسلمانوں کے شہروں میں پھرائے اور مسلمان ان کا تماشہ دیکھنے آئیں۔

یہ سب کام اس نظریے کے تحت انجام دیے گئے کہ خلیفہ کا حکم اور اس کی اطاعت دین ہے۔ آخری دو مقاصد حاصل کرنے کے لیے امویوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ کام کی ابتدا پہلے دو خلفاء سے کریں اور پھر انہیں خیالات کا اطلاق بعد میں آنے والے خلفاء پر کردیں۔ یعنی ان دو خلفاء کی شخصیت اور کردار کو رسول اکرمؐ کی شخصیت اور کردار سے بلند ظاہر کریں اور اس کے نتیجے میں ان کے کہنے پر عمل کرنے کو دین قرار دیں۔ اس کام میں انہیں جو مشکل پیش آئی وہ امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت تھی۔ معاویہ اور اس کے رفقاء نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ کہا کہ ان کی حکومت خلفاء کی حکومت کے خلاف تھی اور وہ خود خلیفہ عثمان کے قاتل تھے اور مسلمانوں کے برحق خلیفہ نہیں ہوسکتے تھے۔ لہٰذا بی بی عائشہ اور خلیفہ معاویہ نے ان کے خلاف قیام کیا اور رسول اکرمؐ کے صحابہ مثلاً طلحہ اور زبیر نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اس بارے میں بھی انہوں نے بہت سی روایتیں گھڑیں اور مسلمانوں کے درمیان نشر کردیں۔

اس کے نتیجے میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ امت کے ارباب اختیار نے معاویہ کے زمانے میں حدیثیں وضع کرکے اپنے تمام مقاصد حاصل کرلیے۔ لہٰذا ہم جعلی حدیثیں تیار کرنے کو اسلام کے احکام اور عقائد میں تغیر و تبدل کا تیسرا عامل شمار کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ

تیسرے وسیلے کے بیان میں

تیسرا وسیلہ جعلی حدیثیں تیار کرنے کا ہے۔

پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ان مضرت رساں روایات میں سے بیشتر معاویہ کے زمانے میں گھڑی گئیں۔ ہم یہ بات اندازے اور تخمینے کی بنا پر نہیں کہتے بلکہ یہ کتابوں میں ثبت اور ضبط ہے۔ اب ہم مدائنی کی چند دلیلیں نقل کرتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب "الاحداث"

میں بیان کی ہیں:

اوّلاً: معاویہ نے اپنی خلافت کے پہلے سال میں ــــ جسے "عام الجماعۃ" کا نام دیا گیا ــــ تمام اسلامی ممالک میں متعین اپنے اہلکاروں کے نام ایک فرمان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ جو شخص ابوترابؑ اور ان کے خاندان کی فضیلت روایت کرے اس کا قتل کرنا جائز اور اس کا مال مباح ہے اور اسے حکومت کا تحفظ حاصل نہیں ہوگا۔

ثانیاً: اس نے دوسری مرتبہ اپنے تمام اہلکاروں کے نام ایک فرمان صادر کیا کہ علی ابن ابی طالبؑ اور ان کے خاندان کے شیعوں کی شہادت قبول نہ کرو اور عثمان کے حامیوں اور ان لوگوں کے ساتھ واقفیت پیدا کرو جو اس کی فضیلت میں روایات نقل کریں اور تمہاری حکومت کے تحت سرزمین میں رہتے ہوں اور انہیں اپنے نزدیک لاؤ اور عزت بخشو اور وہ جو کچھ عثمان کی فضیلت میں نقل کریں وہ مجھ کو لکھ بھیجو اور ناقل اور اس کے باپ اور خاندان کا نام بھی درج کرو۔ اس بنا پر جو کوئی عثمان کے فضائل میں رسول اکرمؐ سے کوئی روایت نقل کرتا وہ ایک سرکاری دستاویز بن جاتی اور اموی خلافت کے دربار میں بھیج دی جاتی۔ اس فرمان پہ یوں عملدرآمد ہوا کہ عثمان کے فضائل اور ان روایات کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی جن میں یہ فضائل بیان کیے گئے تھے کیونکہ معاویہ اس مقصد کی خاطر مال و دولت املاک اور زمین، انعام و اکرام غرضیکہ ہر چیز بے دریغ اور کھلے دل سے عربوں اور موالیوں کے درمیان تقسیم کرتا تھا۔ لہٰذا اسلامی مملکت کے ہر شہر میں جعلی حدیثیں تیار کرنے کا کاروبار عام ہو گیا اور دنیا پرست لوگ مال و زر حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے لگے۔ کوئی رد شدہ اور دور افتادہ شخص ایسا نہ تھا جو کسی سرکاری اہلکار یا معاویہ کے مقرر کیے گئے حاکم کے پاس گیا ہو اور اس نے عثمان کے فضائل اور مناقب کے بارے میں روایت نقل کی ہو مگر یہ کہ اس کا نام لکھ لیا جاتا اور وہ حکومت وقت کے قریب ہو جاتا اور دوسروں کے بارے میں اس کی سفارش قبول کی جاتی اور معاشرے میں اسے بلند مقام حاصل ہو جاتا۔ کافی مدت اسی طرح گزر گئی۔

تیسرے فرمان کا صادر ہونا

اس اعلان کے بعد خلافت کی مرکزی انتظامیہ کی جانب سے ایک اور فرمان صادر ہوا کہ عثمان کے بارے میں احادیث بہت ہو گئی ہیں اور اسلامی مملکت کے تمام شہروں اور دیہاتوں میں نشر ہو گئی ہیں۔ اب جب میرا یہ خط تمہیں ملے تو لوگوں کو دعوت دو کہ وہ صحابہ اور پہلے خلفاء کے متعلق احادیث نقل کریں اور جو روایت بھی لوگوں نے ابو تراب کے متعلق نقل کی ہو اس کی تردید میں صحابہ کے بارے میں روایات مجھے بھیجو کیونکہ اس کام سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں اور یہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس سے ابو تراب اور اس کے شیعوں کے دلائل کی زیادہ کاٹ ہوتی ہے اور یہ ان کے لیے عثمان کے مناقب اور فضائل کے مقابلے میں زیادہ تکلیف دہ ہے

معاویہ کا حکم نامہ پڑھ کر لوگوں کو سنایا گیا اور اس کے بعد صحابہ کے مناقب میں بہت سی جھوٹی روایات وضع کر کے نقل کی گئیں۔ اس سلسلے میں لوگوں نے بڑی سرگرمی دکھائی۔ یہاں تک کہ یہ روایات مسجدوں کے منبروں پر سے پڑھ کر سنائی جانے لگیں اور مدرسوں کے معلموں تک بھی جا پہنچیں اور انہوں نے خورد سال بچوں کو اور نوجوانوں کو پڑھائیں اور اتنی بار پڑھائیں کہ یہ قرآن مجید کی طرح قبول کی جانے لگیں۔ وہاں سے یہ گھروں میں عورتوں اور لڑکیوں تک اور خدمتگاروں اور غلاموں تک پہنچیں۔ گھر کا مرد انہیں سرکاری منبروں پر سے اور نماز جمعہ کے خطبوں میں سنتا تھا اور پھر گھر جا کر اپنے گھر والوں یعنی بیوی بچوں اور خدمتگاروں کے سامنے دہراتا تھا۔

طویل مدت تک یہی صورت رہی۔ معاویہ کو ۴۱ھ سے ۶۰ھ تک حکومت اور خلافت حاصل رہی۔ دنیا پرست لوگ اس لمبے عرصے میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں مصروف رہے۔ یوں بہت سی احادیث وجود میں آئیں اور بہت سے جھوٹ نشر کیے گئے۔ فقہاء، قاضی اور والی سبھی اس چکر میں پھنس گئے اور اسی راہ پر چل کھڑے ہوئے اس محاذ پر ضعیف الایمان اور ریاکار قاریوں نے جو بظاہر بڑے عابد و زاہد بنتے تھے، سب سے

زیادہ سرگرمی دکھائی۔ وہ احادیث وضع کرتے تھے تاکہ والیوں کے نزدیک انکی قدرومنزلت ہو اور وہ حکومت وقت کے منظورِ نظر بن جائیں اور مال و دولت حاصل کریں۔ یہ صورت جاری رہی حتیٰ کہ ایسی جھوٹی روایات اور احادیث دیندار اشخاص اور ان لوگوں تک پہنچیں جو جھوٹ سے پرہیز کرتے تھے۔ ان لوگوں نے مذکورہ احادیث کو صحیح اور درست سمجھتے ہوئے نقل کیا اور اگر انہیں اس بات کا علم ہوتا کہ یہ جھوٹی ہیں تو وہ ہرگز انہیں بیان نہ کرتے اور ان پر اعتقاد نہ رکھتے۔ جو کچھ "مدائنی" نے نقل کیا ہے اس کی تائید کرتے ہوئے چوتھی صدی ہجری کا مورخ "ابن نفطویہ" یوں کہتا ہے:

"بیشتر جھوٹی احادیث جن میں صحابہ کے فضائل بیان کیے گئے ہیں بنی امیہ کے زمانے میں گھڑی گئیں۔ ایسی احادیث کے گھڑنے والے اور انہیں نقل کرنے والے یہ چاہتے تھے کہ اس ذریعے سے دربارِ خلافت تک رسائی حاصل کریں اور اموی اربابِ اقتدار کی خوشنودی حاصل کریں۔ اموی بھی یہ چاہتے تھے کہ ان کے کام کے ذریعے بنی ہاشم کو ذلیل کریں۔" [1]

ان احادیث کے چند نمونے

۱: جب آیت "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ." نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے بنی ہاشم کو اپنے گھر پہ مدعو کیا اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ پھر فرمایا:

"اَيُّكُمْ يُوَازِرُنِيْ عَلٰى هٰذَا الْاَمْرِ فَيَكُوْنَ اَخِيْ وَ وَزِيْرِيْ وَ خَلِيْفَتِيْ."

ان سب نے ایمان لانے اور آنحضرتؐ کی مدد کرنے سے انکار کیا، فقط حضرت علیؑ نے آپ کی دعوت قبول کی۔ اس وقت آنحضرتؐ نے فرمایا:

"هٰذَا اَخِيْ وَ وَزِيْرِيْ ......"

---

[1] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ جلد ۳ (پندرھواں صفحہ اور بعد کے صفحات) قدیم ایڈیشن اور قاہرہ میں مطبوعہ ایڈیشن تصحیح محمد ابوالفضل ابراہیم (جلد ۱۱ صفحہ ۴۶)

اس حقیقت کو جھٹلانے کے لیے بی بی عائشہ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے کہا:
جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے بنی عبدالمطلب کو جمع کیا اور فرمایا: "اے میرے قرابت دارو! اے صفیہ بنت عبدالمطلب! اے فاطمہ بنت محمدؐ! خدا کی بندگی کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

اور ابو ہریرہ سے روایت کی گئی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اکرمؐ نے قریش کی دعوت کی اور ان کے ایک قبیلے کو مخاطب کیا اور فرمایا: اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ......

ایک اور شخص سے روایت کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ نے پتھروں کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر فرمایا: میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں......

اور یوں اس روایت کی تردید میں کئی اور روایتیں نقل کی گئی ہیں۔

ب: ایک مشہور روایت کے مطابق رسول اکرمؐ نے فرمایا: "اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا"
اس روایت کے برعکس کہا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَاَبُوْبَکْرٍ اَسَاسُهَا وَعُمَرُ حِیْطَانُهَا وَ عُثْمَانُ سَقْفُهَا وَعَلِیٌّ بَابُهَا۔

ج: رسول اکرمؐ نے فرمایا: اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔
اس کے برعکس یوں روایت کی گئی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ سَیِّدَا کُهُوْلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔

بی بی عائشہ کی فضیلت کے بارے میں روایات

شاید جو روایات بی بی عائشہ کی فضیلت میں نقل کی گئی ہیں وہ بھی اسی قسم کی ہوں اور ان احادیث کے مقابلے پر ہوں جن میں رسول اکرمؐ کی اپنی بیٹی بی بی فاطمہ علیہا السلام سے محبت بیان کی گئی ہے۔ مثلاً: رسول اکرمؐ جب کبھی سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں بی بی فاطمہ علیہا السلام سے ملاقات فرماتے تھے۔[1]

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۷۵ ۔ سنن بیہقی جلد ۱ صفحہ ۲۶ ۔ مستدرک صحیحین جلد ۱ صفحہ ۴۸۹ ۔

"اور جب کبھی آنحضرت سفر سے واپس تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے بی بی فاطمہ علیہا السلام سے ملنے جاتے تھے۔"[۱]

ایک اور روایت کے مطابق "آنحضرت مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد پہلے بی بی فاطمہ سے ملتے تھے اور پھر اپنی بیویوں کے پاس جاتے تھے۔"[۲]

علاوہ ازیں آپ نے فرمایا: "فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ جو کوئی اسے ناراض کرے وہ مجھے ناراض کرتا ہے۔"[۳]

اور یہ کہ "خدا فاطمہ کے غضبناک ہونے کی وجہ سے غضبناک ہوتا ہے اور فاطمہ کے خوشنود ہونے سے خوشنود ہوتا ہے۔"[۴]

خدا اور رسول اکرم کے نزدیک بی بی سیدہ کی قدر و منزلت کے بارے میں مذکورہ بالا بہت سی احادیث کے مقابلے میں بی بی عائشہ کے متعلق احادیث روایت کی گئی ہیں مثلاً کہا گیا ہے کہ:

"رسول اکرم نے ایک غزوے کے دوران لشکر اسلام کو بی بی عائشہ کا ہار تلاش کرنے کی خاطر ایک ایسے لق و دق بیابان میں روک لیا جس میں پانی دستیاب نہ تھا۔ لشکر اسلام کو نماز ادا کرنے کے لیے طہارت اور وضو کی خاطر پانی کی ضرورت تھی جبکہ آنحضرت بی بی عائشہ کے گھٹنے پر سر رکھ کر سو رہے تھے۔ جب آپ بیدار ہوئے تو خدا نے آپ پر آیۂ تیمم نازل فرمائی۔ اس پر مسلمانوں نے کہا: "مَاهِيَ اَوَّلُ بَرَكَتِكُمْ يَا آلَ اَبِيْ بَكْرٍ" (اے ابوبکر کے خاندان! تم سے یہ برکت پہلی برکت نہیں ہے) اور ابوبکر نے کہا:

۱۔ مستدرک صحیحین جلد ۳ صفحہ ۱۵۶

۲۔ ایضاً جلد ۳ صفحہ ۱۵۵

۳۔ صحیح بخاری باب قول النبی: "فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّيْ فَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِيْ" کتاب بدء الخلق جلد ۲ صفحہ ۲۰۵ اور کتاب النکاح بَابُ ذَبِّ الرَّجُلِ عَنِ ابْنَتِهٖ۔ جلد ۳ صفحہ ۱۷۷ سے مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۲۸ اور صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ باب فضائل فاطمہ

۴۔ مستدرک صحیحین جلد ۳ صفحہ ۱۵۳ - اسد الغابہ جلد ۵ صفحہ ۵۲۲ - اصابہ جلد ۴ صفحہ ۱۵۹

"مَا كُنْتُ اَعْرِفُ كَمْ اَنْتِ مُبَارَكَةً يَا بُنَيَّةَ" (اے میری بیٹی! مجھے علم نہ تھا کہ تم کس قدر بابرکت ہو)۔

اسی طرح وہ روایات ہیں جو ہم نے گزشتہ صفحات میں پڑھی ہیں مثلاً وہ روایت جس کے مطابق رسول اکرمؐ نے بی بی عائشہ کو کندھے پر اٹھالیا تاکہ وہ مسجد میں حبشیوں کا ناچ دیکھ سکیں۔ ان تمام روایات کا انداز بتاتا ہے کہ یہ ان روایات کے مقابلے میں نقل کی گئی ہیں جن میں بی بی فاطمہ علیہا السلام کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

اب تک ہم نے جن روایات کا ذکر کیا ہے وہ خلیفۂ وقت معاویہ کے سرکاری اور کھلے گشتی مراسلوں سے مناسبت رکھتی تھیں جس نے حکم دیا تھا کہ ابوترابؑ کے خاندان کے فضائل کے مقابلے میں خلفاء کے مکتب کے فضائل پیش کیے جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ وہ روایات کیوں بیان کی گئیں جن میں خلفاء کے مکتب کے سرکردہ اشخاص کے لیے تو کوئی فضیلت نہ تھی لیکن رسول اکرمؐ اور آپ کے خاندان کی شخصیت پر زد پڑتی تھی؟

اس بارے میں خلفاء کے مکتب کے جو مقاصد پہلے گنوائے گئے ہیں ان کے علاوہ ہم معاویہ کے ایک اور خطرناک مقصد پر نگاہ ڈالتے ہیں جسے تاریخ نے خود معاویہ کی زبانی محفوظ کیا ہے۔

تاریخ میں معاویہ کا بے حد خطرناک مقصد خود اس کی زبان سے یوں ثبت ہوا ہے:

زبیر بن بکار[1] اپنی کتاب "الموفقیات" میں مغیرہ بن شعبہ کے بیٹے مطرف سے نقل کرتا ہے: میں نے اپنے باپ مغیرہ کے ہمراہ شام کا سفر اختیار کیا اور ہم معاویہ کے پاس پہنچے۔

---

[1] زبیر بن بکار عبداللہ بن زبیر کی اولاد میں سے تھا اور ۲۵۶ھ میں مکہ میں فوت ہوا۔ اس نے کتاب "الموفقیات" متوکل عباسی کے بیٹے الموفق باللہ کے نام پر تالیف کی۔ یہ کتاب ۱۳۹۲ھ میں بغداد میں "العانی" پریس میں چھپی ہے اور یہ روایت اس کے صفحہ ۵۷۶ پر ہے۔ مسعودی نے اسے زبیر سے مروج الذہب سے نقل کیا ہے اور تاریخ ابن اثیر کے حاشیے میں (جلد ۹ صفحہ ۴۹) اور ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۴۶۳ پہلا ایڈیشن) میں بھی آئی ہے۔

میرا باپ ہر روز معاویہ کے پاس جاتا اور کافی دیر تک اس سے باتیں کرتا جب وہ گھر آتا تو بڑے تعجب کے ساتھ اس کے فہم و فراست کا ذکر کرتا، لیکن ایک رات جب میں نے اسے سخت افسردہ دیکھا تو میں کچھ دیر خاموش رہا کیونکہ میں یہ سمجھا کہ میرے باپ کی پریشانی کسی ایسے فعل کی وجہ سے ہے جو ہم سے سرزد ہوا ہے یا کسی ایسے حادثے کی بنا پر ہے جو ہمارے کام میں پیش آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ آج رات اس قدر پریشان کیوں ہیں تو انہوں نے جواب میں کہا: میرے بیٹے! میں ایک خبیث ترین اور کافر ترین شخص کے پاس سے آرہا ہوں۔

میں نے کہا: ہیں! کیا ہوا؟

میرے والد نے کہا: معاویہ اکیلا تھا۔ میں نے اس سے کہا: اے امیر المومنین! آپ کی آرزوئیں اور مرادیں پوری ہو گئی ہیں۔ اب اس بڑھاپے میں اگر آپ عدل و انصاف سے کام لیں اور دوسروں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ اگر آپ اپنے ہاشمی رشتہ داروں پر لطف کی نگاہ ڈالیں اور ان سے صلہ رحم کریں تو آپ ہمیشہ نیک نام رہیں گے۔ خدا کی قسم اس وقت ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جو آپ کے لیے خوف و خطر کا موجب ہو (یعنی بنی ہاشم کا خلافت سے کوئی واسطہ نہیں رہا)۔

معاویہ نے جواب دیا: جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ ناممکن ہے۔ ابوبکر کو حکومت ملی۔ انہوں نے عدل سے کام لیا اور بے شمار تکلیفیں اٹھائیں۔ خدا کی قسم جب وہ فوت ہو گئے تو ان کا نام بھی ان کے ساتھ دفن ہو گیا۔ مگر یہ کہ کوئی کہنے والا کسی دن کہے: ابوبکر!! پھر عمر نے حکومت سنبھالی۔ انھوں نے بھی کوششیں کیں اور دس سال تک تکلیفیں اٹھائیں۔ انھیں مرے ہوئے چند دن سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ ان کی کوئی چیز باقی نہ رہی سوائے اس کے کہ کسی وقت کوئی کہنے والا کہے: عمر! پھر خلافت ہمارے بھائی عثمان کو ملی۔ نسب کے لحاظ سے ان کا مدِمقابل کوئی نہ تھا اور انہوں نے جو کیا سو کیا اور جو کچھ ان کے ساتھ کیا گیا سو کیا گیا لیکن وہ قتل ہو گئے تو خدا کی قسم ان کا نام بھی مر گیا اور ان کے طور طریقے بھی بھلا دیے گئے!!

اس کے برعکس اس ہاشمی مرد (رسول اکرمؐ) کا نام ہر روز پانچ مرتبہ ساری

دنیائے اسلام میں بلند آواز سے لیا جاتا ہے اور اسے بڑے احترام سے یاد کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ!"

تم خود سوچو کہ اس صورت میں کونسا عمل باقی رہ سکتا ہے اور کونسا نیک نام پائیدار ہے۔ خدا کی قسم میں اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اس نام کو دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹا نہ دوں! [1]

معاویہ کا سینہ رسول اکرمؐ کے نام کی شہرت سے ـــ جنہوں نے اس کے بھائی ماموں، نانا اور دوسرے رشتہ داروں کو جنگ بدر میں ہلاکت سے دوچار کر دیا تھا ـــ ایک بھٹی کی مانند بھڑک رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس نام کو دفن کر دے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے دو منصوبے تھے:

معاویہ کے پہلے منصوبے کا خلاصہ ایک جملے میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ: "بنی ہاشم کا ایک فرد بھی زندہ نہیں رہنا چاہیے!"

فقط ہم ہی اس نتیجے پر نہیں پہنچے بلکہ خود امام امیرالمومنینؑ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: "خدا کی قسم معاویہ چاہتا ہے کہ بنی ہاشم کا ایک فرد بھی زندہ نہ رہے۔ وہ اس وسیلے سے خدا کے نور کو بجھانا چاہتا ہے لیکن خدا اپنے نور کی تکمیل کے علاوہ کسی چیز پر راضی نہیں ہوتا گو کافر اس کی مرضی سے راضی نہ ہوں۔"

اور اس کا دوسرا منصوبہ ان جعلی حدیثوں کی تیاری تھی جن کی جانچ پڑتال ہم پہلے کر چکے ہیں اور ان کے ذریعے رسول اکرمؐ کی شخصیت کو گھٹایا گیا اور ان میں خلفاء کے مکتب کے سرکردہ اشخاص کی کوئی فضیلت نہ تھی مثلاً رسول اکرمؐ جنابت کی حالت میں مسجد کی محراب میں نماز کے لیے کھڑے ہو گئے یا یہ کہ یہودیوں کے جادو نے آنحضرتؐ پر اثر کیا۔

---

[1] فَاَیُّ عَمَلٍ یَبْقٰی مَعَ هٰذَا؟ لَا اُمَّ لَكَ! لَا وَاللّٰهِ اِلَّا دَفْنًا دَفْنًا۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ معاویہ نے یہ الفاظ کہے:

وَاَنَّ ابْنَ اَبِیْ كَبْشَةَ لَیُصَاحُ بِهٖ یَوْمِیًا خَمْسَ مَرَّاتٍ لَا وَاللّٰهِ اِلَّا دَفْنًا دَفْنًا۔

امیر المومنین علیہ السلام کی مذمت میں جو روایات وضع کی گئیں اور جنکی جانچ پڑتال ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں وہ بھی اسی قسم کی ہیں۔

لیکن جس چیز نے معاویہ کو اس کے مقصد کے حصول میں سب سے زیادہ مدد دی وہ، وہ روایات ہیں جن میں مندرجہ ذیل افسانہ نقل کیا گیا ہے:

خدا نے جبرئیل کے ذریعے سورۂ اقراء اپنے پیغمبر پر نازل فرمائی۔ رسول اکرمؐ کو شک گزرا کہ آیا یہ کلام لانے والا جن ہے یا شیطان اور آپ کو سورۂ اقراء کی آیات کے بارے میں بھی شک ہوا کہ یہ آیات کاہنوں کے سجع کی قسم کی تو نہیں ہیں جنہیں وہ جنوں سے سیکھتے ہیں؟ اور آپ کو خود اپنے آپ پر بھی شک ہوا کہ کہیں آپ کاہن تو نہیں بن گئے۔ اس بنا پر آپ سخت پریشان ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنے آپ کو پہاڑ سے نیچے گرا دینا چاہا تاکہ ہلاک ہو جائیں اور کاہن نہ کہلائیں۔ بالآخر ورقہ بن نوفل نصرانی کی مدد سے آپ مطمئن ہو گئے!

کیا اس قسم کی باتیں معاویہ کی اور یزید کی جس نے کہا تھا: "لَعِبَتْ هَاشِمُ بِالْمُلْكِ فَلَا خَبَرٌ جَاءَ وَلَا وَحْيٌ نَزَلَ" [1] اور اسی طرح دوسرے منافقین کی مدد نہیں کرتیں جن کی قرآن مجید نے خبر دی ہے اور ان کے بارے میں فرمایا ہے: "مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ" [2]

نفوذ کرنے والے عناصر کی روایات میں تخریب کاری

اب تک ہم نے خلفاء کے مکتب کی روایات میں داخلی عناصر کی تخریب کاری کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ اب ہم اسلام میں نفوذ کرنیوالے عناصر کی تخریب کاری کا مطالعہ کرتے ہیں۔

---

[1] ہاشمیوں (رسول اکرمؐ اور قبیلہ بنی ہاشم) نے ملک اور سلطنت کے لیے کھیل کھیلا تھا ورنہ نہ کوئی خبر آئی تھی اور نہ ہی وحی نازل ہوئی تھی۔

[2] (سورۂ توبہ۔ آیت ۱۰۱) اہل مدینہ میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نفاق میں ماہر ہیں۔ (اے رسولؐ) تم انہیں نہیں جانتے لیکن ہم انہیں جانتے ہیں۔

اسلام سے قبل جاہلیت کے دور میں جو لوگ مکہ و مدینہ میں رہتے تھے یا صحرا نشین تھے وہ حج کے دنوں میں نیز عکاظ اور ذی المجاز کے میلوں میں اپنے جو اشعار سناتے تھے وہ تمام کے تمام قبائلی مفاخر اور جنگوں، اونٹوں، گھوڑوں، تلواروں اور نیزوں اور بعض اوقات محبوبہ اور اس کے وطن کے گرد گھومتے تھے۔ وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور کاہنوں سے علم سیکھتے تھے لیکن اسلامی معاشرے میں صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خلقت کے آغاز اور انجام اور اس کی حکمت آسمانوں اور ستاروں اور گزشتہ قوموں کی عبرت انگیز داستانوں اور دوسرے ہزاروں حقائق کے بارے میں غور کریں۔ وہ جتنی بار قرآن پڑھتے ان کا ایسے معارف کے حصول کا شوق بڑھتا جاتا اور دوسری طرف مسلمانوں کی فتوحات اور روم، فارس اور قبط جیسی قوموں پر ان کی بالادستی اور ان قوموں کے گوناگوں خیالات کے نتیجے میں مسلمانوں کے لیے ہزاروں مسائل پیدا ہو گئے اور ان سے سوالات پوچھے جانے لگے۔ بالخصوص جب صورت یہ تھی کہ جن لوگوں نے یہ معارف رسول اکرمؐ سے حاصل کیے تھے خلافت کی انتظامیہ نے ان کے منہ بند کر دیے تھے اور انہیں آنحضرتؐ کی احادیث نقل کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا اور وہ خود بھی ایسے سوالوں کے جواب نہیں دے پاتے تھے اور جیسا کہ ہم نے صبیغ تمیمی کی داستان میں دیکھا کہ جب اس نے "والذاریات" کے معنی پوچھے تھے تو اسے کوڑوں، قید اور جلاوطنی کی سزا بھگتنا پڑی۔ حتیٰ کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی خلافت کے زمانے میں اس سوال کا جواب دیا۔ ان حالات میں خلافت کی انتظامیہ کے لیے ضروری تھا کہ اس درماندگی کا علاج کرے۔

خلافت کی انتظامیہ نے اس درماندگی کا علاج کیا اور بڑا عجیب علاج کیا۔ اس کے علاج کے لیے انہوں نے اہل کتاب کے بعض علماء سے استفادہ کیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے مجبوراً اسلام قبول کیا تھا مثلاً تمیم داری جو دراصل عیسائی راہب تھا اور جس نے ایک چوری کرنے کے نتیجے میں اسلام قبول کیا تھا تاکہ اپنے گناہ کی سزا سے محفوظ رہے۔ وہ دوسرے خلیفہ کے زمانے میں مسجد نبوی میں خلیفہ کے نماز جمعہ کے خطبہ سے پہلے سرکاری طور پر تقریر کیا کرتا تھا اور خلیفہ عثمان کے زمانے میں اس پر ایک اور دن کا اضافہ کر دیا گیا۔ جیسا کہ یعنی

لمبے بالوں والے حیوان دجال کا افسانہ جو خلفاء کے مکتب کی کتب صحاح میں نقل کیا گیا ہے اس کے خیالات کا نمونہ ہے۔

اہل کتاب کا دوسرا عالم جس کے وجود سے خلافت کی انتظامیہ نے کافی حد تک استفادہ کیا کعب الاحبار یہودی تھا۔ اس نے دوسرے خلیفہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا اور خلیفہ کے اصرار پر مدینہ میں بود و باش اختیار کی اور خلیفہ عثمان کی خلافت تک دربار خلافت کا سرکاری عالم رہا اور ہمیشہ اس سے حقائق دریافت کیے جاتے تھے۔ اس سے جو روایات ملتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے کہا: "خانہ کعبہ ہر روز صبح کے وقت بیت المقدس کو سجدہ کرتا ہے"۔

دوسرے خلیفہ نے اس سے پوچھا: خدا اپنے عرش کو پیدا کرنے سے پہلے کہاں تھا؟ اور بعد میں اس نے اپنے عرش کو جس پانی پر رکھا اسے اس نے کس چیز سے پیدا کیا؟ کعب الاحبار نے جواب دیا: "مجھے اصل حکیم (یعنی تورات) سے پتا چلا ہے کہ خدا بیت المقدس کی چٹان پر تھا اور چٹان ہوا میں تھی۔ خدا نے اپنا لعاب دہن گرایا اور اس کے ذریعے سمندر پیدا کیے اور اپنے عرش کو بیت المقدس کی ایک چٹان کے ایک حصے سے خلق فرمایا اور اس پر بیٹھ گیا اور چٹان کا جو حصہ باقی بچا اس سے بیت المقدس کو پیدا کیا۔ حضرت امیر علیہ السلام وہاں موجود تھے اور آپ نے اس کا جھوٹ ظاہر کر دیا۔

اس عالم نے صحابہ اور تابعین میں سے اپنے کئی ایک شاگردوں مثلاً کثرت سے احادیث روایت کرنے والے صحابی، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمر اور عمرو بن عاص کو تربیت دی اور یوں اہل کتاب کی روایات خلفاء کے مکتب کی کتابوں میں عجیب طور پر پھیل گئیں۔

اسلام میں نفوذ کرنے والے خطرناک عناصر کی ایک اور صنف

پہلی صدی ہجری کے اواخر میں اور دوسری صدی ہجری کے اوائل میں خلیفہ وقت نے رسول اکرمؐ کی احادیث لکھنے کی اجازت دیدی۔ ان دنوں اسلام میں نفوذ کرنیوالا ایک اور خطرناک عنصر جس کا نام زنادقہ تھا اسلامی خیالات کے ہر گوشے میں تخریبکاری کیلئے

اٹھ کھڑا ہوا اور ان کی تخریب کاریوں میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ انھوں نے جعلی حدیثیں تیار کیں۔ ہم نے اب تک ان میں سے ایک شخص کی تخریب کاری کا مطالعہ کیا ہے جس کا نام سیف بن عمر تمیمی تھا اور عراق، یمن، حجاز، شام اور ایران میں اٹھائیس ایسے علاقوں اور شہروں کی نشاندہی کی ہے جو اس نے اپنے دل سے گھڑے ہیں۔ اسکے علاوہ اس نے ارتداد کے سلسلے میں لڑی جانے والی نو جنگوں اور فتوحات اسلامی کی خاطر لڑی جانے والی گیارہ جنگوں کی داستانیں بیان کی ہیں جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئیں ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اس نے اسلامی جنگوں میں جو کبھی نہیں لڑی گئیں مقتولین کی تعداد لاکھوں بتائی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام تلوار اور خونریزی سے پھیلا ہے۔

اس نے سیکڑوں اور تخریب کاریاں کی ہیں مثلاً ابوذر رضؓ اور عمار رضؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کو شورش پسند ظاہر کیا ہے۔

اس نے سیکڑوں جھوٹے افسانے معجزے کے نام سے گھڑے ہیں اور دسیوں تاریخوں کو الٹا دیا ہے۔ تحقیق کے دوران ہم نے دیکھا ہے کہ اس کی تخریب کاریاں خلفاء کے مکتب کی حدیث، تاریخ، سیرت اور جغرافیہ کی بہتر کتابوں میں داخل ہو گئی ہیں۔

خاتمہ

اسلام کے اولین منابع سے رجوع کرنے کے لیے کئی ایک موضوعات میں تخصص ضروری ہے۔ ان میں سے اہم یہ ہیں:

ا : قرآن مجید کے نازل ہونے کے زمانے کی عربی زبان کی شناخت میں تخصص۔

ب : راویان حدیث کی شناخت میں تخصص۔

ج : علم اصول فقہ میں تخصص۔

د : مذکورہ بالا معاملات میں فقہاء اور اہل فن اساتذہ کی زیرنگرانی کام کرنا۔

عربی زبان سے واقفیت قرآن مجید کے مندرجہ ذیل نکات کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

ا : صانع کا وجود اور اس کی توحید۔

ب : حضرت آدمؑ سے حضرت خاتم النبیینؐ تک تمام انبیاء کی نبوت اور ان کی اطاعت کا

واجب ہوتا۔

ج : قیامت، ثواب اور عقاب۔

د : اسلام کے عام احکام کی پہچان۔

لیکن خدائے عزوجل کی صفات انبیاء علیہم السلام کی صفات کی معرفت، روز قیامت، آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی تفصیل اور اسی طرح اسلام کے احکام پر عمل کرنے کا طریقہ رسول اکرم ؐسے اولین منابع کے وسیلے سے ہی سیکھا جا سکتا ہے اور اس کے لیے مذکورہ بالا موضوعات میں تخصص لازم ہے۔

قرآن مجید اور اسلام کے اولین منابع سے رجوع کرنے کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ انسان نے پہلے سے کوئی رائے قائم نہ کر رکھی ہو اور اس کا مقصد اپنے دعوے پر قرآن اور حدیث سے دلیل حاصل کرنا ہو کیونکہ اس صورت میں وہ تفسیر بالرائے کرے گا اور عذاب الٰہی کا مستوجب ٹھہرے گا۔

جو کچھ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس کے علاوہ ہم اپنے دور میں کچھ دوسری مشکلات میں مبتلا رہے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں :

۱ : عربی زبان سے نابلد اشخاص کی مضحکہ خیز تفسیر بالرائے۔

۲ : غیر متخصص حضرات کا قرآن سے رجوع کرنا اور تفسیر بالرائے کرنا۔

۳ : علماء کی خاموشی اور دوسروں کا غیر متخصص اشخاص کی حوصلہ افزائی کرنا۔

۴ : جن لوگوں نے بدعتوں کو عیاں کرنا چاہا ان کی کردار کشی کرنا۔

یہ سب چیزیں اس کام کی مقبولیت کا موجب بنیں۔ چنانچہ ایران میں فرقان اور مجاہدین خلق جیسے منحرف گروہ اس قابل ہو گئے کہ پہلے تو نوجوانوں کو یورپ سے بطور سوغات درآمد کردہ اسلام سے روشناس کرائیں اور پھر قرآن کی تفسیر بالرائے کریں اور بعد ازاں ان فریب خوردہ جوانوں کو دہشت گردی کے کیمپوں میں لے جائیں اور جسے چاہیں ان کے ہاتھوں شہید کرا دیں۔

دوسری جانب بعض متخصص اشخاص نے ان اعمال کے مقابلے پر جعلی اور نامعقول تحریریں چھپوا کر شائع کیں جن میں غلو کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ شیعوں کو کافر

قرار دینا چاہتے تھے انہیں ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔

کیا ان دکھوں کا کوئی مداوا بھی ہے ؟

جی ہاں! اسلامی معاشروں کے تمام دکھوں کا مداوا یہ ہے کہ وہ اپنے پیغمبرؐ کے بنائے ہوئے دستور العمل کے مطابق عمل کریں جنہوں نے فرمایا ہے کہ:

"وَاِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ مَّا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اَحَدُهُمَا اَعْظَمُ مِنَ الْاٰخَرِ کِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَّمْدُوْدٌ مِّنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلِ بَیْتِیْ وَلَنْ یَّتَفَرَّقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ فَانْظُرُوْا کَیْفَ تَخْلُفُوْنِیْ فِیْهِمَا." [۱]

آئندہ بحث میں ہم انشاء اللہ اس بارے میں رسول اکرمؐ کی احادیث کا مطالعہ کریں گے اور پھر اصل مطلب یعنی **"احیائے دین میں ائمۂ اہلبیتؑ کا کردار"** کی جانب لوٹیں گے۔ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰی ۔

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ.

●●●●●

---

[۱] صحیح ترمذی (جلد ۱۳ صفحہ ۲۰۱) اسد الغابہ امام حسنؑ کے حالات کے بارے میں، سیوطی: در المنثور سورۂ شوریٰ میں آیۂ "المودۃ" کی تفسیر میں اور اسی طرح ایک اور حدیث میں انہیں مضامین کے ساتھ مستدرک الصحیحین میں (جلد ۳ صفحہ ۱۰۹)، خصائص نسائی (صفحہ ۳۰)، مسند احمد بن حنبل (جلد ۳ صفحہ ۱۷)، طبقات ابن سعد (جلد ۲ صفحہ ۲) مجمع الزوائد (جلد ۹ صفحہ ۱۶۳) اور کنز العمال (جلد ۱ صفحہ ۴۷ - ۴۸ اور ۹۷)۔

ضمیمہ۔ الف

جب ہمارے بزرگ علمار معاشرے میں اسلامی احکام کے اجرار کی بات کرتے ہیں تو اس چیز کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ جامع الشرائط فقہار کی مدد کریں۔ یہ رائے اس مسئلے کی تائید کرتی ہے جس کی جانب ہم نے کتاب میں اشارہ کیا ہے۔

فقہار کا نظریہ یہ ہے :

"جس طرح غیبتِ امامؑ کے زمانے میں جامع الشرائط فقیہہ کے لیے جائز ہے کہ جب وہ حاکم وقت کے شر سے امن میں ہو تو مسلمانوں میں احکام کا اجرار کرے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس سلسلے میں اس کی مدد کریں۔" [1]

شہید اوّلؒ اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں :

"عام طور پر یہ امامؑ یا نائب امام کا کام ہے کہ حدود اور تعزیرات کا اجرار کریں۔ غیبتِ امامؑ کے دور میں ایک جامع الشرائط فقیہہ کو (جس کا ذکر باب القضار میں آئے گا) چاہیے کہ اگر قادر ہو تو احکام دین کا اجرار کرے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس سلسلے میں اس کی مدد کریں اور اگر کوئی اس پر غلبہ کرنا چاہے تو اسے روکیں۔ امن کی حالت میں فقیہہ پر واجب ہے کہ فتویٰ

---

[1] شرائع الاسلام جلد ۱ صفحہ ۳۴۴۔ مطبوعہ نجف

صادر کرے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے مسائل اسکے سامنے پیش کریں۔" [1]

علاوہ ازیں ایضاح الفوائد (جلد ا ص ۳۹۸-۳۹۹) اور عوائد الایام فقیہہ نراقی وغیرہ سے رجوع کریں۔ یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ بیعت کرنیوالے جو لوگ اسلامی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں ان کی تعداد اس حد تک پہنچ جانی چاہیے کہ ان کے ذریعے ایک صحیح معاشرے کا قیام ممکن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں مسلمانوں سے بیعت نہیں لی کیونکہ جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں بیعت معاشرے کی تشکیل کی بنیاد اور عادلانہ اسلامی حکومت سے مسلمانوں کی وفاداری اور اطاعت کی علامت ہے۔

مقدمہ ابن خلدون میں بیعت کے یہ معنی بیان کیے گئے ہیں:

"بیعت کے معنی اپنے عہد پر قائم رہنے کے ہیں۔ بیعت کرنیوالا اپنے امیر سے عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے انفرادی اور مسلمانوں کے اجتماعی امور میں اسکی رائے کو تسلیم کرے گا اور اسکی مخالفت نہیں کرے گا۔ نیز یہ کہ وہ جو حکم دے گا اسکی پوری پوری اطاعت کرے گا۔" [2]

مفردات القرآن میں کہا گیا ہے:

"جب سلطان کی بیعت میں اطاعت کا اقرار ہو اور بیعت کرنیوالا اسے اپنا امیر مان لے تو اس کو بیعت اور مبایعۃ کہتے ہیں۔" [3]

علاوہ ازیں مصباح المنیر اور لسان العرب، مادۂ بیع سے رجوع فرمائیں۔

مکہ میں مسلمانوں کو ایک تو ابھی تک اتنی انفرادی، سیاسی اور اقتصادی قوت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ وہ کفار سے ٹکرا سکیں جو پورے جزیرہ نمائے عرب پر چھائے ہوئے تھے اور دوسری بات یہ تھی کہ انھیں ابھی اسلامی تربیت کی ضرورت تھی تاکہ دورِ جاہلیت کے پروردہ لوگوں میں سے ثابت قدم اور مستقل مزاج اسلامی شخصیتیں ابھر سکیں۔

---

[1] الدروس الشرعیہ صفحہ ۱۶۵ مطبوعہ ایران [2] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ دار التراث العربی

[3] راغب اصفہانی: مفردات القرآن، مادہ بیع صفحہ ۶۷ - مطبوعہ ایران

تاریخ میں امیرالمومنین علیہ السلام کا جو یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ: "اگر مجھے فولادی ارادے کے مالک چالیس افراد مل جاتے تو میں سقیفہ کے کرتا دھرتا لوگوں سے ٹکر لے لیتا" [۱]

اس کی وجہ یہی ہے کیونکہ اسلامی حکومت کو اسلامی اور اسلام شناس فعال اور سرگرم شخصیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جماعت جس کی تعداد امیرالمومنین علیہ السلام کی زبانی چالیس بتائی گئی ہے تمام پیروؤں پر نہیں بلکہ فقط ان لوگوں پر مشتمل ہو جو عادل حکومت کا مرکزی حصہ تشکیل دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چالیس آدمیوں پر مشتمل نہ تو کوئی معاشرہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی حکومت کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے بہت سے افراد کی موجودگی ضروری ہے۔ بلاشبہ یہ افراد زیادہ تر عام طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور بالعموم رہنما، مفکر اور منتظم نہیں بلکہ پیرو ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس مذکورہ ۴۰ افراد قوم کا غور و فکر کرنیوالا دماغ ہوتے ہیں جو تمام کاروبار چلاتے ہیں۔

یہ امر بھی واضح ہے کہ ایک فولادی عزم و ارادے کا مالک شخص کسی تحریک یا عقیدے کی پیشرفت پر کس حد تک اثرانداز ہو سکتا ہے اور اس کے اردگرد کتنے اشخاص جمع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ علوی حکومت کی تاریخ میں عمار یاسرؓ جیسا فردِ واحد یا مالک اشتر نخعی جیسا ایک شخص کس اہمیت کے حامل تھے اور ان کے نہ ہونے سے اہل حق کے محاذ کی شکست اور ظاہری طور پر پیش قدمی رک جانے پر کتنا اثر پڑا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک ہزار سے زیادہ صحابہ جنگِ صفین میں حضرت علیؑ کے ہمرکاب تھے [۲] اور وہ سب کے سب عمارؓ کے اردگرد جمع تھے۔ اگر وہ کسی ٹیلے پر چڑھتے تو وہ سب بھی ساتھ چڑھتے اور اگر نیچے اتر کر کسی وادی یا درے میں قدم رکھتے تو وہ بھی ہمراہ ہوتے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک صاحب عزم انسان کتنے لوگوں کو اپنے پاس جمع کر لیتا ہے اور اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ لہٰذا اسلامی معاشرے کی عمارت پہلے مرحلے میں کچھ اسلام شناس، دانا، جانباز اور فرمانبردار اشخاص کے کندھوں پر اور پھر مسلمانوں کی کثیر تعداد پر استوار ہوتی ہے۔

---

[۱] شرح نہج البلاغہ جلد ا صفحہ ۱۳۱ قدیم ایڈیشن اور جلد ۲ صفحہ ۷، بہ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم مطبوعہ مصر

[۲] ابن واضح: تاریخ یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۱۶۴

ضمیمہ - ب

آیت تطہیر کی تفسیر اور اس کی اہلبیتِ رسولؐ کی عصمت پر واضح دلالت کے بارے میں کثیر دستاویزات موجود ہیں لیکن ہم ان میں سے فقط چند پر اکتفا کرتے ہیں۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"اللہ نے اپنی مخلوق کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور ہمیں اچھی مخلوق کے حصے میں رکھا۔ آپ نے مزید فرمایا: کچھ لوگ اصحاب یمین ہیں اور کچھ اصحاب شمال ہیں اور ہم اصحاب یمین میں سے بہترین اصحاب ہیں۔ اس کے بعد اللہ نے مختلف قبیلوں کے لیے گھرانے قرار دیے اور ہمارے لیے سب سے اچھا گھرانہ مقرر کیا۔ اسی بنا پر اللہ نے فرمایا ہے کہ اے (پیغمبرؐ کے) اہلبیت! اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ہر برائی سے دور رکھے اور ایسا پاک و پاکیزہ کر دے جیسا کہ پاک و پاکیزہ کرنے کا حق ہے۔ (سورۃ احزاب۔ آیت ۳۳) اسی بنا پر ہم اور ہمارے اہلبیت گناہوں سے پاک ہیں[1]۔"

اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سابقہ اور موجودہ بزرگ مفسرین کا نظریہ یہ ہے:

---

[1] سیوطی: تفسیر در منثور جلد ۵ صفحہ ۱۹۹

پلیدی کا وجود چار صورتوں میں ممکن ہے۔ طبعی نقطۂ نگاہ سے یا عقلی نقطۂ نگاہ سے یا شرعی نقطۂ نگاہ سے اور یا ان تینوں چیزوں کی بنا پر جیسے کہ مردار۔ کیونکہ مردار شرعی نقطۂ نگاہ سے بھی پلید ہے۔ نیز عقل اور انسانی فطرت کے لحاظ سے بھی۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے جوا اور شراب پلید ہیں اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ چیزیں عقل کے فیصلے کی رو سے بھی پلید شمار ہوتی ہیں"۔۔۔ [۱]

ابن اثیر نے لکھا ہے:

"رجس پلید چیز کو کہتے ہیں۔ بعض اوقات اس سے حرام کام اور قبیح عمل بھی مراد ہوتے ہیں"۔ [۲]

علامہ ابن منظور نے کہا ہے:

"رجس کے معنی پلیدی کے ہیں۔ بعض اوقات حرام اور قبیح فعل عذاب، لعنت اور کفر کو بھی رجس سے تعبیر کیا جاتا ہے"۔ [۳]

فیروز آبادی کہتا ہے:

"پلیدی کو نیز ہر برے اور نجس کام کو اور ہر ایسے کام کو جس کا انجام عذاب، شک، بری جزا اور غصہ ہو، رجس کہا جاتا ہے"۔ [۴]

جوہری لکھتا ہے:

"رجس سے مراد گندگی ہے اور فراء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رجس ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے اور یہاں رجس کے معنی عقاب اور غضب کے ہیں"۔ [۵]

---

[۱] مفردات القرآن، مادۂ رجس صفحہ ۱۸۷ مطبوعہ تہران ۱۳۷۳ھ

[۲] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر جلد ۲ صفحہ ۲۰۰ مطبوعہ مصر ۱۳۸۳ھ

[۳] لسان العرب المحیط، مادۂ رجس جلد ۱ صفحہ ۱۱۲۸ مطبوعہ یوسف خیاط و ندیم مرعشلی

[۴] قاموس المحیط، مادۂ رجس جلد ۲ صفحہ ۲۲۷ مطبوعہ مصر

[۵] الصحاح، مادۂ رجس جلد ۲ صفحہ ۹۳۰ مطبوعہ مصر، تحقیق احمد عبد الغفور عطار۔ عبد القادر رازی نے مختار الصحاح صفحہ ۲۳۴ کسی تبدیلی کے بغیر رجس کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔

قتادہؓ سے روایت ہے کہ "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ ..." کے مصداق (پیغمبرؐ کے) اہلبیت ہیں۔ اللہ نے انہیں ہر برائی سے پاک و پاکیزہ رکھا ہے اور اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ [۱]

طبری نے کہا ہے کہ آیت تطہیر "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ" میں "رِجْس" سے مُراد (بدی اور برائی) ہے اور ارشاد باری تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ اے محمدؐ کے اہلبیت! اللہ نے تمہیں گندگی سے جو کہ گنہگاروں میں پائی جاتی ہے پاک رکھا ہے۔ [۲]

زمخشری نے کہا ہے کہ گناہ کو استعارے کے طور پر رجس اور تقویٰ کو طہر کہا جاتا ہے کیونکہ رجس گنہگار کو اسی طرح آلودہ کرتا ہے جیسے میل انسان کے بدن کو آلودہ کرتا ہے۔ [۳]

امام رازی نے کہا ہے کہ آیت تطہیر میں کلمۃ الرجس سے مراد بری چیزوں سے محفوظ رکھنا اور گناہوں سے اس طرح پاک رکھنا ہے جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے اور رجس کو بطور استعارہ گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور تطہیر سے مراد گناہوں سے دور ہونا ہے۔ [۴]

مراغی نے کہا ہے: آیت تطہیر میں لفظ الرجس کے معنی بدی اور برائی کے ہیں اور ارشاد خداوندی کا مطلب یہ ہے کہ اہلبیتِ رسولؐ! خدا نے آپ کو برائی اور فسق و فجور سے جس سے کہ گنہگار آلودہ ہوتے ہیں، پاک و پاکیزہ رکھا ہے۔ [۵]

فرہنگ نویس نے بھی رجس کے ایسے معنی بتائے ہیں کہ اس سے پاکیزگی کا مطلب بالآخر عصمت نکلتا ہے۔

راغب اصفہانی نے کہا ہے: رجس پلید چیز کو کہتے ہیں مثلاً رجل رجس کے معنی ایک پلید مرد اور رجال ارجاس کے معنی کئی ایک پلید مردوں کے ہیں۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: "رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ" یعنی یہ شیطان کے عمل میں سے ایک پلیدی ہے۔

---

[۱] تفسیر طبری جلد ۲۲ صفحہ ۵۔ تفسیر درمنثور جلد ۵ صفحہ ۱۹۹ [۲] تفسیر طبری جلد ۲۲ صفحہ ۵
[۳] تفسیر کشاف جلد ۳ صفحہ ۴۲۵ مطبوعہ ۱۹۵۳ء مصر
[۴] تفسیر کبیر جلد ۲۵ صفحہ ۲۰۹ آفسٹ ایڈیشن
[۵] تفسیر مراغی جلد ۲۲ صفحہ ۷، مطبوعہ مصر ۱۳۹۲ھ

فیومی نے کہا ہے کہ الرجس کے معنی بدبو، گناہ اور گندگی کے ہیں۔ فارابی نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جو گندی ہو جائے وہ رجس ہے۔ نقاش نے کہا ہے کہ الرجس کے معنی نجس کے ہیں اور البارع میں کہا گیا ہے کہ الرجس رجاسۃ اور نجاست دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ [۱]

ابن فارس کہتا ہے: رجس کے معنی گندگی کے ہیں کیونکہ رجس چپکتا ہے اور آلودہ کرتا ہے۔ [۲]

حبیش تفلیسی کہتا ہے: یہ جاننا چاہیے کہ قرآن میں رجس کا لفظ تین صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ پہلی صورت میں اس کے معنی سیکی [۳] قماربازی، بتوں، تیروں اور مزامر کے ہیں، دوسری صورت میں اس کے معنی کفر و نفاق کے ہیں اور تیسری صورت میں اس کے معنی بُرے کردار کے ہیں۔ [۴]

---
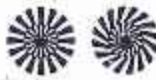
[۱] مصباح المنیر، مادہ رجس جلد ۱ صفحہ ۲۲۶

[۲] معجم مقاییس اللغۃ جلد ۲ صفحہ ۴۹۰

[۳] وہ شراب جو جوش کھاتے کھاتے ایک تہائی رہ جائے۔

[۴] وجوہ قرآن صفحات ۱۱۰ - ۱۱۱

ضمیمہ - ج

خلیفہ ابوبکر کے گھر کے بارے میں سب سے زیادہ وضاحت ابن اثیر اور ابن سعد نے کی ہے۔ ابن اثیر لکھتا ہے:

" ابوبکر کا قیام سنح میں اپنی بیوی حبیبہ بنت خارجہ کے پاس تھا۔ وہ اپنی بیعت کے بعد چھ ماہ تک وہاں رہے اور وہاں سے صبح کے وقت پیدل مدینہ آتے تھے۔ کبھی کبھار اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر بھی آتے تھے اور لوگوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ وہ نماز عشاء ادا کرنے کے بعد سنح واپس لوٹ جاتے تھے اور اگر کسی دن نہیں آتے تھے تو عمر لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ چھ ماہ بعد وہ (یعنی ابوبکر) مدینہ آ گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ [1]

مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابوبکر کی چار بیویاں تھیں یعنی قتیلہ بنت عبدالعزیٰ، ام رومان، اسماء بنت عمیس اور حبیبہ بنت خارجہ۔ [2] اور پھر کہا ہے ابوبکر سنح میں اپنی بیوی حبیبہ بنت خارجہ کے پاس رہا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے وہاں ایک مکان تعمیر کرایا تھا اور اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا حتیٰ کہ وہ مدینہ منتقل ہو گئے۔ ابوبکر نے اپنی بیعت اور خلیفہ بننے کے بعد چھ ماہ تک سنح میں قیام کیا۔ وہ صبح کے وقت پیدل اور بعض اوقات گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ آتے اور پنجگانہ نمازیں لوگوں کے ساتھ پڑھتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنے گھر

---

[1] الکامل فی التاریخ جلد ۲ صفحہ ۲۹۱ مطبوعہ دار الکتاب العربی [2] طبقات الکبریٰ جلد ۳ صفحہ ۱۶۹

لوٹ جاتے تھے .... انہوں نے اس طرح سنح میں چھ مہینے گزارے اور پھر مدینہ منتقل ہو گئے اور پھر وہیں رہنے لگے۔" [1]

اس دستاویز سے پتا چلتا ہے کہ خلیفہ ابو بکر کی چار بیویاں تھیں لیکن وہ رہتے اس گھر میں تھے جو ان کی بیوی حبیبہ بنت خارجہ کے اہل قبیلہ کے درمیان واقع تھا۔ یہ قبیلہ ایک گاؤں میں رہتا تھا جو مدینہ سے ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ [2]

لہٰذا وہ اپنی خلافت کے ابتدائی دور میں اور رسولِ اکرمؐ کی زندگی کے آخری ایام میں مدینہ میں نہیں رہتے تھے۔ ہماری اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت سے جو یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کے آخری دن فرمایا تھا: "ابو بکر کے دروازے کے سوا مسجد کی طرف کھلنے والے تمام دروازے بند کردو" یہ بات تاریخی حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ خلیفہ ابو بکر کا گھر مسجد سے متصل نہیں تھا۔ لہٰذا ان کے گھر کا کوئی دروازہ مسجد میں کھلتا ہی نہیں تھا جسے کھلا رہنے دیا جاتا اور باقی دروازے بند کر دیے جاتے۔ اس روایت کے وضعی ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اپنی وفات سے بہت عرصہ پہلے رسول اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ خود ان کے اپنے اور امیر المومنینؑ کے گھروں کے علاوہ جتنے دروازے مسجد میں کھلتے ہیں وہ سب بند کر دیے جائیں۔ لہٰذا آنحضرتؐ کی وفات کے وقت ان دو دروازوں کے سوا اور کوئی ایسا دروازہ تھا ہی نہیں جو مسجد میں کھلتا ہوتا اور جسے بند کیا جاتا۔

---

[1] طبقات الکبریٰ جلد ۳ صفحہ ۱۸۶ [2] مصباح المنیر جلد ۲ صفحہ ۲۹۰

حدیث اور تاریخ پر علامہ سید مرتضیٰ عسکری کی تحقیق عمیق

نقش عائشہ در تاریخ اسلام

عہدِ رسالت سے عہدِ معاویہ تک

۳ جلدیں

نقل حدیث میں حضرت عائشہ کا مقام اور اسلامی معاشرے میں آپکا کردار

حضرت عائشہ کی پوری زندگی پر مفصل بحث

علامہ عسکری کی دیگر کتب

- من تاریخ الحدیث
- السقیفہ
- مصطلحات اسلامیہ
- مقدمہ بر کتاب علیؑ والسنۃ
- مقدمہ بر کتاب اصل الشیعۃ واصولہا
- مقدمہ بر کتاب الاجازات العلمیۃ عند المسلمین
- نگاہی بہ سرگذشتِ حدیث